پاکستان کمیشن برائے
انسانی حقوق
HRCP

پاکستان میں انسانی حقوق کی صورتِ حال 2012

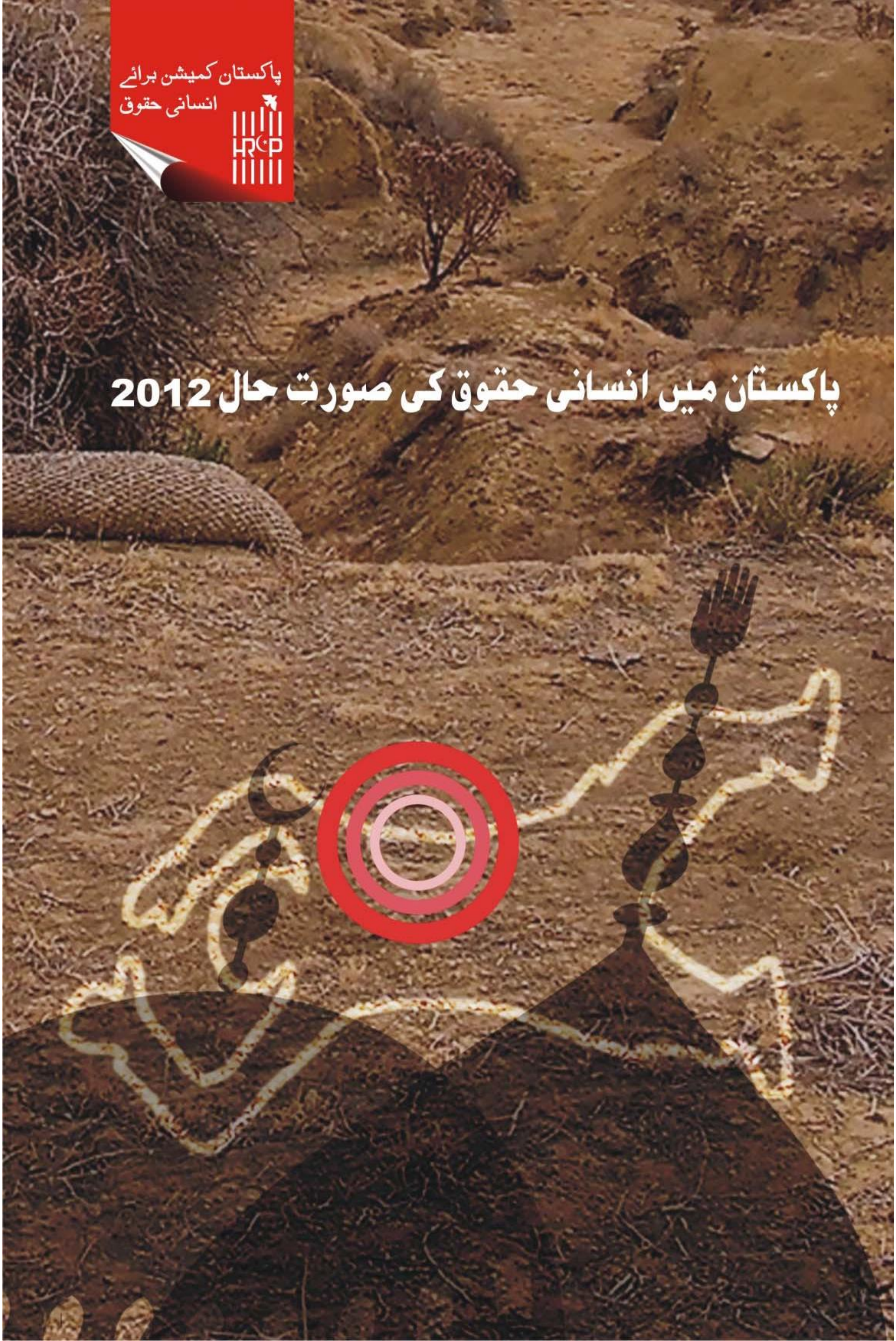

2012

پاکستان میں انسانی حقوق کی صورتحال

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

ناشر

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور - 54600

فون : 92-042-35838341-35864994-35865969 فیکس : 92-042-35883582

ای میل : hrcp@hrcp-web.org

ویب سائٹ: www.hrcp-web.org

طابع

یو بی پرنٹرز

مشن روڈ، لاہور

مئی 2013

قیمت : 300/= روپے

10 ڈالرز

5 پاؤنڈ

(علاوہ ڈاک خرچ)

ISBN - 978-969-8324-62-9

سرورق ڈیزائن: وژنریز ڈویژن، لاہور

متن کمپوزنگ: جمال احمد/سید رضا شاہ

فہرست مضامین

اختصارات ... i

تعارف ... 1

اہم نکات ... 3

1- قانون کی حکمرانی

قوانین اور قانون سازی ... 13

عدل وانصاف کا انتظام وانصرام ... 18

2- قانون کا نفاذ

امن عامہ کی صورت حال ... 63

قید خانے، قیدی اور جبری گمشدگیاں ... 74

3- بنیادی آزادیاں

نقل وحرکت کی آزادی ... 97

فکروضمیر اور مذہب کی آزادی ... 106

اظہار رائے کی آزادی ... 127

اجتماع کی آزادی ... 143

انجمن سازی کی آزادی ... 154

4- فروغ جمہوریت

سیاسی عمل میں شرکت ... 163

5- محروم طبقوں کے حقوق

عورتیں ... 175

بچے ... 192

محنت کش ... 213

6- سماجی اور معاشی حقوق

تعلیم ... 239

صحت ... 254

رہائشی سہولیات ... 270

ماحولیات ... 284

مہاجرین ... 299

ضمیمے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی سرگرمیاں ... 313

اہم مسائل پر کمیشن کا موقف ... 335

ذرائع معلومات

ذرائع، جہاں متن یا حاشیہ میں ان کا حوالہ نہیں دیا گیا، ایچ آر سی پی کے جائزے پر مبنی رپورٹس، نامہ نگاروں اور عام شہریوں کے ساتھ خط و کتابت، سرکاری گزٹ، اقتصادی اور قانونی دستاویزات اور دیگر سرکاری اطلاعات اور بیانات، قومی اور علاقائی پریس میں شائع ہونے والی رپورٹوں اور یو این ڈی پی، آئی ایل او، ڈبلیو ایچ او، یونیسف اور ورلڈ بنک جیسے عالمی اداروں کی مطبوعات پر مبنی ہیں۔ سرکاری رپورٹوں، پریس کے جائزوں اور این جی اوز کی نمونے کی سروے رپورٹوں کو ان کے محدود وسائل کے پیش نظر صورت حال کی مکمل یا حتمی تصویر نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ صرف سال کے دوران سامنے آنے والے رجحانات کی عکاسی کرتی ہیں۔

اختصارات

اے ڈی بی	ایشین ڈویلپمنٹ بنک
اے سی	اسسٹنٹ کمشنر
اے این پی	عوامی نیشنل پارٹی
اے پی پی	ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان
اے آر ڈی	الائنس فار دی ریسٹوریشن آف ڈیموکریسی [یہ وسیع تر اتحاد برائے بحالی جمہوریت 2000 کے اواخر میں تشکیل پایا تھا، جس میں پاکستان مسلم لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی دونوں شامل تھیں]
اے ایس آئی	اسسٹنٹ سب انسپکٹر [پولیس]
اے ایس جے	ایڈیشنل سیشن جج
اے ٹی اے	اینٹی ٹیررازم ایکٹ
اے ٹی سی	اینٹی ٹیررازم کورٹ
بی ایچ سی	بلوچستان ہائی کورٹ
بی ایچ یو	بنیادی ہیلتھ یونٹ
سی ڈی اے	کیپیٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی اسلام آباد، کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی (KDA)، لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی - (LDA)
سی ای سی	چیف الیکشن کمشنر
سی ای ڈی اے ڈبلیو	[CEDAW] عورتوں کے خلاف ہر قسم کے امتیازی سلوک کے خاتمے کا کنونشن
سی آئی اے	کریمنل انویسٹی گیشن ایجنسی
سی آئی آئی	کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی [اسلامی نظریاتی کونسل]
سی سی آئی	کونسل برائے مشترکہ مفادات
سی جے	چیف جسٹس
سی این آئی سی	کمپیوٹرائزڈ نیشنل آئیڈنٹٹی کارڈ
سی او اے ایس	چیف آف آرمی سٹاف
سی او پی	کانسٹی ٹیوشن آف پاکستان
سی آر پی سی	کرمنل پروسیجر کوڈ
سی آر سی	کنونشن آف دی رائٹس آف دی چائلڈ [بچوں کے حقوق کا کنونشن]
ڈی سی او	ڈسٹرکٹ کوآرڈی نیشن آفیسر
ڈی پی او	ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر
ڈی آئی جی	ڈپٹی انسپکٹر جنرل [پولیس]
ڈی ایس جے	ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج
ڈی ایس پی	ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس
ای سی ایل	ایگزٹ کنٹرول لسٹ
ای آئی اے	انوائرنمنٹ امپیکٹ اسسمنٹ
ای پی اے	انوائرنمنٹ پروٹیکشن ایجنسی [ادارہ تحفظ ماحولیات]
ای پی آئی	ایکس پینڈڈ پروگرام آف امیونائزیشن
ایف اے ٹی اے (فاٹا)	فیڈرلی ایڈمنسٹرڈ ٹرائبل ایریاز [وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات]
ایف سی آر	فرنٹیر کرائمز ریگولیشنز
ایف آئی آر	فرسٹ انفارمیشن رپورٹ
ایچ ای سی	ہائر ایجوکیشن کمیشن
ایچ آر سی پی	ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان [پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق]
آئی ڈی ایم سی	انٹرنیشنل ڈس پلیسمنٹ (اندرون ملک بے گھر ہونے والے افراد کے بارے میں) مینجمنٹ سنٹر
آئی ای ای	انٹرنیشنل انوائرنمنٹ ایگزامینیشن
آئی جی	انسپکٹر جنرل [آف پولیس]
آئی ایچ سی	اسلام آباد ہائی کورٹ
آئی ایم ایف	انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ
آئی ایس آئی	انٹر سروسز انٹیلی جنس
آئی ایس پی آر	انٹر سروسز پبلک ریلیشنز
آئی یو سی این	انٹرنیشنل یونین فار دی کنزرویشن آف نیچر
جے آئی	جماعت اسلامی
جے یو آئی (ایف)	جمعیت علمائے اسلام (ف)
جے جے ایس او	جوینائل جسٹس سسٹم
ایل ایچ سی	لاہور ہائی کورٹ
ایل ایچ وی	لیڈی ہیلتھ وزیٹر

ایم این اے	ممبر قومی اسمبلی
ایم پی اے	ممبر صوبائی اسمبلی
ایم کیو ایم	متحدہ (سابق مہاجر) قومی موومنٹ
ایم ایس ایف	مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن
این اے	نیشنل اسمبلی
این اے بی	نیشنل اکاؤنٹ ایبلیٹی بیورو
این سی ایس ڈبلیو	نیشنل کمیشن آن دی سٹیٹس آف ویمن
این ای کیو ایس	نیشنل انوائرنمنٹ کوالٹی سٹینڈرڈز
این جی او	نان گورنمنٹ آرگنائزیشن [غیر سرکاری تنظیم]
سی این آئی سی	کمپیوٹرائزڈ نیشنل آئیڈنٹی کارڈ
این آئی آر سی	نیشنل انڈسٹریل ریلیشنز کمیشن
این ایس سی	نیشنل سیکورٹی کونسل
پی اے ای سی	پاکستان اٹامک انرجی کمیشن
پی اے ٹی اے [پاٹا]	پروونشلی ایڈمنسٹرڈ ٹرائبل ایریاز [صوبے کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات]
پی ایف یو جے	پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس
پی ایچ اے	پاکستان ہاؤسنگ اتھارٹی
پی ایچ سی	پشاور ہائی کورٹ
پی ایم ایل [این]	پاکستان مسلم لیگ [نواز شریف گروپ]
پی او این ایم (پونم)	پاکستان اپریسڈ نیشنز موومنٹ [چھوٹے صوبوں کی قومیت پرست جماعتوں کا پلیٹ فارم، جس کا مقصد پنجاب کی بالادستی کے خلاف شکایات کے ازالے کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔]
پی پی سی	پاکستان پینل کوڈ
پی پی پی	پاکستان پیپلز پارٹی
پی پی پی پی	پاکستان پیپلز پارٹی۔ پارلیمنٹیرین
پی ایس	پولیس اسٹیشن
پی ٹی آئی	پاکستان تحریک انصاف
آر ایچ سی	رورل ہیلتھ سنٹر
ایس اے اے آر سی (سارک)	ساؤتھ ایشین ایسوسی ایشن فار ریجنل کوآپریشن
ایس سی	سپریم کورٹ
ایس سی اے آر پی [سکارپ]	سیلنٹی کنٹرول اینڈ ریکلیمیشن پروجیکٹ
ایس سی بی اے	سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن
ایس ایچ سی	سندھ ہائی کورٹ
ایس ایچ او	اسٹیشن ہاؤس آفیسر [تھانیدار]
ایس آئی	سب انسپکٹر [آف پولیس]
ایس آئی ٹی ای [سائیٹ]	سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹ
ایس ایم پی	سپاہ محمد پاکستان
ایس پی	سپرنٹنڈنٹ آف پولیس
ایس ایس پی	سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس
ایس ٹی این	شالیمار ٹیلی ویژن نیٹ ورک
ٹی بی	ٹیوبرکلوسس
ٹی جے پی	تحریک جعفریہ پاکستان
ٹی این ایس ایم	تحریک نفاذ شریعت محمدی
ٹی ٹی پی	تحریک طالبان پاکستان
یو جی سی	یونیورسٹی گرانٹس کمیشن
یو این ڈی سی پی	یونائیٹڈ نیشنز ڈرگ کنٹرول پروگرام
یو این ڈی پی	یونائیٹڈ نیشنز ڈویلپمنٹ پروگرام
یو این ای ایس سی او [یونیسکو]	یونائیٹڈ نیشنز ایجوکیشنل، سائنٹیفک اینڈ کلچرل آرگنائزیشن
یو ڈی ایچ آر	یونیورسل ڈکلریشن آف ہیومن رائٹس
یو این ایچ سی آر	یونائیٹڈ نیشنز ہائی کمیشن فار ریفیوجیز [اقوام متحدہ ہائی کمیشن برائے مہاجرین]
یو این آئی سی ای ایف (یونیسف)	یونائیٹڈ نیشنز انٹرنیشنل چلڈرنز ایجوکیشن فنڈ
ڈبلیو اے پی ڈی اے	(واپڈا) واٹر اینڈ پاور ڈویلپمنٹ اتھارٹی
ڈبلیو اے ایس اے	واٹر اینڈ سیوریج اتھارٹی (واسا)
ڈبلیو بی	ورلڈ بنک
ڈبلیو ایچ او	ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن
ڈبلیو ٹی او	ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن
ڈبلیو ڈبلیو ایف	ورلڈ وائیڈ فنڈ فار نیچر
ملین	دس لاکھ
بلین	ایک ارب/ایک سو کروڑ

تعارف

یہ امر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ 2012 میں ملک بھر میں انسانی حقوق کی صورت حال مایوس کن رہی ہے مگر منتخب شدہ جمہوری حکومت کی جانب سے اپنی مقررہ مدت پوری کرنے کی غیر معمولی پیش رفت سے امید پیدا ہوئی ہے کہ اگر عوام کو موقع دیا گیا تو وہ خود کو اِس بحرانی کیفیت سے نکال سکتے ہیں۔ یہ خوش آئند امر ہے کہ اختلافات ہونے کے باوجود پاکستان کی سیاسی جماعتوں نے ملک کو جمہوریت کی پٹڑی سے اتارنے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ اگرچہ پاکستان یو پی آر کی کارروائی میں جھوٹ اور نصف سچائی کا سہارا لیے بغیر بھی کام چلا سکتا تھا مگر کارروائی میں شمولیت اختیار کرنا بذات خود ایک مثبت اقدام ہے۔ 'یو این ورکنگ گروپ برائے جبری وغیر ارادی گمشدگی' کو پاکستان کے دورے کی دعوت دینا، یو این ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق اور ججوں و وکلا کی خود مختاری پر خصوصی رپورٹیر، کے دورہ پاکستان پر اُن کی معاونت کرنا تنہائی پسندی کی پالیسی ترک کرنے کے مترادف ہے۔ ورکنگ گروپ کی سفارشات یا اقوام متحدہ کے دیگر حکام کی تجاویز کے نفاذ سے ہی اس بات کا تعین ہوگا کہ آیا پاکستان جبری گمشدگی کی لعنت سے ہمیشہ کے لیے نجات پا سکتا ہے یا نہیں۔

2012 بہت زیادہ مشکلات پر مشتمل سال تھا جن پر پاکستان قابو پانے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ ملک کے توثیق شدہ انسانی حقوق کے بین الاقوامی معاہدات کے نفاذ کی رفتار انتہائی سُست روی کا شکار تھی۔ معذور افراد کے حقوق کا میثاق جیسے معاہدات کے نفاذ کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اس سال بھی وسیع پیمانے پر عدم رواداری کا سلسلہ بلا روک ٹوک جاری رہا جس کی قیمت مذہبی و مسلکی اقلیتوں کو اپنے خون سے چکانا پڑی۔ تشدد اور خوف و ہراس کی بڑھتی ہوئی لہر کے باعث ہزارہ اور مذہبی اقلیتوں نے پاکستان کو چھوڑ کر دیگر ممالک میں جائے پناہ لینے کو ترجیح دی۔ غیرت، ثقافتی روایات اور مذہب کے نام پر خواتین کو اُن کے حقوق سے محروم

رکھا گیا اور اُنہیں سنگین زیادتیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ انسانی حقوق کے مدافعین، این جی اوورکرز، سیاسی کارکنوں اور صحافیوں کو تمام اطراف سے خطرات کا سامنا تھا۔ حکومت اُن کی زندگیوں کو تحفظ فراہم کرنے کے علاوہ اُن کے قاتلوں کو گرفتار کرنے میں بھی ناکام رہی ہے۔ فاٹا کا زیادہ تر حصہ مرکزی دھارے سے باہر رہا۔ وہاں اور دیگر مقامات پر ہونے والی تمام فوجی کارروائیوں کے دوران جنگجو انتہا پسند اردگرد کے پوشیدہ مقامات پر چھپے رہے ہیں۔ پاکستان کے سب سے بڑے شہر میں بے قابو اور وسیع پیمانے پر ہونے والی ہلاکتوں سے حکام کی بدامنی پر قابو پانے کی صلاحیت اور آزادی، دونوں کے متعلق شکوک وشبہات نے جنم لیا ہے۔ سندھ میں جبری گمشدہ افراد کی تعداد بلوچستان کی تعداد کے برابر ہوتی نظر آ رہی ہے۔ شہریوں کے تحفظ وسلامتی کو جواز بنا کر بنیادی آزادیوں کو محدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 2009 میں گلگت بلتستان میں متعارف ہونے والی اصلاحات بذات خود اصلاح کی متقاضی ہیں۔ وفاق سے صوبوں کو اختیارات کی منتقلی کا مطالبہ کرنے والی سیاسی جماعتوں نے خود نچلی سطح پر اختیارات منتقل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ شعبہ صحت اور تعلیم ترجیحات میں شامل نہیں تھے۔ سرکاری شعبہ میں صحت اور تعلیم کا معیار انتہائی پست تھا جبکہ نجی شعبہ میں انہیں محض منافع بخش کاروبار کا درجہ حاصل تھا۔ عوام کے معاشی حقوق کو توجہ نہیں ملی اور توانائی کے بحران کا شکار معیشت میں مزدور اپنے معاش کا بندوبست کرنے کے عمل میں بے یارومددگار رہے۔ کشیدگی سے متاثرہ علاقوں بالخصوص فاٹا کے لوگوں کی مشکلات میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اندرونی نقل مکانی ایک مستقل مسئلہ کی صورت اختیار کرگئی ہے۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں پاکستان کے سب سے عظیم سرمایہ نوجوان نسل اور خواتین کی صلاحیتوں سے استفادہ حاصل نہیں کیا گیا جو کہ ملک کی تقدیر بدلنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ملکی نظم ونسق میں اُن کی شمولیت اور شرکت کو یقینی بنا کر ہی یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ملک میں انسانی حقوق کی صورت حال میں بہتری آئے گی۔

نجم الدین

ایڈیٹر

اہم نکات

■ قوانین اور قانون سازی

☆ 2012 میں تشکیل پانے والے اہم قوانین میں بیسویں ترمیم شامل ہے جو انتخابی امور سے متعلق ہے۔

☆ قومی کمیشن برائے انسانی حقوق کی تشکیل کے لیے قانون معرض وجود میں آیا تاہم اس پر عمل درآمد نہیں ہوسکا۔

☆ قومی کمیشن برائے مقام نسواں (این سی ایس ڈبلیو) کو خود مختار حیثیت ملی۔ اس نے اقلیتوں کے حقوق بارے چار بل تجویز کیے مگر ان کی منظوری کے لیے خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہوسکی۔

☆ جوابدہی اور معلومات کے حصول کی آزادی سے متعلقہ بل اور قومی وصوبائی اسمبلیوں میں اقلیتوں کی نشستیں بڑھانے کے لیے متعارف کیا جانے والا بل قانونی عمل کی تکمیل میں ناکام رہے ہیں۔

☆ انسانی حقوق کے بین الاقوامی معیارات کے نفاذ کو آسان کرنے کے لیے ملکی قانون سازی ممکن نہیں ہوسکی۔

☆ 22 قوانین تشکیل دیئے گئے اور آٹھ حکم نامے جاری کئے گئے ہیں۔

■ انصاف کا انتظام وانصرام

☆ سپریم کورٹ نے عدالتی فعالیت کے دائرہ کو توسیع دی جبکہ حکومت نے عدالتی احکامات کی بجا آوری میں پس وپیش سے کام کیا جس کے باعث عدالت اور انتظامیہ کے مابین محاذ آرائی کی کیفیت جاری رہی۔

☆ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کو توہین عدالت پر سزا سنائی گئی جس کے نتیجے میں انہیں اپنے عہدے اور

قومی اسمبلی کی نشست سے محروم ہونا پڑا۔ ان کے جانشین مذکورہ سزا کا نشانہ بننے سے بڑی بمشکل سے بچے اور نتیجتاً انہیں سپریم کورٹ کے حکم پر عمل کرنا پڑا۔

☆ 2012 میں 242 افراد کو سزائے موت سنائی گئی۔

☆ 1990 میں آئی ایس آئی کی جانب سے انتخابات میں مداخلت اور ایوان صدر میں خصوصی سیل بارے اصغر خان کے کیس کا بالآخر فیصلہ کر دیا گیا۔ سپریم کورٹ نے فیصلہ سنایا کہ ایوان صدر یا آئی ایس آئی یا ایم آئی میں موجود کسی بھی انتخابی سیل کو فوراً ختم کیا جائے اور 1990 کے انتخابات میں دھاندلی کرنے والے فریقین کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔

☆ بلوچستان میں امن عامہ کی صورتحال سے متعلق کیس میں سپریم کورٹ نے کہا کہ بلوچستان حکومت کے پاس حکومت کرنے کا آئینی جواز ختم ہو گیا ہے اور اسے ختم ہونا پڑا۔

☆ میمو کیس نے بہت زیادہ سنسنی پھیلائی مگر تصفیہ طلب رہا۔

■ امن عامہ کی صورتحال

☆ 2012 میں ملک بھر میں 350 پولیس مقابلوں کی اطلاعات موصول ہوئیں جن میں 403 مشتبہ افراد مارے گئے۔

☆ 2012 میں فاٹا میں 48 ڈرون حملے ہوئے جبکہ 2011 میں یہ تعداد 74 تھی۔ ہلاک شدگان کی تعداد کا اندازہ 240 سے 400 کے درمیان لگایا جا رہا ہے۔

☆ 2012 میں پاکستان بھر میں 1,577 دہشت گردی کے حملے ہوئے جس کے نتیجے میں 2,050 افراد ہلاک جبکہ 3,822 زخمی ہوئے۔ صرف بلوچستان میں 100 سے زائد ہزارہ شیعہ مارے گئے۔

☆ 2012 میں کراچی میں لسانی، فرقہ وارانہ اور سیاسی تشدد میں کم از کم 2,284 افراد مارے گئے۔

■ جیلیں، قیدی اور گمشدگان

☆ ایچ آر سی پی کو پاکستان بھر سے 87 افراد کی گمشدگی کی اطلاعات موصول ہوئیں۔ 72 افراد کا سراغ لگایا یا انہیں رہا کر دیا گیا۔

☆ بلوچستان سے کم از کم 72 افراد کی نعشیں برآمد ہوئیں جو گزشتہ کئی مہینوں سے لاپتہ تھے۔

☆ مارچ میں سینکڑوں حملہ آوروں نے سنٹرل جیل بنوں کا گیٹ توڑ دیا اور 384 قیدیوں کو جیل سے نکالنے

شانہ بننے سے بڑی بمشکل سے

ن صدر میں خصوصی سیل بارے

نہ ایوان صدر یا آئی ایس آئی یا

ے انتخابات میں دھاندلی کرنے

نے کہا کہ بلوچستان حکومت کے

ئیں جن میں 403 مشتبہ افراد

د 74 تھی۔ ہلاک شدگان کی

س کے نتیجے میں 2,050 افراد

ہزارہ شیعہ مارے گئے۔

2,2 افراد مارے گئے۔

ل ہوئیں۔ 72 افراد کا سراغ

سے لاپتہ تھے۔

38 قیدیوں کو جیل سے نکالنے

میں کامیاب ہوگئے بشمول اس قیدی کے جسے سابق صدر پرویز مشرف پر قاتلانہ حملہ کرنے کے الزام میں سزائے موت سنائی گئی تھی۔

☆ پاکستان کی جیلوں میں 75,444 قیدی مقید تھے جبکہ مجاز گنجائش 44,578 قیدیوں کی تھی۔

☆ ملک بھر میں 12,89 بچے جیلوں میں قید تھے اور ان میں سے زیادہ تر کے مقدمات زیر سماعت تھے۔

☆ 2012 میں 59 قیدی جیل حکام کی تحویل میں ہلاک ہوئے جبکہ 81 زخمی ہوئے اور قیدیوں پر مبینہ تشدد کے 10 واقعات منظر عام پر آئے۔

نقل وحرکت کی آزادی

☆ ماہ محرم میں پنجاب حکومت نے 929 مذہبی علماء کے پنجاب میں داخلے پر پابندی عائد کی جبکہ 439 مذہبی علما کو تقریر کرنے سے روکا گیا۔

☆ 2011 میں بذریعہ بلوچستان سفر کرنے والے شیعہ زائرین پر حملوں کے بعد یہ ضروری قرار دیا گیا تھا کہ زائرین بلوچستان کے ذریعے ایران جانے کا سفر اختیار کرنے سے قبل حکام سے این او سی حاصل کریں مگر اس کے باوجود 2012 میں شیعہ زائرین کے قتل کا سلسلہ جاری رہا۔

☆ گیس کی قلت کے باعث ملک کے اندر لوگوں کی نقل وحرکت پر شدید اثرات مرتب ہوئے۔ آل پاکستان سی این جی ایسوسی ایشن کے چیئرمین کے مطابق ملک بھر کے 3,395 گیس فلنگ سٹیشنز میں سے 1800 کئی ہفتوں تک بند رہے جبکہ حکومت نے دیگر 1800 سٹیشن واجبات کی عدم ادائیگی پر بند کردیئے تھے۔

☆ ریڈایبل دستاویزات کے اجراء کے لیے استعمال ہونے والی مشینری میں خرابی کے باعث نارمل اور فوری پاسپورٹس کے اجراء میں غیر معمولی تاخیر کا مشاہدہ کیا گیا۔

فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی

☆ مذہبی اور لسانی اقلیتوں پر حملوں اور ان کی ہراسیمگی کا سلسلہ جاری رہا اور مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لیے بہت کم کوشش کی گئی۔

☆ تضحیک مذہب کے قانون میں ترمیم کا معاملہ التواء کا شکار رہا۔ 14 سالہ لڑکی رمشا کو قرآن پاک جلانے کے الزام سے بری الذمہ قرار دے دیا گیا جبکہ 17 سالہ ریان کو جیل میں ڈال دیا گیا اور امریکہ

میں پاکستانی سفیر شیری رحمان کے خلاف تضحیک مذہب کا مقدمہ درج کیا گیا۔

☆ فرقہ وارانہ دہشت گردی کے حملوں اور فرقہ وارانہ تنازعات کے 213 واقعات میں 583 افراد ہلاک جبکہ 853 افراد زخمی ہوئے۔

☆ تقریباً 20 احمدیوں کو ان کی مذہبی شناخت کے باعث نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا گیا۔

☆ کراچی میں کم از کم چھ گرجا گھروں پر حملہ کیا گیا۔ ان میں سے دو کو اکتوبر میں دس دنوں کے دوران نشانہ بنایا گیا۔

☆ مارچ میں خیبر پختونخواہ کے شہر مردان میں لینڈ مافیا نے رات کی تاریکی میں 150 برس قدیم بابا کرم سنگھ گردوارے کو مسمار کر دیا۔

■ اظہار رائے کی آزادی

☆ 2012 میں پاکستان میں کم از کم 14 صحافیوں کو ہلاک کیا گیا ہے۔

☆ گوشوارہ آزادی صحافت کے مطابق پاکستان کا شمار مسلسل دو برسوں سے صحافیوں کے لیے خطرناک ممالک میں ہے۔ اس حوالے سے 179 ممالک کی فہرست میں پاکستان کا درجہ 151 ہے۔

☆ دو صحافیوں نے سپریم کورٹ میں ایک عرضداشت پیش کی جس میں استدعا کی گئی کہ مختلف چینل مالکان، اینکرز اور اشتہاراتی ایجنسیوں کے ذرائع آمدن کا کھوج لگانے کے لیے ایک احتسابی کمیشن قائم کیا جائے جس پر سپریم کورٹ نے متعلقہ فریقین سے رپورٹس طلب کیں۔

☆ قومی اسمبلی میں شفاف ٹرائل بل 2012 کو اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔

☆ متعدد فنکاروں، سوسائٹی کے کارکنوں اور شہریوں نے یوٹیوب کی بندش کے خلاف احتجاج کیا اور اسے اظہار رائے کی آزادی اور معلومات تک رسائی کے حق کی شدید خلاف ورزی قرار دیا۔

■ اجتماع کی آزادی

☆ پُرتشدد اجتماع اور مظاہروں کے رجحان میں اضافہ ہوا اور اسے عوام کے حق اجتماع کو محدود کرنے کے لیے جواز کے طور پر استعمال کیا گیا۔

☆ بلوچستان میں شیعہ ہزارہ کمیونٹی کے افراد نے متعدد بار اپنے افراد کی ٹارگٹ کلنگ کے خلاف احتجاج کیا۔

☆ حکومت پنجاب نے مال روڈ لاہور جیسی مصروف شاہراہوں پر ریلیوں، جلوسوں اور احتجاجی مظاہروں پر پابندی عائد کرنے کی پالیسی کا اعلان کیا۔

☆ ضلعی حکومتوں نے شہریوں کے بنیادی حقوق پر پابندی عائد کرنے کے لیے ضابطہ فوجداری پاکستان

(سی آر پی سی) کی دفعہ 144 کا بھرپور استعمال کیا۔

■ انجمن سازی کی آزادی

☆ ٹریڈ یونینوں کی تشکیل پر عائد پابندیاں 2012 میں جاری رہیں۔ ٹریڈ یونین رہنماؤں کی زندگیوں کو بھی شدید خطرات کا سامنا رہا۔

☆ صرف کراچی میں 356 سیاسی کارکنوں کو ان کی پارٹی وابستگی کے باعث قتل کر دیا گیا۔

■ سیاسی عمل میں شراکت

☆ چیف الیکشن کمشنر (سی ای سی) نے کہا کہ آٹھ کروڑ، چالیس لاکھ ووٹرز رجسٹرڈ ہو گئے ہیں جن میں چار کروڑ، ستر لاکھ مرد اور تین کروڑ، ساٹھ لاکھ خواتین شامل ہیں۔ ان کے مطابق فہرست ہر گھر کا دورہ کرنے کے بعد تیار کی گئی ہے۔

☆ سپریم کورٹ نے دہری شہریت کے حامل کئی اراکین مجالس قانون ساز کو نااہل قرار دے دیا۔

☆ ای سی پی ان حلقوں کے نتائج منسوخ کرنے جہاں 10 فیصد سے کم خواتین ووٹ ڈالیں گی اور سمندر پار پاکستانیوں کو ووٹ کا حق دینے کے وعدے کی پاسداری کرنے میں ناکام رہا۔

☆ احمدیوں کو انتخابی عمل سے باہر رکھا گیا۔

■ خواتین

☆ پارلیمان میں خواتین کی نمائندگی کی شرح فیصد کے لحاظ سے عالمی درجہ بندی میں پاکستان کا نمبر باون (52) رہا۔

☆ ملک میں ٹریڈ یونینوں میں خواتین کی شرح نمائندگی دو فیصد رہی۔

☆ یونیسکو کے مطابق کم از کم 51 لاکھ پاکستانی بچے سکول میں داخل نہیں تھے جس میں سے 63 فیصد لڑکیاں تھیں۔

☆ 2012 میں تقریباً 913 لڑکیوں کو عزت کے نام پر قتل کیا گیا۔ ان میں کم از کم 99 کمسن لڑکیاں شامل تھیں۔

☆ خیبر پختونخوا کے اضلاع چارسدہ اور مردان میں 2012 میں بیاہی جانے والی خواتین میں سے 74 فیصد کی عمر 16 برس سے کم تھی۔

گیا۔
21 واقعات میں 583 افراد
کر دیا گیا۔
دنوں کے دوران نشانہ بنایا گیا۔
میں 150 برس قدیم بابا کرم
سے صحافیوں کے لیے خطرناک
کا درجہ 151 ہے۔
عا کی گئی کہ مختلف چینل مالکان،
لیے ایک احتسابی کمیشن قائم کیا
یا۔
کے خلاف احتجاج کیا اور اسے
زی قرار دیا۔
حق اجتماع کو محدود کرنے کے
کلنگ کے خلاف احتجاج کیا۔
لوسوں اور احتجاجی مظاہروں پر
لیے ضابطہ فوجداری پاکستان

■ بچے

☆ شیر خوار بچوں کی شرح اموات اور پانچ سال سے کم عمر بچوں کی شرح اموات میں معمولی کمی دیکھی گئی لیکن پاکستان ابھی بھی دوسرے جنوبی ایشیائی ممالک سے پیچھے ہے۔

☆ پولیو، ایک ایسی بیماری جس سے پوری دنیا میں صرف دو ممالک متاثر ہیں سے پاکستان کے بیس اضلاع میں 58 واقعات سامنے آئے۔

☆ پاکستان دنیا میں دوسرے نمبر پر تھا جہاں پانچ سے نو سال تک کی عمر کے بچوں کی بڑی تعداد سکول نہیں جاتی۔

☆ 2012 کے پہلے چھ ماہ کے دوران بچوں پر جنسی تشدد کے 1573 واقعات منظر عام پر آئے۔

تقریباً ایک کروڑ بچے چائلڈ لیبر کا شکار تھے۔

■ محنت

☆ پاکستان کو تاریخ کی بدترین صنعتی آفت کا سامنا کرنا پڑا جب کراچی کی ایک گارمنٹ فیکٹری میں لگنے والی آگ کے نتیجے میں کم از کم 270 افراد جاں بحق ہو گئے۔

☆ گیس اور بجلی کی بڑھتی ہوئی قلت کی وجہ سے ہزاروں محنت کش بیروزگار ہو گئے جس کی وجہ سے قومی اداروں اور نجی کمپنیوں سے ملازمین کو نکالا گیا۔

☆ پنجاب کے تقریباً دس ہزار بھٹوں میں سے صرف 3836 اندراج شدہ تھے۔

☆ سرکاری ذرائع کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں پانچ کروڑ، اسی لاکھ مزدوروں میں سے صرف اکیس لاکھ کا سول سکیورٹی کی فوائد میں اندراج ہوا تھا۔

☆ اگرچہ ملک کی 60 فیصد آبادی زراعت پر انحصار کرتی ہے، بنیادی ڈھانچے میں موثر سرمایہ کاری اور جدت کاری کی کمی، زرعی پیداواری لوازمات کی قیمتوں میں اضافہ اور کسانوں کو مطلوب فنی مہارت کی فراہمی میں ناکامی پیداوار میں کمی کا سبب بنے رہے۔

■ تعلیم

☆ ملک میں شرح خواندگی کا تناسب 58 فیصد رہا۔

☆ کم از کم 121 سکولوں کو ان دہشت گردوں نے نشانہ بنایا جو تعلیم بالخصوص لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف تھے۔

☆ 2012-13 کے بجٹ میں پرائمری تعلیم کے لیے 71 ارب، 60 کروڑ روپے اور ثانوی تعلیم کے

لئے 69 ارب 40 کروڑ روپے مختص کیے گئے جو کہ (MDGS) کو پورا کرنے کے لیے انتہائی کم تھے۔

- ☆ پرائمری سکول کے 25 بچوں میں 22 کا فیل ہونے یا پانچویں جماعت سے قبل سکول چھوڑنے کا امکان تھا۔
- ☆ پاکستان کے 10.9 فیصد سکول مناسب عمارتوں سے محروم تھے، 37.7 فیصد چار دیواری سے محروم تھے، 33.1 فیصد میں پینے کے پانی کی سہولت موجود نہیں تھی، 36.9 فیصد میں لیٹرین نہیں تھیں اور 59.6 فیصد سکولوں میں بجلی نہیں تھی۔
- ☆ تقریباً 70 فیصد قومی یونیورسٹیوں کو ایچ ای سی کی جانب سے سرمائے کی عدم وصولی کی وجہ سے مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جبکہ خود ایچ ای سی کو درکار وسائل سے محروم رکھا گیا۔

■ صحت

- ☆ 2012-13 کے مالی سال میں شعبہ صحت کے لیے مختص فنڈز میں کمی کر کے جی این پی کا صرف 0.2 فیصد (سات ارب، چوراسی لاکھ پچاس ہزار) مختص کیا گیا۔
- ☆ پاکستان میں نوے لاکھ کے قریب افراد نشے کے عادی تھے اور یہ تعداد مزید بڑھ رہی تھی۔ نشے کے عادی بیس لاکھ افراد کی عمریں پندرہ سے پچیس سال کے درمیان تھیں اور نشے کی عادی خواتین کی تعداد دو لاکھ تھی۔
- ☆ دنیا کے ٹی بی سے متاثرہ 22 ممالک میں پاکستان چھٹے نمبر پر تھا۔
- ☆ ملیریا کے سالانہ سولہ لاکھ کیسز منظر عام پر آئے۔ ہر نو خواتین میں سے ایک چھاتی کے کینسر کے خطرے کا شکار تھی جس کے نتیجے میں ہر سال چالیس ہزار اموات واقع ہوتی ہیں جو کہ جنوبی ایشیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ ہیں۔

■ اقامت کاری

- ☆ رہائش کی قلت شدید تر ہوتی گئی اور بڑے شہروں میں سڑکوں پر سونے والے لوگوں کی تعداد بڑھ گئی۔
- ☆ سندھ اور بلوچستان کے کچھ علاقوں میں سیلابوں کی وجہ سے دو لاکھ، 75 ہزار، 720 مکانات تباہ ہوئے جبکہ 2005 سے لے کر اب تک آنے والی قدرتی آفات اور جنگ کی وجہ سے بے گھر ہونے والے لوگوں کی بحالی نو کے عمل کی تکمیل ہونا ابھی باقی تھی۔
- ☆ سپریم کورٹ کی جانب سے کراچی میں لینڈ مافیا کی زیادتیوں کا نوٹس لینے کے باوجود وہ ناقابل شکست رہے۔

سوات میں معمولی کمی دیکھی گئی

سے پاکستان کے بیس اضلاع

ی بڑی تعداد سکول نہیں جاتی۔
ت منظر عام پر آئے۔

ایک گارمنٹ فیکٹری میں لگنے

ار ہو گئے جس کی وجہ سے قومی

تھے۔
لاکھ مزدوروں میں سے صرف

انچے میں موثر سرمایہ کاری اور
سانوں کو مطلوب فنی مہارت کی

کیوں کی تعلیم کے خلاف تھے۔
روڑ روپے اور ثانوی تعلیم کے

☆ کراچی کی دو کچی آبادیوں میں لگنے والی آگ کے نتیجے میں ایک خاتون جاں بحق اور دیگر متعدد افراد زخمی ہوئے۔

☆ قبضہ گیروں کے پاس کسی کچی آبادی کو خالی کرانے کے لیے تضحیک مذہب کے قانون کا استعمال جدید ترین حربہ تھا۔

■ ماحولیات

☆ کابینہ نے ماحولیاتی تبدیلی سے متعلقہ قومی پالیسی کی منظوری دی۔

☆ ماحولیاتی انصاف کی فراہمی کے لیے پاکستان بھر کی ہائی کورٹس میں سبز بینچ تشکیل دیئے گئے۔ تاہم مذکورہ بنچوں میں دائر شدہ مقدمات میں سے صرف پندرہ فیصد کا فیصلہ کیا گیا اور عائد شدہ جرمانوں میں سے بیس فیصد وصول کئے جا سکے۔

☆ لاہور، کوئٹہ، پشاور اور کراچی میں نصب 10 فضائی آلودگی مانیٹرز بند ہو گئے جس کے بعد فضا کے معیار کے مشاہدے کے لیے طریقہ کار تشکیل دینے کے لیے حکومتی جانب سے کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

☆ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن نے کینجھر جھیل کے پانی کو 'کیچڑ زدہ ارضیات پر رامسر میثاق' کے تحت کیچڑ زدہ زمین قرار دیا اور اسے پینے کے لیے ناموزوں قرار دیا ہے۔

■ مہاجرین

☆ اگرچہ 2012 میں 83000 افغانیوں کو ان کے ملک افغانستان بھیجا گیا تاہم 16 لاکھ رجسٹرڈ اور دس لاکھ غیر رجسٹرڈ افغان اب بھی پاکستان میں موجود ہیں۔

☆ 2012 میں کم از کم 800 افغانیوں کو فارنرز ایکٹ کے تحت پاکستان میں بغیر قانونی دستاویزات کے رہائش پذیر ہونے پر تحویل میں لیا گیا۔

☆ 1971 سے بنگلہ دیش میں پھنسے ایک چوتھائی ملین پاکستانیوں کو وطن واپس لانے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

☆ کم از کم 757,996 پاکستانی خاندان کشیدگی کے باعث اندرون نقل مکین بنے رہے۔

☆ مون سون کے سیلاب اور تھرپارکر میں خشکی نے لاکھوں افراد کو اپنے گھروں سے بے دخل ہونے پر مجبور کیا۔

1- قانون کی حکمرانی

ن جاں بحق اور دیگر متعدد افراد

ب کے قانون کا استعمال جدید

تشکیل دیئے گئے۔ تاہم مذکورہ
ر عائد شدہ جرمانوں میں سے

گئے جس کے بعد فضا کے معیار
وئی کوشش نہیں کی گئی۔
رامسر میثاق' کے تحت کیچڑ زدہ

یا تاہم 16 لاکھ رجسٹرڈ اور دس

ں بغیر قانونی دستاویزات کے

پس لانے کے لیے کوئی کوشش

ن بنے رہے۔
گھروں سے بے دخل ہونے

قوانین اور قانون سازی

بنیادی حقوق، بشمول رتبے، مواقع، قانون کی نظر میں برابری، سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف اور فکر، اظہار، عقیدہ، ایمان، عبادت اور اجتماع کی آزادیاں، قانون کے مطابق اور اخلاق عامہ کے مفاد میں عائد پابندیوں کے ساتھ مہیا کرنے کی ضمانت دی جائے گی۔ عدلیہ کی آزادی کو مکمل طور پر یقینی بنایا جائے گا۔ آئین پاکستان [تعارف]

قانونی تحفظ اور قانون کے مطابق سلوک، ہر شہری کا بنیادی اور ناقابل تنسیخ حق ہے، چاہے وہ جہاں کہیں بھی ہو، اور ہر اس شخص کا بھی جو عارضی طور پر پاکستان میں مقیم ہو۔ آئین پاکستان [آرٹیکل - 4]

کوئی قانون یا کوئی رسم یا رواج، جسے قانون کی حیثیت حاصل ہو اگر ان حقوق سے متصادم ہے جو اس باب [بنیادی حقوق] کے تحت شہریوں کو حاصل ہیں، تو وہ اس میں پائے جانے والے تضاد کی حد تک منسوخ تصور کیا جائے گا۔

آئین پاکستان [آرٹیکل- 8 (1)]

اگر انسان کو اس بات پر مجبور کرنا مقصود نہیں ہے کہ وہ آخری چارہ کار کے طور پر ظلم اور ناانصافی کے خلاف خود علم بغاوت بلند کرے، تو لازم ہے کہ قانون کی حکمرانی کے ذریعے انسانی حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [ابتدائیہ]

ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر یا آزادانہ طور پر منتخب نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل دفعہ - 21 (1)]

مختلف اطراف سے درپیش متعدد مشکلات کے باوجود حکومت 2012 میں پارلیمنٹ سے تقریباً دو درجن قوانین منظور کروانے میں کامیاب رہی ہے جو کہ 2011 میں منظور ہونے والے قوانین کے برابر ہے۔ سال کے دوران منظور ہونے والے قوانین میں آئین میں بیسویں ترمیم جس نے آئین میں انتخابی امور سے متعلقہ دفعات میں متعدد تبدیلیاں کیں، قومی کمیشن برائے مقام نسواں کو خودمختاری دینے والا قانون، قومی کمیشن برائے انسانی حقوق قائم کرنیوالا قانون، ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی ایکٹ، اور وفاقی علاقے میں پانچ سے لے کر سولہ برس کی عمر کے بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم کی فراہمی کا قانون شامل ہیں۔ تاہم متعدد اہم مسودہ قانون

نے قانون سازی کا طریقہ کار مکمل نہ کیا۔ ان میں احتساب کے لیے نئے قانون کا مسودہ، آزادی معلومات کے قانون میں ترمیم کا مسودہ اور آئین میں ترمیم کا مسودہ جو کہ بالخصوص قومی اسمبلی میں اقلیتوں کی تعداد بڑھانے کے متعلق تھا شامل تھے۔ اگرچہ قومی کمیشن برائے مقام نسواں کو خودمختار حیثیت دینے کے لیے پیش کیا جانے والا مسودہ قانون کی شکل اختیار کر گیا تاہم کمیشن کی جانب سے پیش کئے جانے والے چار سودہ (بلز) کو قانونی شکل دینے کے لیے کوئی پیش رفت نہ ہوسکی۔ مذکورہ مسودے درج ذیل ہیں۔

ہندو ازدواج کا بل 2011، مسیحی ازدواجی (ترمیمی) بل 2011، مسیحی طلاق (ترمیم) بل 2011 اور فوجداری قانون (ترمیمی) بل 2011 (گھریلو تشدد کے متعلق)

انسانی حقوق کے بین الاقوامی معاہدات کے تحت عائد فرائض کی انجام دہی اور اٹھارویں ترمیم کے تحت مطلوبہ تبدیلیوں کے لیے قانون سازی کی ضرورت پر توجہ نہ دینا انتہائی سنگین قسم کی غفلت ہے۔ اول، قومی کمیشن برائے انسانی حقوق کے قیام کے متعلق قانون سازی، جو 30 مئی کو قیام عمل آیا اور 2012 کے اختتام تک اس پر عملدر آمد نہ ہوا اور کمیشن کا قیام واقع نہ ہوا۔ دوئم، توہین عدالت قانون 2012 ملک کی تاریخ میں واحد قانون ہے جسے اسکی منظوری ایک ماہ کے بھی کم عرصے میں کالعدم قرار دے دیا گیا۔

پارلیمنٹ سے منظور کردہ قوانین

مندرجہ ذیل قوانین سال 2012 میں منظور کئے

1- کیرج بائی ائیرا ایکٹ 6 فروری 2012، منٹر یال کنونشن کی پیروی پاسداری کے لیے۔

2- آئین (بیسویں ترمیم) ایکٹ، 28 فروری 2012، آئین میں موجود انتخابی معاملات کی دفعات میں تبدیلی کے لیے۔

3- شفاء تعمیر ملت ایکٹ، 2 مارچ 2012، یونیورسٹی کے قیام کے لیے۔

4- نجی توانائی اور انفراسٹرکچر بورڈ ایکٹ، 2 مارچ 2012

5- خواتین کی حالت پر قومی کمیشن ایکٹ، 8 مارچ 2012، کمیشن کو خودمختار حیثیت دینے کے لیے۔

6- سٹیٹ بینک آف پاکستان (ترمیم) ایکٹ۔ 10 مارچ 2012

7- صنعتی تعلقات ایکٹ، 14 مارچ 2012، وفاقی دارالحکومت اور بین الصوبائی تنظیموں میں یونین سازی کے لیے۔

8- پاکستان ٹریڈ کنٹرول آف وائلڈ فانا اینڈ فلورا ایکٹ، 4 مارچ 2012

9- این ایف سی انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی ملتان ایکٹ، 4 مارچ 2012۔ ادارے کے قیام کے لیے۔
10- مدارس کمپنیز اینڈ مدارس (فلوٹیشین اینڈ کنٹرول) (ترمیم) ایکٹ، 4 مارچ 2012
11- حد بندی برائے حلقۂ انتخابات (ترمیم) ایکٹ، 4 مارچ 2012
12- سٹاک ایکسچینج (کارپوریشن، ڈی میوچلائزیشن اینڈ انٹیگریشن) ایکٹ 7 مئی 2012
13- قومی کمیشن برائے انسانی حقوق ایکٹ، 30 مئی 2012
14- فنانس ایکٹ، 28 جون 2012
15- توہین عدالت ایکٹ، 11 جولائی 2012 (جسے سپریم کورٹ نے کالعدم قرار دیا)
16- میڈیکل اینڈ ڈینٹل کونسل ایکٹ، 7 اگست 2012
17- خصوصی معاشی زونز ایکٹ، 12 اگست 2012
18- ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی آف پاکستان ایکٹ، 3 نمبر 2012 (اتھارٹی قائم کرنے کے لیے)
19- انٹیلیکچوئل پراپرٹی آرگنائزیشن آف پاکستان ایکٹ 3 دسمبر 2013 (تنظیم قائم کرنے کے لیے)
20- فوجداری قانون (ترمیم) ایکٹ 3 دسمبر 2013، (جھوٹے انعامی بانڈز اور غیر قانونی کاروبار کو جرم تصور کرنے کے لیے)
21- ایکٹ برائے مفت اور لازمی تعلیم کا حق، 18 دسمبر 2012 (وفاق میں 5 سے لے کر 16 سال تک کے بچے کی مفت اور لازمی تعلیم کے حق کے لیے)
22- ائیر پورٹ سکیورٹی فورس (ترمیم) ایکٹ، 23 دسمبر 2012 (اے ایس ایف اور دیگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کے مابین تنخواہوں اور تعیناتیوں کے اختلاف ختم کرنے کے لیے)

آرڈیننس

چونکہ کم از کم 8 قوانین صدارتی اختیار کو استعمال کرتے ہوئے آرڈیننس کے ذریعے بنائے گئے، اس سے کو آرڈیننس کے اجرا کی روایت کے حوالے سے اٹھارہویں ترمیم کے اثرات عیاں ہیں۔ 2012 کے دو آرڈیننس کو مستقل کرکے ایک ہی سال میں قانون کی شکل دی گئی اور دو کو صرف 120 دنوں کے لیے توسیع دی گئی اور دونوں کو قومی اسمبلی سے قرارداد کے ذریعے توسیع دلائی گئی۔ سب سے اہم اقدام 24 جون کو آرڈیننس کی توثیق تھی جسے 24 اکتوبر کو 120 دنوں کے لیے توسیع دے دی گئی۔ اس آرڈیننس نے ان اقدامات کو تحفظ

دیا جو کہ یوسف رضا گیلانی کی توہین عدالت کی سزا سے لے کر عہدہ کے ہٹنے تک اٹھائے گئے۔ مندرجہ ذیل آرڈیننس 2012 میں جاری ہوئے۔

1- ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی آف پاکستان آرڈیننس، 17 فروری، اس کو 10 جون کو 120 دنوں کے لیے قومی اسمبلی سے توسیع دی گئی اور 3 نومبر کو باقاعدہ قانون کی حیثیت دی گئی۔

2- فنانس (ترمیم) آرڈیننس، 20 فروری 2012، فنانس ایکٹ 1989 اور انکم ٹیکس آرڈیننس 2001 میں ترمیم کے لیے۔

3- انٹیلیکچوئل پراپرٹی آرگنائزیشن آف پاکستان آرڈیننس 2012، ادارہ کو قائم کرنے کے لیے، اس کو 3 دسمبر کو مستقل قانون کی شکل دی گئی۔

4- کیپیٹل گین ٹیکس آرڈیننس 29 اپریل 2012

5- بچوں کے لیے نظام عدل/ جووینائل جسٹس سسٹم (ترمیم) آرڈیننس، 25 مئی 2012، قانون کو وفاقی علاقہ تک توسیع کے لیے۔

6- توثیقی آرڈیننس (ویلیڈیشن آرڈیننس)، 23 اکتوبر کو قومی اسمبلی نے 120 دنوں کے لیے توثیق دی۔ اس کے مطابق ان اقدامات کو تحفظ ملا جو کہ 26 اپریل (وہ تاریخ جب وزیر اعظم گیلانی کو توہین عدالت کی سزا ہوئی) سے 19 جون (جس دن انہوں نے وزیر اعظم کا عہدہ چھوڑا) کے درمیان اٹھائے گئے۔

7- سروسز آف پاکستان (کم نمائندگی کی تلافی) آرڈیننس یکم اکتوبر، پاکستانی سروس میں صوبوں کی کم نمائندگی کی تلافی کے لیے۔

8- وفاقی محتسب (اومبڈزمین) آرڈر کے قیام کا (ترمیمی) آرڈیننس 7 دسمبر، محتسب کو اجازت دینے کے لیے کہ وہ اپنے اختیارات کو اپنے دفتر کے گریڈ 21 کے افسر کو سونپ سکے۔

سفارشات

1- 2012 میں بھی پارلیمنٹ نے ملکی قانون سازی میں بین الاقوامی انسانی حقوق کے معاہدوں پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے کوئی توجہ نہیں کی۔ جب تک یہ رجحان ختم ہوتا ہے، پاکستان کی معاہدوں سے وابستگی اپنا مقصد کھودے گی۔

2- مطلوبہ قانون سازی کے باوجود جو کہ مئی 2012 میں واقع ہوئی، قومی کمیشن برائے انسانی حقوق کے

قیام میں ناکامی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ کوئی ایسا طریقہ کار وضع کیا جائے جس سے قانون پر فوری عمل ہو سکے۔

3- اٹھارہویں ترمیم کے تحت صدارتی آرڈیننس کی بار بار توسیع پر پابندی اب ثمر آور ثابت ہو رہی ہے۔ تاہم ضروری احکامات کی بروقت منظوری میں ناکامی کے نتائج سے بچنے کے لیے احتیاط برتنے کی ضرورت ہوگی۔

4- نجی اراکین پارلیمان کے بلوں کی نسبتاً با آسانی منظوری کے لیے اثباتی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ بالخصوص ان کی جو عورتوں کی طرف سے یا پھر اقلیتی برادریوں کے اراکین کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں۔

عدل وانصاف کا انتظام وانصرام

قانون کا تحفظ اور قانون کے مطابق سلوک، ہرشہری کا چاہے وہ جہاں بھی ہو، نا قابل تنسیخ حق ہےاور ہراس شخص کا بھی جوفی الوقت پاکستان میں موجود ہے۔خاص طور پر(الف) کسی شخص کی زندگی، آزادی، جسم، وقار یا جائیداد کے خلاف کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جائے گا جونقصان دہ ہو۔سوائے ایسے قدم کے جوقانون کے عین مطابق ہو(ب) کسی شخص کوایسا کوئی کام سرانجام دینے سے نہیں روکا جائے گا جس کی قانون ممانعت نہیں کرتا اور (ج) کسی شخص کوایسا کوئی کام کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، جس کی قانون اجازت نہیں دیتا۔

آئین پاکستان[آرٹیکل- 4 (1)اور(2)]

کسی شخص کواس کی زندگی یا آزادی سے محروم نہیں کیا جائے گا۔سوائے قانون کی مطابقت میں۔

آئین پاکستان[آرٹیکل - 9]

تمام افراد قانون کے سامنے مساویانہ حیثیت کے مالک ہیں اور مساویانہ قانونی تحفظ کے حق دار ہیں۔ آئین پاکستان [آرٹیکل 25(1)]

محض جنس کی بناپرکسی کے خلاف کوئی امتیازی سلوک روانہیں رکھا جائے گا۔ آئین پاکستان[آرٹیکل - 25 (2)]

ریاست سستے اورفوری انصاف کے حصول کویقینی بنائے گی۔ آئین پاکستان [آرٹیکل 37(اے)]

کسی جائیداد کو جبراً حاصل یا اس پر قبضہ نہیں کیا جائے گا ماسوائے قومی سطح پرکسی مقصد کے لیے اور ماسوائے قانون کی اجازت سے۔ آئین پاکستان[آرٹیکل- (2)24]

تمام انسانوں کے وقاراوران کے مساویانہ اورناقابل تنسیخ حقوق کوتسلیم کرنا، دنیا میں امن اورانصاف اورآزادی کی بنیاد رکھنے کے مترادف ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور[تعارف]

ہرشخص کوقانون کے روبروبطورانسان تسلیم کروانے کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل(6)]

ہرشخص قانون کے روبرومساویانہ حیثیت رکھتا ہےاور بغیرکسی تمیز کے مساویانہ قانونی تحفظ کا حق رکھتا ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل- (3)]

قانون یا آئین کی طرف سے عطا کردہ حقوق کی خلاف ورزی کے خلاف ہرشخص کو بااختیارقومی ٹریبونلز کے ذریعے موثر دادرسی کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل نمبر - 8]

ہر شخص کو اپنے حقوق اور ذمہ داریوں یا اپنے خلاف عائد کیے گئے کسی بھی فوجداری الزام کے تعین کے لیے، ایک خود مختار اور غیر جانبدار ٹریبونل کے ذریعے، مکمل مساویانہ حیثیت میں منصفانہ اور کھلی سماعت کا حق حاصل ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل - 10]

کسی شخص کو یکطرفہ طور پر اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل 17 - (2)]

موجودہ اختیاری پروٹوکول [سزائے موت کے خاتمے کے لیے] کی فریق کوئی ریاست اپنی حدود میں کسی شخص کو سزائے موت نہیں دے گی۔

ہر فریق ریاست اپنی حدود اختیار میں موت کی سزا کے خاتمے کے لیے تمام ضروری اقدامات کرے گی۔

دوسرا اختیاری پروٹوکول ICCPR۔[آرٹیکل - 1]

2012 اعلیٰ عدلیہ کے لیے پُر جوش سرگرمی کا سال تھا۔ جہاں انتظامیہ اور مقنّنہ نے بتدریج اپنا اعتماد کھو دیا، وہاں ریاست کے تیسرے ستون عدلیہ نے آئین اور عوامی مفادات کے اعلیٰ اور اکثر واحد محافظ کا کردار اختیار کیا۔ بدانتظامی کے واقعات، طرفداری، اختیارات کے غلط استعمال، بدعنوانی اور سب سے بڑھ کر اقتدار کے رکھوالوں کی بری ساکھ نے سپریم کورٹ کو عدالتی فعالیت کی حدود میں اضافہ کرنے کے قابل بنایا۔ بہت سے مواقع پر سپریم کورٹ ریاست کے دیگر دوستونوں کے معاملات میں دخل اندازی کرتی رہی اس کے حمایتیوں کی دلیل تھی کہ مقاصد ذرائع کا تعین کرتے ہیں۔ عدالتی فعالیت نے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو متحرک کیا کہ وہ سپریم کورٹ کے ساتھ پہلے بلاوے کے مرکز کے طور پر برتاؤ کریں۔ ان میں حزب اختلاف کی جماعتوں کے قائدین، نواز شریف، عمران خان، عابد حسن منٹو، قاضی حسین احمد اور حتیٰ کہ ایک وفاقی وزیر (جو وزیر اعظم کے لیے عدالت گئے) شامل تھے۔ قانونی گرہوں کے اراکین بہت سے مقدمات میں عوامی مفادات کے زمرے میں آنے والی قانونی کارروائی میں درخواست گزار بن گئے جس کے سیاسی مضمرات تھے۔ شکایات کے ازالے کے متلاشی متعدد شہریوں نے سپریم کورٹ کے انسانی حقوق کے سیل کو مصروف کئے رکھا۔ ایک موقع پر یہ بتایا گیا کہ سیل کو صرف تین ماہ کے عرصے کے دوران 14,757 شکایت موصول ہوئیں۔ سال گزرنے کے ساتھ ساتھ عدلیہ اور مقنّنہ کے درمیان محاذ آرائی کی صورتحال عیاں ہوگئی اگرچہ دونوں فریقین نے اکثر اس کی تردید کی۔

لوگوں کی نظروں میں مثبت شکنی کی علامت کے باعث حمایت حاصل ہونے اور میڈیا کے طاقتور حلقے کی سرپرستی کی وجہ سے عدالت نے نہ صرف احکامات جاری کئے بلکہ ان کے نفاذ کو بھی یقینی بنانے کی کوشش کی۔ یہ اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی تعیناتی پر اپنا مکمل اختیار قائم کرنے، پارلیمانی کمیٹی اور صدر پر اپنے اختیارات استعمال کرنے اور بار کے نمائندوں کے احتجاج کو نظر انداز کرنے میں کامیاب ہوئی۔

یہ وہ سال بھی تھا کہ جب سپریم کورٹ نے توہین عدالت کے قانون کا فراخدلی سے استعمال کرتے

ہوئے قانون کی عظمت قائم کرنے کی کوشش کی۔ ایک وزیراعظم کو توہین عدالت کا مجرم قرار دیا گیا اور اسے وزیراعظم کا عہدہ چھوڑنا پڑا اور دوسرا مقدمے کی پیروی کرتے ہوئے بمشکل بچ نکلنے میں کامیاب ہوا اور نئے سال میں متعدد دیگر مقدمات کی سماعت کی گئی۔ اس سارے عمل کے دوران قابل احترام ججوں نے عوامی مقامات اور کمرہ عدالت میں ایک نیا اور زیادہ حاکمانہ گفتگو اپنایا جس سے ان کے پیش روؤں نے ضبط نفس اور کم گوئی کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اجتناب کیا تھا۔

اب مارشل لاء کی گنجائش نہیں

اعلیٰ عدلیہ نے بسا اوقات یہ اعلان کیا کہ عدلیہ کی چوکنا رہنے کی حالت نے عوام کو مارشل لاء کے بھوت سے چھٹکارا دلا دیا ہے۔ صدر آصف علی زرداری کی جانب سے بھٹو کیس کا از سر نو جائزہ لینے کے لیے دائر کئے گئے ریفرنس کی سماعت کے دوران چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے گیارہ رکنی بنچ کی صدارت کرتے ہوئے 4 جنوری کو یہ اعلان کیا کہ ملک میں فوجی عدالتوں کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ حتمی دائرہ اختیار کی حامل آئینی عدالت نے پہلے ہی ایسی عدالتوں کے لئے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے تھے۔ چیف جسٹس نے سرکاری وکیل بابر اعوان سے کہا کہ یہ سب کے لیے کھلا اور واضح پیغام ہے کہ کسی کو بھی اب کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ جب تک ہم یہاں بیٹھے ہیں اور آئین کے دائرے میں رہ کر کام کر رہے ہیں، انشاء اللہ نظام کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ دن گزر گئے جب لوگ سنتے تھے کہ راتوں رات کچھ نہ کچھ ہوسکتا ہے۔

چند دن بعد راولپنڈی میں نئے عدالتی کمپلیکس کا افتتاح کرنے کے بعد چیف جسٹس نے راولپنڈی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ سپریم کورٹ نے مارشل لاء کے دروازے بند کر دیئے ہیں۔ ایک آزاد اور شفاف عدلیہ کی موجودگی میں کسی کو بھی مارشل لاء نافذ کرنے کی جرات نہیں۔ چیف جسٹس نے کہا کہ عدالت زرداری کے جسٹس عبدالحمید ڈوگر کے تحت حلف اٹھانے پر اعتراض کر سکتی تھی لیکن وہ ملک میں انتشار پھیلانا نہیں چاہتی تھی۔ دیگر اعلیٰ ججوں نے بھی ایسے ہی بیانات دیئے۔ مثال کے طور پر پشاور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے 19 جنوری کو میڈیا کو بتایا کہ چیف جسٹس کے دوبارہ اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد 31 جولائی 2011 کا فیصلہ ججوں کے لیے ایک مکمل ضابطہ اخلاق تھا اور یہ کہ آمروں پر دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔

این آر او کیس اور وزیراعظم کی سزایابی

سال 2012 کے تیسرے دن سپریم کورٹ نے 9 دسمبر 2009 کے قومی مفاہمتی آرڈیننس کے متعلق اپنے فیصلے پر عملدرآمد کو یقینی بنانے کے لیے کارروائی کا آغاز کیا، جس کے باعث یوسف رضا گیلانی کو توہین

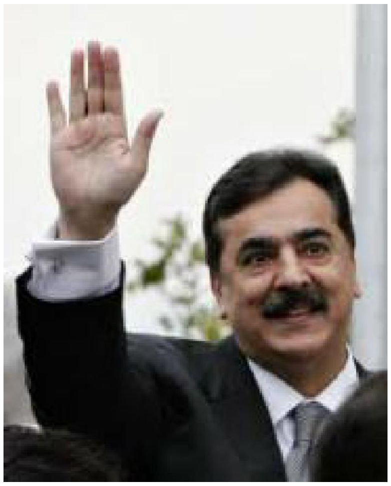

گیلانی: توہین عدالت پر برطرف

عدالت کی وجہ سے سزا کا حکم دیا گیا اور انہیں وزیراعظم کا عہدہ چھوڑنا پڑا۔ ان کے جانشین راجہ پرویز اشرف آخری وقت میں ہونے والے سمجھوتے کے باعث ایسی صورتحال سے بچنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس مقدمے کا جو بنیادی نقطہ سامنے آیا اس میں وزیراعظم کو یہ ہدایات جاری کی گئی تھیں کہ وہ ریاست کے سربراہ ہونے کے ناطے صدر آصف علی زرداری کے خلاف مقدمات دوبارہ کھولنے کے لیے سوئس حکومت کو خط لکھیں۔ 3 جنوری کو سپریم کورٹ کے 5 رکنی بینچ جس کی صدارت جسٹس آصف سعید کھوسہ کر رہے تھے، نے حکومت کو کہا کہ وہ 10 جنوری تک عدالتی حکم پر عملدرآمد کرے ورنہ عدالت خود قانونی کارروائی عمل میں لائے گی۔ اگلے دن (10 جنوری) کی سماعت کے دوران عدالت نے ایک مختصر سا حکم جاری کیا جہاں اس بات کے متعلق مشاورت کرنے کے لیے کہ جن لوگوں نے عدالت کے 2009 کے قلم کو جان بوجھ کر نظرانداز کیا ان کے خلاف کس قسم کی کارروائی کی جائے، چیف جسٹس سے ایک بڑا بینچ تشکیل دینے کی درخواست کی گئی۔

وزیراعظم کے خلاف پورا کیس مبشر حسین بنام حکومت کیس میں سپریم کورٹ کے 16 دسمبر 2009 کے فیصلے کے پیراگراف نمبر 178 میں درج تھا۔ ان پیراگراف میں وفاقی حکومت اور دیگر متعلقہ اداروں کو سوئٹزرلینڈ میں آصف علی زرداری کے خلاف اس مقدمہ کو دوبارہ شروع کرانے کا حکم دیا گیا جو کہ اس وقت کے اٹارنی جنرل ملک محمد قیوم کی جانب سے لکھے گئے خط کی بنیاد پر بند کیا جا چکا تھا۔ عدالت نے مشاہدہ کیا کہ وفاقی حکومت کی واضح ناکامی یا حکم کی تعمیل سے انکار کی صورت میں ذمہ داری وفاق کے چیف ایگزیکٹو وزیراعظم پر عائد ہوتی ہے۔ عدالت نے کہا کہ اس کے چھ آپشنز موجود ہیں۔

1۔ ایک اعلامیہ جاری کیا جائے جو کہ وزیراعظم کی پارلیمنٹ کے رکن کے طور پر چنے جانے کی اہلیت پر اثرانداز ہوسکتا ہے۔ عہد کی کھلی خلاف ورزی کرنے پر صدر اور وزیر قانون کے خلاف بھی ایسی کارروائی کا امکان ہے۔

2۔ این آر او کے فیصلے پر عملدرآمد میں ناکامی یا انکار پر وزیراعظم، وزیر قانون اور سیکرٹری قانون کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی کا آغاز کیا جائے۔

3۔ آئین کے آرٹیکل 187 کے تحت این آر او فیصلے کے متعلقہ حصوں پر عملدرآمد کے لیے ایک کمیشن تشکیل دیا جائے۔

4۔ آئین کے آرٹیکل 248 کی استثنا کی شق کے تحت صدر کو اپنے تحفظ کا موقع دیا جائے۔

5۔ چیئرمین نیب کو برطرف کیا جائے کیونکہ بظاہر ان کا طرز عمل قومی احتساب آرڈیننس کے سیکشن بی (1) کی خلاف ورزی ہے۔

6۔ عدالتی فعالیت کو آئینی حدود میں دیکھا جائے اور فیصلہ پاکستانی عوام یا پارلیمنٹ میں ان کے نمائندوں پر چھوڑ دیا جائے۔

سات ججوں پر مشتمل بڑے بینچ جس کی صدارت جسٹس ثار الملک کر رہے تھے, نے صدر آصف علی زرداری کے خلاف کیس پھر سے کھولنے کے لیے سوئس حکومت کو خط لکھنے سے انکار پر وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کو توہین عدالت کا نوٹس جاری کیا۔ وزیراعظم سپریم کورٹ کے سامنے پیش ہوئے اور اعلان کیا کہ وہ سپریم کورٹ کا مکمل احترام کرتے ہیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ صدر کو استثنیٰ حاصل ہے۔

2 فروری کو عدالت نے وزیراعظم کو توہین عدالت کے مقدمے کا سامنا کرنے کے لیے 13 فروری کو عدالت میں پیش ہونے کا حکم دیا۔ جسٹس ثار الملک نے اعلان کیا کہ ہم مطمئن ہیں کہ بظاہر توہین عدالت کیس کے متعلق کارروائی کو آگے بڑھانے کے لیے اس کیس میں بہت کچھ موجود ہے۔ اگلی سماعت سے پہلے ایک آٹھ رکنی بینچ جس کی قیادت چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کر رہے تھے، نے وزیراعظم کی 2 فروری کے فیصلے کے خلاف کی گئی اپیل کو مسترد کر دیا۔ 13 فروری کو عدالت نے وزیراعظم کو 16 دسمبر 2009 کو این آر او کو کالعدم قرار دینے کے دوران دیئے گئے حکم کی جان بوجھ کر توہین کرنے، نظر انداز کرنے اور نافرمانی کرنے کا الزام عائد کیا۔ مسٹر گیلانی نے التجا کی کہ وہ بے قصور ہیں اور کہا کہ وہ اپنا دفاع کریں گے۔

وزیراعظم کی جانب سے پیش کی گئی صفائی عدالت کو قائل نہ کر سکی اور اس نے درج ذیل مختصر حکم جاری کیا۔

چند وجوہات جن کا ذکر بعد میں کیا جائے گا، کی بنا پر وزیراعظم پاکستان/حکومتی سربراہ یوسف رضا گیلانی اسلامی جمہوریہ پاکستان 1973 کے آئین کے آرٹیکل 204 اور توہین عدالت آرڈیننس کی شق نمبر 3 (2003 کے آرڈیننس نمبر 5) کے تحت عدالتی حکم، جس کا ذکر ڈاکٹر مبشر حسن بنام حکومت پاکستان کے مقدمے میں جاری کردہ فیصلے کے پیراگراف نمبر 178 میں کیا گیا ہے، کی جان بوجھ کر توہین کرنے، اسے نظر انداز کرنے اور نافرمانی کرنے اور ہمارے اس اطمینان کے بعد کہ ان کا توہین عدالت کا مرتکب ہونا انصاف کے انتظام و انصرام کے لیے کافی مُضر اور اس کا مقصد عدالت اور عدلیہ کا مذاق اڑانا ہے، توہین عدالت کے

مجرم اور قصور وار پائے گئے ہیں۔

''جہاں تک ملزم کو دی جانے والی سزا کا تعلق ہے تو ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ عدالت کی جانب سے قلم بند کئے گئے حقائق اور سزا کے 1973 کے آئین کے آرٹیکل (1)63 کے حوالے سے شدید نتائج برآمد ہونے کا امکان ہے، جو کہ ان کو دی جانے والی سزا کے حقیقی عوامل تصور کئے جا سکتے ہیں''۔

''اس لیے انہیں توہین عدالت آرڈیننس (2003 کا آرڈیننس نمبر 5) کی شق نمبر 5 کے تحت آج عدالت کا وقت ختم ہونے تک کی سزا دی جاتی ہے''۔

وزیر اعظم کی سزا ایک منٹ سے بھی پہلے ختم ہوگئی اور حکومت قومی اسمبلی کی سپیکر کے اس فیصلے، کہ آیا یوسف رضا گیلانی قومی اسمبلی کے رکن اور وزیر اعظم کے طور پر کام جاری رکھنے کے لیے نا اہل ہیں پر بھروسہ کرتی رہی۔

قومی اسمبلی کی سپیکر نے فیصلہ کیا کہ ''سید یوسف رضا گیلانی پر لگائے گئے الزامات کا آرٹیکل نمبر 63 کی شق نمبر 1 کے پیراگراف جی یا ایچ میں دیئے گئے حوالہ جات سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے آئین کے آرٹیکل نمبر 63 کی شق نمبر 2 کے تحت سید یوسف رضا گیلانی کا رکنیت کے لیے نا اہل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا''۔

سپیکر کے فیصلے کو تحریک انصاف کے چیئرمین عمران خان اور پی ایم ایل (این) کے رہنما خواجہ آصف نے سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا۔

سپریم کورٹ نے کہا کہ سید یوسف رضا گیلانی پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے نا اہل ہو گئے تھے اور وہ اب وزیر اعظم نہیں رہے۔ چیف جسٹس نے 19 جون 2012 کو اپنے پانچ نکاتی مختصر حکم میں کہا کہ:

1۔ عدالت آرٹیکل نمبر (3)184 کے بنیادی حق کے نفاذ کو یقینی بنانے کی مجاز تھی۔

2۔ سپریم کورٹ کی جانب سے عدالتی نظر ثانی کے اختیار کے استعمال کے دوران اسے سپیکر کے 25 مئی 2012 کے حکم کی تحقیقات سے روکا نہیں جا سکتا تھا۔

3۔ گیلانی کی توہین عدالت کی سزا کو سپریم کورٹ کے سات رکنی بینچ کی جانب سے قطعیت حاصل ہوگئی ہے اس لیے وہ پارلیمنٹ کا رکن بننے کے اہل نہیں رہے اور وہ 26 اپریل 2012 کے بعد وزیر اعظم نہیں رہے۔

4۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان کو گیلانی کی نا اہلی کا نوٹیفکیشن جاری کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

5۔ صدر پاکستان کو اس صورتحال کا سامنا کرنے کے لیے ضروری کارروائی کرنا چاہئے۔

الیکشن کمیشن آف پاکستان نے فوری طور پر یہ اعلامیہ جاری کیا کہ سید یوسف رضا گیلانی 26 اپریل 2012 کے بعد وزیر اعظم نہیں رہے، لہذا ان کے عہدے کی معیاد 14 جون کو ختم ہوگئی ہے۔

نئے وزیراعظم راجہ پرویز اشرف کو بھی اسی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا جس کا حل تلاش کرنے میں ان کے پیش رو ناکام رہے تھے۔ اگرچہ عدالت نے کسی حد تک دباؤ کو کم کیا اور 18 ستمبر کو وزیراعظم نے اعلان کیا کہ انہوں نے عدالتی احکامات کی تعمیل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے عدالت کو بتایا کہ تمام پہلوؤں پر غور کرنے، اس کے مضمرات کو محسوس کرنے اور عدالت کی ابتدائی تجاویز پر غور کرنے کے بعد میں نے وزیر قانون کو اس وقت کے اٹارنی جنرل ملک قیوم کی جانب سے لکھے گئے خط کو واپس لینے کا اختیار دیا ہے۔ میں یہ کھل کر کہوں گا کہ ہمارے جذبات صدر زرداری کی ذاتی حیثیت کے متعلق نہیں بلکہ ان کے عہدے کے متعلق ہیں۔

وزیر قانون کی جانب سے لکھا گیا خط عدالت کو مطمئن نہ کر سکا اور اس نے حکومت سے کہا کہ وہ جلد از جلد اس متن کو حتمی شکل دے یا پھر توہین عدالت کے مقدمے کا سامنا کرے۔

بالآخر سپریم کورٹ نے درج ذیل متن کو منظور کر لیا۔ یہ خط بتاریخ 22 مئی 2012 کے حوالے سے ہے، جو کہ ملک محمد قیوم کی جانب سے جنیوا، سوئٹزرلینڈ کے اٹارنی جنرل ڈینئل زپیلی کو بھیجا گیا۔ سپریم کورٹ کی جانب سے 16 دسمبر 2009 کے فیصلے کے پیراگراف نمبر 175 میں جاری کئے گئے احکامات کو دیکھتے ہوئے مذکورہ خط واپس لیا جاتا ہے اور یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ کبھی لکھا ہی نہیں گیا۔ چنانچہ درخواستوں، مقام اور دعویٰ جات کی بحالی کی درخواست کی جاتی ہے۔

''یہ بغیر کسی تعصب کے صدور/ ریاست کے سربراہان کے قانونی حقوق اور دفاع کے حوالے سے ہے جو کہ قانون، آئین اور بین الاقوامی قانون کے تحت حاصل ہو سکتا ہے۔''

یہ خط 7 نومبر کو جنیوا ارسال کیا گیا اور ایک ہفتے کے بعد وزیراعظم کے خلاف توہین عدالت کا نوٹس واپس لے لیا گیا۔

اس طرح پاکستانی عدلیہ کی تاریخ کے سب سے زیادہ سنسنی خیز مقدمے کا اختتام ہوا۔ قانونی حلقوں میں اس بات کے متعلق کچھ شک کا اظہار کیا گیا کہ مقدمے کی سماعت کے دوران پیش کئے گئے دلائل اور قائم کی گئی مثالوں کا ایک لمبے عرصے تک زیر بحث رہنے کا امکان ہے۔

این آر او سے مستفید ہونے والے دیگر افراد کے حوالے سے 2009 کے فیصلے پر عملدرآمد التواء کا شکار رہا لیکن ان مقدمات کے متعلق زیادہ اطلاعات نہیں ملیں۔

میموکیس

امریکی فوج کے سربراہ ایڈمرل مائیک مولن کو بھیجے گئے ایک خط سے تعلق رکھنے والا میموکیس، جس کی پیروی پاکستانی تاجر منصور اعجاز کر رہے تھے اور جن کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ خط امریکہ میں پاکستانی سفیر حسین حقانی کی

ایک بڑے ناٹک کی تشہیر

طرف سے بھیجا گیا تھا اور جو 2011 کے آخری ہفتوں میں سپریم کورٹ کی جانب سے سماعت کے لیے داخل کیا گیا تھا، سال بھر جاری رہا اور اس کا فیصلہ نہ ہوسکا۔

زیادہ تر قانونی کارروائیاں تین رکنی کمیشن (بلوچستان، اسلام آباد اور سندھ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس) جو کہ سپریم کورٹ نے 30 دسمبر 2011 کو تشکیل دیا تھا کی سربراہی میں ہوئیں۔ اس کمیشن کے تشکیل کو بہت سے وکیلوں بشمول عاصمہ جہانگیر نے چیلنج کر دیا جنہوں نے کمیشن کے سامنے پیش ہونے سے انکار کر دیا (اگر چہ وہ اس مقدمے میں سپریم کورٹ کے سامنے پیش ہوتی رہیں)۔

کمیشن منصور اعجاز اور حسین حقانی کی عدالت میں حاضری کو یقینی بنانے میں ناکام رہا۔ اول الذکر نے اپنی زندگی کو لاحق شدید خطرات کو دیکھتے ہوئے پاکستان آنے سے انکار کر دیا اور وہ کافی بحث مباحثے کے بعد لندن میں پاکستانی ہائی کمیشن جا کر کمیشن کے سیکرٹری جو کہ خاص طور پر پاکستان سے وہاں پہنچے تھے کی موجودگی میں اپنا بیان قلمبند کرنے پر رضامند ہوئے جبکہ کمیشن نے انہیں وڈیو لنک کے ذریعے دیکھا۔

جب ان کی باری آئی تو حسین حقانی، جنہیں سپریم کورٹ نے امریکہ واپس جانے کی اجازت دی تھی نے بھی پاکستان آنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے بھی اس کی وجہ یہ بتائی کہ ان کی زندگی کو خطرہ لاحق تھا اور انہوں نے منصور اعجاز کو مہیا کی جانے والی سہولیات کا مطالبہ کیا۔ ایک ایسی درخواست جسے منظور نہیں کیا گیا تھا۔

کمیشن کو دی گئی مہلت 31 مارچ کو ختم ہوگئی۔ اسے مزید چھ ہفتے دیئے گئے اور 10 مئی کو چار ہفتے اور دیئے گئے۔ چند دن بعد انہوں نے یہ کہتے ہوئے کمیشن سے علیحدگی اختیار کر لی کہ آئین اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد سپریم کورٹ نے اپنی چھان بین مکمل کر لی۔ اپنے مباحثوں کے آخری مرحلے میں کمیشن نے حسین حقانی پر خرچ کی جانے والی رقم کے بارے میں سوال کیا۔ کمیشن کی رپورٹ سپریم کورٹ کے ایک نو رکنی بنچ جو کہ اس معاملے کو مزید آگے لے جانے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا، کے سامنے پیش کی گئی اور عدالت نے حسین حقانی کو مقدمے کی سماعت کے دوران حاضر ہونے کا حکم دیا کیونکہ انہیں کمیشن کی جانب سے

قلم بندی کی گئیں معلومات کے بارے میں جواب دینا تھا۔ کمیشن جس کے حقائق اٹارنی جنرل کی جانب سے عدالت میں پڑھ کر سنائے جاتے تھے، کے مطابق ایڈمرل مولن کو بھیجا گیا خط مصنف تھا اور حسین حقانی اس کے اصلی اور معمار تھے۔ امریکہ سے مدد مانگتے ہوئے وہ امریکہ کے لیے ناگزیر بھی بننا چاہتے تھے۔ ایک اخباری اطلاع کے مطابق حقانی نے شدید خطرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے ایٹمی اثاثے اب اصل حدف تھے، اور چنانچہ ان اثاثوں کو ایک زیادہ قابل تصدیق اور شفاف حکومت کی تحویل میں لاتے ہوئے یہ بیان کرتے ہوئے کہ آئی ایس آئی کے طالبان کے ساتھ تعلقات قائم ہیں اور آئی ایس کے سیکشن ''ایس'' کو حذف کرنے کی تجویز دیتے ہوئے امریک کے خلاف برسرپیکار طاقتوں کو ایک کوٹھڑی میں بند کرنے میں مدد کرنے کے لیے، ایک تجویز کردہ قومی سلامتی کی ٹیم کا حصہ بنتے ہوئے ایک غیر ملکی حکومت کو اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے سیاسی ڈھانچے میں دراڑیں پیدا کیں اور یہ فعل پاکستان کے ساتھ غداری اور آئین کی خلاف ورزی تھے۔ حسین حقانی نے کمیشن کی رپورٹ کو یک طرفہ، ادھوری اور سیاسی طور پر ترغیب یافتہ قرار دیا اور اس میں پائی جانے والی قانونی خامیوں کی نشاندہی کرنے کا اعلان کیا۔ کمیشن نے صدر آصف علی زرداری کو خط کے ساتھ کسی براہ راست تعلق کے الزام سے بری کر دیا۔ اس نے کہا ہمارے سامنے ایسا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا جو اس بات کی نشاندہی کرے کہ صدر آصف علی زرداری نے یا تو اس خط کی تیاری کا حکم دیا یا اسے امریکی انتظامیہ کو بھیجنے کی ہدایات جاری کیں۔ دسمبر میں اس مقدمے کی سپریم کورٹ میں سماعت کے موقع پر اس کی کارروائی کو 28 جنوری 2013 تک ملتوی کر دیا گیا۔

اصغر خان کیس

آئی ایس آئی اور ایوان صدر کے ایک مخصوص سیل جو کہ 1990 میں تشکیل دیا گیا تھا، کی جانب سے 1990 کے انتخابات میں اثر انداز ہونے سے متعلق اصغر خان کی شکایت کا فیصلہ بالآخر سپریم کورٹ نے 2012 میں سنا دیا۔ اپنے مختصر فیصلے جو کہ کافی لمبی سماعتوں کے بعد اکتوبر میں سنایا گیا تھا، میں سپریم کورٹ نے درج ذیل دلائل پیش کیے۔

- ☆ پاکستان کے شہریوں کو ایک آزاد، منصفانہ اور جائز انتخابات میں آزادانہ طور سے اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق حاصل ہے۔
- ☆ غیر اخلاقی سرگرمیوں نے 1990 کے عام انتخابات کو داغدار کیا۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ایوان صدر میں موجود ایک الیکشن سیل نے من پسند نتائج حاصل کرنے اور لوگوں کو ان کے نمائندوں کے چناؤ کے حق

سے محروم کرنے کے لیے اپنے حمایت یافتہ امیدواروں/ جماعتوں کو مالی اعانت فراہم کی۔

☆ صدر اپنے حلف کے تحت تمام لوگوں کی بہتری کے لیے کام کرنے کا پابند ہے اور اگر وہ ایسا کرنے میں ناکام ہو جائے تو وہ آئین کی خلاف ورزی کرتا ہے اور وہ آئین اور قانون کے تحت خود کو کارروائی کے لیے ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔

☆ 1990 کے انتخابات میں آرمی چیف جنرل اسلم بیگ اور آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل اسد درانی نے ایوان صدر کے ایک الیکشن سیل کو مالی امداد فراہم کی، اگرچہ انہوں نے الیکشن سیل کی غیر قانونی سرگرمیوں میں انفرادی طور پر حصہ لیا۔

☆ آئی ایس آئی اور ایم آئی کا حکومتوں کی تشکیل یا انہیں غیر مستحکم کرنے کے حوالے سے سیاست میں کوئی کردار نہیں اور نہ ہی وہ سیاستدانوں گروہوں یا جماعتوں کو کامیابی دلانے میں ان کی مدد کر سکتے ہیں۔

☆ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ صدر غلام اسحاق خان جنرل اسلم بیگ، جنرل اسد درانی اور ایم آئی کے لیے کام کرنے والے دیگر لوگوں جواب ریٹائر یا وفات پا چکے ہیں، کی حمایت سے غیر قانونی طور پر قائم الیکشن سیل کی کارروائیوں کی حمایت کر رہے تھے۔

☆ حبیب بنک کے سی ای او جناب یونس حبیب نے اوپر بیان کئے گئے عہدیداروں کی حمایت یا ایماء پر قومی خزانے سے تعلق رکھنے والے چودہ کروڑ روپے ان سیاستدانوں میں تقسیم کئے گئے جن کے بارے میں جنرل درانی نے جزوی تفصیلات فراہم کی تھیں۔ اگرچہ ایک جامع تفتیش کے بغیر ان کے خلاف کوئی حکم جاری نہیں کیا جا سکتا۔

☆ کوئی بھی ماورائے آئین اقدام مسلح افواج کے افسروں/ اہلکاروں کے خلاف آئین اور قانون کے مطابق بلا امتیاز کارروائی کا تقاضہ کرتا ہے۔

☆ قوم اندرونی اور بیرونی جارحیت کے خلاف ملک کا دفاع کرنے کے دوران اپنی زندگیوں کا نذرانہ پیش کرنے پر مسلح افواج کا تہہ دل سے احترام کرتی ہے۔

☆ خفیہ ایجنسیوں مثال کے طور پر آئی ایس آئی، ایم آئی، آئی بی وغیرہ کے عہدیداروں/ اراکین کی غیر قانونی سرگرمیوں میں شرکت ان کے خلاف قانون کے تحت سخت کارروائی کا تقاضہ کرتی ہے۔

☆ ایوان صدر، یا آئی ایس آئی، ایم آئی یا ان کے ذیلی اداروں میں قائم کسی بھی الیکشن سیل کا فوری طور پر خاتمہ کیا جائے اور ایسے کسی بھی ادارے کی تشکیل کے لیے جاری کردہ کسی بھی نوٹیفکیشن کو فی الفور تنسیخ شدہ تصور کیا جائے گا۔

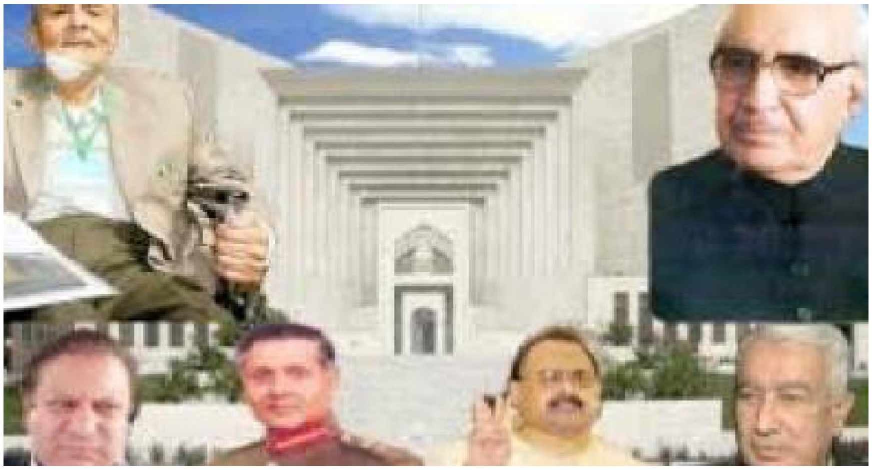

ٹرائل کا حکم دیا گیا جو ابھی تک نہیں ہو سکا

☆ مرحوم غلام اسحاق خان، جنرل اسلم بیگ، اور جنرل اسد درانی نے سیاستدانوں اور جماعتوں کو اپنے حریفوں کو شکست دینے میں مدد کرتے ہوئے آئین کی خلاف ورزی کی۔ وفاقی حکومت ان کے خلاف قانون کے تحت ضروری اقدامات اٹھائے گی۔

☆ 1990 کے انتخابات میں پیسے وصول کرنے والے سیاستدانوں اور یونس حبیب کے خلاف قانونی کارروائی کا آغاز کیا جائے گا۔ اگر ایف آئی اے نے شفاف تحقیقات کے بعد ان کے خلاف کافی ثبوت اکٹھے کر لیے تو انہیں مقدمے کا سامنا کرنے کے لیے بھیجا جائے گا۔

☆ اوپر ذکر کیے گئے اشخاص کی جانب سے وصول کی گئی رقم کی نفع کے ساتھ وصولی کے لیے ان کے خلاف دیوانی قانونی کارروائی کی جائے گی۔

☆ آٹھ کروڑ روپے کی رقم جس کے بارے میں یہ کہا گیا جاتا ہے کہ یہ ایم آئی کے اکاؤنٹ میں جمع کرائی گئی، اگر اس کی ذمہ داری کا اب تک تعین نہیں کیا گیا، تو اس کا منافع حبیب بینک یا حکومت پاکستان کو منتقل کیا جائے گا۔

☆ اصغر خان کے وکیل کی درخواست پر عدالت نے صدر کے عہدے کو (کسی شخص کو نہیں) مقدمے میں فریق بنا لیا اور صدر کے سیکرٹری کو اس بات کی وضاحت کرنے کے لیے ایک نوٹس جاری کیا کہ آیا ایوان صدر میں ایسا کوئی الیکشن سیل کام کر رہا تھا۔ سیکرٹری نے عدالت کو بتایا کہ 2008 تک ایوان صدر میں ایسا کوئی سیل کام نہیں کر رہا تھا۔ چیف جسٹس نے غور کیا کہ عدالت نے 2008-2009 کے سیل کے بارے میں نہیں پوچھا تھا، اس نے 1990 میں موجود سیل کے کام کرنے کے بارے میں پوچھا تھا۔

سیکرٹری نے عدالت کو بتایا 1990 میں ایوان صدر میں قائم کسی بھی سیل کے شواہد نہیں ملے۔

☆ عدالتی فیصلے میں صدر کے پارٹی سیاست سے بالاتر ہونے کی ضرورت کے حوالے وکلا میں ایک نئی بحث چھیڑ دی اور بہت سے لوگوں نے یہ سوچا کہ عدالت کے اعلان کا اشارہ غلام اسحاق خان سے زیادہ آصف علی زرداری کی طرف تھا۔ چند ماہرین نے سوچا کہ یہ فیصلہ مستقبل میں زرداری کی پارلیمنٹ کے ممبر کے طور پر اہلیت کو متاثر کر سکتا ہے۔

☆ مقدمے کی سماعت کے دوران عدالت نے ایک اخباری رپورٹ کا اس تاثر کے ساتھ نوٹس لیا تھا کہ 2008 کے بعد کی حکومت نے 2009 میں پنجاب حکومت کو غیر مستحکم کرنے کے لیے انٹیلی جنس بیورو (آئی بی) کے اکاؤنٹ میں سے ستائیس کروڑ روپے استعمال کیے تھے اور عدالت نے تحقیقات کا حکم دیا۔ مقدمے کے تفصیلی فیصلے میں عدالت نے نہ صرف 2009 بلکہ اصغر خان کیس کے حوالے سے 1989 میں بھی آئی بی کے فنڈز کے استعمال کے معاملے کو علیحدہ کر دیا اور CMA کے طور پر خبروں کے اندراج کا حکم دیا جن کا بعد میں جائزہ لیا جائے گا۔

توہین عدالت کا قانون 2012 کالعدم قرار

وزیر اعظم گیلانی کو توہین عدالت کی سزا سنائے جانے کے بعد حکومت نے توہین عدالت قانون کا متبادل بل لانے کے لیے فوراً پارلیمنٹ سے رجوع کیا۔ نیا قانون، توہین عدالت ایکٹ 2012 توہین عدالت کی سزا یابی کو کسی حد تک مشکل بنانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس قانون کے فرمان جاری کیے جانے کے فوراً بعد اسے سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا گیا۔

یہ تصور کرنے کے بعد کہ نئے ایکٹ کے خلاف دائر کردہ عرضداشتیں آئین کے آرٹیکل (3)184 کے تحت قابل سماعت ہیں، عدالت کو اس بات کا پتہ چلا کہ ایکٹ کی بہت سی دفعات آئین کی خلاف ورزی ہیں۔ چند دیگر دفعات کے حوالے سے عدالت نے کہا کہ وہ مبہم ہیں اور توہین عدالت کے مرتکب ہونے والوں کو فائدہ پہنچاتی ہیں، یا استثنیٰ جس کی منظوری نہیں دی جا سکتی کا تقاضہ کرتی ہیں، یا عدلیہ کی آزادی یا اختیارات کے توازن یا برابری کے اصول کی خلاف ورزی کرتی ہیں، یا قانونی کارروائی کو طول دیں گی یا مقدمہ سازی کے عمل کو ناممکن بنائیں گی۔

عدالت نے کہا کہ توہین عدالت قانون کی متعدد دفعات کے آئین کے منافی پائے جانے کے بعد قانون سازی کی دیگر دفعات کو قانونی کتب کا حصہ بنانے کا کوئی مقصد باقی نہیں رہتا۔ مزید برآں انقطاع کا

اصول بھی اس مقدمے پر لاگو نہیں ہوتا۔عدالت نے کہا ''لہٰذا کوئی اور چارہ موجود نہ ہونے کی بنا پر توہین عدالت قانون 2012 کو غیر آئینی، کالعدم اور عدم موجود قرار دیا جاتا ہے اور مزید یہ کہا کہ توہین عدالت آرڈیننس،توہین عدالت ایکٹ 2012 کے نفاذ کے دن سے بحال شدہ ہے۔

عدلیہ کے کردار کے متعلق تبصرے

جیسے جیسے عدالتی فعالیت اپنے عروج پر پہنچی اور ججوں کی تقرری کے لیے نئے طریقہ کار اپنائے گئے،ان معاملات کے متعلق بحث میں بھی اضافہ ہوا۔عین اسی وقت بہت سے غیر ملکی حکام نے عدلیہ کے مناسب طرز عمل کو یقینی بنانے کے لیے تبصروں اور تجاویز کی پیشکش کی۔

آئی سی جے کی رپورٹ

ماہرین قانون کے بین الاقوامی کمیشن (آئی سی جے) نے 2011 (خزاں) میں کیے گئے زمینی دورے کی بنیاد پر اپریل میں اپنی رپورٹ شائع کی،جس میں اس نے سپریم کورٹ کی فعالیت کے متعلق کچھ سوالات اٹھائے۔

آئی سی جے نے کہا کہ اگرچہ پاکستان کی عدلیہ آزاد تھی،لیکن اس نے ان معاملات میں مداخلت کی جو عام طور پر حکومت کے لیے مختص ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے طاقت کے توازن کے متعلق خدشات میں اضافہ ہوا۔انہوں نے مزید کہا کہ ''پارلیمنٹ اور حکومت کمزور ہیں،جس کی وجہ سے سپریم کورٹ انتظامیہ سے منسلک معاملات میں مداخلت کرتے ہوئے اس خلا کو پُر کرتی ہے''۔

''یہ بات اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ سپریم کورٹ آئینی ترامیم کو بھی چیلنج کر دیتی ہے اور اپنی طاقت میں اضافہ کرنے کے لیے اور جہاں تک ججوں کی تعیناتی کا تعلق ہے،بالخصوص چیف جسٹس کے اختیارات میں اضافہ کرنے کے لیے مداخلت کرتی ہے۔اس کی وجہ سے اختیارات کے توازن کے حوالے سے ایک تشویش پیدا ہوتی ہے۔

آئی سی جے جن نتائج پر پہنچا ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

☆ اگرچہ فوج کی طرف سے پیدا کردہ بہت سی بالخصوص عدلیہ کے حوالے سے مشکلات کا ازالہ کر دیا گیا ہے یا معنی خیز انداز سے ازالہ کیا جا رہا ہے، تاہم اب بھی منتخب حکومت اور فوج کے بیچ میں وقتی تناؤ موجود ہے جس کے باعث ڈرامائی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عدلیہ انتظامیہ اور مقننہ سے آزاد ہے۔

☆ اگر چہ بہت سی ایسی مشکلات ہیں جو ریاست کے عمومی مسائل سے منسلک ہیں ہم ان میں سے دو پر زور دینا چاہتے ہیں۔

(الف) انصاف کا انتظام وانصرام اس وقت تک صحیح طریقے سے نہیں چل سکتا جب تک اس کے افراد کار بشمول وکیلوں کو اس خواہش کی ترغیب نہ دی جائے کہ وہ ذاتی مفاد کے لیے اپنے عہدے کے ناجائز استعمال کی بجائے انصاف کا انتظام وانصرام کرتے ہوئے مشترکہ مفاد کے لیے کام کریں۔ یہ بات بالکل واضح ہے۔

(ب) ایسا محسوس ہوتا ہے اور جیسا کہ جسٹس پرویز علی شاہ کے کیس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ریاست میں مذہبی جنگجوئی کی متشدد لہریں موجود ہیں۔ ان پر بہر صورت قابو پایا جانا چاہیے، وگرنہ قانون کی حکمرانی ٹھوس طریقے سے قائم اور برقرار نہیں رکھی جا سکتی۔''

☆ ججوں کی نامزدگی کی راہ میں بھی بہت سی مشکلات حائل ہیں۔ بہت سے ایسے سیاسی مسائل ہیں جن کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر بار ایسا نہیں ہوتا کہ سب سے زیادہ قابل امیدوار کو بڑے عہدے پر ترقی دی جائے۔ قانونی کارروائیاں پوری طرح شفاف نہیں ہیں۔

☆ نام نہاد سوموٹو قانونی کارروائیاں عام طور پر بنیادی حقوق کے تحفظ اور قانون کی حکمرانی کی تائید کرنے کے لیے عمل میں لائی جاتی ہیں۔ جہاں تک اصول کا تعلق ہے اور جب تک قانونی کارروائیاں سختی سے اور شفاف کسوٹی کی بنیاد پر عمل میں لائی جاتی ہیں تو یہ بات قابل تحسین ہے، جس میں ان کے عملی اطلاق میں ان کے ناجائز استعمال کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔

☆ اس کے باوجود ان میں سے کچھ سوموٹو قانونی کارروائیاں ان کے انتظام وانصرام کے حوالے سے خدشات میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان کو لاگو کرنے کے فیصلے میں خودسری کا عنصر نظر آتا ہے اور جب انہیں غلط طریقے سے لاگو کیا جاتا ہے تو وہ طاقت کے توازن کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور انصاف کے عمومی تسلسل میں مداخلت کر سکتے ہیں۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ ان کا حد سے زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔

آئی سی جے کی چند تجاویز مندرجہ ذیل ہیں

☆ حکومت پاکستان کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ یہ بدعنوانی چاہے وہ جہاں کہیں بھی ہو بالخصوص جہاں اس کا انصاف کے انتظام وانصرام سے تعلق ہو، کا مقابلہ کرنے کے لیے کیے جانے والے اقدامات کو جاری رکھے اور انہیں مضبوط بنائے۔

☆ حکومت پاکستان اور تمام صوبائی حکومتوں کو عدالتوں، بالخصوص ضلعی عدالتوں کی حالت بہتر بنانے اور

اس کے بعد ججوں اور عدالتوں کے دیگر عملے چاہے حالات جیسے بھی ہوں تنخواہوں میں اضافے کے لیے عدلیہ کے مختص فنڈز میں خاطر خواہ اضافہ کرنا چاہیے۔

☆ ججوں کی تقرری اور ترقی میں بار کے اثر ورسوخ کا لازمی طور پر خاتمہ کرنا چاہیے۔

☆ ججوں کی تقرری اور ترقی میں ملوث تمام حکام کو یہ اصول بنا لینا چاہیے کہ اعلیٰ ترین قابلیت، وقار اور آزادی کے حامل افراد کی تقرری کی جائے۔ دیگر اہم امور مثال کے طور پر جنسی مساوات کا بھی خیال رکھا جائے۔

☆ بار کونسلوں اور جہاں ضروری ہو، عدالتوں کو چاہئے کہ وہ وکلاء کے لیے ضابطہ اخلاق کی وضاحت کریں اور تشکیل دیں (اگر پہلے سے تشکیل شدہ نہ ہوں) جس کا مقصد تمام سطحوں پر شعبہ قانون اور وکلاء کی خودمختاری کا تحفظ ہو۔

☆ سپریم کورٹ کو چیمبرز کی تشکیل اور مقدمات کی تخصیص کے لیے واضح اصول متعارف کرانے چاہئیں۔

اقوام متحدہ کے خصوصی رپوٹیئر کا دورہ پاکستان

ججوں اور قانون دانوں کی آزادی کے متعلق اقوام متحدہ کے ایک رپوٹیئر جس نے مئی میں 11 دن کے لیے پاکستان کا دورہ کیا اس نے اس موضوع پر بھی کام کیا اور عدلیہ کی طرف سے سوموٹو اختیارات کی رہنمائی کرنے کے لیے معیار کو واضح کرنے کا مطالبہ کیا۔

اپنی ابتدائی رپورٹ میں محترمہ گیبرئیلا ناؤل (Gabriela Knaul) نے تمام انسانی حقوق کی پامالی سے تعلق رکھنے والے مقدمات، مثال کے طور پر بلوچستان میں جبری گمشدگیوں جیسے مقدمات کے حوالے سے سپریم کورٹ کے بنیادی اختیارات کے استعمال کی تعریف کی۔ کچھ مقدمات میں عدالت انسانی حقوق کے قانون کو برقرار رکھے ہوئے تھی اور سزا سے استثنیٰ کے انسداد میں اپنا کردار ادا کر رہی تھی۔ اگرچہ مناسب رہنما اصولوں کی عدم موجودگی سوموٹو کی طاقت کو کمزور کر سکتی ہے اور زیر التوا مقدمات کے بروقت تصفیے کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔

اپنے اختیار میں آنے والے دیگر معاملات کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے حکومت کو پورے پاکستان کو اعلیٰ عدالتوں کے دائرہ اختیار میں لانے پر زور دیا اور کہا کہ ایک متوازی اعلیٰ عدالت (وفاقی شرعی عدالت) کی موجودگی نے ابہام پیدا کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس کی وجہ سے ان آئینی تشریحات کو موقع فراہم ہوا جو ایک دوسرے سے متصادم ہو سکتی ہیں۔

انہوں نے نام نہاد توہین رسالت کے قانون کے تحت چلائے جانے والے مقدمات پر بھی تشویش کا اظہار کیا اور وکیلوں پر دباؤ ڈالے جانے اور مقدمات کا دفاع کرنے میں وکیلوں کی ہچکچاہٹ (خوف کی وجہ سے) کا حوالہ بھی دیا۔ پولیس کی جانب سے کی جانے والی تحقیقات کا بُرا معیار بھی ایک ایسا معاملہ تھا جو تشویش کا باعث بنا۔

اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی کونسل کے طریقہ کار، جسے پاکستان کا دورہ کرنے کا اختیار ملا، کے پہلی فرد کے طور پر محترمہ ناؤل (Knaul) نے امید ظاہر کی کہ اس ملک کا دورہ کرنے میں دلچسپی رکھنے والے دیگر رپوٹیئرز کے لیے پاکستان اپنے دروازے کھلے رکھے گا۔

جسٹس لوئس آربر (Justice Louis Arbour)

پاکستانی عدلیہ کی بڑھتی ہوئی فعالیت کے نقادوں میں انٹرنیشنل کرائسز گروپ کی صدر اور اقوام متحدہ کی کمشنر برائے انسانی حقوق، جسٹس لوئس آربر بھی شامل تھیں انہوں نے پاکستان کا دورہ کرنے کے بعد واشنگٹن کے وڈرو ولسن سنٹر (Worldrow Wilson Centre) میں ایک تقریب کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''وہ جج جو 2007ء کی وکلاء تحریک کے ذریعے بحال کیے گئے تھے، وہ اپنی خودمختاری کے نشے میں مدہوش ہو چکے ہیں اور ان کے حالیہ اقدامات سے اس جمہوری حکم کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ جس کے تحت وہ اپنے عہدوں پر بحال ہوئے تھے۔ ان کے مطابق ایسا ممکن ہے کہ آخر میں سپریم کورٹ فوج کی مدد سے جمہوری طریقے سے منتخب کردہ حکومت کو تحلیل کرتے ہوئے اس کی جگہ ایک نگران حکومت لے آئے اور اسے توسیع دے، جو کہ تمام مقاصد اور ارادوں کے حوالے سے ایک اور سازش تصور کی جائے گی۔

بلوچستان کیس

سپریم کورٹ نے جنوری 2010 کے اوائل میں بلوچستان میں امن عامہ کی صورت حال کے حوالے سے 2010 میں دائر کردہ عرض داشتوں، جو کہ اس وقت کے بلوچستان ہائی کورٹ بار کے صدر نے دائر کی تھیں، کی سماعت جاری رکھی۔ اس نے امن و عامہ کی صورت حال کے متعلق صوبائی حکومت کی رپورٹوں کو مسترد کر دیا۔ مارچ میں عدالت نے مقدمے کی سماعت کوئٹہ میں کرنے کا فیصلہ کیا۔

کوئٹہ میں بلوچستان کی امن عامہ کی صورت حال کے متعلق درخواستوں کی سماعت کے دوران سپریم کورٹ نے گمشدگیوں کے معاملے کا بھی نوٹس لیا۔ 5 اپریل کو عدالت کو مطلع کیا گیا کہ کوئٹہ کے علاقے سریاب روڈ سے 10 افراد کو اغوا کیا گیا تھا جن میں سے تین کو رہا کر دیا گیا ہے۔ چیف جسٹس نے پولیس کو سات افراد کو

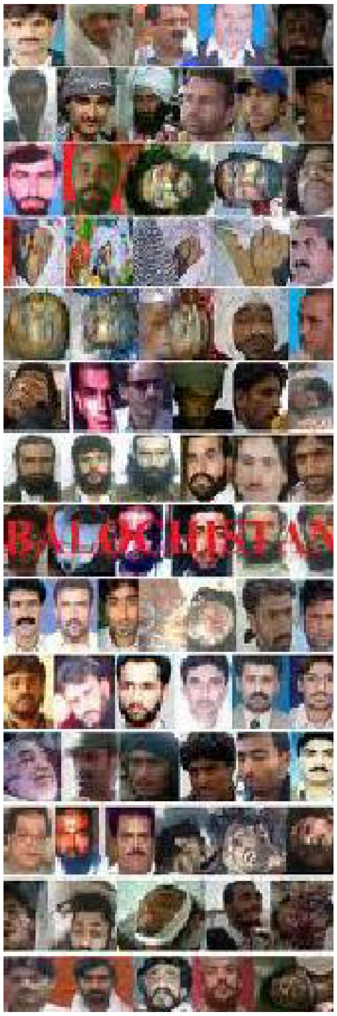

اُن کے خاندان اُن کی واپسی کالاحاصل انتظار کرتی رہے

اگلے دن عدالت میں پیش کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے سیکرٹری داخلہ کوان تین صوبائی وزرا کوگرفتار کرنے کاحکم بھی دیا جن کے بارے میں اطلاع تھی کہ وہ اغوا برائے تاوان کے مقدمات میں ملوث تھے۔ سماعتوں کے دوران لاپتہ افراد کے خاندان دیگر مقدمات بھی بڑی تعداد میں سپریم کورٹ کے نوٹس میں لاتے رہے۔ فرنٹیئر کارپس (Frontier Corsp) اور فرنٹیئر کانسٹیبلری (Frontier Constabulary) پر شدید الزامات لگائے گئے اور صوبائی وزرا کو بھی شامل تفتیش کر لیا گیا۔ عدالت نے لاپتہ افراد کو بازیاب کرانے اوران کے خاندانوں کی مدد کرنے کے احکامات جاری رکھے۔

عدالت نے متعدد مواقع پر کہا کہ بلوچستان میں آئینی نظم وضبط غیرمؤثر ہوکر رہ گیا ہے۔ چیف جسٹس نے حکام سے کہا کہ وہ اپنا کردار ادا کریں اس سے پہلے کہ ہم تباہی کے دہانے پر پہنچ جائیں اور خبردار کیا کہ بلوچستان کے ساتھ ایک دوسری حکومت بھی جاسکتی ہے۔ سرکاری اہلکاروں کو اقوام متحدہ کی ٹیم کے پہنچنے سے پہلے اپنی روش درست کرنے کا کہا گیا۔ عدالت نے غیر ارادی اور جبری گمشدگیوں کے معاملے پر اقوام متحدہ کے ایک ورکنگ گروپ کو مدعو کرنے کی وجہ پر بھی سوال اٹھایا۔

اکتوبر میں عدالت نے حکم دیا کہ بلوچستان حکومت امن عامہ برقرار رکھنے میں ناکام ہو چکی ہے اور صوبائی حکومت سے کہا کہ وہ خاموش تماشائی بن کے بیٹھنا بند کرے اورشہریوں کے جان و مال کے تحفظ کے لیے مناسب اقدامات کرے۔ نومبر میں آرمی چیف اور چیف جسٹس کے چند بیانات نے ان کےاداروں کے بیچ تناؤ کا عارضی تاثر قائم کردیا۔ اس تکرار کا مرکز جنرل کیانی کا مسلح افواج اوران کے نمائندوں پر کی جانے والی بلاجواز تنقید پر ردعمل اوران کا یہ بیان تھا کہ وسیع تر قومی مفاد کی وضاحت کرتے وقت کہ کسی بھی فرد یا ادارے کو

اس بات کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ یہ بات واضح نہیں کہ آیا وہ سپریم کورٹ کے حوالے سے بات کر رہے تھے لیکن چیف جسٹس نے غالباً یہ سوچا کہ ان کا اشارہ سپریم کورٹ کی طرف تھا، اور یہ اعلان کیا کہ وہ دن گئے جب ٹینک اور میزائل قومی سلامتی کی ضمانت ہوتے تھے اور سپریم کورٹ آئین کی واحد محافظ ہے۔ مزید جب کسی نے عدلیہ کے لیے فوج کے احترام کا حوالہ دیا تو چیف جسٹس نے کہا کہ وہ، ہم کل دیکھ چکے ہیں۔

بہر حال دونوں فریقین نے ضبط کا مظاہرہ کیا اور معاملہ جو بھی تھا، اس کے متعلق دوبارہ کوئی بات نہیں سنی گئی۔ غالباً یہ محسوس کر لیا گیا تھا کہ بلوچستان میں لاقانونیت، گمشدگیاں یا فوج کی اعلیٰ قیادت کی تنقید دو بڑے فریقین کے درمیان تکرار والے معاملات نہیں تھے۔

یہ سماعتیں سال کے آخری مہینے تک جاری رہیں اور سپریم کورٹ حکم کی بحالی میں صوبائی اور وفاقی حکومت کی ناکامی اور عدالتی احکامات کو نظر انداز کرنے پر شدید اضطراب کا شکار ہوگئی۔ 5 دسمبر کو اس نے اعلان کیا کہ بلوچستان حکومت اپنے رسک اور ذمہ داری پر حکومت کر رہی ہے۔ بلوچستان میں امن عامہ کی صورت حال کے متعلق اپنے 12 دسمبر 2012 کے قلیل المدتی فیصلے میں سپریم کورٹ نے کہا کہ بلوچستان حکومت صوبے میں حکومت کرنے کے آئینی اختیارات کھو چکی ہے اور اسے بنیادی حقوق کی پامالی پر خاموش تماشائی کے طور پر اپنا کام جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ عدالت نے کہا کہ تمام لوگوں کے بنیادی حقوق کی مکمل حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے تمام آئینی متبادلات کو استعمال میں لانا وفاق کا آئینی فرض تھا، لیکن ایسا کچھ نہیں کیا گیا۔ عدالت کا ماننا تھا کہ ''اس وقت بھی آئین کے آرٹیکل (3)184 کے تحت بلوچستان میں اندرونی لڑائی جھگڑوں پر قابو پانا وفاق کا آئینی فرض ہے۔

عدالت نے کہا کہ اس لیے وفاقی حکومت سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ آئین کے تحت بلوچستان کے لوگوں کو مجرمانہ جارحیت بشمول مسخ شدہ لاشوں کی برآمدگی، لاپتہ افراد، ٹارگٹ کلنگ اغوا برائے تاوان اور فرقہ وارانہ قتل کے خلاف تحفظ فراہم کرنے کے لیے فوری کارروائی کو یقینی بنائے۔

آخر کار اسلام آباد نے بلوچستان میں گورنر راج نافذ کر دیا۔

جبری گمشدگیاں

اگرچہ جبری گمشدگیوں کا شکار ہونے والے افراد کی بازیابی کے لیے 2007 میں دائر کی گئی عرضداشتیں التواء کا شکار رہیں، تاہم ان میں سے زیادہ تر سماعتیں کوئٹہ میں ہوئیں۔ سپریم کورٹ نے بلوچستان میں بدامنی سے متعلقہ عرضداشت کی سماعت کرتے ہوئے اس معاملے کا نوٹس لیا۔

سال بھر جاری رہنے والی جبری گمشدگیوں کے خلاف احتجاج

سپریم کورٹ نے جبری گمشدگیوں کے پرانے مقدمات کا جائزہ لینے کے علاوہ گمشدگیوں کے ان نئے واقعات کا بھی فوری نوٹس لیا جو بلوچ کارکنان اس کے نوٹس میں لائے تھے۔

مئی کے اوائل میں ایک تین رکنی بنچ جس کی صدارت چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کررہے تھے، نے وزیراعلیٰ بلوچستان اور وزیرداخلہ کو عدالت میں طلب کرلیا اور کہا کہ انہیں سپریم کورٹ کو اس بات کی یقین دہانی کرانی ہوگی کہ حکومت آئین کے آرٹیکل 9 کے تحت لوگوں کی جان و مال کے مکمل تحفظ کو یقینی بنائے گی۔ علاوہ ازیں نہ ہی کسی شہری کو اٹھایا یا اغوا کیا جائے اور نہ ہی قتل اور لاپتہ افراد کی گولیوں سے چھلنی لاشوں کو پھینکنے کے واقعات پیش آئیں گے۔

عدالت کی جانب سے طلب کرنے کے جواب میں نہ ہی وزرا اور نہ ہی ایف سی کے سربراہ عدالت میں حاضر ہوئے۔ عدالت کو اس وقت شدید دھچکا لگا جب بلوچستان پولیس کے سربراہ نے یہ بیان دیا کہ سپریم کورٹ نے جن تین افراد کی بازیابی کا حکم دیا تھا انہیں ایف سی نے اٹھایا تھا۔ عدالت نے اعلان کیا کہ اگر ایف سی اور پولیس نے اس کے احکامات کو نظرانداز کرنا جاری رکھا تو یہ فوجی حکام کو ضروری کارروائی کرنے کا حکم دے گی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد کی سماعت کے موقع پر چیف جسٹس نے اس بات پر غور کیا کہ لگ بھگ 25 افراد کو منظر عام پر لایا گیا لیکن پولیس اس بات کا پتہ چلانے میں ناکام رہی کہ انہیں کس نے اغوا کیا تھا اور انہیں اتنے لمبے عرصے تک کہاں رکھا گیا تھا۔ عدالت نے اس بات پر غور کیا کہ ہر شخص سکیورٹی اور خفیہ ایجنسیوں پر الزام عائد کررہا تھا اور ان کے خلاف ثبوت بھی موجود تھا۔ چیف جسٹس نے مزید کہا کہ ''لاپتہ افراد کا مسئلہ ایک سنگین

موضوع ہے اور بلوچستان میں امن و عامہ کی بگڑتی ہوئی صورت حال ایک بڑی وجہ ہے۔ اس مسئلے کا لازمی طور پر سیاسی حل تلاش کیا جانا چاہیے۔

اگلی سماعت کے موقع پر عدالت کے سخت سوالوں کے دوران نائب اٹارنی جنرل کے اوسان خطا ہو گئے اور انہوں نے اپنے عہدے سے یہ کہتے ہوئے استعفیٰ دے دیا کہ انہیں باعزت طریقے سے زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ عدالت نے بلوچستان کے وزیر داخلہ کے عدالت میں پیش نہ ہونے کا سخت نوٹس لیا اور سیکرٹری داخلہ سے کہا کہ اگر وزیر داخلہ پیش نہیں ہونا چاہتے تو انہیں گرفتار کر لینا چاہیے اور ضرورت پڑنے پر انہیں زنجیریں ڈال کر عدالت میں پیش کرنا چاہیے۔ چیف جسٹس نے کہا کہ اگر وزیر اعظم یہ نہیں سوچتے کہ امن عامہ کی بحالی اور آئین پر عملدرآمد ان کی ذمہ داری ہے تو آئین اپنی سمت خود متعین کرے گا اور انہوں نے ایمرجنسی کی طرف اشارہ کیا۔

اس کے بعد کی سماعتوں کے موقع پر بھی سپریم کورٹ نے اپنی مایوسی اور شرمندگی کا اظہار کیا کیونکہ اس کے پاس گمشدگیوں کے معاملات کے متعلق کوئی جوابات نہیں تھے۔ چیف جسٹس نے کہا کہ وہ لاپتہ افراد کو بازیاب کرانے میں حکام کی ناکامی پر مایوس ہیں، جیسے ہی جج کوئٹہ پہنچے تو لاش کی برآمدگی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ہر تیسرے شخص کی گمشدگی کا الزام ایف سی پر عائد کیا گیا۔

ستمبر کے آخر میں سپریم کورٹ نے کسی بھی پیش رفت کی امید کھو دی۔ چیف جسٹس نے کہا کہ ''چھ ماہ کی کوششوں کے بعد بھی نتیجہ صفر ہے۔'' عدالت نے وفاقی اور بلوچستان حکومت کو یہ لکھ کر دینے کو کہا کہ وہ بلوچستان میں قانون کی رٹ قائم کرنے میں بُری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔ آخر کار سپریم کورٹ نے امن وامان سے متعلقہ مقدمے میں جبری گمشدگیوں کے مسئلے کے ساتھ نبٹا اور موخر الذکر مقدمے میں ایک حکم نامہ جاری کیا۔

پشاور ہائی کورٹ

عدالتوں، بالخصوص پشاور ہائی کورٹ نے جبری گمشدگیوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل پر بھی اپنی گرفت قائم رکھی۔ موخر الذکر عدالت نے سال بھر کے دوران ایسے مقدمات کی سماعت کی، کیونکہ خیبر پختونخوا میں گمشدگیوں کے واقعات بہت عام ہو چکے تھے۔

پشاور ہائیکورٹ کے ضلعی بنچ جس کی سربراہی جسٹس دوست محمد خان کر رہے تھے، نے واضح طور پر حکام کی جانب سے تاخیری حربے استعمال کرنے اور جن کے بارے میں عدالت کا خیال تھا کہ انہوں نے خفیہ اور

سکیورٹی ایجنسیوں کو بچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا، پر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے وفاقی، دفاعی سیکرٹری، وزیر اعظم کے مشیر برائے انسانی حقوق، خیبر پختونخوا کے چیف سیکرٹری، ایڈیشنل سیکرٹری اور فوج کے جج ایڈووکیٹ جنرل اور ان تمام لوگوں کو عدالت میں طلب کر لیا جنہوں نے عدالت کو جبری طور پر گمشدہ افراد کی بازیابی اور ان کا سراغ لگانے میں اپنے تعاون کی یقین دہانی کرائی تھی۔

اپنے تفصیلی فیصلے میں عدالت نے کہا کہ ''جواب دہ لوگوں نے یقین دہانی کرائی تھی کہ جبری گمشدگیوں کے معاملے کی ذمہ داری سیاسی وفاقی انتظامیہ کے علاوہ مسلح افواج اور خفیہ ایجنسیوں کے سربراہان لیں گے اور گمشدہ افراد کے رشتے داروں کی شکایات کے ازالے کے لیے اس معاملے کی تحقیق کے لیے ایک حکمت عملی وضع کی جائے گی۔ مئی میں خیبر پختونخوا اسپیشل سیکرٹری برائے داخلی وقبائلی امور نے عدالت کو بتایا کہ 1,930 لاپتہ افراد کی شناخت ہو چکی ہے ان میں سے 1,035 افراد پشاور ہائی کورٹ کی منظور کردہ ضمانت کے تحت رہا کیے جا چکے ہیں اور ان میں سے 835 کو حراستی مراکز میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد کے مرحلے میں عدالت نے خفیہ ایجنسیوں کو خبردار کیا کہ اگر انہوں نے تعاون نہ کیا تو وہ حراستی مراکز پر پابندی لگا دے گی۔ ان میں سے ایک سماعت کے دوران جب عدالت کے سامنے گمشدگیوں کے 176 مقدمات تھے، اسے بتایا گیا کہ سکیورٹی ایجنسیوں نے 9 افراد کو رہا کر دیا ہے اور ایسے ایک شخص کی لاش ہسپتال سے ملی ہے۔

اسی دن پشاور ہائی کورٹ نے بالخصوص پشاور اور نوشہرہ میں بوری بند لاشوں کی برآمدگی کا نوٹس لیا۔ چیف جسٹس دوست محمد خان نے کہا کہ چند دنوں کے دوران 16 لاشیں برآمد ہو چکی ہیں اور نہ قانون نافذ کرنے والے اداروں اور نہ ہی عوامی نمائندوں نے اس پر توجہ دینے کی زحمت کی۔ اس سے پہلے چیف نے کہا تھا کہ عدالت کو احکامات جاری کرنے پر مجبور نہ کیا جائے کیونکہ یہ بلوچستان اور وفاقی حکومت کے خاتمے کا سبب بن سکتا ہے۔ عدالت لاشوں کو تواتر کے ساتھ ٹھکانے لگانے کے مقدمات کی سماعت کر رہی تھی۔ اسی دوران اکتوبر کے اوائل میں لاپتہ افراد پر بنائے گئے ایک کمیشن جس کی سربراہی جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال کر رہے تھے نے کہا کہ گزشتہ تین ماہ کے دوران اسے گمشدگیوں کے 80 واقعات کی اطلاع ملی۔ کمیشن نے کہا کہ یکم جنوری 2011 کو اس کے پاس 138 مقدمات زیر التوا تھے اور 21 ماہ (30 ستمبر 2012 تک) کے دوران اس نے 714 نئے مقدمات وصول کیے۔

نومبر کے شروع میں عدالت مختلف ایجنسیوں کے متعلق صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑتی ہوئی نظر آئی اس نے حکم دیا کہ تمام سکیورٹی ایجنسیوں اور چیف سیکرٹری کو 4 دسمبر تک لاپتہ افراد کی حتمی فہرست تیار کرنے کا عمل مکمل کرنا چاہیے۔ فہرست 18 دسمبر کو پیش کی گئی۔ عدالت کو بتایا گیا کہ 45 لاپتہ افراد کو رہا کیا جا چکا ہے۔ زیر

حراست 261 افراد کو خطرناک جنگجو قرار دیا گیا اور انہیں قید خانوں میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے چند کو انسداد بنیاد پرستی کے مراکز میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

سماعتیں نئے سال میں بھی جاری رہیں۔

شدید سرزنش

پشاور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے لاپتہ افراد کیس میں حکومت، خفیہ ایجنسیوں اور پولیس پر شدید تنقید کی۔

ضلع چارسدہ سے تعلق رکھنے والے شیخ محمد نے حبس بے جا کی درخواست دائر کی کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں نے 23 اگست 2010 کو اس کے بیٹے گل محمد کو ڈرائیور سمیت گرفتار کر لیا تھا۔ ایک ماہ کے بعد ڈرائیور کو رہا کر دیا گیا لیکن اس کے بیٹے کو لاپتہ قرار دیا گیا تھا۔ 2011 کے آخر میں گل محمد کی لاش سڑک کے کنارے پڑی ہوئی ملی۔ جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔

چیف جسٹس نے غور کیا کہ بدقسمتی سے پولیس نے خفیہ ایجنسیوں کی جانب سے استعمال کی جانے والی حکمت عملیوں کو اپنا لیا ہے اور ایسی جگہیں کرائے پر حاصل کر رکھی ہیں جہاں لوگوں کو غیر قانونی حراست میں رکھا جاتا ہے۔ عدالت نے گمشدگیوں کے چار واقعات میں مقدمات کے درج کرنے کا حکم دیا اور یہ مشاہدہ کیا کہ اگر حکومت لوگوں کو غیر قانونی حراست میں رکھنے کے عمل کو جاری رکھنا چاہتی ہے تو اسے انسانی حقوق سے تعلق رکھنے والی آئینی دفعات کو ختم کر دینا چاہیے۔

پشاور ہائی کورٹ کی جانب سے لاپتہ افراد کے مقدمات کی سماعت کے دوران افواج پاکستان کے جج ایڈووکیٹ جنرل کے ایک افسر نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ نوجوان جن میں سوات آپریشن کے بعد فوج کے بحالی کے مراکز میں شدت پسندی کے جذبے کو ختم کیا گیا وہ پھر سے جنگجو گروہوں میں شمولیت اختیار کر رہے ہیں۔

پشاور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے محسوس کیا کہ عسکریت پسندوں میں انتہا پسندی کے خاتمے کا پروگرام اس وقت مؤثر ہوگا جب انہیں بالخصوص مالی اور درجہ چہارم کی نوکریاں دی جائیں اور جو ایک سخت جانچ پڑتال کے نظام کی ضمانت دیتی ہوں۔

رینٹل پاور پراجیکٹ کیس

30 مارچ کو سپریم کورٹ نے 2000 سے 2008 کے دوران رینٹل پاور پراجیکٹ کی تکمیل کے لیے کیے گئے معاہدوں کے طریقہ کار کو غیر شفاف قرار دیا اور ان معاہدات کو منسوخ کرنے کا حکم دیا۔ عدالت نے قومی احتساب بیورو کے چیئرمین کو ان تمام افراد کے خلاف بدعنوانی کے ریفرنس تیار کرنے کا حکم دیا جو ان

معاہدوں کی توثیق کے ذمہ دار تھے۔ یہ فیصلہ وفاقی وزیر فیصل صالح حیات (پاکستان مسلم لیگ۔ق) اور ایم این اے خواجہ آصف (پاکستان مسلم لیگ۔ن) کی دائر کردہ درخواستوں پر سنایا گیا تھا۔

سپریم کورٹ نے قرار دیا کہ کمپنیوں کو پیشگی ادائیگی کی رقم میں سات سے چودہ فیصد تک اضافہ کر کے اور زیادہ قیمت پر آر پی پی سے بجلی خریدتے ہوئے وزارت خزانہ، واپڈا اور بجلی پیدا کرنے والی کمپنیاں قومی خزانے کو اربوں روپے کا نقصان پہنچانے کی ذمہ دار ہیں۔

ان ذمہ داران میں سابق وزراء برائے پانی و بجلی لیاقت جتوئی اور راجہ پرویز اشرف، وزیر خزانہ نوید قمر اور سیکرٹری خزانہ وقار مسعود شامل تھے۔

ملزم قرار دیے گئے افراد کے خلاف کارروائی شروع کرنے میں نیب کی بے اختیاری کئی ماہ تک عدالت کی جھنجھلاہٹ کا سبب بنی رہی اور بالآخر اس نے نیب کے چیئرمین کو راجہ پرویز اشرف جو اس وقت وزیر اعظم بن چکے تھے، کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔

عدالت نے اپنے فیصلے میں اس امر کا جائزہ لیا کہ شہریوں کو بجلی کی عدم دستیابی انہیں زندگی کی بنیادی ضروریات میں سے ایک سے محروم کر دینے کے مترادف تھی۔ اس نے کہا کہ ''آج کی حکومت آئین کے آرٹیکل 29 اور 12 کے تحت لوگوں کی معاشی اور معاشرتی خوشحالی کو فروغ دینے کے لیے پالیسیاں وضع کرنے کی پابند ہے جس میں شہریوں کو مناسب آرام اور فرحت کے ساتھ کام اور روزگار کے لیے سہولیات کی فراہمی شامل ہے۔

بینک آف پنجاب بنام حارث سٹیل انڈسٹریز اور لیاقت حسین بنام وفاق مقدمات میں آرٹیکل 9 کی تشریح کی گئی ہے اور اس کی وسعت کا دائرہ کار انسانی زندگی کے ہر پہلو تک بڑھا دیا گیا ہے۔ اس لیے لوگوں کے معاشی و معاشرتی حالات کو بہتر بنانے کے لیے جب بھی کوئی پالیسی وضع کی جائے تو اس کا مقصد ان کے بنیادی حقوق کے نفاذ کو یقینی بنانا ہونا چاہیے۔

عدالت نے کہا کہ بجلی کی عدم دستیابی کی وجہ سے لوگ زندگی کی بنیادی ضروریات میں سے ایک سے محروم ہو گئے ہیں۔

اڈیالہ 11

اڈیالہ جیل کے قیدیوں جنہیں انسداد دہشت گردی کی عدالت کی جانب سے بے گناہ قرار دیے جانے اور ہائی کورٹ کی جانب سے انہیں حراست میں لینے کے پنجاب حکومت کے حکم کو کالعدم قرار دیے جانے کے بعد خفیہ ایجنسیوں نے حراست میں لے لیا تھا کی حالت زار سپریم کورٹ کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ ان کی مزید مدد

ممکن نہ تھی۔ ایک قیدیوں میں ایک بوڑھی بیوہ روحیفہ کے تین بیٹے بھی شامل تھے۔ سپریم کورٹ میں دائر کردہ درخواست میں اس نے فوج کی جانب سے زیرحراست افراد پر مقدمہ چلانے کے فیصلے کو چیلنج کیا۔ ان میں تین افراد آرمی ایکٹ کے تحت 2011 میں پشاور کے ایک ہسپتال میں جاں بحق ہوئے۔ ایک چوتھا قیدی بھی درخواست کی سماعت سے پہلے جاں بحق ہو گیا۔ 30 جنوری کو آئی ایس آئی اور ایم آئی کے وکیل نے عدالت کو آگاہ کیا کہ زندہ بچ جانے والے 7 قیدیوں میں سے 4 افراد کو لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور میں منتقل کر دیا گیا ہے جبکہ دیگر تین افراد کو سول پاور ریگولیشن کے تحت قائم کردہ حراستی مرکز میں لا کے رکھا گیا ہے۔ موخرالذکر افراد صوبائی حکومت (کے پی کے) کی تحویل میں ہیں۔

عدالت نے وکیل کو تمام 7 افراد کو 9 فروری کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ چیف جسٹس جو کہ سپریم کورٹ کے بنچ کی صدارت کر رہے تھے نے ایک موقع پر آئی ایس آئی اور ایم آئی کے وکیل کو کہا کہ ان کے لیے زیر حراست افراد کو پیش کرنا ضروری ہے کیونکہ حکومت نے انہیں ان کی تحویل میں دیا تھا۔ عدالت نے وکیل کو ان حالات جن میں چار افراد کی موت واضح طور پر ہوئی کی وضاحت پیش کرنے کے لیے ایک بیان درج کرانے کا حکم بھی دیا۔ زیرحراست افراد کو مقرر کردہ تاریخ تک پیش نہ کیا گیا۔ 10 فروری کو عدالت نے 7 افراد کو 13 فروری تک پیش کرنے کا حکم دیا۔ اس مرتبہ عدالت کے حکم کی تعمیل کی گئی اور زیرحراست 7 افراد، مظہرالحق، شفیق الرحمٰن، محمد صادق، ڈاکٹر نیاز احمد، عبدالماجد، گل روز اور عبدالباسط کو عدالت میں پیش کر دیا گیا۔

تمام 7 افراد لاغر اور کمزور دکھائی دیتے تھے اور وہ بولنے اور چلنے سے معذور تھے۔ عدالت میں حاضر لوگ ان بیماری زدہ ڈھانچوں کے نظارے کو بمشکل برداشت کر سکے۔ چیف جسٹس نے ان کے مکمل طبی معائنے کا حکم دیا اور خیبر پختونخوا کے چیف سیکرٹری کو ہر چار گھنٹے بعد زیرحراست افراد کی صحت کے بارے میں اطلاع دینے کو کہا۔ جب تک یہ معاملہ عدالت میں زیرغور تھا اس وقت تک زیرحراست افراد کو پارہ چنار کے حراستی مرکز میں منتقل نہ کرنے کا حکم بھی دیا گیا۔

اس کے علاوہ عدالت نے اٹارنی جنرل اور آئی ایس آئی اور ایم آئی کے وکیل کو 26 جنوری 2012 سے پہلے قیدیوں کی حراست کی تفصیلات جمع کروانے کو کہا۔ عدالت یہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ آیا زیرحراست افراد کے خلاف کسی قانون کے تحت کارروائی کی گئی تھی، اگر ایسا تھا تو اس کا نتیجہ کیا تھا۔

زیرحراست تمام افراد کو لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور لے جایا گیا۔ ان میں سے پانچ جن کے بارے میں کہ گیا کہ وہ صحت یاب ہو چکے ہیں انہیں بعد میں پارہ چنار کے حراستی مراکز میں بھیج دیا گیا۔

روحیفہ اپنے ناقابل پہچان بیٹوں، عبدالماجد اور عبدالباسط کو سپریم کورٹ میں دیکھنے کے کچھ عرصہ بعد

وفات پا گئی اوراس کی درخواست ساکت ہوگئی۔اگر چہ عدالت نے اس کے وکیل کودرخواست میں ترمیم کرنے کی اجازت دے دی۔اس مقدمے کوسول پاور ریگولیشن 2011 کے تحت کارروائی اور آرمی ایکٹ کے سیکشن 2(1،ڈی) کوچیلنج کرنے والی درخواستوں کے ساتھ یکجا کر دیا گیا۔پارہ چنار یافاٹا کے کسی اورمرکز میں کسی بھی شخص کی حراست کوغیر قانونی قرار دیتے ہوئے عدالت اس بات کویقینی بنانا چاہتی تھی کہ اس کی قانون حدود کا دائرہ کارقبائلی علاقوں تک وسیع کیا جاسکے۔اڈیالہ الیون میں سے بچ جانے والے افراد قید ہی رہے۔ایک سے دوسرے چارہ گر کی طرف رجوع کرنے کے باعث سپریم کورٹ کی منشا غیر موثر ہونے کے حوالے سے اس مقدمے کوایک طویل عرصے تک یادرکھا جائے گا۔

آرمی ایکٹ کی مخالفت

سپریم کورٹ کی جانب سے ایک ناموافق فیصلے کے امکان کودیکھتے ہوئے فوج 1952 کے آرمی ایکٹ میں پائے جانے والے سنگین نقص کوختم کرنے پر رضا مند ہوگئی۔درخواست گزار نے اس ضابطے کوچیلنج کیا جس کے تحت کسی فوجی عدالت کی جانب سے مجرم قرار دیے گئے شخص کو نہ تو اس فیصلے کی نقل فراہم کی جاتی تھی اور نہ ہی اس سزا کی وجوہات کے بارے میں آ گاہ کیا جاتا تھا۔اس وجہ سے اپیل دائر کرنے میں مشکلات پیش آتی تھیں۔سپریم کورٹ سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ 1952 کے آرمی ایکٹ میں ترمیم کے لیےفوج کواحکامات جاری کرے کیونکہ وہ قوانین جن کا اطلاق بحریہ اورفضائیہ پر ہوتا ہےان میں پہلے ہی ترمیم کی جاچکی تھی۔فوج کے وکیل نے دلیل پیش کی کہ آرمی ایکٹ ان دونوں اداروں کے لیے بنائے گئے قوانین سے پرانا ہےاوراس میں ترمیم ایکٹ کے آدھے حصے کوتبدیل کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔عدالت نے کہا کہ آرٹیکل 10 اے (آزادانہ ٹرائل کا حق،جس کی اٹھارہویں ترمیم کے تحت ضمانت دی گئی ہے) سے متصادم کسی بھی چیز کوکالعدم قرار دیا جائے گا۔آرمی ایکٹ کی متنازع شقوں کوبھی امتیازی ہونے کی بنا پر آرٹیکل 25 کے تحت کالعدم قرار دیا جاسکے گا۔وکیل کوفوج کی رائے معلوم کرنے کا کہا گیا۔اگلی سماعت کے موقع پرعدالت کو بتایا گیا کہ فوجی حکام 1952 ایکٹ میں کرنے کوتیار ہیں لیکن انہیں اس کے لیے وقت درکار ہے۔اس حوالے سے تاحال کوئی عملی اقدام نہیں کیا گیا تھا۔

انتخابات سے متعلق امور

سپریم کورٹ نے ایک سے زائد مرتبہ الیکشن سے متعلق امور میں مداخلت کی۔سال کے شروع میں سپریم کورٹ نے الیکشن کمیشن آف پاکستان کی ووٹرز کی فہرست کی اشاعت مکمل کرنے کی مقررہ تاریخ کو 26

فروری سے آگے توسیع دینے کی درخواست کو مسترد کر دیا۔ عدالت نے اس بارے میں بالکل غور نہیں کیا کہ فہرست میں موجود تین کروڑ ستر لاکھ ووٹرز کی تصدیق نہیں کی جا سکی اور انتخابی قواعد وضوابط کی تجدید کے بغیر شفاف اور آزادانہ انتخابات ممکن نہیں۔ ای سی پی پر دباؤ کے نتیجے میں اس کے سیکرٹری نے اپنے عہدے سے استعفی دے دیا لیکن چند ماہ کے بعد انہوں نے بظاہر مستعدی سے اپنا کام سرانجام دینے کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے اپنے عہدے کو دوبارہ اختیار کرتے ہوئے ایک طرح کا ریکارڈ قائم کیا۔ ووٹرز کی فہرست کے معاملے کو حل کر لیا گیا۔

سال کے آخر میں سپریم کورٹ نے ووٹرز کی فہرست اور گھر گھر جا کے تصدیق اور کراچی کے انتخابی حلقے کی حد بندی کا حکم دیا۔ سابقہ حکم کو پابندی سے پایہ تکمیل تک پہنچایا گیا، اگرچہ ایم کیو ایم نے اس کا پرجوش استقبال نہیں کیا لیکن اس کا حکم سال کے آخر تک ناقابل عمل رہا۔ انتخابی اخراجات کے متعلق ایک زیادہ معیاری حکم ورکرز پارٹی کے صدر کی دائر کردہ درخواست پر جاری کیا گیا۔

سپریم کورٹ نے ای سی پی کو فضول خرچی، دولت، طاقت اور نمود ونمائش کی حوصلہ شکنی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انتخابی اخراجات کی نگرانی کا حکم دیا۔ اس حکم کے نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

☆ ہر امیدوار کو انتخابی مقابلے کے لیے منظور کردہ رقم کسی شیڈولڈ بینک میں جمع کرانی چاہیے اور تمام انتخابی اخراجات اس اکاؤنٹ سے پورے کیے جائیں۔

☆ سادہ اکثریت کا نظام ووٹ ڈالنے والوں کی اکثریت کے ذریعے انتخابات کے اصول کو پامال کرتا ہے۔ ای سی پی کو لوگوں کی حقیقی نمائندگی اور تمام قانون ساز مجالس میں اکثریت کی حکمرانی کو یقینی بنانے

الیکشن کمیشن کو بھی سپریم کورٹ کی ہدایات موصول ہوئیں

کے لیے راستے تلاش کرنے چاہئیں۔

☆ ای سی پی کو ووٹنگ کو لازمی بنانے کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں۔

☆ پولنگ سٹیشنوں کی تعداد میں اضافہ کیا جانا چاہیے اور پولنگ سٹیشن اور ووٹ ڈالنے والوں کے گھروں کے بیچ فاصلہ 2 کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

☆ امیدواروں کے کیمپوں سے جاری کردہ پرچی کی جگہ ای سی پی کو ووٹر کو اس کے پولنگ بوتھ کے بارے میں آگاہ کرنے کے لیے دیگر ذرائع کو اپنانا چاہیے اور پولنگ سٹیشن کے نزدیک امیدواروں کے الیکشن کیمپ پر پابندی ہونی چاہیے۔

☆ امیدواروں کو ووٹرز کو ذرائع نقل وحرکت فراہم کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ ووٹروں کے لیے ذرائع نقل وحرکت کا بندوبست ای سی پی کو کرنا چاہیے۔

☆ ای سی پی کو ہر صورت میں گھر گھر جا کے ووٹروں کی جانچ کرنی چاہیے۔

☆ ای سی پی نے سپریم کورٹ کے احکامات کو ملتان کی قومی اسمبلی کی نشست جو کہ یوسف رضا گیلانی کے نااہل ہونے کے بعد خالی ہوئی تھی، پر ضمنی انتخاب میں نافذ کیا۔ تمام ووٹروں کو ذرائع نقل وحرکت فراہم کرنے میں ای سی پی کی بے اختیاری کی تصدیق ہوگئی اور اس معاملے پر آرا تقسیم ہوگئیں کہ آیا صرف ایک یا کسی مخصوص اکاؤنٹ سے انتخابی اخراجات پورے کرنے کی شرط سے فضول خرچیوں کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

لال مسجد کیس

سپریم کورٹ نے 2007 کے لال مسجد آپریشن سے متاثر ہونے والے افراد کی شکایات کا از خود نوٹس لیا اور وفاقی حکومت کو ان 103 افراد کے ورثا کو مالی مدد فراہم کرنے کا حکم دیا جو اس آپریشن کے دوران جاں بحق ہوئے تھے۔

سپریم کورٹ کے تین ججوں پر مشتمل بنچ جس کے سربراہ چیف جسٹس افتخار چوہدری تھے، نے پولیس کو ان افراد کی بازیابی کے لیے ایف آئی آر درج کرنے کا حکم دیا جو آپریشن کے بعد لاپتہ ہوگئے تھے۔ بنچ نے مشاہدہ کیا کہ وہ لوگ جو آپریشن میں مارے گئے تھے، پولیس نے ان کے مقام کا تعین کرنے کے لیے کوئی تحقیق نہیں کی تھی جو کہ معاوضہ فراہم کرنے کے لیے ضروری تھا۔

چیف جسٹس نے ڈپٹی اٹارنی جنرل سے پوچھا کہ حکومت نے آپریشن میں جاں بحق ہونے والے افراد کے ورثا کو معاوضہ ادا کیوں نہیں کیا؟ ڈپٹی اٹارنی جنرل نے عدالت کو بتایا کہ حکومت نے صرف سکیورٹی فورسز

کے 11 اہلکاروں اور تین شہریوں کے رشتہ داروں کو معاوضہ ادا کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جو لوگ ریاست کے خلاف جنگ جاری رکھے ہوئے تھے ان کے ورثا کو معاوضہ ادا نہیں کیا گیا۔ چیف جسٹس نے کہا یہ ایک چھوٹا سا مسئلہ تھا۔ کوئی بھی ریاست کے خلاف جنگ میں مصروف نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ اگر اس وقت ایک بہتر حکمت عملی اپنائی جاتی تو صورت حال پر قابو پایا جاسکتا تھا۔

عدالت نے ان والدین کی شکایات پر پولیس کو ایف آئی آر درج کرنے کا حکم بھی دیا جو یہ کہتے تھے کہ ان کے بیٹے لاپتہ ہیں اور پولیس اس معاملے کی تحقیقات نہیں کر رہی۔ عدالت نے اپنی تحریری فیصلے میں پولیس کو اداروں کی بے عزتی کرنے سے احتراز اور قانون کے مطابق ایف آئی آر درج کرنے کو کہا۔

عدالت نے جامعہ حفصہ کی تعمیر نو کے لیے سیکٹر ایچ 11/4 میں 20 کنال اراضی کی تخصیص کے لیے لال مسجد کے خطیب مولانا عبدالعزیز اور اسلام آباد انتظامیہ کے بیچ معاہدے کی منظوری بھی دی۔

فحاشی کے متعلق سپریم کورٹ کا مؤقف

ٹیلی ویژن کے ذریعے معاشرے میں بڑھتی ہوئی عریانی اور فحاشی، بھارتی چینلز، موبائل نیٹ ورک اور انٹرنیٹ کے غیر قانونی استعمال کے خلاف قاضی حسین احمد کی درخواست اور جسٹس (ریٹائرڈ) وجیہہ الدین کی جانب سے لکھے گئے ایک خط پر کارروائی کرتے ہوئے سپریم کورٹ نے پیمرا کو فحاشی کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے ضروری اقدامات کرنے کا حکم دیا۔

سپریم کورٹ پیمرا کے قائم مقام چیئرمین کی ہدایات سن کے حیران تھی کہ حکومت کے پاس ٹی وی پروگراموں کی نگرانی کے لیے کوئی پالیسی نہیں اور نہ ہی اس کے پاس فحاشی کی کوئی تشریح موجود ہے۔ جب انہوں نے کہا کہ فحاشی اور عریانی غیر متعلقہ اصطلاحات ہیں جن کی مختلف لوگ مختلف طریقوں سے تشریح کرتے ہیں، تو عدالت نے انہیں آرڈیننس اور ضابطے کا حوالہ دیا، جس کے تحت فحش اور عریاں مواد نشر کرنے کی ممانعت ہے۔ ٹی وی چینلز پر فحاشی کے پھیلاؤ پر سپریم کو شدید تشویش تھی اور اس نے پیمرا کو اپنی ذمہ داری پوری کرنے کو کہا، اس نے عدلیہ کے خلاف نشر کیے جانے والے پروگراموں پر بھی اعتراض کیا۔ چیف جسٹس نے کہا کہ عدالت ان پروگراموں سے باخبر ہے جن کا مقصد صرف عدلیہ کو بدنام کرنا ہے۔ عدالت میں موجود ڈپٹی اٹارنی جنرل نے عدالت کو سیاستدانوں اور پارٹی قائدین کی نقالی کرنے والے پروگراموں کا بھی نوٹس لینے کی درخواست کی۔ چیف جسٹس نے کہا کہ یہ پروگرام اچھے طنز و مزاح کے حامل ہیں اور لوگ انہیں دیکھ کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جسٹس طارق پرویز نے اس بات سے اتفاق کیا۔

قاضی حسین احمد کے وکیل نے عدالت سے فحاشی کی تشریح اور عدالت کا تمسخر اڑانے والے پروگراموں کو جانچنے کے لیے ایک کمیشن تشکیل دینے کی درخواست کی۔ چیف جسٹس نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا اور انہوں نے پیمرا کے صدر کو تحقیق کرنے کے لیے وقت دیا۔ یہ مقدمہ تا حال زیر التوا ہے۔

ججوں کی تقرری

اٹھارویں ترمیم میں دیے گئے اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی تقرری کے طریقہ کار کی وجہ سے مسائل پیدا ہوتے رہے۔ عدالتی کمیشن کے اس اصرار پر کہ پارلیمانی کمیٹی اس کے نامزدگان کو مسترد یا روک نہیں سکتی، پارلیمانی نگرانی کی دفعات عملی طور پر ناکارہ ہو کے رہ گئیں۔ اس معاملے پر عدلیہ انتظامیہ محاذ آرائی دو موقعوں پر بڑی پریشانی کا سبب بنی۔ وزیر اعظم گیلانی کے اپنے عہدے سے برطرف ہونے کے بعد سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے یہ محسوس کیا کہ عدالت کے پاس اس مقدمے کی سماعت کی طاقت نہیں، کیونکہ سپریم کورٹ کے متعدد ججوں نے اس معاملے کی سماعت سے معذرت کر لی تھی۔ چیف جسٹس نے اس صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے ایک اضافی اور سپریم کورٹ کے ایک ایڈ ہاک جج کو تعینات کرنے کی ضرورت کی نشاندہی کی۔ اس تجویز کی وکلا کے نمائندوں نے شدید مخالفت کی اور آخر کار اسے ترک کر دیا گیا۔

جب اسلام آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کو سپریم کورٹ میں بڑے عہدے پر ترقی دی جا رہی تھی تو ان کے جانشین کی تقرری ایک متنازع معاملہ بن گئی۔ عدالتی کمیشن نے اس عہدے کے لیے جسٹس کاسی کی تجویز پیش کی جبکہ صدر کا خیال تھا کہ جسٹس ریاض احمد، سینئر ہونے کی بنا پر ترقی کے مستحق ہیں، لیکن اس سے پہلے کہ اس ریفرنس کا فیصلہ کیا جاتا، سپریم کورٹ نے ایک نئی درخواست پر کارروائی کرتے ہوئے جسٹس کاسی کی اسلام آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے طور پر تقرری کا حکم دیا اور ایوان صدر نے مطلوبہ نوٹیفکیشن جاری کر دیا۔

سبز بنچوں کی تشکیل

2012 کے دوران ایک اہم پیش رفت تمام ہائی کورٹس کی جانب سے ماحولیات سے متعلق معاملات کی سماعت کے لیے سبز بنچوں کی تشکیل تھی۔ یہ فیصلہ بھوربن اعلامیہ 2012 جنوبی ایشیائی عدالت کے لیے ماحولیات سے متعلق ایک مشترکہ تصور کی سفارش پر کیا گیا تھا، جسے سپریم کورٹ کی سربراہی کے تحت 24 سے 25 مارچ تک ماحولیاتی انصاف پر جنوبی ایشیائی کانفرنس کے دوران اختیار کیا گیا تھا۔

اسلام آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے ایک انفرادی بنچ اور ایک سبز ضلعی بنچ تشکیل دیا۔ اسلام آباد

میں سینئر سول ججوں مع جوڈیشل مجسٹریٹوں کے علاوہ سول ججوں مع جوڈیشل مجسٹریٹوں کی تمام عدالتوں کو سبز عدالتیں قرار دیا گیا۔ اسلام آباد کی ڈسٹرکٹ اور سیشن جج کی عدالتوں کو تمام مقدمات / اپیلوں کی سماعت کے لیے سبز عدالتیں قرار دیا گیا۔

لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے لاہور کی مرکزی نشست اور مختلف شاخوں میں ایک سبز انفرادی بنچ اور ایک سبز ضلعی بنچ تشکیل دیا۔ ہیڈکوارٹروں میں سینئر سول ججوں مع جوڈیشل مجسٹریٹوں کی عدالتوں اور سب ڈویژن میں سول ججوں مع جویشل مجسٹریٹوں کی عدالتوں کو سبز عدالتیں قرار دیا گیا۔ پنجاب کے سیشن اور ڈسٹرکٹ ججوں کی تمام عدالتوں کو اپیلوں کی سماعت کے لیے سبز عدالتوں کا درجہ دیا گیا۔ پشاور، سندھ اور بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے بھی ایسا اقدام کیا۔

دُہری شہریت

سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ کسی دوسرے ملک کی شہریت رکھنے والے پاکستانی بڑے عہدے نہیں رکھ سکتے کیونکہ کسی غیر ملکی ریاست کی شہریت حاصل کرتے ہوئے وہ مفادات کے شدید تصادم کو جنم دیتے ہیں کیونکہ ایسے افراد پاکستان سے وفاداری سے دستبردار ہوتے ہوئے غیر ملکی ریاست کے ساتھ وفاداری کا حلف اٹھاتے ہیں۔ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے ایک درجن سے زائد اراکین کو نااہل قرار دے دیا گیا۔ عدالت نے یہ واضح کیا کہ اس کا فیصلہ پاکستانی شہریوں کے کسی دوسرے ملک کی شہریت حاصل کرنے کے حق پر اثر انداز نہیں ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا حق ہے جس کی شہریت ایکٹ میں ضمانت دی گئی ہے۔

طویل عرصے تک چلنے والے ایک مقدمے نے وزیر داخلہ کو پریشانی میں مبتلا کیے رکھا۔ انہیں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ انہوں نے اپنی برطانوی شہریت ترک کر دی ہے، ایک نوٹس جاری کیا گیا۔ ان کی جانب سے جمع کرائی گی دستاویزات کو ان کے دعوے کے ثبوت کے طور پر تسلیم نہ کیا گیا اور انہیں سینیٹر کے عہدے کے لیے نااہل قرار دیا گیا۔ وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے اور انہیں ایک مشیر مقرر کر دیا گیا۔ بعد میں وہ سندھ سے دوبارہ سینیٹر منتخب ہو گئے اور دوبارہ وزیر داخلہ کے طور پر حلف اٹھالیا۔ بالآخر ان کی برطانوی شہریت سے دستبرداری کو ثابت کرنے والی دستاویزات کو تسلیم کر لیا گیا۔

دوہرے عہدوں کا مقدمہ

لاہور ہائی کورٹ نے صدر زرداری کے دو عہدے (دوسرا عہدہ پی پی پی کے کو چیئر پرسن کے طور پر) رکھنے کے حق کے مقدمے کی سماعت جاری رکھی۔ اس سے پہلے مئی میں عدالت نے صدر زرداری کو حکم دیا تھا

کہ یا تو وہ صدر کا عہدہ چھوڑ دیں یا پھر پیپلز پارٹی کے کو چیئر پرسن کے عہدے سے استعفیٰ دے دیں اور سیاست میں حصہ لینا چھوڑ دیں۔ 2012 کے دوران کی جانے والی قانونی کارروائیوں کا مقصد 2011 کے ہدایت نامے پر عملدرآمد کو یقینی بنانا تھا۔ جون میں سپریم کورٹ نے صدر زرداری کو ہدایت نامے پر عملدرآمد کے لیے 5 ستمبر تک 68 دن کی مہلت دی۔ سال کے آخری چوتھائی حصے میں حکومت نے صدر کے دو عہدے رکھنے کے حق کا دفاع کرنا شروع کر دیا اور عدالت سے عملدرآمد کا مطالبہ کرتی رہی۔ یہ معاملہ 2013 میں داخل ہو گیا۔

ارسلان کیس

رئیل اسٹیٹ کے امیر تاجر ملک ریاض کے انکشاف کہ چیف جسٹس کا بیٹا ارسلان ان کے حوالے سے پیسے اور دیگر فوائد حاصل کرتا رہا ہے، نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے معاملے کا فوری نوٹس لیا۔ تین رکنی بنچ کے صدر کے طور پر یہ اعلان کرتے ہوئے کہ اس معاملے کا فیصلہ قرآن جس کی ایک کاپی انہوں نے اپنی میز پر رکھی ہوئی تھی کے مطابق کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ ان کے بیٹے کے متعلق کسی قسم کی نرمی کا مظاہرہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر چہ اس کے کچھ عرصہ بعد انہیں اپنے بیٹے کے مقدمے میں جج نہ بننے کا مشورہ دیا گیا۔ بنچ نے وفاقی ٹیکس محتسب شعیب سڈل کے نام پر سمجھوتا کرتے ہوئے اس معاملے کی چھان بین ایک رکنی کمیشن کے ذریعے کرانے کا فیصلہ کیا۔ کمیشن نے فیصلہ کیا کہ یہ معاملہ دو فریقین کے درمیان ایک دیوانی تنازع ہے اور وہ دستیاب شدہ قانونی اداروں سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ چیف جسٹس اور سپریم کورٹ اس میں شامل نہیں تھے۔ اگر چہ انہوں نے کہا کہ ملک ریاض کے ٹیکس اکاؤنٹ کی تفتیش کرنا ضروری ہے۔

ارسلان افتخار۔ ہنگامے پر قابو پا لیا گیا

آخر کار سپریم کورٹ کے دو رکنی بنچ نے یہ مقدمہ اٹارنی جنرل کے سپرد کر دیا اور انہیں قانون کے مطابق کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ عدالت نے کہا کہ ہمیں یہ امید ہے کہ وہ (اٹارنی جنرل) ریاستی مشینری کو حرکت میں لائیں گے تا کہ وہ تمام لوگ بشمول ملک ریاض، ان کے داماد سلمان احمد خان اور ڈاکٹر ارسلان افتخار جنہوں نے غیر قانونی افعال کا ارتکاب کیا ہے ان کا نوٹس لیا جائے اور ان کے خلاف قانون کے مطابق سخت کارروائی کی جائے۔

جسٹس خلجی عارف حسین نے ایک تفصیلی یادداشت پیش

کی جس میں انہوں نے کہا ''اگر چہ سرکاری عہدیداروں کے اہل خانہ ریاستی کام سرانجام نہیں دے رہے تاہم اس مقدمے کے مبینہ حقائق ان کے نجی اور سرکاری معاملات اور طرز عمل میں بہت زیادہ احتیاط اور دانشمندی کی ضرورت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ عدالت نے کہا کہ اس مقدمے پر از خود کارروائی کا مقصد ملوث افراد کے جرم یا بے گناہی پر حتمی فیصلہ سنانا نہیں بلکہ اس کا مقصد معاملے کی معلومات حاصل کرنا تھا تا کہ عوامی اہمیت کے حامل معاملات کے متعلق لوگوں کے معلومات تک رسائی کے حق کا دفاع کیا جا سکے۔ عدالت نے کہا کہ اس مقدمے میں عوامی نوعیت کا معاملہ اعلیٰ عدلیہ کی خود مختاری اور وقار پر لگنے والا بہتان ہے۔

کالا باغ ڈیم

عدلیہ نے دیرینہ اور متنازعہ کالا باغ ڈیم منصوبے پر اس وقت ناپسندیدہ موقف اختیار کیا جب لاہور ہائی کورٹ نے وفاقی حکومت کو مشترکہ مفادات کی کونسل کے کالا باغ ڈیم کی تعمیر سے متعلق فیصلوں پر مکمل عملدرآمد کرنے کا حکم دیا۔ لاہور ہائی کورٹ نے یہ فیصلہ ان 9 درخواستوں کی سماعت کے بعد جاری کیا جن میں کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے لیے احکامات جاری کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔

مشترکہ مفادات کی کونسل نے 1991 میں ڈیم کی تعمیر کی منظوری دی تھی اور اس نے اس منصوبے کے لیے سرمایہ اور تکنیکی مدد حاصل کرنے کے لیے ایک حکمت عملی تیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

چیف جسٹس عمر عطا بندیال نے ایک مختصر حکم میں کہا کہ بجلی کی قلت نے شہریوں کی زندگی کو بُری طرح متاثر اور اُن کے بنیادی حقوق کو پامال کیا ہے جس کی آئین کے آرٹیکل 9 اور 25 میں ضمانت دی گئی ہے۔ اسی لیے حکومت کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اسے آئین کے آرٹیکل 154 کے تحت اپنے فرائض کی ادائیگی کرتے ہوئے مشترکہ مفادات کی کونسل کے 1991 اور 1998 کے فیصلوں پر عملدرآمد کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں۔

توہین عدالت کے مقدمات

سید یوسف رضا گیلانی جنہیں توہین عدالت کے جرم میں سزا سنائی گئی تھی کے علاوہ متعدد سیاستدانوں اور بیوروکریٹس پر بھی توہین عدالت آرڈیننس 2003 کے تحت توہین عدالت کا الزام عائد کیا گیا، لیکن یہ معاملہ جو ایک مشہور و معروف کیس کی شکل اختیار کر گیا تھا، سے سابق وزیر قانون بابر اعوان بری طرح متاثر ہوئے۔

ان پر 2011 کے آخری دنوں میں سپریم کورٹ کا تمسخر اڑانے اور اس کے ایک جج اور ان کے اہل خانہ پر بہتان لگانے پر توہین عدالت کا الزام عائد کیا گیا۔ شروع میں ان کا مؤقف تھا کہ وہ قصوروار نہیں ہیں اور

انہوں نے اور اٹارنی جنرل نے دلیل پیش کی کہ توہین عدالت قانون کا کوئی وجود نہیں۔ 17 جنوری کو عدالت نے ان کا لائسنس معطل کر دیا۔ اپریل میں انہوں نے عدالت اور متعلقہ جج کو اپنا معافی نامہ پیش کیا۔ اگرچہ بنچ نے سماعت کے دوران انہیں دفاعی گواہان پیش کرنے کو کہا اور انہوں نے بارہا سپریم کورٹ میں پریکٹس کرنے کے لائسنس کی منسوخی کے حکم کو واپس لینے کی درخواست کی۔

یہ مقدمہ 2013 میں بھی جاری رہا۔

سپریم کورٹ نے جن لوگوں کو توہین عدالت کے نوٹس جاری کیے ان کی فہرست میں ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین بھی شامل تھے۔ ملک میں اپنے مداحوں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے انتخابی حلقوں کی حد بندیوں سے متعلق عدالتی فیصلے کو تنقید کا نشانہ بنایا اور ججوں کو اپنے بیانات پر معافی مانگنے کو کہا۔ سپریم کورٹ کے ایک تین رکنی بنچ جس کے سربراہ چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری تھے، نے ایم کیو ایم کے قائد کی تقریر کی نقل جو کہ پیمرا سے حاصل کی گئی تھی، کا جائزہ لیا اور کہا کہ ''الطاف حسین کی تقریر کے اجزاء بظاہر سپریم کورٹ کے قابل احترام ججوں کے خطرات میں اضافہ کرنے کے باعث سپریم کورٹ کی کارروائی میں مداخلت کرنے اور رکاوٹ ڈالنے کے مترادف ہیں اور ان کا مقصد ججوں کے خلاف نفرت میں اضافہ کرنا، ان کا مذاق اڑانا اور توہین کرنا تھا۔

عدالت نے الطاف حسین کو 7 جنوری کو پیش ہونے کا حکم دیا۔

ایم کیو ایم نے فوری طور پر نوٹس کے خلاف ردعمل ظاہر کیا اور اسے انصاف کے اصولوں کے منافی قرار دیا۔

سال کے آخر تک مقدمے کی سماعت نہ ہو سکی، اگرچہ عدلیہ کے لیے احترام کا اظہار کرنے پر الطاف حسین کی تعریف کی گئی۔

خفیہ ایجنسیوں پر نکتہ چینی

پشاور ہائی کورٹ نے طویل عرصے کی غیر قانونی حراستوں کے مقدمات میں خفیہ ایجنسیوں پر بھی شدید تنقید کی۔

میر محمد ارشد نے 12 اپریل کو عدالت کو بتایا کہ کہ ہشت نگر پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او نے 10 جنوری 2009 کو اسے گرفتار کیا اور سادہ کپڑوں میں ملبوس افراد کے حوالے کر دیا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور تین گھنٹوں سے زائد سفر کے بعد اسے ایک تہہ خانے میں پھینک دیا گیا۔ اگرچہ اسے 38 ماہ تک تہہ خانے میں رکھا گیا، تاہم اس سے صرف تین دن تفتیش کی گئی۔ اس کے مطابق ایک وقت تہہ خانے میں 107 افراد

تھے اور جب اسے رہا کیا گیا تو 17 افراد تا حال وہاں موجود تھے۔ عدالت نے اس کی رہائی کے لیے دائر کردہ درخواست کو خارج کر دیا کیونکہ اب وہ ایک آزاد شخص تھا اور وہ اس مقدمے کو جاری نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

عدالت نے زاہداللہ کی داستان بھی سنی۔ اس کے مطابق ایک مقدمے میں اس کی اور اس کے بھائی کی ضمانت منظور کر لی گئی تھی۔ جیسے ہی وہ ڈسٹرکٹ جیل مردان سے باہر آئے تو انہیں حراست میں لے لیا گیا اور انہیں صدر پولیس سٹیشن لے جایا گیا اور سادہ کپڑوں میں ملبوس افراد کے حوالے کر دیا گیا۔ اسے ساڑھے چھ ماہ کے بعد رہا کر دیا گیا لیکن اس کا بھائی تا حال لا پتہ تھا۔

اطلاعات کے مطابق ضلعی بنچ جس کے سربراہ چیف جسٹس دوست محمد خان تھے، نے یہ محسوس کیا کہ یہ براہ راست کارروائی کرنے کی بجائے اس معاملے کو ڈی جی آئی ایس آئی اور جی ایچ کیو پر چھوڑ دے گا کہ وہ خیبر پختونخوا اور اس سے متصل فاٹا میں آئی ایس آئی اور دیگر ایجنسیوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لیے ایک اعلیٰ اختیاراتی ٹیم تشکیل دیں۔ میڈیا میں یہ کہتے ہوئے بنچ کا حوالہ دیا گیا کہ ''یہ عدالت پاکستانی فوج، جس نے ملک کے لیے عظیم قربانیاں دی ہیں، سے یہ توقع کرتی ہے کہ اس نے ایجنسیوں کی غیر قانونی کارروائیوں کی وجہ سے جو کچھ کھویا ہے یہ اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے فوری طور پر اس معاملے میں مداخلت کرے گی۔

سپریم کورٹ نے ان سات افراد کو بازیاب کرانے کا حکم دیا جنہیں خفیہ ایجنسیوں نے مبینہ طور پر مالاکنڈ میں 2009 کے آپریشن کے دوران اغوا کیا تھا۔

درخواست گزار عبدالستار نے عدالت کو بتایا کہ فوجی اہلکار اس کے بیٹے، بھائی اور سات بھتیجوں کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ یونٹ کے کمانڈر نے اسے بتایا تھا کہ اس کا ایک بھتیجا (جو کہ ابھی تک آزاد تھا) فوج کو مطلوب تھا۔ اگر اس نے ہتھیار ڈال دیے تو گرفتار کیے گئے تمام افراد کو رہا کر دیا جائے گا اس مطالبے کی اطاعت کرنے سے انکار کے چار ماہ بعد اسے اپنے بھتیجوں، جنہیں فوج اٹھا کر لے گئی تھی، میں سے ایک کی لاش ملی۔ درخواست گزار نے کہا کہ اس کے بیٹے، بھائی اور بھتیجوں کی کوئی خبر نہیں تھی۔

شہزاد کمیشن

صحافی سلیم شہزاد کے قتل کی تفتیش کے لیے قائم کردہ تحقیقاتی کمیشن نے تجویز پیش کی کہ خفیہ ایجنسیوں کو اور زیادہ جوابدہ ہونا چاہیے۔ اسلام آباد سے تعلق رکھنے والے صحافی سلیم شہزاد طالبان اور القاعدہ کے معاملات کے علاوہ ان کے خلاف کارروائیوں میں خفیہ ایجنسیوں کے کردار پر مضامین کے حوالے سے جانے جاتے

تھے۔ وہ 29 مئی 2011 کو لاپتہ ہو گئے اور ان کی لاش دارالحکومت سے 130 کلومیٹر دور ایک نہر سے ملی۔ ایک کمیشن جس کے سربراہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس ثاقب نثار تھے، نے صحافی کے قتل پر کسی فرد یا ادارے کی نشاندہی نہیں کی اور کہا کہ سلیم شہزاد کی تحریروں نے یقیناً دہشت گردی کے خلاف جنگ میں مصروف مختلف لوگوں جس میں پاکستانی ریاست اور غیر ریاستی عناصر مثال کے طور پر طالبان اور القاعدہ اور غیر ملکی عناصر شامل تھے کو غصہ دلایا ہو گا۔ اس جرم میں ان میں سے کسی کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے کیونکہ واضح طور پر اس کے ان کے ساتھ بھی قریبی روابط تھے۔

حجاب سے متعلق درخواست

لاہور ہائی کورٹ نے ٹی وی پر آنے والی خواتین کے لیے حجاب ضروری قرار دینے، قرآن کو پاکستان کا آئین اور تمام عدالتوں کو وفاقی شرعی عدالتیں قرار دینے سے متعلق درخواست کو ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے خارج کر دیا۔ لاہور ہائی کورٹ نے پیمرا کے خلاف دائر کردہ درخواست، جس میں ٹی وی پر آنے والی خواتین کے لیے حجاب کو لازمی قرار دینے کا حکم جاری کرنے کی استدعا کی گئی تھی، کو خارج کر دیا۔ درخواست گزار جو ایک وکیل تھا، نے دلیل پیش کی کہ حجاب کے بغیر ٹی وی پر آنے والی خواتین فحاشی پھیلا رہی ہیں۔ دفتر رجسٹرار نے اعتراض کیا کہ لاہور ہائی کورٹ اس معاملے کے لیے مناسب فورم نہیں۔ چیف جسٹس نے اس اعتراض کو برقرار اور کہا کہ اس معاملے کا تعلق اسلامی قوانین سے ہے اور درخواست گزار کو وفاقی شرعی عدالت سے رجوع کرنا چاہئے۔

عورت کی پسند

یوسف علی نامی ایک شخص نے لاہور ہائیکورٹ سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی بیٹی جس نے دارلامان میں پناہ لے لی تھی اور اس سے ملنے سے انکاری تھی، سے ملاقات کروانے کے لیے دارالامن انتظامیہ کو حکم جاری کرے۔ عدالت نے اس درخواست کو مسترد کر دیا کیونکہ بالغ افراد کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ جہاں چاہے رہیں اگرچہ اپنا حکم جاری کرنے سے پہلے جسٹس محمد خالد نے کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ اس قانون کا غلط استعمال ہوتا رہا ہے، لیکن وہ اس کے پابند ہیں۔

بچوں کی حراست

عمر کوٹ کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اور سیشن جج نے ایک جوڑے جو کہ ہندو سے مسلمان ہوا تھا، کے چار

بچوں کوان کے آباؤاجداد کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔ یہ بچے جن کے نام ساجی بارہ برس، نارائن دس برس، برہمی سات برس اور سروان پانچ برس تھے،اس وقت سے اپنے آباؤاجداد کے ساتھ رہ رہے تھے، جب ان کے والدین نے اسلام قبول کیا تھا۔ ان کی ماں جس کا نام رخسانہ تھا، نے ڈسٹرکٹ سیشن جج کی عدالت میں درخواست دائر کی تھی کہ وہ ان کے آباؤاجداد کوحکم دیں کہ وہ بچوں کوان کے والدین کے ساتھ رہنے دیں۔ جب بچوں کوایڈیشنل ڈسٹرکٹ سیشن جج کی عدالت میں پیش کیا گیا توانہوں نے شکایت کی کہ پولیس نے ان پرتشدد کیا تھا۔

مالاکنڈ میں خواتین قاضیوں کی تقرری

ایک خبر جوکہ حقوق سے متعلقہ لوگوں اور بالخصوص ان لوگوں کے لیے خوشگوار حیرت کا باعث بنی جو خواتین کی ترقی کے لیے کام کررہے تھے، وہ ان علاقوں میں خواتین کی عدالتی افسروں کے طور پرتعیناتی سے متعلق تھی، جہاں کچھ عرصہ پہلے انتہا پسندوں کا قبضہ تھا۔ اپریل میں اعلیٰ سول ججوں حنا خان کوسوات، زینب رحمان کوبٹ خیلہ اور حاجرہ رحمان کوزیریں دیر میں تعینات کیا گیا۔

ناکامی میں ثابت قدمی

پنجاب میں سول ججوں کے 29 ویں امتحان کا انعقاد لاہور ہائی کورٹ نے مارچ 2011 میں کیا، جس میں 230 میں سے 86 امیدوار فیل ہوئے اوران میں سے 25 افراد نے اضافی نمبر حاصل کرنے کے بعد امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اس امتحان میں کامیابی سول ججوں کی نوکری کی مستقلی کے لیے ایک شرط ہے اور ہرافسر کوامتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے چار مواقع دیئے جاتے ہیں۔ دوسول جج چوتھی مرتبہ، چھ تیسری مرتبہ اور 75 دوسری مرتبہ ناکام ہوئے۔

قومی عدالتی پالیسی کمیٹی

قومی عدالتی پالیسی کمیٹی کا دوروزہ اجلاس جو 30 سے 31 مارچ تک منعقد ہوا،اس میں چاروں صوبوں کی ضلعی عدلیہ کے کردار پراطمینان کا اظہار کیا گیا۔ نئی عدالتی پالیسی کے نفاذ کے بعد سے 90 فیصد پرانے مقدمات کا فیصلہ سنایا جاچکا تھا۔ اجلاس کے بعد جاری کردہ بیان میں یہ غور کیا گیا کہ متعدد سیشن ڈویژنوں میں ایک بھی پرانا کیس زیرالتواء نہیں تھا۔ ان ڈویژنوں میں چکوال، لیہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، میانوالی، جہلم، کشمور،

تھرپارکر، مٹھی اور کچھ دوسرے ڈویژن شامل تھے کہا جاتا ہے کہ بلوچستان کی ضلعی عدلیہ نے بالخصوص اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ ''یہ دیوانی یا فوجداری مقدمے کا چھ سے آٹھ ماہ کے اندر فیصلہ کرنے پر کمربستہ ہے''۔

کمیٹی نے ان عناصر مثال کے طور پر چالانوں کی غیر جمع بندی، زیر سماعت مقدمات کی عدم پیشی اور تحقیقات میں تاخیر سمیت دیگر عناصر کا جائزہ لیا جو کہ انصاف کی فراہمی میں رکاوٹ کا باعث ہیں۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ رجسٹرار، تفتیشی ٹیموں کے اراکین سیکرٹریز داخلہ، جیلوں کے آئی جی اور اصلاح اور جانچ کے ڈائریکٹروں کو اپنے یونٹ کے کام میں بہتری لانے اور نگرانی کے لیے باقاعدگی سے ملاقات کرنی چاہئے۔ جیلوں کی ناقص صورتحال مثال کے طور پر بھیڑ اور رہن سہن کی بری کیفیتوں کا نوٹس لیتے ہوئے کمیٹی نے حکومت سے فوری طور پر نئی جیلوں کی تعمیر کی درخواست کی۔ کمیٹی نے صوبائی حکومت سے بددیانتی کو کم کرنے کے لیے اپنے آمدن کے ریکارڈ کو کمپیوٹرائزڈ بنانے کی درخواست کی۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ سیشن ججوں اور جیل حکام کو زیر سماعت مقدمات کی عدم پیشی کے مسئلے کو حل کرنا چاہئے۔

کمیٹی نے بلوچستان میں ایک طبی سائنس لیبارٹری اور اسلام آباد کے لیے ایک خودمختار سروس کے قیام کا بھی مطالبہ کیا۔ اس کے بعد کے اجلاس (27 تا 28 اپریل) میں این جے پی ایم سی نے فیصلہ کیا کہ وفاقی اور صوبائی حکومتیں ججوں اور ان سے منسلک عملے کی تعداد میں اضافے کے لیے آنے والے بجٹ میں مالیاتی تخصیص کریں گی۔ کمیٹی نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ ضلعی عدلیہ کے ججوں کی تعداد میں اضافہ کیا جانا چاہئے۔

مذہب کی بنیاد پر درج مقدمات

2012 میں مذہب سے متعلق جرائم میں 27 مسلمانوں، جن میں دو خواتین شامل تھیں، کے خلاف 23 مقدمات درج کئے گئے۔ ان میں سے آٹھ افراد پر ضابطہ تعزیرات پاکستان کی توہین رسالت کی دفعہ 295-c کے تحت، اور بقیہ افراد پر دیگر شقوں کے تحت الزام عائد کیا گیا۔ 26 میں سے 15 مقدمات جن میں ملزم کا پتہ دستیاب تھا، ان کا تعلق پنجاب، 5 کا تعلق سندھ اور دو کا تعلق اسلام آباد اور خیبر پختونخوا سے تھا۔ دو افراد جنہیں جلا کر ہلاک کر دیا گیا۔ ان میں سے ایک کا تعلق پنجاب اور ایک کا سندھ سے تھا۔ جہاں تک 2012 سے پہلے نمٹائے گئے مقدمات کا تعلق ہے تو ایک ملزم کو الزام سے بری کر دیا گیا، دوسرے کو موت کی سزا سنائی گئی دو کو عمر قید کی سزا سنائی گئی اور ایک کو 25 سال قید کی سزا سنائی گئی۔

سزائیں اور رہائیاں

نمبر شمار	نام	ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ	ضلع/شہر	الزامات	گرفتار/قید	ریمارکس
1	محمد امین	295۔بی	لاہور	قرآن جلانے پر	گرفتار	19 جنوری 2012 کو 25 سال قید کی سزا سنائی گئی
2	نسیم احمد	295۔بی	مظفر گڑھ	۔	۔	مارچ 2012 میں عمر قید کی سزا سنائی گئی
3	شاہ جہاں	295۔سی	قصور	۔	گرفتار۔سزا سنائی گئی	مارچ 2012 میں عمر قید کی سزا سنائی گئی
4	علی شاہ	295۔سی 295۔بی	چترال	ایک لڑائی کے دوران قرآن اور رسولؐ کی توہین کی	گرفتار	15 نومبر 2012 کو موت کی سزا سنائی گئی
5	اشتیاق حسین	۔	چیچہ وطنی	۔	۔	الزام سے بری کر دیا گیا
6	منور حسین	295۔بی	لاہور	۔		۔

نئے مقدمات

نمبر شمار	نام	ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ	ضلع/شہر	الزامات	گرفتار/قید
1	شیخ آصف	295 سی	لودھراں	نبوت کا دعویٰ	گرفتار
2	عبدالشکور لیاقت	295 سی	لاہور	غلط طریقے سے کلمہ پڑھا	گرفتار
3	عابد حسین، محمد حسین، تصور حسین، اصغر عباس، مرزا حسین	۔	۔	توہین آمیز بیانات	گرفتار
4	مجاہد علی	298اے سیکشن 24 ٹیلی گراف ایکٹ	کراچی	۔	گرفتار
5	افتخار علی	۔	اوکاڑہ	خلفائے راشدین کے خلاف نازیبا الفاظ	گرفتار
6	عبدالغفور	۔	تونسہ شریف	۔	گرفتار
7	۔	295۔بی	ٹوبہ ٹیک سنگھ	قرآن کو نذر آتش کیا	گرفتار

8	شہاب الدین	295-بی	اوکاڑہ	قرآن کی بے حرمتی	-
9	نامعلوم	295-بی	چنی گوٹھ، بہاولپور	قرآن جلایا	گرفتار
10	سلیم	295-بی	کراچی	قرآن کی بے حرمتی	گرفتار
11	فریاد	-	فیصل آباد	-	-
12	-	295-سی	-	نبیؐ کی شان میں گستاخی	گرفتار
13	شمشان بی بی	295-بی	ہنجروال، لاہور	قرآن کی بے حرمتی	گرفتار
14	شفیق	295-بی	مصری شاہ، لاہور	قرآن کی بے حرمتی	گرفتار
15	ارشد	295-بی	ٹوبہ ٹیک سنگھ	قرآن کی بے حرمتی	گرفتار
16	زبیر	295-بی	ڈیرہ غازی خان	قرآن کے اوراق جلائے	گرفتار
17	حاجی نصر اللہ	295-سی	حیدرآباد	نبیؐ کی شان میں گستاخی	گرفتار
18	نصیر	295-سی	مظفر گڑھ	نبیؐ کی شان میں گستاخی	گرفتار
19	عارف، پرائیویٹ سکول کے استاد	295-سی	لاہور	امتحانات کے سوالیہ پرچے میں توہین آمیز مواد	-
20	شہادت علی	-	سرگودھا	توہین آمیز ایس ایم ایس بھیجا	گرفتار
21	ڈاکٹر	295-سی	اسلام آباد	توہین رسالت پر مبنی کتاب لکھی	گرفتار
22	نامعلوم	295-بی	دادو	قرآن جلایا	گرفتار
23	غالب	295-سی	ہری پور	نبیؐ کی شان میں گستاخی	گرفتار

مسیحوں کے خلاف مقدمات

مذہب سے متعلق ایک اہم مقدمہ جس کا 2012 میں فیصلہ کیا گیا، وہ ایک چودہ سالہ مسیحی لڑکی رمشا مسیح سے متعلق تھا، جسے قرآن کی بے حرمتی (جلاتے ہوئے) کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ یہ مقدمہ کچی آبادی، جہاں رمشا کے اہل خانہ اور بہت سے دوسرے مسیحی خاندان رہ رہے تھے، کے نزدیک ایک مسجد کے امام کی شکایت پر درج کیا گیا تھا۔

اس مقدمے نے اس وقت ایک غیر معمولی رخ اختیار کیا جب ایک مسلمان آگے آیا اور شکایت درج کرانے والے امام پر وہ الزام عائد کیا جو اس نے رمشا پر عائد کیا تھا۔ اسلام آباد ہائی کورٹ کے جسٹس اقبال حمید الرحمان نے رمشا کے خلاف ایف آئی آر خارج کرنے کا حکم دیا۔ عدالت نے کہا کہ اس کے خلاف عائد کیا گیا الزام ایک حساس معاملہ ہے اور اسی لیے کسی پر بھی ایسے جرائم کا الزام عائد کرنے سے پہلے مناسب

احتیاط برتنی چاہیئے۔ رمشا کے وکیل نے کہا کہ اسے اس لیے بری کیا گیا کہ کسی نے بھی اسے قرآن پاک کے اوراق جلاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

گزشتہ سال کے دوران قصور سے تعلق رکھنے والے ایک مسیحی جوڑے، منیر مسیح اور اس کی بیوی رقیہ بی بی کو بھی الزام سے بری کیا گیا۔ ان پر 2005 میں سیکشن 295 بی کے تحت قرآن پاک کی بے حرمتی کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ ضلعی عدالت نے انہیں 2010 میں عمر قید کی سزا سنائی۔ لاہور ہائی کورٹ نے 2012 میں انہیں الزام سے بری کر دیا۔

سال کے دوران مذہب کی بنیاد پر رمشا کیس کے علاوہ مسیحی برادری کے متعدد اراکین کے خلاف سات نئے مقدمات درج کئے گئے۔ ان میں سے تین پر سیکشن 295 سی کے تحت مقدمات درج کئے گئے۔ ان میں سے چھ مقدمات پنجاب اور ایک سندھ میں درج کیا گیا۔

نمبر شمار	نام	ضلع/شہر	ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ	الزامات	گرفتار/قید
1	سجاد مسیح	ٹوبہ ٹیک سنگھ	295 سی، 295 بی، 295 ڈی ٹیلی گراف ایکٹ	توہین آمیز ایس ایم بھیجا	گرفتار
2	ریان ستنتان	کراچی	295 سی 25 ٹیلی گراف ایکٹ	توہین رسالت پرمبنی ایس ایم بھیجا	گرفتار
3	رمضان مسیح	سکھیکی	295۔سی	نبیؐ کی شان میں گستاخی	۔
4	ایم ایس ٹی شمیم	بہاولپور	۔	نبیؐ کی شان میں گستاخی	گرفتا
5	افتخار	حجرہ شاہ مقیم، اوکاڑہ	295۔بی	قرآن کی بے حرمتی	گرفتار
6	لطیف	بورے والا	295۔بی	قرآن کو نذر آتش کیا	گرفتار
7	شہباز	بورے والا	295۔بی	قرآن کی توہین کی	گرفتار
8	طاہر	ڈسکہ، سیالکوٹ	295۔بی	قرآن کی بے حرمتی	گرفتار

رہائیاں

نمبر شمار	نام	ضلع/شہر	ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ	الزامات	گرفتار/قید
1	رضیہ بی بی، منیر مسیح	قصور	295۔بی	قرآن کی بے حرمتی	2010 میں گرفتاری اور عمر قید کی سزا لاہور ہائیکورٹ نے 17 مئی 2012 کو رہا کر دیا
2	رمشا	اسلام آباد	295۔بی	قرآن کے اوراک جلائے	گرفتار، لاہور ہائیکورٹ نے 20 نومبر 2012 کو مقدمہ خارج کر دیا

احمدیوں کے خلاف مقدمات

2012 کے دوران احمدی برادری پر مذہب کی بنیاد پر پانچ نئے مقدمات درج کئے گئے۔ ان میں سے ایک مقدمے (295۔اے کے تحت) کے سوا تمام مقدمات پاکستان پینل کوڈ کے سیکشن 298۔سی کے تحت اور یہ تمام مقدمات پنجاب میں درج کردیئے گئے۔

نمبر شمار	نام	ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ	ضلع/شہر	موجودہ حالت
1	مسز طاہرہ صدیقی	295۔بی	رحیم یار خان	گرفتار نہیں کیا گیا
2	مسز تسنیم کوثر	298 سی، 295اے	سول لائن، لاہور	۔
3	چوہدری منصور احمد	298 سی	مانکیرہ، بھکر	گرفتار
4	ایم۔اشرف	298 سی	سرگودھا، سلانوالی	گرفتار
5	حسن مامون اوراہل خانہ	298 سی	علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور	گرفتار

سزائے موت

ایک سابق فوجی جسے ایک فوجی افسر کو قتل کرنے کے الزام میں ایک فوجی عدالت نے سزا سنائی، کو نومبر میں پھانسی دینے کے سوا حکومت نے سال بھر کے دوران سزائے موت پر اپنے غیر رسمی وقفے کو برقرار رکھا۔ یقیناً حکومت کے پاس کورٹ مارشل کے مجرم کو دی گئی پھانسی کی سزا کو روکنے کا اختیار نہیں تھا۔ سال کے دوران 242 افراد (ان میں صرف ایک خاتون شامل تھی) کو 169 مقدمات میں موت کی سزا سنائی گئی جو کہ ایسی

سول سوسائٹی نے سزائے موت کے خلاف مہم جاری رکھی

سزاؤں میں مسلسل کمی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ تعداد 2010 کی تعداد 356 سے 32 فیصد اور 2011 کی تعداد 313 سے 22.7 فیصد کم ہے۔ ان 169 مقدمات میں درج ذیل 10 الزامات عائد کئے گئے تھے۔ 130 قتل، 10 اغواء وقتل، چوری وقتل، 18 اغواء برائے تاوان، 3 تیزاب حملے، 3 توہین رسالت، 2 منشیات سمگلنگ، گینگ ریپ، 2 جنسی تشدد، ایک قتل، چار نامعلوم۔

سفارشات

1۔ مختلف گروہوں کے وکلاء نے عدالتوں کی جانب سے بقایا جات کی ادائیگی پر مقررہ تواریخ پر پورا نہ اترنے کی جلدی کے باعث باضابطہ قانونی کارروائی سے اجتناب کے خلاف احتجاج کیا جس سے 2012 میں مقدمات کے فوری تصفیے پر بے جا زور کے اثرات ظاہر ہیں۔

2۔ سپریم کورٹ نے جس تواتر سے مقدمات کا ازخود نوٹس لیا ہے اور جس طرح وہ مختلف نوعیت کے معاملات کا احاطہ کرتے تھے اس سے عام مقدمات کو نظرانداز کئے جانے والے امر اور ازخود نوٹس کے اختیارات کے استعمال کے حوالے سے واضح اصولوں اور ترجیحات کے تعین کی واضح نشاندہی ہوتی ہے۔

3۔ اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کے تقرر کے طریقہ کار کے بارے میں پیدا ہونے والے تنازعات بالخصوص بارکونسلوں اور ایسوسی ایشنوں کے شدید تحفظات سے انصاف کی فراہمی اور عدلیہ پر عوام کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی ہے۔ ریاست کے دیگر دواداروں کے ستونوں کے ملبے پر عدالتی خودمختاری کی عمارت کھڑی کرنا ترقی مخالف اقدام ہے۔

4۔ اگرچہ شہریوں اور اداروں کو ریلیف ملنے اور آئین وقانون سے انتظامیہ کے انحراف پر بندش کے حوالے سے عدالتی فعالیت کے فوائد سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر اختیارات کی علیحدگی اور اپنے بنیادی فرائض کی ادائیگی کی صلاحیت پر اس کے مضر اثرات اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ ترجیحات پر نظرثانی کی جائے۔

5۔ توہین عدالت قانون کے تقدس کے تحفظ کا لازمی ذریعہ ہے مگر عدالتیں صرف توہین عدالت کے قانون کے ذریعے عوامی اعتماد اور احترام حاصل نہیں کرسکتیں۔ اس قانون کا جتنا کم استعمال ہوگا، یہ اتنا ہی موثر ثابت ہوگا۔

6۔ قانون میں تضحیک مذہب سے متعلقہ دفعات کے خاتمے کے مطالبے کا اعادہ کرتے ہوئے، ایچ آر سی پی کا خیال ہے کہ تضحیک مذہب کے مقدمات میں قانونی کارروائی کے طریقہ کار میں تبدیلیوں کی ضرورت واضح ہے۔ تضحیک مذہب قانون کے ٹرائل کا آغاز ہائی کورٹ سے ہونا چاہئے اور سینئر پولیس افسر کی تحقیقات اور مقدمہ سازی کی اعلیٰ اتھارٹی کی اجازت کے بغیر مقدمے کا اندراج نہیں ہونا چاہئے۔

7۔ اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ جج اپنی آواز کا اظہار صرف اپنے فیصلوں کے ذریعے کریں۔

2- قانون کا نفاذ

امن عامہ کی صورت حال

کسی شخص کو وجہ بتائے بغیر حراست میں نہیں لیا جائے گا۔ نہ ہی اسے اس کی مرضی کے وکیل سے مشورہ حاصل کرنے یا اس کے ذریعے اپنے دفاع کے حق سے محروم کیا جائے گا۔ آئین پاکستان [آرٹیکل-10(1)اور(2)]

انسانی وقار، گھر اور چار دیواری کی حرمت کی، قانون کے مطابق، ہر قیمت پر حفاظت کی جائے گی۔ کوئی شہادت یا ثبوت حاصل کرنے کے لیے کسی شخص کو تشدد کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ آئین پاکستان [آرٹیکل 14(1)اور(2)]

ہر شخص کو زندہ رہنے، آزادی اور جان و مال کے تحفظ کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل -3]

کسی شخص کو اذیت نہیں پہنچائی جائے گی۔ اور نہ ہی اس کے ساتھ ظالمانہ، غیر انسانی یا توہین آمیز سلوک کیا جائے گا۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل-5]

ہر اس شخص کو جس پر کوئی قابل سزا الزام عائد کیا جائے، یہ حق حاصل ہے کہ جب تک قانون کے تحت اس کو ایک کھلی عدالت میں، جہاں اسے اپنے دفاع کی تمام سہولتیں حاصل ہوں، مجرم ثابت نہیں کیا جاتا، اسے بے قصور تصور کیا جائے گا۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل 11-(1)]

کسی شخص کی خلوت یا تنہائی، خاندانی زندگی، گھر یا اس کی خط و کتابت میں، من مانے طور پر مداخلت نہیں کی جائے گی۔ نہ ہی اس کے وقار اور اس کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔ ہر شخص کو اس قسم کی مداخلت اور کوششوں کے خلاف قانونی تحفظ حاصل ہوگا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل-2]

سال 2012 میں پاکستان میں امن عامہ کی صورتحال مزید ابتر ہوئی۔ کراچی میں ٹارگٹ کلنگ کی گنتی میں پچھلے سال کی تعداد جو کہ بذات خود بہت زیادہ تھی کی نسبت خطرناک حد تک اضافہ ہوا۔ یہ واضح ہے کہ پاکستان کے سب سے بڑے اور گنجان آباد شہر میں ریاست کی گرفت کمزور ہو رہی۔ ریاست مذہبی اور لسانی اقلیتوں کو ملک کے متعدد علاقوں سے ملنے والی دھمکیوں اور حملوں سے محفوظ رکھنے میں ناکام ہے۔ بالخصوص کوئٹہ میں شیعہ ہلاکتوں کی تعداد میں گونہ گوں اضافہ ہوا جہاں ہزارہ کمیونٹی غیر محفوظ رہی۔ سال نے بہت سے

معروف سیاستدانوں اور انسانی حقوق کے کارکنوں کی ٹارگٹ کلنگ بھی دیکھی کیونکہ یہ لوگ اپنے شہریوں کی حفاظت کرنے میں ریاستی نااہلی کے خلاف آواز بلند کر رہے تھے۔ ملک کے تمام علاقوں میں دہشت گردوں اور جرائم پیشہ عناصر کی ماجگاہیں موجود رہیں جہاں سے وہ ریاست کی رٹ کو مذاق کا نشانہ بناتے رہے۔ بلوچستان میں کالعدم تنظیموں کے ہاتھوں فرقہ وارانہ تشدد جاری رہا جبکہ متعدد مجرمانہ عناصر نے حریف گروہوں کو بلا روک ٹوک کراچی میں نشانہ بنایا۔ خفیہ ایجنسیوں نے انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیموں کی طرف سے تنقید کے باوجود 'اپنے مارو اور ٹھکانے لگاؤ' آپریشنز جاری رکھے۔ اگرچہ 2012 میں پنجاب میں جرائم کی شرح اور پورے ملک میں دہشت گرد حملوں کی تعداد میں کمی آئی تاہم ریاست اپنے شہریوں کے لیے ایک محفوظ جائے پناہ تلاش نہ کر سکی۔ القاعدہ سے منسلک عسکری گروپ، لشکر جھنگوی سینٹرل جیل مچھ کے وارڈن کو قتل کرنے میں کامیاب رہا جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے خیال میں مقتول نے ان کے مقید قائدین سے سخت سے سلوک کیا تھا۔

ماورائے عدالت ہلاکتیں

جیسے جیسے یہ واضح ہوتا گیا کہ حکام دہشت گردوں اور مجرموں کو گرفتار کرنے اور ان کے خلاف مقدمہ سازی کرنے میں ناکام ہیں، مجرمانہ عناصر کو سزا کے خوف کے بغیر آزادانہ تشدد کرنے کا موقع ملا۔ نہ صرف یہ کہ طالبان اور سیاست زدہ جنگجو گروہوں جیسے غیر ریاستی عناصر قانون کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے رہے بلکہ ریاستی اہلکار بھی موثر عدالتی چارہ جوئی کے ذریعے مشتبہ دہشت گردوں کے خلاف مقدمہ سازی کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ایچ آر سی پی کی طرف سے میڈیا نگرانی کے مطابق سال 2012 میں پورے ملک میں

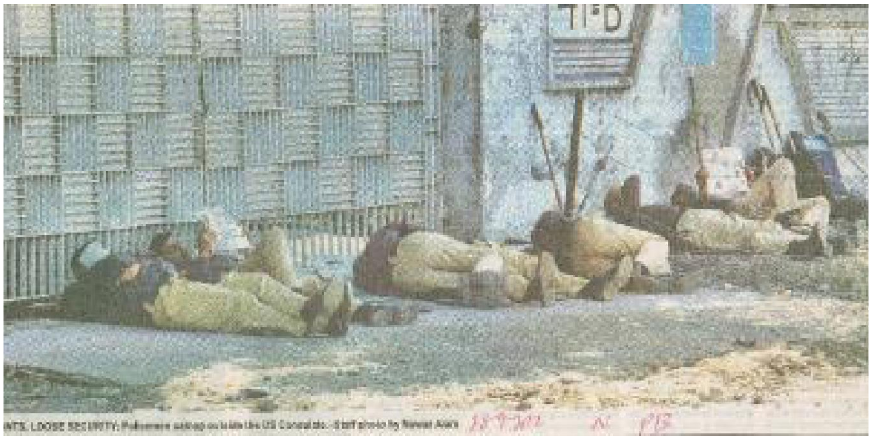

سکیورٹی چوکس ہے: اسلام آباد میں امریکی قونصلیٹ کے باہر پولیس اہلکار

'یوم محبت رسولؐ' پر پولیس کے ساتھ کشیدگی

350 پولیس مقابلے رپورٹ کئے گئے جن میں 403 مشکوک افراد مارے گئے۔ ایچ آر سی پی کی طرف سے 2011 میں کی جانے والی نگرانی سے حاصل ہونے والے اعداد وشمار سے قابل ادراک اضافہ ہے۔ 2011 میں 254 پولیس مقابلوں میں 337 مشکوک افراد مارے گئے تھے۔ 2012 کے مقابلوں میں 26 مشکوک افراد زخمی بھی ہوئے اور 79 افراد کو گرفتار کیا گیا۔ ان مقابلوں میں 41 پولیس والے مارے گئے اور 65 زخمی ہوئے۔ کُل 350 واقعات میں سے 282 واقعات میں نہ کوئی پولیس والا مارا گیا اور نہ ہی کوئی زخمی ہوا جبکہ 385 مشکوک افراد مارے گئے۔ 20 زخمی ہوئے اور 70 کو گرفتار کیا گیا۔

میڈیا کی اطلاعات کے مطابق ان پولیس مقابلوں میں سے صرف 19 کی تفتیش کا حکم دیا گیا۔ پنجاب سے 256، سندھ سے 75، خیبر پختونخوا سے 16، بلوچستان سے 3 اور اسلام آباد سے ایک پولیس مقابلے کی رپورٹ موصول کی گئی۔ لاہور 74، کراچی 60 اور فیصل آباد 24 پولیس مقابلوں کے ساتھ نمایاں رہے۔

ڈرون حملے بھی خصوصی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ یہ دیگر خود مختار ریاست کی جانب سے پاکستانی حکومت کے تعاون کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔ یہ امر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ غیر ملکی ریاست سے اہلکاروں کی طرف سے ہونے والے ڈرون حملے ماورائے عدالت ہلاکتوں کی واضح مثال ہیں۔ ڈرون حملوں کی تعداد میں فی الحال کمی واقع ہوئی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ سنگین مسئلہ ایک قسم کی ملک بھگت اور خاموشی کا شکار ہے۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق 2011 میں 74 حملوں کے مقابلے میں 2012 میں ڈرون حملوں کی

تعداد 48 تھی۔ ان حملوں کی وجہ سے ہونے والی اموات کی تعداد مختلف ہے۔ محتاط اعداد وشمار کے مطابق یہ 240 جبکہ بعض دیگر اعداد وشمار کے مطابق 400 تک تھی۔

دہشت گردانہ حملے

پاکستان انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز کے مطابق سال 2012 میں عسکریت پسندوں، قوم پرست باغیوں اور پُرتشدد فرقہ وارانہ گروہوں نے سال 2012 میں پورے پاکستان میں 1577 دہشت گردانہ حملے کئے جن میں 2050 افراد ہلاک ہوئے اور 3,822 افراد زخمی ہوئے۔ ان حملوں میں 61 فیصد سے زائد حملے نام نہاد مذہبی عسکریت پسند گروہوں بالخصوص تحریک طالبان پاکستان نے کروائے جو کہ 1076 لوگوں کی موت اور 2227 لوگوں کے زخمی ہونے کا باعث بنے۔ بلوچ اور سندھ قوم پرست باغیوں کی جانب سے 404 حملے ہوئے جن میں 437 لوگ ہلاک اور 823 زخمی ہوئے۔ دہشت گردوں نے پشاور اور فاٹا میں 14 سے زائد سکولوں پر بمباری کی۔ ان بم دھماکوں کا نشانہ بننے والوں سکولوں میں ایک مڈل سکول، لڑکوں کے چار سکول، لڑکیوں کے تین سکول اور چھ پرائمری سکول شامل تھے۔ خیبر پختونخوا کی پولیس کے مطابق سال 2012 میں دہشت گردوں کے بارہ نیٹ ورکس تباہ کئے گئے۔ 459 عسکریت پسندوں کو حراست میں لیا گیا اور 52 کی موت واقع ہوئی۔ اسی دوران کالعدم فرقہ پرست گروہوں نے 202 فرقہ پرست دہشت گرد حملوں کا ارتکاب کیا۔ ٹی ٹی پی اور اس سے ملحقہ گروہوں نے ان حملوں کے نتیجے میں 537 افراد کو ہلاک جبکہ 772 لوگوں کو زخمی کرنے کا دعویٰ کیا۔ پورے ملک میں فرقہ پرست تشدد کے نتیجے میں 531 لوگ مارے گئے جن میں زیادہ تر شیعہ تھے۔ لشکر جھنگوی، ایک کالعدم تنظیم نے شیعہ برادری کے خلاف ہونے والے زیادہ تر

کوہاٹ بم دھماکہ: دہشت گردوں نے شمال مغربی پاکستان کے شہروں میں حملوں کا سلسلہ جاری رکھا

حملوں کی ذمہ داری قبول کی۔ صرف بلوچستان میں ایک سو سے زائد شیعہ ہزارہ کو مار دیا گیا۔ ایک خودکش حملہ آور نے 22 دسمبر کو خیبر پختونخوا کے سینئر وزیر بشیر احمد بلور کو ایک سیاسی اجلاس کے دوران آٹھ لوگوں سمیت دردناک طریقے سے ہلاک کر دیا۔ ٹی ٹی پی نے حملہ کرنے کا دعویٰ کیا۔ ٹی ٹی پی کے ایک سخت ناقد 69 سالہ سیاستدان کی ہلاکت ایک ایسے شہر میں ہوئی جو عسکریت پسندی کے خلاف ملکی جنگ میں صف اول کے دستے کا کردار ادا کر رہا ہے۔ بلور تیسری دفعہ دہشت گردوں کا نشانہ بنے اور وہ دہشت گردوں کی فہرست میں سب سے اوپر تھے۔ بلور کی موت پر ساری قوم نے ماتم کیا۔

این جی اوز اور انسانی حقوق کے محافظین کو درپیش خطرات

سال 2012 میں پاکستان میں انسانی حقوق کے کام کے حوالے سے پُرخطر رہا جس کا مشاہدہ ایچ آر سی پی کی سابق چیئرپرسن عاصمہ جہانگیر کو ملنے والی قتل کی دھمکیوں سے لگایا جا سکتا ہے جو جون میں منظر عام پر آئیں۔ صوبہ خیبر پختونخوا کا صوبہ این جی اوز کارکنان اور انسانی حقوق کے محافظین کے لیے خاص طور پرخطرناک رہا۔ اطلاعات کے مطابق مئی میں کوہستان کے بااثر مذہبی رہنما مولوی عبدالحلیم نے این جی او کی خواتین کارکنان کو ضلع میں داخل ہونے پر تنبیہ کی اور کہا کہ ڈسٹرکٹ میں داخل ہونے کی صورت میں زبردستی ان کی شادی مقامی آدمیوں سے کروادی جائے گی۔ اس طرح کی کھلے عام دھمکیوں پر مولوی کے خلاف کارروائی نہ کی گئی۔ اس طرح کے واقعات اور ان پر اعلیٰ افسران کی خاموشی نے خیبر پختونخوا اور فاٹا میں این جی او خواتین کارکنان کے

پولیو ورکرز کی ہلاکت پر آنسو بہاتے ہوئے

لیے ماحول کوانتہائی غیر محفوظ بنادیا۔ دھمکیاں صرف دورافتادہ قبائلی علاقوں تک محدود نہیں تھیں۔ایک خیراتی ادارے ستر سالہ سویڈش کارکن برگیتا المبی کولاہور میں نامعلوم افراد نے گولی ماری جو کچھ دنوں بعد زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ گئیں۔مسز المبی ایک این جی او فُل گوسپل اسمبلیز آف پاکستان کے سماجی حلقے کی مینجنگ ڈائریکٹر تھی۔ پولیو کے خلاف مہم کی متعدد کارکنان کو دھمکیاں موصول ہوئیں جبکہ کچھ حملوں میں ماردی گئیں۔دسمبر میں نو پولیو ہیلتھ ورکرز کو تین دنوں کے اندر ملک بھر میں شروع ہونے والے حملوں کے ایک سلسلے میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ریڈ کراس کے برطانوی امدادی کارکن کو جنوری میں کوئٹہ سے اغواء کرلیا گیا۔ اپریل میں تاوان کی رقم کی ادائیگی نہ ہونے کی وجہ سے اس کی نعش ملی۔سال 2012 میں سوات کے قصبے مینگورہ کی ایک بچی ملالہ یوسف زئی پر ٹی ٹی پی نے پاکستان میں خواتین کی تعلیم کی حمایت کی بنیاد پر حملہ کیا۔ 9اکتوبر کوایک طالبان نے ملالہ کی سکول سے واپسی پر سکول بس پر اس کی گردن اور سر پر گولی ماری۔

12 اکتوبر کو 50 مذہبی رہنماؤں کے گروہ نے ملالہ پر جان لیوا حملہ آوروں کے خلاف فتوی جاری کیا لیکن ٹی ٹی پی نے ملالہ اوراس کے والد ضیاء الدین کوقتل کرنے کے ارادے کا بارہا اظہار کیا۔اس وقوعے کو قومی اور بین الاقوامی حلقوں کی غیر معمولی توجہ ملنے کے باوجود حکمران اس حملے میں شامل مشکوک افراد کو پکڑ نے میں ناکام رہے۔واقعے کے فوراً بعد حملہ آور کی عطاء اللہ خان کے نام سے شناخت کی گئی لیکن 2012 کے اختتام تک پولیس اس کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی۔

دسمبر 2011 میں ضلع پشین سے بلوچستان رورل سپورٹ پروگرام کے چھ ملازمین کواغواء کرلیا گیا۔ اغواء کاروں نے فوراً ہی ڈرائیور کو ہلاک کر کے باقی افراد کو وزیرستان منتقل کر دیا۔ 2012 میں ان کے خاندانوں کومتعدد بار کالز کی گئیں اور تاوان کا مطالبہ کیا گیا جس کا انتظام نہ ہوسکا۔نتیجتاً مئی کے آخر میں اغواء کاروں نے ایک اور ملازم کو مار دیا۔اغواء کے آٹھ مہینوں بعد بقیہ چار کے لیے تاوان کی رقم کا اطلاعات کے مطابق انتظام کرلیا گیا جس پر ان کواگست کی ابتدا میں رہا کر دیا گیا۔یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ریاست اس معاملے میں مداخلت کرنے میں ناکام رہی اوراغواشدہ ملازمین کے رشتہ داروں نے کیمپ لگا کر عطیات کے ذریعے تاوان کی رقم اکٹھی کی۔

بلوچستان

بلوچستان کو کچھ عرصے سے ملک کا انتہائی شورش زدہ خطہ سمجھا جاتا ہے اور حالیہ سالوں میں پُرتشدد فرقہ پرست گروہوں کے ظہور نے صورتحال کو مزید سنگین کر دیا۔نتیجتاً صوبہ ایک کٹھالی کی صورت اختیار کر چکا ہے

ایران جانے والے زائرین کو بلوچستان میں بارہا نشانہ بنایا گیا

جہاں مختلف پُرتشدد گروہ برتری کی جنگ لڑ رہے ہیں اور ملک کی خفیہ ایجنسیاں شہریوں کی اذیت رسانی اور قتل وغارت کا ارتکاب کررہی ہیں۔ ہر فریق اپنے مخصوص ایجنڈے سے متاثر ہے۔ کچھ سال پہلے بلوچستان میں دہشت گردانہ تشدد کی تمام اقسام کو قوم پرستوں سے منسوب کیا جاتا تھا۔ تاہم موجودہ حالات میں فرقہ پرست گروہوں نے پہلے سے بحران کا شکار اس صوبہ کو آماجگاہ بنالیا ہے اور مخصوص لسانی گروہوں کو نشانہ بنارہے ہیں۔ میڈیا کی اطلاعات کے مطابق 2008 سے 2012 تک شیعہ برادری کے 758 افراد کو ماردیا گیا جن میں سے 338 افراد کا تعلق ہزارہ برادری سے تھا۔ بلوچستان میں مشکوک قوم پرست اور دہشت گردوں کی مسخ شدہ لاشیں برآمد ہورہی ہیں۔ سرکاری رپورٹس کے مطابق 31 اکتوبر 2012 تک 125 مسخ شدہ لاشیں برآمد ہوئیں جبکہ غیر سرکاری اعداد وشمار سرکاری گنتی سے کہیں زیادہ تھے۔ (فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی، والا باپ ملاحظہ کیجئے)۔ بلوچستان میں گمشدہ افراد کا مسئلہ حفاظت کی ذمہ داران خفیہ ایجنسی کی تحویل میں تھا جس کا زیر بحث سال کے دوران سپریم کورٹ نے نوٹس لیا۔ جیلیں، قیدی اور جبری گمشدگان، والا باب ملاحظہ کریں)۔ بلوچستان میں امن عامہ کی مجموعی صورتحال بھی بہتر نہیں تھی کیونکہ 2012 میں 8,201 جرائم رپورٹ کئے گئے۔ بلوچستان کی طرف جانے والی سڑکوں کو بالخصوص رات کے سفر کے لیے غیر محفوظ ٹھہرایا گیا۔ خام مال یا مصنوعات کی بروقت فراہمی نہ ہونے کی وجہ مقامی تجارتی کمیونٹی بری طرح متاثر ہوئی۔ بلوچستان میں 2012 کے دوران کل 261 افراد قتل کئے گئے جبکہ 210 پر قاتلانہ حملے ہوئے۔

کراچی میں تشدد

پاکستان کے سب سے زیادہ گنجان آباد شہر میں امن عامہ کی حالت خراب رہی کیونکہ متعدد نشانہ زدآ پریشنز ہلاکتیں روکنے میں ناکام رہے۔ تقریباً 28,104 ٹارگٹ آپریشنز کئے گئے ۔کچھ میڈیا رپورٹس کے مطابق یہ تعداد 2,095 اور 2,370 کے درمیان ہے۔ کراچی کے پولیس اہلکاروں پر الزام ہے کہ یا تو وہ تشدد کی روک تھام میں حصہ لینے سے انکار کرتے ہیں یا پھر وہ ایسا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ تحقیق اور متعدد میڈیا رپورٹس کے مطابق ٹارگٹ کلنگ کے زیادہ تر واقعات میں پولیس اہلکار کا ہاتھ پائے گئے ہیں۔ تاہم کراچی میں تشدد نے عام آدمی جتنا ہی پولیس اہلکاروں کو بھی متاثر کیا ہے۔ 2012 میں کراچی میں 133 پولیس اہلکار اور پیراملٹری فورس کے 12 افراد کو ہلاک کیا گیا۔ میڈیا رپورٹس نے واضح کیا کہ صرف کراچی میں ہر روز اوسطاً کم از کم چھ لوگ ہلاک ہوئے۔ متاثرین کی سیاسی وابستگی ان کی ہلاکتوں کی وجہ بنی۔ ابھی تک کسی بھی سیاسی پارٹی کو نہیں چھوڑا گیا۔ تقریباً 61 ہلاک شدگان کا تعلق متحدہ قومی تحریک سے تھا۔ 18 کا تعلق پیپلز پارٹی سے، 19 کا عوامی نیشنل پارٹی، 13 افراد مہاجر قومی تحریک حقیقی سے اور آٹھ سنی تحریک سے تھے۔ سال کے آخری تین مہینوں میں فرقہ پرست ہلاکتیں بہت زیادہ تعداد میں ہوئیں۔ زیادہ تر متاثرین شیعہ فرقے کے پیشہ ور افراد تھے۔ اپریل میں سندھ پولیس نے کراچی کے علاقے لیاری میں مجرم گروہوں کے خلاف ایک مہم چلائی۔

کراچی: کشیدگی زدہ علاقے کے مناظر

تاہم مہم کو ختم کرنا پڑا کیونکہ افسران کو پولیس کے پاس ساز و سامان کم ہو جانے کا اندازہ ہوا اور قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں کو سنگین نقصانات برداشت جن میں ایک سپاہی کی ہلاکت اور ایک اے پی سی کا جلنا شامل تھا۔ کراچی کے متعدد علاقے مختلف لسانی شناختوں کے افراد کے لیے ممنوعہ علاقے تھے جہاں وہ داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ تقریباً ایک کروڑ، 80 لاکھ افراد پر مشتمل کراچی شہر کو جرائم کے واقعات میں اضافے کے سبب اربوں روپوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ 2011 میں جرائم کے واقعات کی تعداد 30,547 تھی جبکہ 2012 میں یہ تعداد 33,417 تھی۔

اغواء کے واقعات

خطرے پر قابو پانے والی ایک بین الاقوامی کمپنی ریڈ 24 کے مطابق پاکستان کو اس فہرست میں پانچویں نمبر پر رکھا گیا جہاں اغواء برائے تاوان کا خطرہ بہت زیادہ ہے۔ سرکاری اعداد و شمار نے واضح کیا کہ یہاں ایک سال میں 15,000 سے زائد اغواء کے واقعات پیش آئے ہیں جبکہ ریڈ 24 کے مطابق رپورٹنگ کم ہونے کے باعث ان کی اصل تعداد کافی زیادہ ہے۔ صرف دس سے بیس فیصد اغواء تاوان کے لیے کیے گئے۔ بلوچستان میں 2011 کے 58 واقعات کے مقابلے میں 2012 میں 112 اغواء کے واقعات کی رپورٹ درج کروائی گئی۔ جبکہ سال 2011 میں اغواء برائے تاوان کے 32 واقعات جبکہ 2012 میں 58 واقعات کی رپورٹ درج ہوئی۔ پنجاب میں 2011 میں 215 جبکہ 2012 میں 134 اغواء برائے تاوان کے واقعات کی رپورٹ درج کی گئی۔ کراچی میں 2011 میں 100 جبکہ 2012 میں اغواء برائے تاوان کے 117 واقعات کی رپورٹ درج ہوئی اور رپورٹ نہ ہونے والے واقعات کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ فاٹا میں اغواء کے تقریباً 25 مقدمات درج ہوئے۔

عورتوں کے خلاف تشدد

ملک کی خواتین بڑھتی ہوئی انتہا پسندی اور غربت سے دہرے طور پر متاثر ہوئیں۔ 2012 میں 626 خواتین نے خودکشی کی۔ یہ تعداد خواتین کی مکمل بے چارگی و بے بسی کی ایک جھلک پیش کرتی ہے۔ اگرچہ خواتین کو کام کرنے کے لیے محفوظ ماحول فراہم کرنے کے لیے متعدد قوانین موجود ہیں اور نئی قانون سازی بھی ہوئی ہے۔ کام کی جگہ پر خواتین کو ہراساں ہونے سے تحفظ فراہم کرنے کے لیے قانون بنایا گیا مگر ان کی اکثریت اب بھی ہراسیمگی کا شکار ہے۔ وفاقی محتسب کے اعداد و شمار کے مطابق ابھی بھی 60 فیصد خواتین کو پریشانی کا سامنا ہے۔ خواتین کو نشانہ بنانے، ان کی ترقی میں رکاوٹ ڈالنے اور ان کے بنیادی حقوق کو سلب

اہل خانہ اپنے اغوا شدہ رشتہ داروں کی بازیابی کا مطالبہ کر رہے ہیں

کرنے کی مہلک روایات جاری ہیں۔ ایچ آر سی پی کی میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق سال 2012 میں 913 لڑکیوں اور خواتین کو غیرت کے نام پر قتل کیا گیا۔ اس گنتی میں 99 کم سن لڑکیاں شامل ہیں۔ زیادہ تر واقعات میں لڑکیوں کو ناجائز تعلقات کا مجرم ٹھہرایا گیا اور پھر خاندان یا عزیز رشتہ داروں نے انہیں قتل کر دیا۔ جب تک قانون متاثرین کے خاندان کو معافی اور معاوضہ کی ادائیگی کے مواقع فراہم کرے گا غیرت کے نام پر قتل جیسا جرم بلا روک ٹوک جاری رہے گا۔

ذرائع ابلاغ کی اطلاعات کے مطابق سال 2012 میں تیزاب پھینکنے کے 83 واقعات کی رپورٹ درج کی گئی۔

سفارشات

1۔ اس سال ملک کے معاشی مرکز کراچی میں ٹارگٹ کلنگ کے واقعات میں شدید اضافہ ہوا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ سیاسی جماعتیں شہر میں مجرموں کی پشت پناہی اور معاونت کا سلسلہ ختم کریں۔ اگر کوئی مجرم سیاسی جماعت سے وابستگی رکھتا ہو تو اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ نہیں کرنا چاہئے۔ اغواء برائے تاوان کے واقعات میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ سابق گورنر سلمان تاثیر کے بیٹے تا حال لاپتہ ہیں۔ ملک بھر میں امن وامان کی صورتحال بہتر کی جائے تا کہ جنگجو گروہوں کو اغواء برائے تاوان جیسے

واقعات کے ذریعے دہشت گردانہ سرگرمیوں کو مالیاتی مدد فراہم کرنے کا موقع نہ ملے۔

2۔ این جی اوز، امدادی کارکنان، اور ہیلتھ ورکرز وغیرہ کو شدید خطرے کا سامنا ہے۔ حکومت کو اپنی انٹیلی جنس ایجنسیوں کو مزید چاک وچوبند ہونے کی ہدایت کرنی چاہیے اور پولیو مخالف ورکروں کو تحفظ بھی فراہم کرنا چاہیے۔

3۔ فرقہ واریت کا ناسور پاکستان کے معاشرتی ڈھانچے کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ پاکستان میں گواہوں کے تحفظ کا مستحکم نظام ہونا چاہیے، مزید برآں پولیس اہلکاروں، پراسیکیوٹرز اور ججوں کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے تاکہ ان پر قتل وغارت کے ملزمان کو آزاد کرنے پر دباؤ نہ ڈالا جا سکے۔

قید خانے، قیدی اور جبری گمشدگیاں

کسی بھی شخص کو جسے گرفتار کیا جاتا ہے' گرفتاری کی وجوہات بتائے بغیر [جتنا بھی جلدی ممکن ہو سکے] حراست میں نہیں رکھا جائے گا۔ اسے اپنی مرضی کے وکیل سے مشورہ کرنے اور قانونی تحفظ حاصل کرنے کے حق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

ہر وہ شخص جسے گرفتار کرنے کے بعد حراست میں رکھا گیا ہے' گرفتاری کے 24 گھنٹے کے اندر' مجسٹریٹ کے روبرو پیش کیا جائے گا۔ آ ئین پاکستان ۔ آرٹیکل- 10 (1)اور (2)]

ہر انسان کا احترام اور وقار اور بشرطیکہ قانون اس کی اجازت دیتا ہے' خلوت اور تنہائی نا قابل دخل اندازی ہے۔

کوئی معلومات' شہادت' ثبوت حاصل کرنے کی خاطر' کسی شخص کو تشدد کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

آ ئین پاکستان [آرٹیکل-14-(1)اور (2)]

کسی شخص کو اذیت رسانی یا ظالمانہ' غیر انسانی یا رسوا کن سلوک یا سزا کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل-5]

ہر شخص کو ہر کہیں قانون کے روبرو خود کو انسان تسلیم کروانے کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل - 6]

کسی شخص کو غیر قانونی گرفتاری، حراست یا جلاوطنی کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل - 7]

اس باب میں تین بنیادی امور ملک میں قیدیوں کی حالت زار، سزائے موت اور جبری گمشدگیوں کو توجہ کا مرکز بنایا گیا ہے جن کی حالت 2012 میں کئی حوالوں سے سنگین رہی۔ ملک بھر کی جیلوں کی حالت پہلے کی طرح افسوسناک رہی اور انہیں افراد کو بند کرنے کے لیے بنائے گئے پنجروں سے جیلوں میں تبدیل کرنے کے لیے کوئی پیش رفت نہیں کی گئی۔ گنجائش سے زیادہ قیدیوں کا مسئلہ جوں کا توں رہا۔ زیر سماعت مقدمات والے قیدیوں کی بہت بڑی تعداد جیلوں میں مقید تھی۔ علاوہ ازیں قیدیوں کے حقوق کے تحفظ کا انحصار جیل عملے کی مرضی کے تابع تھا اور رشوت کے بغیر قیدی اپنے حقوق اور سہولیات سے مستفید نہیں ہو سکتے تھے۔ قیدیوں کو

قیدیوں اور اُن کے اہل خانہ کو ازدواجی ملاقاتوں کے حوالے سے مشکلات کا سامنا تھا

اپنے اہل خانہ کے ساتھ ملنے اور تبادلہ خیال کرنے کے حوالے سے شدید مشکلات کا سامنا تھا۔ ازدواجی ملاقاتیں ایک ادھورا خواب ہی رہی ہیں اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ اگر صرف ان افراد کو ہی پابند سلاسل کیا جائے جو معاشرے کے لیے حقیقی خطرہ ہیں تو بہت سی مشکلات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ حالات پہلے کی طرح ابتر رہے کیونکہ قید کے متبادل انتظامات پر غور نہیں کیا گیا تھا اور لوگوں کو ان کے مقدمات کے فیصلوں سے قبل بھی جیلوں میں بند کرنے کا رجحان جاری رہا اور اس وجہ سے بھی کہ ان لوگوں کو رہا نہ کیا گیا جو معمولی جرمانے ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ قیدیوں کو رہائی کے بعد معاشرے کے مفید اراکین بنانے کے معاملے پر بہت کم توجہ دی گئی۔ تقریباً چار سال تک سزائے موت پر غیر رسمی پابندی عائد کرنے کے بعد پاکستان نے نومبر میں قتل میں سزایاب ایک آدمی کو پھانسی دی جس سے خدشات پیدا ہوئے ہیں کہ 2013 کے انتخابات میں حکومت کی تبدیلی سے پھانسی کی کوٹھڑی میں بند لوگوں کی بڑی تعداد میں کمی لانے کے لیے لوگوں کو پھانسی دینے کا عمل شروع کردیا جائے گا۔ پاکستان میں سزائے موت کے قیدیوں کی تعداد تقریباً 8000 ہے جس کے باعث پاکستان کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں سزائے موت کے قیدیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جبری گمشدگیوں کی شرح اور ایسے واقعات کی تعداد جن کی ایچ آر سی پی چھان بین کرسکا ہے 2011 سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ کمیشن کو ملک بھر میں 87 جبری گمشدہ افراد کی اطلاعات موصول ہوئیں جن میں سے 72 کا سراغ لگا لیا گیا تھا یا وہ بازیاب ہو گئے تھے۔ کم از کم 72 افراد کی نعشیں بلوچستان کے مختلف ویران مقامات سے ملیں جن کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ لاپتہ ہیں۔ جبری گمشدہ افراد کے ایماء پر ایچ آر سی پی کی جانب سے 2007 میں دائر کردہ پٹیشن کو 2012 میں توجہ نہ ملی کیونکہ اس حوالے سے کوئی نتیجہ خیز سماعت

نہ ہو سکی۔ بلوچستان میں جبری گمشدہ افراد کی نعشیں ملنے کا سلسلہ جاری رہا۔ستمبر میں، یو این ورکنگ گروپ برائے جبری یا غیر ارادی گمشدہ افراد، نے پاکستان کا دس روزہ دورہ کیا اور مشن کی تکمیل پر اپنی ابتدائی رپورٹ اور سفارشات کا اجراء کیا۔گروپ کی تفصیلی رپورٹ کو 2013 کے اوائل میں اقدام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل میں زیر بحث لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ابتدائی رپورٹ میں ورکنگ گروپ نے بتایا کہ جن افراد سے وہ ملے تھے ان میں بعض نے بتایا کہ انہیں دھمکیاں دی جارہی ہیں اور خوف زدہ کیا جارہا ہے۔

قیدیوں کی حالت زار

پاکستان کی جیلوں میں مجاز گنجائش سے زیادہ قیدیوں کی بندش کا سلسلہ جاری ہے۔قیدیوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جن کے مقدمات کی سماعت بھی شروع نہیں ہوئی اور قیدی رشوت دیئے بغیر اپنی بنیادی ضروریات سے مستفید نہیں ہو سکتے۔زیادہ تر شکایات جیل عملے کے برے رویے، قیدیوں کو ملنے والے کھانے اور پانی کے معیار اور صفائی وطبی سہولیات تک رسائی کی فقدان سے متعلق تھیں۔ انتہائی بری حالت میں زیرحراست ہونے کے علاوہ جیل میں اہل خانہ سے ملاقات کرنے کے حوالے سے شدید مشکلات درپیش تھیں۔ قیدیوں کے تفریحی اور مثبت سرگرمیوں کے بندوبست پر بہت کم توجہ دی گئی۔قیدیوں کو ازدواجی ملاقات کی سہولت فراہم کرنے کے دیرینہ وعدوں پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔زیرنظر سال کے دوران شعبہ جیل خانہ جات کے لیے پنجاب حکومت کا ترقیاتی بجٹ 802 ملین (8 کروڑ 20 لاکھ) سے کم ہو کر (5 کروڑ، 40 لاکھ) ہو گیا۔جنوری میں خیبر پختونخوا کی حکومت نے اعلان کیا کہ پشاور اور ہری پور کی موجودہ جیلوں میں غیر معمولی تحفظ پر مبنی جیلیں تعمیر کرنے کے لیے کام شروع کر دیا گیا ہے۔اس فیصلے کا مقصد یہ تھا کہ دہشت گرد کہلانے والے قیدیوں کو دیگر قیدیوں سے علیحدہ رکھا جا سکے تاکہ تحفظ کی صورتحال کو یقینی بنایا جائے اور کالعدم تنظیموں میں قیدیوں کی بھرتی کے امکانات کو کم کیا جائے۔ مارچ میں سینکڑوں قیدیوں نے سنٹرل جیل بنوں کا گیٹ توڑ دیا اور سابق صدر پرویز مشرف پر قاتلانہ حملہ کرنے کی پاداش میں سزائے موت پانے والے ایک قیدی سمیت 384 قیدیوں کو جیل سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔طالبان نے حملے کی ذمہ داری قبول کی۔ تقریباً 100 قیدی رضا کارانہ طور پر دوبارہ جیل واپس آ گئے۔دیگر 67 قیدیوں کو بعدازاں سکیورٹی اہلکاروں کی کارروائیوں کے نتیجے میں گرفتار کر لیا گیا۔جیل افسران کی حوالہ جاتی میڈیا اطلاعات کے مطابق جنوری سے اکتوبر 2012 کے دوران پنجاب کی مختلف جیلوں میں اچانک چھاپوں کے نتیجے میں قیدیوں سے 4000 موبائل فون، سمیں، چارج ہونے والے ریڈیو اور ٹرانسمیٹر زبرآمد ہوئے۔اس حوالے سے ایک جیل

سپرنٹنڈنٹ، ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ سمیت 70 اہلکاروں کو سزا دی گئی۔ نومبر میں سنٹرل جیل گوجرانوالہ میں قیدیوں کے لیے فسٹ کال دفتر قائم کیا گیا جبکہ اڈیالہ جیل راولپنڈی میں موبائل فون کو جامد کرنے کا آلہ نصب کیا گیا جس کا مقصد قیدیوں کی غیر قانونی ٹیلی فونک گفتگو کو روکنا تھا۔ ایک قیدی کو ہفتہ میں دو دفعہ زیادہ سے زیادہ پانچ لینڈ لائن نمبرز پر پندرہ منٹ تک کال کرنے کی اجازت تھی۔ ابتدائی مرحلے میں گوجرانوالہ جیل کا انتخاب کیا گیا جبکہ اس سہولت کو بعد ازاں دیگر سنٹرل جیلوں تک توسیع دی جا سکتی ہے۔ یہ کہا گیا کہ موبائل فون کو بند کرنے والہ آلہ موثر ثابت ہوا تو آلہ نصب کرنے والی کمیشن کو دیگر جیلوں میں بھی ایسے آلات نصب کرنے کے لیے کہا جائے گا۔ یہ نئے آلات پوری جیل کا احاطہ کریں گے برعکس 2010 میں کوٹ لکھپت جیل لاہور میں نصب ہونے والے آلات کے جو صرف انتہائی حساس بیرکوں تک رسائی رکھتے تھے۔

گنجائش سے زائد قیدیوں سے بھری جیلیں اور زیر سماعت مقدمات والے قیدی

جیل خانہ جات کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق ماسوائے گلگت بلتستان کے 2012 کے اختتام پر ہر صوبے/ علاقے کی جیل میں مجاز گنجائش سے زیادہ قیدی مقید تھے۔ پنجاب میں 49,889 قیدی تھے جبکہ گنجائش 11,937 افراد کی تھی۔ خیبر پختونخوا میں 7,996 قیدیوں کی گنجائش تھی جبکہ بند قیدیوں کی تعداد 8,113 تھی۔ بلوچستان کی جیلوں میں 2,483 زیر حراست تھے جبکہ مجاز گنجائش 2,473 قیدیوں کی تھی۔ گلگت بلتستان کی جیلوں میں 260 افراد قید تھے جبکہ مجاز گنجائش 645 قیدیوں کی تھی۔ پنجاب کی دو جیلوں کے سوا دیگر تمام میں مجاز گنجائش سے زائد قیدی زیر حراست تھے۔ ان میں سے سات جیلوں میں مجاز تعداد سے 200 فیصد زیادہ تھی۔ 11 جیلوں میں تعداد مجاز تعداد سے 100 فیصد زیادہ تھی۔ ضلعی جیلوں میں یہ تقریباً 350 فیصد زیادہ تھی جہاں 959 قیدی موجود تھے جبکہ مجاز گنجائش 228 قیدیوں کی تھی۔ قیدیوں کی بھاری اکثریت کسی جرم کی سزایابی کے بغیر ہی زیر حراست تھی۔ پنجاب میں تقریباً 32,108 (49,889 میں سے) قیدی زیر سماعت تھے جس کا مطلب ہے کہ انہیں دوران سماعت یا سماعت کے التواء کے دوران گرفتار کیا گیا تھا۔ دیگر صوبوں میں بھی صورتحال اس سے مختلف نہیں تھی ماسوائے بلوچستان کے جہاں قیدیوں کی اکثریت سزایاب تھی۔ بلوچستان میں کل 2,454 قیدیوں میں 1,335 سزایاب تھے اور 948 زیر سماعت مقدمات والے قیدی تھے۔ خیبر پختونخوا کی 22 جیلوں میں قیدیوں کی کل تعداد 8,113 تھی جن میں سے 4,768 زیر سماعت مقدمات والے قیدی تھے۔ پنجاب کی طرح سندھ میں بھی کل 14,199 قیدیوں کی

پاکستان کی جیلوں کی قابل نظر بیرکوں میں سے ایک

اکثریت (11,299) زیرسماعت مقدمات والے قیدی تھے۔ خیبرپختونخوا میں کل 7,996 قیدیوں میں سے 4,870 زیرسماعت مقدمات والے قیدی تھے۔ بلوچستان میں 1,129 قیدیوں کے مقدمات زیرسماعت تھے جبکہ 1,354 سزایاب تھے۔ پاکستان کی جیلوں میں 75,444 قیدی تھے جبکہ مجاز گنجائش 44,578 افراد کی تھی۔ اگر پاکستان کا فوجداری نظام عدل اور جیل خانہ جات کا نظام زیرسماعت مقدمات والے 49,582 افراد کو جیل کی صعوبتیں برداشت کرنے پر مجبور نہ کرے یا ان میں سے ممکنہ حد تک کم افراد کو زیرحراست رکھنے کا فیصلہ کیا جائے تو ملک کی جیلوں میں گنجائش سے زیادہ قیدیوں کی موجودگی کا مسئلہ راتوں رات حل ہوسکتا ہے۔

صحت اور اُس سے متعلقہ معاملات

اُس ملک میں قیدیوں کے لیے طبی سہولیات کا فقدان حیران کُن امر نہیں ہے جو معمولی وجوہات پر بھی افراد کو جیل میں ڈالنے اور اُنہیں وہاں بند رکھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ 2012 میں بھی قیدیوں کے لیے ڈاکٹروں اور ادویات تک رسائی کرنا مشکل کا کام تھا۔ زیادہ تر جیلوں میں قابل ڈاکٹروں کی کمی تھی اور اکثر میڈیکل اسسٹنٹ قیدیوں کی طبی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مزید نگہداشت کے لیے ضرورت مندوں کو ہسپتال ریفر کیا جاتا تھا۔ طبی معاملات کے باعث قیدیوں کی بیشتر ہلاکتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہیں بروقت ہسپتال ریفر نہیں کیا جاتا تھا۔ 2012 میں کم از کم 20 قیدی صحت سے متعلقہ مسائل کے باعث جیل میں یا پھر ہسپتال میں جا کر ہلاک ہوئے۔ قیدیوں کو ہسپتال میں ریفر کرنے کے زیادہ تر واقعات میں ظاہر ہوتا

ہے کہ اُنہیں ریفر کرنے کا فیصلہ اتنی تاخیر سے لیا گیا تھا ان کے زندہ بچنے کے بہت کم امکانات تھے۔ ملک بھر میں خواتین قیدیوں کو تجربہ کار خواتین ڈاکٹروں تک رسائی نہیں تھی۔ ملک بھر کی جیلوں میں قیدیوں کی ذہنی نگہداشت کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ بعض جیلوں میں نجی نگہداشت کی آگہی مہم سے متعلقہ سرگرمیاں منعقد کی گئی ہیں۔ ستمبر میں، سنٹرل جیل میانوالی میں تقریباً 2500 قیدیوں نے ڈینگی کے انسداد پر منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں شرکت کی۔ 2012 میں پنجاب ٹی بی کنٹرول پروگرام کے ڈائریکٹر نے کہا کہ جیلوں میں گنجائش سے زیادہ قیدیوں کے باعث تپ دق کی بیماری 25 فیصد زیادہ تیزی سے پھیلتی ہے۔ کوٹ لکھپت جیل لاہور میں اپنی ماؤں کے ساتھ بند چار برس سے کم عمر کے بچوں کو پولیو ویکسین نہیں دی گئی تھی۔ دسمبر میں جیل میں بند دو بچوں میں پولیو کی تشخیص کی گئی۔ 2012 کے اوائل میں پشاور ہائی کورٹ (پی ایچ سی) نے خیبر پختونخوا کی جیلوں میں غیر معیاری اور جعلی ادویات کے استعمال کا نوٹس لیا۔ انسپکٹر جیل خانہ جات نے عدالت کو آگاہ کیا کہ خیبر پختونخوا کی جیلوں میں گزشتہ چھ ماہ سے ادویات کی قلت ہے اور مہلک امراض کی تشخیص کا مناسب بندوبست نہیں ہے۔ قیدیوں کو لاحق آب وردہ بیماریاں قیدیوں کو دیے جانے والے پینے کے پانی کے معیار پر سوالیہ نشان ہیں۔ جنوری میں جیل خانہ جات کے سربراہ نے اعلان کیا کہ صوبے کی تمام جیلوں میں پانی کی صفائی کے پلانٹ نصب کیے جائیں گے۔ پہلا فلٹریشن پلانٹ فروری میں کیمپ جیل لاہور میں لگایا گیا جس کے باعث ہر روز 5,000 گیلن پانی کی دستیابی کو یقینی بنایا گیا۔ اُنہوں نے کہا کہ مارچ میں صوبے کی تمام جیلیں اس سہولت سے مستفید ہو سکیں گی۔ اگرچہ اس مقررہ حد پر عمل درآمد نہیں کیا جا سکا مگر مختلف جیلوں میں فلٹریشن پلانٹس نصب ہونے کی اطلاعات پورا سال موصول ہوتی رہی ہیں۔ نومبر میں ضلعی جیل فیصل آباد میں 360 لیٹرینیں اور واش روم تعمیر کیے گئے۔

پاکستان میں خواتین و بچے قیدی

ریجن / صوبہ	عورتیں	بچے	کل
بلوچستان	29	46	2,483
گلگت بلتستان	2	10	260
خیبر پختونخوا	146	194	8,113
پنجاب	791	779	49,889
سندھ	131	260	14,199
ٹوٹل	**1,099**	**1,289**	**74,944**

قیدی بچے

ملک بھر میں قیدیوں میں سے سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا قیدی بچوں کو کرنا پڑا ہے۔ ملک بھر کی

جیلوں میں قیدی بچوں کی تعداد 1,289 تھی۔ اُن میں سے زیادہ تر کے مقدمات زیرِ سماعت تھے۔ پنجاب میں 779 قیدی بچوں میں سے 668 کے مقدمات زیرِ سماعت تھے۔ سندھ میں 260 میں سے 235 کے مقدمات زیرِ سماعت تھے۔ 2012 میں بھی بچوں کی کوئی عدالت قائم نہیں کی گئی یا فوجداری مقدمات میں ملوث بچوں کو مستقل مفت قانونی مدد فراہم نہیں کی گئی جو کہ بچگان نظام انصاف آرڈیننس (جے جے ایس او) 2000 کی خلاف ورزی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جیلوں میں زیرِ سماعت مقدمات والے قیدی بچوں کی تعداد میں اضافے کا بنیادی سبب ہے۔ ('بچے' والا باب بھی ملاحظہ کریں)

جیلوں کے دورے

2012 میں ذرائع ابلاغ کے ذریعے ججوں کی جانب سے جیلوں کے دورے کی متعدد اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ ان دوروں سے عدالتی افسران کو نہ صرف قیدیوں کی حالت زار معلوم کرنے کا موقع ملا بلکہ اُن مقدمات کا بھی علم ہوا جن میں قیدی صرف اس وجہ سے رہائی نہ پا سکے کہ وہ جرمانہ کی گئی رقم کی ادائیگی نہیں کر سکے تھے۔ معمولی جرائم میں ملوث کم از کم 844 قیدیوں کو ججوں کے دورے کے بعد رہائی مل گئی۔ متعدد مزید قیدی بھی قید کی اذیت سے نجات پا سکتے ہیں اگر جج جیلوں کے دورے کا سلسلہ جاری رکھیں۔

جیلوں میں ہنگامے

قیدیوں کے درمیان فسادات اور کشیدگی کی اطلاعات پورا سال موصول ہوتی رہی ہیں۔ بسا اوقات ہنگامہ اُس وقت شروع ہوتا جب قیدیوں کی طبی ضروریات اور اچھی خوراک جیسی بنیادی ضروریات کو نظرانداز کیا جاتا تھا۔ ہنگامے کے بعد ہونے والی فیصلہ سازی میں قیدیوں کے مسائل کا ازالہ کرنے کی بجائے اُنہیں سزا دینے پر توجہ دی جاتی تھی جس کے باعث ہنگامہ انگیزی کو ہوا ملتی تھی۔

مارچ کے وسط میں ڈسٹرکٹ جیل، رحیم یار خان میں ایک ہنگامہ شروع ہو گیا جس کا سبب یہ تھا کہ ایک 60 سالہ مریض دل کا دورہ پڑنے سے ہلاک ہو گیا تھا اور حکام پر الزام عائد کیا گیا کہ اُسے مؤثر اور بروقت طبی سہولیات فراہم نہیں کی گئی تھیں۔ اُس کی موت کے دوسرے دن درجنوں قیدی جیل کے احاطے میں اکٹھا ہو گئے اور جیل حکام کے خلاف نعرے لگانے شروع کر دیے۔ وہ جیل کی چھت پر چڑھ گئے اور اُن میں سے بعض نے بطور احتجاج اپنے کپڑے جلا دیے۔ جیل حکام نے صورت حال پر قابو پانے کے لیے آنسو گیس کا استعمال کیا۔

مئی کے آخر میں مشتعل قیدیوں نے سنٹرل جیل گلگت کی 15 بیرکوں کو آگ لگا دی۔ دو مشہور و معروف قتل کے مقدمات کے ملزمان کو بری کیا گیا جس کے بعد ہنگامہ شروع ہوا۔ آگ بجھانے والوں کو آگ

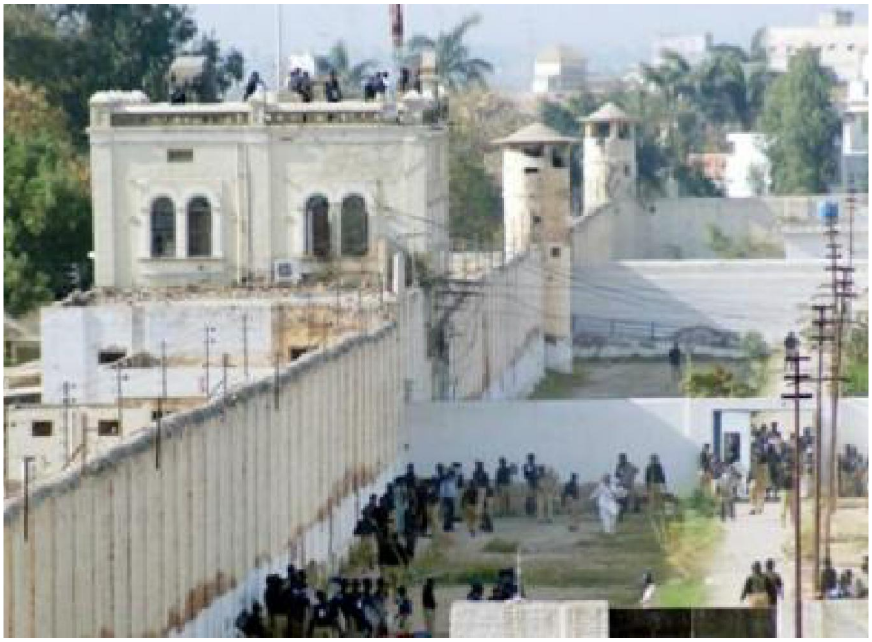

قیدی چھت پر چڑھے ہوئے ہیں، تمام اطراف میں پولیس ہے، جیل میں ہنگامے کا منظر

بجھانے میں دو سے زائد گھنٹے کا وقت لگا جس دوران ایک قیدی زخمی ہو گیا۔

جولائی میں حیدر آباد سنٹرل جیل میں قیدیوں نے 15 جیل وارڈنز کو یرغمال بنا لیا۔ قیدی بنیادی سہولیات کی قلت کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ صورت حال پر قابو پانے کے لیے ہونے والی پولیس کارروائی کے نتیجے میں ایک قیدی ہلاک اور 7 زخمی ہو گئے۔ جنوری کے اوائل میں لکی مروت کی جیل میں دو گروہوں کے مابین تصادم ہوا جس کے باعث آٹھ قیدی زخمی ہوئے جنہیں ہسپتال منتقل کیا گیا۔

جیلوں میں ہلاکتوں اور ضربات کے واقعات

ایچ آر سی پی کی جانب سے میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق، 2012 میں 59 قیدی جیل حکام کی تحویل کے دوران ہلاک اور 81 زخمی ہوئے جبکہ قیدیوں پر تشدد کے 10 واقعات کی اطلاعات موصول ہوئیں۔ شیخوپورہ جیل میں ایک سزا یاب قیدی پر اتنا بہیمانہ تشدد کیا گیا کہ اُس کے معدے کی آنت پھٹ گئی۔ متاثرہ شخص کے بھائی نے جیل حکام کے خلاف شکایت درج کروائی۔ ضلعی جج نے ڈی ایس پی پولیس اور چند وارڈنز کے خلاف مقدمے کے اندراج کا حکم دیا۔ جیلوں میں قیدیوں کے درمیان کشیدگی اور تصادم کے واقعات بھی پیش آتے رہے جن کے باعث کئی قیدی زخمی ہوئے۔ فروری میں سنٹرل جیل سکھر میں قیدیوں کے دو گروہوں کے

مابین تشدد کا واقعہ پیش آیا۔ دھنی بخش کورائی نامی ایک قیدی گیس سلنڈر لگنے کے باعث ہلاک ہوگیا۔ سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے انکوائری کا حکم دے دیا۔ مارچ کے آخر میں سنٹرل جیل کراچی میں ایک زیر سماعت قیدی بشارت حسین کی اپنے ساتھی قیدی کے ہاتھوں ہلاکت کا واقعہ پیش آیا۔ متوفی ملیر ڈویلپمنٹ اتھارٹی کا ڈپٹی ڈائریکٹر تھا اور بدعنوانی کے الزامات کا سامنا کر رہا تھا۔ متوفی کے بھائی نے الزام لگایا کہ بشارت پولیس حکام کے تشدد کے نتیجے میں ہلاک ہوا ہے جس کی پولیس نے تردید کی۔ مارچ میں کوٹ لکھپت جیل میں پراسرار حالات میں تین افراد سمیت دو قیدیوں کی ہلاکت کا واقعہ پیش آیا۔ سرکاری وضاحت میں کہا گیا کہ مرنے والے شدید مہلک بیماری کا شکار تھے مگر متوفین کے اہل خانہ اور شعبہ جیل کے بعض ذرائع نے اِس وضاحت کو بے بنیاد قرار دیا۔ انہوں نے الزام لگایا کہ جیل حکام نے حریف گروہ سے رشوت لے کر متوفین کے پینے کے پانی میں زہر ملا دیا تھا۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ پنجاب نے انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کو انکوائری کر کے رپورٹ جمع کروانے کا حکم دیا۔ مئی میں گلت جیل میں پانچ لوگوں پر تشدد کی اطلاعات ذرائع ابلاغ کے ذریعے منظر عام پر آئیں۔ ان افراد کو بنیادی طور پر بے دخل افراد کی حمایت میں احتجاجی مظاہرہ کرنے کی پاداش میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اُنھیں اِس پاداش میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا کہ اُنہوں نے قیدیوں کے مسائل کا نوٹس لینے کے لیے کیے گئے احتجاجی مظاہرے کی قیادت کی تھی۔ سول سوسائٹی کی تنظیموں نے کہا کہ پانچواں افراد پر عائد الزامات بے بنیاد تھے اور اُنہیں محض لوگوں کو اپنے مطالبات کے لیے منظم کرنے کی سزا دی گئی تھی۔

غیرملکی جیلوں میں بند پاکستانی قیدی

ستمبر میں وزیر خارجہ نے قومی اسمبلی کو آگاہ کیا کہ 30 خواتین سمیت 1,831 پاکستانی سعودی عرب کی جیلوں میں بند ہیں۔ وزیر موصوف نے کہا کہ ان میں سے تقریباً 40 فیصد افراد منشیات کی سمگلنگ جیسے جرائم کے تحت قید ہیں۔

جولائی میں، وزارت خارجہ نے لاہور ہائی کورٹ کو مطلع کیا کہ بٹ گرام جیل میں بند پاکستانی قیدیوں کی رہائی کے لیے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کو خط لکھا گیا تھا لیکن امریکی حکومت نے مثبت ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ عدالت کو بتایا گیا کہ حکومت پاکستان کے مطابق 34 پاکستانی بٹ گرام جیل میں بند ہیں۔ عدالت بٹ گرام انٹرنمنٹ کیمپ میں قید پاکستانی شہریوں کی رہائی کے لیے جسٹس پراجیکٹ پاکستان کی طرف سے دائر کی گئی پٹیشن کی سماعت کر رہی تھی۔ پٹیشنرز کے وکیل کا کہنا تھا کہ دیگر ممالک بٹ گرام جیل سے اپنے شہریوں کی رہائی کے لیے بہت سرگرم ہیں مگر پاکستانی شہری کئی سالوں سے وہاں گل سڑ رہے ہیں۔

عدالت نے حکومت کو ہدایت کی کہ وہ بٹ گرام میں قید پاکستانیوں کی رہائی کے لیے سنجیدہ دلچسپی کا مظاہرہ کرے۔ دسمبر میں ریاستی نیوز ایجنسی، ایسوسی ایٹڈ پریس پاکستان (اے پی پی) نے غیر مذکور سرکاری ذرائع کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مختلف ممالک کی جیلوں میں 8,715 پاکستانی قید ہیں اور حکومت اُن کی فوری رہائی کے لیے کوشش کر رہی ہے۔ اطلاعات کے مطابق حکومت نے ان معاملات کا نوٹس لینے کے لیے خصوصی سیل برائے بیرون ملک پاکستانی قائم کیا۔

پاکستانی جیلوں میں بند ہندوستانی ماہی گیر اور دیگر غیر ملکی

پاکستانی جیلوں میں بند غیر ملکی جن کا ذرائع ابلاغ میں اکثر ذکر کیا جاتا رہا ہے، کا زیادہ تر تعلق ہندوستانی ماہی گیروں سے ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے پاکستان اور ہندوستان ایک دوسرے کے قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے حوالے سے نہیں جانے جاتے۔ ماہی گیروں کو طویل عرصہ سے دونوں ممالک کے ناخوشگوار تعلقات کی قیمت چکانا پڑ رہی ہے۔ دونوں ممالک نے اکثر اوقات بحیرہ عرب میں بحری حدود کی خلاف ورزی کے الزام میں ایک دوسرے کے ماہی گیروں کو گرفتار کیا ہے۔ انسانی حقوق کے کارکنوں کا مطالبہ رہا ہے کہ حدود عبور کرنے پر ماہی گیروں کو گرفتار کرنے کی بجائے اُنہیں تنبیہہ دے کر رہا کر دینا چاہیے۔ اُن کا کہنا تھا کہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ اُن کی پکڑی گئی مچھلیوں کو ضبط کر لیا جائے مگر اُن کی گرفتاری اور کشتیاں ضبط کرنا انتہائی غیر ضروری ہے۔ ماہی گیروں کو سفارتی معاونت کی رسائی دینے اور بعد ازاں اُن کی قومیت کی مکمل چھان بین کے عمل کے باعث بعض اوقات اُن ماہی گیروں کی رہائی میں تاخیر ہوئی ہے جو اپنی قید کی مدت پوری کر چکے

ہندوستانی ماہی گیروں کی رہائی: پاک۔انڈیا ڈپلومیسی میں خیر سگالی کا عنصر

ہوتے ہیں۔ اُن کی رہائی کی صورت میں بھی اُنہیں زمینی راستے سے اُن کے ملک بھیجا جاتا ہے اور اُن کی کشتیاں دوسرے ملک کے ساحل پر بے مصرف پڑی رہنے سے زنگ آلودہ ہو جاتی ہیں جس کے نتیجے میں اُن کا روزگار از سرِ نو شروع ہونے کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔ مارچ میں قیدیوں کے لیے قائم انڈیا۔ پاکستان جوائنٹ جوڈیشل کمیٹی کے ایک رکن اور انڈیا سے امن کے حامی کارکنوں کے وفد نے دونوں ممالک کی حکومتوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے ممالک کی جیلوں میں بند دونوں اطراف کے ماہی گیروں کو رہا کر دیں اور اُنہیں اُن کی ضبط شدہ کشتیوں سمیت اپنے ممالک واپس جانے دیں۔ 2012 کے دوران پاکستانی جیلوں سے رہائی پانے والے 500 ہندوستانی ماہی گیروں میں درجنوں کمسن شامل تھے۔ کہا گیا کہ یہ تمام رہائیاں خیر سگالی کی علامت کے طور پر عمل میں آئی ہیں۔ ہندوستان نے بھی پاکستانی ماہی گیروں کو رہا کرتے وقت یہی کہا تھا مگر یہ خیر سگالی دونوں ممالک کو ایک دوسرے کے مچھیرے گرفتار کرنے کے عمل سے نہیں روک سکی۔ جیل حکام کی جانب سے ایچ آر سی پی کو فراہم شدہ کوائف کے مطابق 2012 کے اختتام پر سندھ کی جیلوں میں کم از کم 184 سزایاب غیر ملکی قیدی بند تھے، اُس کے علاوہ 118 زیرِ سماعت غیر ملکی اور 17 غیر ملکی ایسے تھے جن کا ٹرائل شروع نہیں کیا گیا تھا۔ ڈسٹرکٹ جیل ملیر میں تقریباً 152 سزایاب غیر ملکی قیدی تھے جن میں سے 99 زیرِ سماعت جبکہ 13 دیگر تھے۔ گرفتار شدہ ہندوستانی قیدیوں کو زیادہ تر اِس جیل میں بند کیا جاتا ہے۔ بلوچستان کی جیلوں میں بند 193 غیر ملکی قیدیوں میں سے 181 ڈسٹرکٹ جیل نوشکی میں بند تھے۔

جبری گمشدگیاں

پاکستان میں حکومتی حکام کی تحویل میں تمام افراد سرکاری جیلوں میں بند نہیں ہیں۔ سال 2012 نے جبری گمشدہ افراد کے اہلِ خانہ کے زخموں پر مرہم نہیں رکھا۔ سال کے دوران لوگوں کے اٹھائے جانے اور اُن کی رہائی کا سلسلہ جاری رہا۔ سپریم کورٹ (ایس سی) نے کوئٹہ میں سماعتیں کیں اور صوبے میں امنِ عامہ کی مجموعی صورتِ حال سے متعلقہ پٹیشن میں بلوچستان میں جبری گمشدگیوں کے معاملے کا جائزہ لیا۔ تاہم عدالتِ عظمیٰ نے سینکڑوں گمشدہ افراد کے ایما پر ایچ آر سی پی کی دائر کردہ پٹیشن کی اسلام آباد میں کوئی خاص سماعت نہیں کی۔ چونکہ اس سال کے دوران شہریوں کے اٹھائے جانے کا سلسلہ جاری رہا ہے، لہٰذا سپریم کورٹ کی مداخلت زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئی۔ تاہم 2012 میں جبری گمشدگی کے شکار افراد کی منظرِ عام پر آنے کی شرح ماضی کے برسوں کی نسبت زیادہ تھی۔ سب سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ ایچ آر سی پی کا یہ کہنا نہیں کہ یہاں مذکور جبری گمشدہ افراد کی تعداد حتمی ہے۔ جبری گمشدگی کے واقعات کی حقیقی تعداد زیادہ ہو سکتی ہے مگر ذیل میں

دیئے گئے اعداد وشمار صرف ان واقعات کی نشاندہی کرتے ہیں جن کے بارے میں متاثرین کے اہل خانہ نے ایچ آر سی پی کو آ گاہ کیا اور جن میں معلومات اس قدر تھیں کہ کمیشن ان کی چھان بین کرسکتا۔ ایچ آر سی پی 2012 میں پیش آنے والے جبری گمشدگی کے 87 واقعات کی چھان بین کرسکا ہے۔ ایچ آر سی پی کے چھان بین شدہ واقعات کے مطابق بلوچستان میں 2012 میں 34 افراد اٹھائے گئے جن میں سے 26 کا سراغ لگالیا گیا یا وہ رہا ہوگئے۔ دیگر لاپتہ ہیں۔ ایچ آر سی پی کو پنجاب (ملتان اور لاہور) سے دو افراد اور فاٹا (خیبر پختونخوا) سے ایک فرد کے اٹھائے جانے کی اطلاعات موصول ہوئیں۔ یہ تینوں افراد لاپتہ ہیں۔

افسوسناک رجحان کے تسلسل کے نتیجے میں 2012 میں مختلف ویران مقامات سے کم از کم 72 افراد کی لاشیں برآمد ہوئیں۔ یہ تمام نعشیں بلوچستان سے برآمد ہوئیں۔ 2012 میں صوبے سے ملنے والی دیگر 29 نعشوں کی شناخت نہیں ہوسکی۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ ان میں بعض افراد جبری گمشدہ تھے۔ خیبر پختونخوا کے علاقوں نوشہرہ اور پشاور سے بھی جبری گمشدہ افراد کی متعدد نعشیں برآمد ہوئیں۔ جبری گمشدگیوں کا معاملہ اس وقت کافی اجاگر ہوا جب یو این ورکنگ گروپ برائے جبری یا غیر ارادی گمشدگیاں نے حکومت کی دعوت پر پاکستان کا دورہ کیا اور اپنے مشن کے اختتام پر اپنی ابتدائی رپورٹ اور سفارشات جاری کیں۔ ابتدائی رپورٹ میں لاپتہ افراد کے اہل خانہ کو درپیش اذیت کا ذکر کیا گیا اور سزا سے استثنٰی، قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کی نگرانی اور تربیت، متاثرین کے اہل خانہ کی معاونت اور معاوضے کو توجہ کا مرکز بنانے سمیت دیگر سفارشات پیش کیں۔ ورکنگ گروپ کی مفصل رپورٹ کو 2013 کے اوائل میں اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل میں زیر بحث لایا جائے گا۔ ایچ آر سی پی نے گروپ کی ابتدائی رپورٹ اور سفارشات کو انگریزی اور اردو میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کے دو مقاصد تھے۔ اول، بین الاقوامی سطح پر معاملے کے حل کے لیے ہونے والی کوششوں سے لوگوں کو آ گاہ کرنا، اور دوم، حکومت کو اس امر پر قائل کرنا کہ وہ ورکنگ گروپ کی سفارشات پر عملدرآمد کرکے اقوام متحدہ میں معاملے پر بحث سے قبل اقوام متحدہ کو خیرسگالی کا پیغام بھیجے۔

مشہور و معروف اڈیالہ/ 11 یا 2012 کے اختتام پر بنیادی گیارہ افراد میں سے زندہ بچ جانے والے سات افراد کی حالت زار میں کمی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ یہ افراد ملٹری ہیڈکوارٹرز پر حملے کے الزام سمیت دیگر الزامات سے بریت کے بعد اڈیالہ جیل راولپنڈی سے رہائی پانے کے بعد لاپتہ ہوگئے۔ بعدازاں انٹیلی جنس ایجنسیوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے ان لوگوں کو دہشت گردوں کے سرگرم علاقے سے گرفتار کیا ہے جہاں وہ دہشت گردی کی سازش کررہے تھے۔ گیارہ میں سے چار حراست کے دوران ہلاک ہوگئے۔ عدالت عظمٰی کی بارہا مداخلت کے باعث بالآخر ان میں سے بعض افراد کو عدالت میں پیش کیا گیا جو صحیح طرح چل بھی نہیں سکتے

تھے مگر ان کی رہائی کو یقینی نہ بنایا جاسکا۔ 2012 کے اختتام پر وہ زیر حراست تھے۔اس مرتبہ نئے متنازعہ قانون 'سول انتظامیہ کی معاونت میں اقدام' کے تحت انہیں حراست میں لیا گیا ('انصاف کا انتظام وانصرام' والا باب بھی ملاحظہ کریں)

سزائے موت: تعطل سے پھانسی تک اور پھر واپسی کا سفر

حکومت پاکستان کی جانب سے پھانسی پر عملدرآمد کے تقریباً چار برس بعد نومبر کے وسط میں پنجاب کے ضلع میانوالی کی جیل میں ایک قیدی کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا۔ پھانسی پر لٹکائے جانے والا فرد، محمد حسین ہرل ایک سابق سپاہی تھا اور اسے فروری 2009 میں فوجی عدالت نے 2008 میں قتل ہونے والے ایک سپاہی کے مقدمے میں سزائے موت سنائی تھی۔اس سے قبل 2008 میں دی جانے والی پھانسی کا واقعہ بھی ملٹری عدالت کی طرف سے سزائے موت سنانے کے بعد پیش آیا تھا۔ پھانسی کا مذکورہ واقعہ سول سوسائٹی کے لیے حیران کن امر تھا کیونکہ اس وقت اگرچہ سزائے موت کے متعدد قیدیوں کو پھانسی دینے کی تاریخوں کا تعین ہوتا رہا مگر سزا پر عملدرآمد کو ہمیشہ ملتوی کیا جاتا رہا۔ درحقیقت مئی میں ایچ آر سی پی نے یہ علم ہونے پر کہ 23 مئی کو کراچی میں ایک قیدی کو پھانسی دی جائے گی، صدر سے اپیل کی کہ سزا پر عملدرآمد کو ملتوی کیا جائے۔ پھانسی پر عملدرآمد ملتوی کر دیا گیا۔ ذرائع ابلاغ کی اطلاعات کے مطابق میانوالی جیل کے حکام کو توقع تھی کہ صدارتی دفتر سے حکم امتناعی جاری ہوگا جیسا کہ پہلے کئی پھانسیوں کو ملتوی کرنے کے سلسلے میں ہوا تھا مگر ایسا نہ ہوسکا۔ نومبر میں دی جانے والی پھانسی نے کئی سطحوں پر تحفظات کو جنم دیا۔ یہ معلوم نہیں کہ پھانسی پر لٹکانے کا واقعہ غفلت کا نتیجہ تھا یا اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ملٹری عدالت نے سزا سنائی تھی۔ دوسرا پریشان کن امر یہ تھا کہ متعدد یاددہانیوں کے باوجود حکومت 2008 کئے گئے اپنے وعدے کی پاسداری نہیں کرسکی کہ وہ سزائے موت کو عمر قید کی سزا میں تبدیل کر دے گی۔ بعد کے ہفتوں میں معلوم ہوا کہ پھانسی پر عملدرآمد ملٹری عدالت کی طرف سے سزائے موت سنائے جانے کے باعث ہوا تھا۔ چونکہ پابندی کو باضابطہ پابندی میں تبدیل نہیں کیا گیا جس کے باعث خدشات نے جنم لیا کہ مارچ 2013 میں حکومت اپنی مدت مکمل کرے گی اور بعدازاں حکومت کی تبدیلی سے پھانسی سے متعلق ریاستی پالیسی تبدیل ہوسکتی ہے۔ پالیسی میں تبدیلی کے نتیجے میں قتل کے علاوہ دیگر جرائم میں سزائے موت کے قیدیوں پر فوری طور پر شدید اثرات مرتب ہوں گے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قتل کے مقدمات میں پاکستانی حکام نے بسا اوقات پھانسی کی تاریخ کو توسیع دی ہے تاکہ مجرم کو مقتول کے اہل خانہ کے ساتھ صلح کرنے کا موقع دیا جاسکے۔ ایسے تاخیری مواقع دیگر جرائم میں سزا یافتہ لوگوں کو میسر

نہیں تھے۔ اگر پھانسی پر عملدرآمد شروع ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ اس کی زد میں آئیں گے۔ نومبر میں، صدر کے ترجمان نے کہا کہ حکومت سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہے اور اس مقصد کے لیے قانون سازی کے اقدامات کررہی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وزیراعظم نے وزیرداخلہ، وزیرقانون، اٹارنی جنرل اور صوبائی حکومتوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی ہے تاکہ وہ اس حوالے سے سفارشات مرتب کریں۔ اگر اس سلسلے میں کوئی پیش رفت ہوئی بھی ہے تو عوام کو اس سے آگاہ کیا جائے۔

پاکستان میں سزائے موت

(2012-2004)

سال	سزایاب	سزاپر عملدرآمد
2004	455	21
2005	362	58
2006	445	83
2007	319	134
2008	237	36
2009	277	0
2010	356	0
2011	313	0
2012	242	1
کل	**3,006**	**327**

ستمبر میں صدر نے حکم نامہ جاری کیا کہ اڈیالہ جیل راولپنڈی میں مقید سزائے موت کے سات قیدیوں کی پھانسی کو تین ماہ کے لیے ملتوی کردیا جائے۔ سات قیدیوں نے صدارتی معافی نامے کی درخواست کی تھی۔ اس سے دو ماہ قبل، وزیرقانون سندھ نے کہا کہ پاکستان پیپلزپارٹی کی حکومت کے دوران سزائے موت کے کسی بھی قیدی کو پھانسی نہیں دی جائے گی۔ عدالتوں نے پورا سال مختلف جرائم پر سزائے موت سنانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اطلاعات کے مطابق سال کے دوران

پاکستان میں سزائے موت کے قیدی

2012

صوبہ/علاقہ	سزائے موت کے قیدی
بلوچستان	85 بشمول ایک خاتون
گلگت بلتستان	23
خیبرپختونخوا	183
پنجاب	6,469 بشمول 31 خواتین
سندھ	359
کل	**7,119**

تقریباً 242 افراد کو مختلف جرائم میں سزائے موت سنائی گئی۔ 130 افراد کو قتل، آٹھ کو اغواء برائے تاوان، ایک کو جنسی تشدد، ایک کو اجتماعی جنسی تشدد، دو کو منشیات سے متعلقہ جرائم، آٹھ کو ڈکیتی و قتل، تین کو تیزاب پھینکنے اور دو کو تضحیک رسالت کے جرم میں سزائے موت سنائی گئی۔ 2012 میں ایک خاتون کو بھی موت کی سزا سنائی گئی۔ سزایاب افراد میں تین مسیحی افراد بھی شامل تھے۔ 2012 کے اختتام پر ان وجوہات میں کسی قسم کی تبدیلی پیش نہیں آئی جو ایچ آر سی پی نے سزائے موت کے خاتمے کے لیے بیان کی تھیں۔ حکومت نے لوگوں کو سزائے موت پر غیر رسمی پابندی کی وجوہات سے آگاہ کرنے کی کوئی کوشش نہ کی اور نہ ہی اس کے لیے لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ 2012 کے اختتام پر پاکستان بھر کی جیلوں میں سزائے موت کے تقریباً 7,119 قیدی تھے۔ (’انصاف کا انتظام و انصرام‘ والا باب بھی ملاحظہ کیجئے)

پاکستان میں جیلیں اور قیدی

نمبر شمار	جیلیں	مجاز گنجائش	قیدی	سزایاب	زیر سماعت
1	سنٹرل جیل، لاہور	1053	3559	2411	1148
2	سنٹرل جیل، گوجرانوالہ	913	3240	1072	2168
3	سنٹرل جیل، ساہیوال	1750	3931	1380	2551
4	ڈسٹرکٹ جیل، قصور	444	1602	423	1179
5	ڈسٹرکٹ جیل، لاہور	1050	2948	117	2831
6	ڈسٹرکٹ جیل، شیخوپورہ	590	2267	502	1765
7	ڈسٹرکٹ جیل، سیالکوٹ	722	2096	564	1532
8	سنٹرل جیل، راولپنڈی	1994	4483	1834	2649
9	ڈسٹرکٹ جیل، اٹک	539	865	269	596
10	ڈسٹرکٹ جیل، گجرات	385	1340	329	1011
11	ڈسٹرکٹ جیل، جہلم	416	807	351	456
12	ڈسٹرکٹ جیل، ایم بی دین	279	656	185	471
13	سب جیل، چکوال	142	178	55	123
14	سنٹرل جیل، فیصل آباد	1190	2705	1799	906
15	بی آئی اینڈ جے جیل، فیصل آباد	224	163	48	115
16	سنٹرل جیل، میانوالی	1050	1735	896	839

17	ڈسٹرکٹ جیل، فیصل آباد	853	2177	147	2030
18	ڈسٹرکٹ جیل، جھنگ	916	1904	502	1402
19	ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا	563	1439	494	945
20	ڈسٹرکٹ جیل، شاہ پور	292	898	297	601
21	ڈسٹرکٹ جیل، ٹی ٹی سنگھ	500	965	318	647
22	ڈسٹرکٹ جیل، وہاڑی	500	905	228	677
23	ڈسٹرکٹ جیل، ملتان	1460	2399	1461	938
24	بی آئی اینڈ جے جیل، بہاولپور	434	65	34	31
25	سنٹرل جیل، بہاولپور	1334	2100	1195	905
26	سنٹرل جیل ڈی جی خان	582	1070	380	690
27	ڈسٹرکٹ جیل، بہاولنگر	347	580	121	459
28	ڈسٹرکٹ جیل، ملتان	228	959	110	849
29	ڈسٹرکٹ جیل، مظفر گڑھ	180	608	39	569
30	ڈسٹرکٹ جیل، رحیم یار خان	318	926	165	751
31	ڈسٹرکٹ جیل، راجن پور	114	236	8	228
32	ویمن جیل، ملتان	165	83	47	36
	کل	**21527**	**49889**	**17781**	**32108**

سندھ

نمبر شمار	جیلیں	مجاز گنجائش	قیدی	سزایاب	زیر سماعت
1	سی۔پی۔کراچی	2400	3896	773	3120
2	سی۔پی۔حیدرآباد	1527	1758	930	826
3	سی۔پی۔سکھر	1498	898	501	396
4	ڈی۔پی۔سکھر	550	347	4	343
5	سی۔پی۔لاڑکانہ	410	874	206	668
6	سی۔جے۔خیرپور	526	731	131	600
7	ڈی۔جے۔ملیر، کراچی	1591	2163	235	1915
8	ڈی۔جے۔نوابشاہ	100	298	2	296
9	ڈی۔جے۔میرپورخاص	75	218	5	213

10	ڈی۔جے۔سانگھڑ	250	309	3	306
11	ڈی۔جے۔جیکب آباد	250	246	2	244
12	ڈی۔جے۔دادو	250	341	7	334
13	ڈی۔جے۔بدین	250	322	8	314
14	ڈی۔جے۔شکارپور	250	456	48	452
15	ڈی۔جے۔این۔فیروز	250	296	4	292
16	ڈی۔جے۔گھوٹکی	250	295	0	295
17	ڈی۔پی۔لاڑکانہ	110	44	1	43
18	ناراجیل،حیدرآباد	300	313	6	306
19	وائی۔او۔آئی۔ایس۔کراچی	350	137	9	128
20	وائی۔او۔آئی۔ایس۔حیدرآباد	150	57	9	48
21	وائی۔او۔آئی۔ایس۔لاڑکانہ	40	28	3	25
22	وائی۔او۔آئی۔ایس۔سی پی آئی،سکھر	50	38	4	34
23	ڈبلیو۔جے۔کراچی	250	78	17	61
24	ڈبلیو۔جے۔لاڑکانہ	110	25	2	23
25	ڈبلیو۔جے۔حیدرآباد	150	28	11	17
26	اوپن جیل۔بدین		3	3	0
	کل	**11937**	**14199**	**2880**	**11299**

خیبرپختونخوا

نمبرشمار	جیلیں	مجاز گنجائش	قیدی	سزایاب	زیرسماعت
1	سنٹرل جیل،پشاور	850	2133	890	1243
2	سنٹرل جیل،ڈی آئی خان	1506	437	204	233
3	سنٹرل جیل،ہری پور	1597	1663	1343	320
4	سنٹرل جیل،بنوں	720	680	439	241
5	ڈسٹرکٹ جیل،کوہاٹ	500	286	27	259
6	ڈسٹرکٹ جیل،مردان	314	500	64	436
7	ڈسٹرکٹ جیل،سوات	200	0	0	0
8	ڈسٹرکٹ جیل،ایبٹ آباد	208	0	0	0

9	ڈسٹرکٹ جیل، چترال	164	57	7	50
10	ڈسٹرکٹ جیل، تیمرہ گرہ	250	481	66	415
11	ڈسٹرکٹ جیل، مانسہرہ	485	509	142	367
12	ڈسٹرکٹ جیل، کرک	227	78	7	71
13	ڈسٹرکٹ جیل، ڈگر	145	210	15	195
14	سب جیل، چارسدہ	120	236	4	232
15	ڈسٹرکٹ جیل، لکی	36	135	18	117
16	سب جیل، بٹگرام	118	16	0	16
17	سب جیل، داسو	210	29	0	29
18	سب جیل، دیر	60	4	2	2
19	جوڈیشل لاک اپ، صوابی	75	238	4	234
20	جوڈیشل لاک اپ، نوشہرہ	98	279	11	268
21	جوڈیشل لاک اپ، ٹانک	13	32	0	32
22	جوڈیشل لاک اپ، مالاکنڈ	100	110	0	110
	کل	**7996**	**8113**	**3242**	**4870**

بلوچستان

نمبر شمار	جیلیں	مجاز گنجائش	قیدی	سزایاب	زیر سماعت
1	سنٹرل جیل، مچھ	810	903	877	26
2	سنٹرل جیل، خضدار	210	157	109	48
3	سنٹرل جیل، گڈانی	223	307	182	125
4	سنٹرل جیل، مستونگ	70	21	06	15
5	سنٹرل جیل، ژوب	150	20	13	7
6	ڈسٹرکٹ جیل، کوئٹہ	470	583	102	481
7	سنٹرل جیل، سبی	120	110	22	88
8	سنٹرل جیل، ڈی ایم جمالی	120	118	17	101
9	سنٹرل جیل، لورالائی	60	45	10	35

10	سنٹرل جیل، تربت	60	21	06	18
11	سنٹرل جیل، نوشکی	150	198	10	188
	کل	2473	2983	1354	1129

گلگت بلتستان

نمبرشمار	جیلیں	مجاز گنجائش	قیدی	سزایاب	زیرسماعت
1	ڈسٹرکٹ جیل، گلگت	60	78	27	51
2	سب جیل جتیل، گلگت	35	68	15	23
3	ڈسٹرکٹ جیل، سکردو	50	25	10	15
4	ڈسٹرکٹ جیل، دیامیر	300	69	29	40
5	ڈسٹرکٹ جیل، غذر	100	16	3	13
6	ڈسٹرکٹ جیل، استور	100	4	0	4
	کل	**645**	**260**	**84**	**176**
	مجموعی کل	**44578**	**75444**	**25341**	**49582**

سفارشات

1۔ پاکستان بھر کی جیلوں میں گنجائش سے زیادہ قیدیوں کی موجودگی کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ لوگوں کو جیلوں سے باہر رکھنا حکام اور معاشرے دونوں کے مفاد میں ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ لوگوں کو مقید کرنے کی بجائے رہا کیا جائے۔ علاوہ ازیں قید کے سوا دیگر سزاؤں پر بھی غور کرنا چاہئے۔

2۔ پاکستان کی جیلیں ایسے مقامات ہیں جہاں نہ صرف افراد سے ان کی آزادی چھینی جاتی ہے بلکہ وہاں انہیں تذلیل اور دیگر مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ جیلوں میں بنیادی ضرورت کی فراہمی اور ازدواجی ملاقاتوں کے بندوبست کی ضرورت ہے تاکہ اگر کوئی آدمی اپنے اقدامات کے باعث قید کا شکار ہوتا بھی ہے تو اس کی عزت نفسی اور وقار کا تحفظ برقرار رہے۔

3۔ پاکستان کو فوری جبری گمشدگیوں پر میثاق پر دستخط کرنے چاہئیں اور اس کی مطابقت میں ملکی قانون میں ترامیم کرنی چاہئیں۔ اس حوالے سے ضابطہ تعزیرات پاکستان (پی پی سی) میں ترمیم بھی کرنی چاہیئے تاکہ جبری گمشدگی کو پی پی سی کے تحت فوجداری جرم قرار دیا جائے اور متاثرہ فرد اور اس کے اہل خانہ کو

معاوضہ کی ادائیگی لازمی قرار دی جائے۔ مجرموں کو تحفظ فراہم کرنے اور ان کی کارروائیوں کو نظر انداز کرنے کی پالیسی سے پہلے سے ابتر صورتحال مزید ابتر ہوگی۔

4۔ بارہا کئے گئے مگر تعمیل طلب وعدوں کے برسوں بعد اب ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت پھانسی پر غیر رسمی پابندی کو رسمی قرار دے اور ملک میں سزائے موت کا خاتمہ کرے چاہے یہ عمل مرحلہ وار بنیادوں پر تکمیل پذیر ہو۔

5۔ پاکستان اور ہندوستان کی جانب سے ایک دوسرے کے قیدیوں بالخصوص ماہی گیروں کو غیر ضروری اور بے مقصد مشکلات کا نشانہ بنانے کا سلسلہ ختم ہونا چاہئے۔ دونوں ممالک کو مہذب اقوام کی طرح مشترکہ طور پر فیصلہ کرنا چاہئے کہ وہ اس مسئلے کو ہمیشہ کے لیے کس طرح ختم کریں گے۔

خالی

3- بنیادی آزادیاں

نقل وحرکت کی آزادی

ہر شہری کو پاکستان میں رہنے، داخل ہونے اور آزادانہ پورے ملک میں گھومنے پھرنے، ملک کے کسی بھی حصے میں رہائش اختیار کرنے یا مستقل طور پر آباد ہونے کا حق حاصل ہے۔ البتہ یہ حق قانون کے تحت مفاد عامہ میں جائز طور پر عائد کی گئی کسی بھی پابندی سے مشروط ہے۔

آئین پاکستان [آرٹیکل- 15]

ہر شخص کو کسی بھی ریاست کی حدود میں گھومنے، پھرنے، سفر کرنے اور رہائش اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔

ہر شخص کو اپنے ملک سمیت، کسی بھی ملک کو چھوڑنے اور اپنے ملک واپس آنے کا حق حاصل ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل-17(2,1)]

سال 2012 میں ریاست اور غیر ریاستی عناصر کی جانب سے نقل وحرکت کی آزادی پر مسلسل پابندیاں دیکھنے کو ملیں۔ ریاست کی جانب سے لگائی گئی زیادہ تر پابندیاں ماضی کے طرز عمل اور ادارتی رکاوٹوں کا تسلسل تھیں، جن میں شیعہ برادری کے ماتمی مہینے محرم میں مذہبی پیشواؤں کے مخصوص شہروں میں داخلے پر پابندی اور ایگزٹ کنٹرول لسٹ پر روایتی انحصار بھی شامل تھا۔ پاسپورٹ کے اجرا کے دوران پیش آنے والی عمومی مشکلات زیادہ تر غیر ازالہ شدہ رہیں۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان نئے اور آسان ویزا نظام کا معاہدہ غیر نافذ العمل رہا جس سے ان کے لوگوں کے لیے شدید مشکلات پیدا ہوئیں جو بھارت کا سفر کرنے کے خواہاں تھے۔

ملک کے کچھ حصوں میں موٹر سائیکل کے استعمال پر پابندی اور بہت سے شہروں میں ڈبل سواری پر پابندی، نقل وحرکت کی آزادی پر پابندی لگانے کے نئے حربوں میں سے ایک تھا۔ ایک اور نیا حربہ ملک کے مختلف علاقوں میں موبائل فون پر پابندی لگانا تھا جس سے نقل وحرکت کی آزادی پر براہ راست اثرات مرتب ہوئے۔ ایندھن کی کمی اور سی این جی مالکان کی جانب کی جانے والی ہڑتالوں کا مطلب یہ تھا کہ سال بھر کے

اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں

دوران ذرائع آمدورفت کے روزمرہ کے معمولات متاثر رہے۔ سال 2012ء کے دوران پاکستان ریلوے مسلسل زوال کا شکار رہا اور بڑی تعداد میں ٹرینوں کی روانگی منسوخ ہوئی، ان کے شیڈول میں ردوبدل کیا گیا اوران کے روٹ بند کر دیئے گئے۔ اس کا لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی آزادی سے سفر کرنے کی قابلیت پر براہ راست اثر پڑا۔

گلگت بلکستان اور بلوچستان میں فرقہ وارانہ تشدد جہاں قومی شاہراہوں پر مسافروں کو بسوں سے اتارا گیا، شناختی کارڈ کے ذریعے ان کی فرقہ وارانہ وابستگی معلوم کی گئی اور پھر انہیں گولی مار کے قتل کر دیا گیا، کا مطلب یہ تھا کہ کچھ شاہراہیں بشمول وہ جو فاٹا کے علاقے کرم ایجنسی کو پورے ملک سے ملاتی ہے، سال بھر کے دوران لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے نوگوایریا بنی رہیں۔ بالکل اسی طرح بلوچستان کے راستے ایران جانے والے شعیہ زائرین کے قافلوں پر بار بار حملے کیے گئے۔ بلوچستان کی شیعہ ہزارہ کمیونٹی بڑھتے ہوئے ٹارگٹ حملوں سے بچنے کے لیے اپنی نقل وحرکت کو جتنا ممکن ہوسکتا تھا محدود کرنے کے لیے خود کو کوئٹہ کے صرف دوعلاقوں تک محدود رکھنے پر مجبور تھی۔ فاٹا کی ایجنسیوں کی امن وامان کی صورت حال نے ان علاقوں کو موثر انداز سے ملک کے دوسرے علاقوں کے لوگوں اور بعض اوقات فاٹا کے رہائشیوں کے لیے بھی نوگوایریا بنائے رکھا۔

داخلے پر پابندی

پنجاب حکومت نے محرم میں نوسوانتیس (929) مذہبی پیشواؤں کے پنجاب میں داخلے جبکہ چارسو انتالیس (439) کے تقریر کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ یہ پابندیاں بظاہر محرم کے مہینے کے دوران اشتعال

انگیز تقاریر کو روکنے کے لیے لگائی گئی تھیں۔ پنجاب کے تقریباً 35 اضلاع میں سے انیس کو حساس قرار دیا گیا اور صوبے بھر میں محرم کے جلوسوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے 118,308 پولیس اہلکار تعینات کیے گئے۔ جب شیعہ برادری نے ملک بھر میں جلوس نکالے تو امن و امان کی صورت حال اور دہشت گرد حملوں سے بچنے کے لیے ایسی پابندیاں سندھ میں بھی لگائی گئیں۔ گزشتہ برسوں کی طرح اشتعال انگیز تقاریر اور تشدد کی ترغیب کی حوصلہ شکنی کرنے کی بجائے حکام نے اپنی کارروائیوں کو مشکلات پیدا کرنے والوں کے ان اضلاع جنہیں، سال کے چند ہفتوں میں حساس قرار دیا جاتا ہے میں داخلے پر پابندی تک محدود رکھا۔

بلوچستان اور شیعہ افراد کی ہلاکتیں

بلوچستان میں امن و امان کی خراب صورت حال، ہزارہ برادری اور نام نہاد آبادکاروں، نسل پرست پنجابیوں، سندھیوں، پختونوں اور اردو بولنے والوں کی بلا اشتعال ہلاکتوں نے صوبے بھر میں شہریوں کی نقل و حرکت کو محدود کرنے کے علاوہ ہزارہ برادری اور نوآبادکاروں کے صوبے کے زیادہ تر حصوں میں رہائش اختیار کرنے کو ناممکن بنا دیا۔ 2011 میں بلوچستان کے راستے سفر کرنے والے شیعہ زائرین پر حملوں کے بعد بلوچستان کے راستے ایران کا سفر کرنے والے زائرین کے لیے سفر کرنے سے پہلے حکام کی طرف سے این او سی کے حصول کو لازمی بنا دیا گیا۔ سال 2012 بھر کے دوران زائرین کی نقل و حرکت حکومت کی منظوری کے ساتھ مشروط رہی لیکن سال بھر کے دوران سرکاری محافظین کے ساتھ قافلوں کی صورت میں سفر بھی جزوی تحفظ فراہم کر سکا۔

شیعہ برادری کے افراد کو زیارت کے لیے ایران لے جانے والی بسوں کے علاوہ صوبے میں ہزارہ برادری کے لوگوں کو 2012 کے شروع سے آخر تک نشانہ بنایا جاتا رہا۔ اسی طرح نوآبادکاروں کو ان کی فرقہ وارانہ وابستگی کی جانچ کرنے کے بعد قتل کیا گیا۔

ایگزٹ کنٹرول لسٹ

شہریوں کو ملک کی علاقائی حدود سے باہر جانے سے روکنے کے لیے ریاست کے پاس ایگزٹ کنٹرول لسٹ طاقتور ہتھیار کے طور پر موجود رہی۔ ایگزٹ کنٹرول لسٹ کی آئینی حیثیت کا موضوع ماضی میں زیر بحث رہا ہے۔ ای سی ایل کا بنیادی اصول فہرست میں ڈالے جانے والے آدمی کو پابندیوں کی وجوہات سے آگاہ نہ کرنا ہے۔

بہرحال اس سال اعلیٰ عدالتوں کی ہدایات پر بہت سے لوگوں کا نام ای سی ایل میں شامل کیا گیا۔ ای سی

فرقہ وارانہ دہشت گردی کے باعث ہلاک شدہ شیعوں کی نعشوں کی گنتی کرتے ہوئے

ایل سرحد کو کنٹرول کرنے کا نظام ہے جو کہ حکومت پاکستان کی جانب سے واپسی (ضبط) آرڈیننس 1981 کے تحت استعمال کیا جاتا ہے۔ پاکستان کی فیڈرل انویسٹی گیشن ایجنسی (ایف آئی اے) وزارتِ داخلہ کی سرپرستی میں ای سی ایل کے شائستہ اور درست ضبط کی ذمہ دار ہے۔ 1999 میں لاہور ہائی کورٹ نے مشاہدہ کیا تھا کہ ای سی ایل کے تحت تفویض کیے گئے وسیع اختیارات آئین کے آرٹیکل 2-A، 19 اور 25 ہے اور فطری انصاف کے اصولوں سے متصادم ہیں۔ خاص طور پر ہائی کورٹ نے کسی شخص کا نام ای سی ایل میں شامل کرنے کی تفصیلی وجوہات بتانے میں ناکامی پر بھی اعتراض کیا۔

گزشتہ برس کی طرح اس سال بھی لوگوں کو ملک چھوڑنے سے باز رکھنے کے لیے ای سی ایل کا استعمال جاری رہا۔ 2012 میں بھوجا ائیر لائن کے طیارے کے اسلام آباد کے قریب گر کر تباہ ہونے کے بعد ائیر لائن کے مالک فاروق بھوجا کا نام ای سی ایل میں شامل کر دیا گیا۔ سپریم کورٹ کی ہدایات پر قومی احتساب بیورو نے 19 اعلیٰ سرکاری افسران بشمول سابق وفاقی وزراء، مثال کے طور پر راجہ پرویز اشرف (پانی و بجلی)، لیاقت جتوئی (پانی و بجلی) اور شوکت ترین (مالیات) سابق وفاقی سیکرٹریوں مثال کے طور پر شاہد رفیع (پانی و بجلی)، اشفاق محمود (پانی و بجلی) اور سلمان صدیق (مالیات)، نیپرا کے سابق چیئرمین خالد سعید اور سعید ظفر (GCNCO) کے سی ای او یوسف علی، پرائیویٹ پاور انفراسٹرکچر بورڈ (پی پی آئی بی) کے ایم ڈی خالد عرفان رحمٰن، پیپکو کے سی ای او اور سلیم عارف عارف اور فضل احمد خان کے نام ای سی ایل میں ڈال دیے۔ دوسرے افراد جن کے نام ای سی ایل میں شامل کیے گئے ان میں لیاری سے تعلق رکھنے والی پیپلز امن کمیٹی کے قائدین عزیز بلوچ اور ظفر بلوچ شامل تھے۔

ہندو نقل مکانی

پاکستان ہندو سبھا کے سربراہ ڈی ایم مہاراج کے مطابق سندھ جہاں پاکستانی ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد رہتی تھی میں سے 3000 ہندو بھارت منتقل ہوگئے جو کہ اس نقل مکانی کا حصہ تھا جو چار سال قبل سندھ میں امتیازی سلوک اور جرائم میں اضافے کے سبب شروع ہوئی۔ اگرچہ سندھ اسمبلی کے رکن پیتمبر سوامی کے مطابق ایسی کوئی نقل مکانی ہوئی ہی نہیں۔ ہندو لڑکیوں کے اغوا اور انہیں زبردستی مسلمان بنانے کے عمل نے ہندو برادری کے عدم تحفظ کے احساس میں اضافہ کیا اور پاکستان میں ان کی نقل وحرکت اور رہائش کے انتخاب کی آزادی کو محدود کیا۔

پاسپورٹ کے حصول میں مشکلات

پاسپورٹ کے اجرا میں حد سے زیادہ تاخیر نے ملک سے باہر جانے کی خواہش رکھنے والے لوگوں کی مشکلات میں اضافہ کیا۔ بعض اوقات ریگولر اور ارجنٹ دونوں طرح کے پاسپورٹ تاخیر کا شکار ہوئے۔ اس تاخیر کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے سفر کے شیڈول بری طرح متاثر ہوئے۔ بعض اوقات ریگولر پاسپورٹ ایک ماہ کے بعد بھی جاری نہیں ہوئے تھے۔ دوگنی فیسیں وصول کرنے کے باوجود ارجنٹ پاسپورٹ وقت پر لوگوں کے حوالے نہیں کیے گئے۔ پچھلے سال کی طرح پھر سے پاسپورٹوں کے التوا کو مشین ریڈ ایبل پاسپورٹ کے اجرا میں استعمال ہونے والی مشینوں کی خرابی سے منسوب کیا گیا۔

شہری مسلسل شکایت کرتے رہے کہ پاسپورٹ دفاتر میں وہ ایجنٹوں کے رحم وکرم پر تھے اور صرف رشوت دینے کی صورت میں وہ اپنے پاسپورٹ وقت پر حاصل کر سکتے تھے۔ اور قطار میں موجود ان لوگوں سے آگے بھی کھڑے ہو سکتے تھے جنہوں نے رشوت نہ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

موٹر سائیکل سواری پر پابندی اور موبائل سروس کی فراہمی میں تعطل

16 نومبر جو کہ محرم کا پہلا دن تھا کو وفاقی وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے خفیہ ایجنسی کی رپورٹس کہ دہشت گرد حملوں میں موٹر سائیکل استعمال ہو سکتے ہیں کا حوالہ دیتے ہوئے کراچی اور کوئٹہ میں موٹر سائیکل سواری پر پابندی عائد کر دی۔ سندھ ہائی کورٹ نے اسی رات موٹر سائیکل پر سواری پر پابندی کو منسوخ کر دیا۔ اگرچہ عدالت نے یہ تجویز دی کہ ایسی پابندیاں سرکاری چھٹیوں کے موقع پر، یا شہر کے مخصوص علاقوں، خاص طور پر وہ جو امام بارگاہوں کے قریب واقع ہیں میں لگائی جا سکتی ہے۔

ملک بھر میں دہشت گردی کے خطرات کے باعث عام لوگوں کی نقل وحرکت کی آزادی کو بار بار محدود کیا گیا۔ چند مواقع پر تمام بڑے شہروں میں سکیورٹی خطرات کے باعث ڈبل سواری پر پابندی تھی۔

عاشورہ کے موقع پر اور داتا گنج بخش کے عرس اور اس کے ساتھ بیک وقت منعقد ہونے والے حضرت امام حسین کے چہلم کے موقع پر دہشت گرد حملوں کے خطرات کے باعث موبائل سروس بھی معطل کر دی گئی جس کے باعث شہریوں کی زندگیاں بری طرح متاثر ہوئیں۔

سی این جی بحران

اگر چہ شہریوں کی نقل وحرکت پر جسمانی پابندیاں نہیں لگائی گئیں لیکن ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے کے ذرائع کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا گیا اور ان سب میں سے سی این جی کی قیمتوں میں سب سے زیادہ اضافہ ہوا۔ گیس بھروانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرنے والی کاروں، چھوٹی بسوں، ویگنوں اور رکشوں کی لمبی قطاریں 2012 میں پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں دیکھا جانے والا عام نظارہ تھا۔ 2012 میں پاکستان کو سی این جی کے شدید بحران کا سامنا کرنا پڑا جہاں آل پاکستان سی این جی ایسوسی ایشن کے صدر کے مطابق ملک کے تین ہزار تین سو پچانوے گیس فلنگ سٹیشن میں سے ایک ہزار آٹھ سو سٹیشن ہفتے کے آخری دنوں میں بند کر دیے جاتے تھے اور حکومت نے بلوں کی عدم ادائیگی کی وجہ سے مزید آٹھ سو سٹیشن بند کر دیے۔ پاکستان اپنے قدرتی گیس کے ذخائر کو تیزی سے استعمال کر رہا ہے۔ پرویز مشرف کی سابقہ حکومت نے پیسے بچانے کے لیے گاڑیوں میں قدرتی گیس کے استعمال کی حوصلہ افزائی کی اور پیسے کو تیل کی درآمد پر خرچ کیا۔ آج ملک میں اسّی فیصد سے زائد گاڑیوں میں قدرتی گیس استعمال ہو رہی ہے جو کہ دنیا کے تمام ممالک میں سب سے

موٹر سائیکل سواری خطرات کا باعث سمجھی جانے لگی

زیادہ ہے۔ وزیراعظم کے مشیر برائے پٹرولیم اور قدرتی وسائل کے مطابق 2022 تک ملک کے دوسب سے بڑے گیس کے ذخائر کے ختم ہونے کا امکان ہے۔ حکومت صارفین کی گیس کی طلب کو پورا کرنے میں ناکام رہی جس کی وجہ سے گیس سٹیشن ہفتے میں تین دن بند رہے اور شہریوں کی نقل وحرکت کی آزادی محدود رہی۔ ایک ایسا ملک جہاں پٹرول کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں اور ملک کی اکثریتی آبادی کی پہنچ سے باہر ہیں وہاں گیس کی قلت نے اوسط درجے کے پاکستانیوں کے بجٹ کو بُری طرح متاثر کیا۔ پٹرول سے چلنے والی پبلک ٹرانسپورٹ کے کرایے بھی زیادہ تر لوگوں کے لیے بہت زیادہ ہیں۔ ذخائر کی تلاش کی کوششوں میں اس عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا گیا جس کا سی این جی بحران تقاضہ کرتا تھا۔ مستقبل میں پڑوس میں واقع ایران سے گیس درآمد کرنا قابل نظر آتا تھا۔

2012 میں شہریوں کی بڑی تعداد نے اپنی گاڑیوں میں ایندھن بھروانے کے لیے روزانہ کئی گھنٹے ضائع کیے جس کی وجہ سے ان کی کارکردگی اور پیداواری صلاحیت متاثر ہوئی۔

ذرائع نقل وحمل

ایندھن کی قیمتوں میں اضافے اور مہنگائی نے پاکستانیوں کی اوسط تعداد کے لیے سفر کو مشکل بنا دیا۔ بڑے شہروں کے اندر اور شہروں کے درمیان کم قیمت ٹرانسپورٹ نظام کے فقدان نے سفر کو تکلیف دہ اور مہنگا بنا دیا۔ میڈیا کی خبروں کے مطابق پاکستان ریلوے کو ماہانہ دس کروڑ روپے کا نقصان ہو رہا تھا۔ پاکستان ریلوے

مسافرین کے احتجاج کا پاکستان کی ریلوے انتظامیہ پر کوئی اثر نہ پڑا

جس کے پاس 1948 میں 821 ریل گاڑی کے انجن تھے اب یہ تعداد 528 رہ گئی تھی جس میں سے صرف 140 انجن فعال تھے۔ زیر جائزہ سال میں، ٹرینیں مسلسل گھنٹوں کی تاخیر کا شکار تھیں اور حتیٰ کہ کچھ انجنوں کی خرابی کے باعث اپنا سفر مکمل کرنے میں ناکام رہیں۔

حکومت ریاست کی جانب سے اربوں روپے کی مالی معاونت کے باوجود پی آئی اے نے زیادہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا اور بہت سی پروازیں منسوخ اور تاخیر کا شکار ہوئیں۔ سی این جی بحران نے شہروں میں سفر کو بُری طرح متاثر کیا اور سی این جی کی قلت کی وجہ سے ٹیکسیاں، بسیں، ویگنیں اور رکشے پٹرول اور ڈیزل پر چلتے رہے اور گراں کرائے وصول کرتے رہے۔

گروی مشقت

دیہی سندھ اور پنجاب کے بھٹے کی صنعت میں گروی مشقت جاری رہی۔ مزدوروں کو غیر قانونی قید میں رکھا جاتا تھا۔ ان کی نقل و حرکت کی آزادی کو مسلح محافظوں کے ذریعے حزف کیا جاتا تھا یا ان کے خاندان کو یرغمال بنا کر رکھا جاتا تھا۔ ایسی سرگرمیاں 2012 میں جاری رہیں اور حکام ان کی روک تھام کے لیے کوئی خاص پیش قدمی نہیں کر سکے۔

کراچی میں ٹارگٹ کلنگ

ایچ آر سی پی کے میڈیا معائنے کے مطابق 2012 کے پہلے آٹھ ماہ میں کراچی میں ٹارگٹ کلنگ کے واقعات میں 1725 افراد جاں بحق ہوئے۔ ان میں 221 سیاسی کارکنوں کے علاوہ 107 خواتین اور 78

انہوں نے نقل و حرکت کی آزادی کی قیمت چکائی ہے۔ کراچی 18 جون 2012

بچے شامل تھے۔ پاکستان کے سب سے بڑے شہر میں کام کاج کے لیے اپنے گھروں کو چھوڑنے والے لوگ تشدد کے اچانک آغاز کے خوف کا شکار رہے۔ مختلف گروہوں اور برادریوں کے بیچ ہونے والی علاقائی جنگوں نے شہروں کی آزاد نقل وحرکت کو مسلسل خطرے سے دوچار کیے رکھا۔

کراچی کے کچھ علاقے جن پر ایک یا کسی اور لسانی گروہ کی بالادستی تھی وہ دوسرے لسانی گروہوں کے لیے نو گو ایریا بنے رہے۔ اسی دوران پولیس اور رینجرز کی جانب سے کیے گئے ٹارگٹڈ آپریشنز کے نتیجے میں لوگ کئی دنوں تک اپنے گھروں تک محدود رہے۔

سفارشات

1- اس میں کوئی شک نہیں کہ امن وعامہ کی صورت حال میں بہتری کی ضرورت ہے۔ ریاست کو اس امر کو یقینی بنانا چاہیے کہ ملک میں کوئی نو گو ایریا نہ ہوں اور شہری ملک بھر میں سفر کے دوران محفوظ ہوں۔

2- ای سی ایل اور اسی طرح کسی شخص کا نام اس میں شامل کرنے کی وجوہات کو منظر عام پر لایا جائے اور اس کے من مانے استعمال کو روکا جائے۔ پاسپورٹ کے اجرا میں تاخیر اور اس کے لیے استعمال ہونے والی مشینوں کی مسلسل خرابی پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

3- حکومت کو لازمی طور پر علاقوں بالخصوص بلوچستان اور فاٹا میں اپنی رٹ قائم کرنی چاہیے اور شہریوں کو غیر ریاستی عناصر سے تحفظ فراہم کرنا چاہیے۔

4- گروی مشقت کے خلاف قوانین کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے خصوصی اقدامات کیے جائیں کیونکہ معاشرے کے غیر محفوظ ترین طبقات کو حقیقی غلامی کی صورت حال کا سامنا ہے۔

5- شہریوں کو ایندھن اور نقل وحرکت کے مختلف الاقسام ذرائع کی قابل استطاعت قیمتوں پر فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ ٹرین اور ہوائی جہاز کے سفر کو اور زیادہ مؤثر بنایا جائے۔

فکر وضمیر اور مذہب کی آزادی

پاکستان کے عوام کی خواہش ہے کہ ایک ایسا نظام وجود میں لایا جائے، جس میں بنیادی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔ ان حقوق میں سماجی مساوات، مساوی مواقع کی فراہمی، سب کے لیے یکساں قانون، سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف، فکر وضمیر اور اظہار رائے کی آزادی، ایمان، عقیدے، عبادت اور تنظیم سازی کی آزادیاں بھی شامل ہیں۔ یہ حقوق اور آزادیاں قانون اور اخلاق عامہ کی حدود کے تابع ہوں گی۔ آئین پاکستان [دیباچہ]

قانون، امن عامہ اور اخلاقیات کی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے، الف: ہر شہری کو اپنے مذہب پر قائم رہنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق حاصل ہوگا اور ب: ہر مذہبی گروہ، فرقے اور مسلک کو حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے مذہبی ادارے قائم کرے، انھیں برقرار رکھے اور چلائے۔ آئین پاکستان [آرٹیکل- 20]

تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں، سب کی عزت اور حق برابر ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل عطا کیے گئے ہیں، انھیں ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ سلوک اور رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل - 1]

ہر شخص کو فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے کی آزادی بھی شامل ہے، اور یہ آزادی بھی، کہ کوئی شخص تنہا یا کچھ افراد مل کر اجتماعی طور پر، نجی حدود میں یا سر عام، تعلیم و تبلیغ، اعمال و عبادات کے ذریعے اپنے مذہب کا اظہار کریں۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل - 18]

کسی شخص پر اس طرح کا دباؤ نہیں ڈالا جائے گا کہ اس کا عقیدہ اور مذہب اختیار کرنے کی آزادی مجروح ہو۔
کسی ریاست، ادارے، افراد کے گروہ یا فرد کی طرف سے کسی شخص کے ساتھ اس کے مذہب اور عقیدے کے باعث کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔
مذہب کی بنیاد پر ہر طرح کے امتیازی سلوک اور عدم برداشت کے خاتمے کے لیے اقوام متحدہ کا اعلامیہ
[آرٹیکل: 1 (2) اور 2 (1)]

مذہبی اقلیتوں کی ہراسیمگی اور اُن کے خلاف تشدد اور اِس کے انسداد کے لیے کوششوں کی عدم موجودگی سے 2012 میں پاکستان میں مذہبی عقائد کی آزادی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ سال کے دوران اس امر کے شواہد دیکھنے کو نہیں ملے کہ پاکستان نے سرایت شدہ عدم رواداری سے نجات پانے کے حوالے سے کوئی پیش

رفت کی ہے جس نے مذہبی عقائد کی آزادی کو شدید نقصان پہنچایا ہے اور جو مذہبی و مسلکی اقلیتوں کی ہراسیمگی اور اُن کے خلاف تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات کی شکل میں ظاہر ہو رہی ہے۔ اگرچہ زیادہ سنگین نوعیت کے امتیازی سلوک کا نشانہ ہندو، مسیحی اور احمدی کمیونٹی کو بنایا گیا ہے مگر تشدد کے باعث زیادہ اموات شیعہ مسلک کے افراد کی ہوئی ہیں۔ شیعہ، ہزارہ برادری کی منصوبہ بند ہلاکتوں اور کراچی میں متواتر نشانہ زد حملوں کو مذہبی علما، مصنفین، دانشوروں اور میڈیا کی جانب سے مناسب توجہ حاصل نہیں ہوئی۔

تشدد اور ہراسیمگی کے علاوہ مذہبی اقلیتوں کو خانگی قوانین میں عدم ترمیم اور مجالس قانون ساز میں غیر مؤثر نمائندگی کے باعث اپنے حقوق کے تحفظ کے حوالے سے بھی مشکلات درپیش تھیں۔ قومی اسمبلی میں اقلیتوں کی مخصوص نشستوں میں اضافے کا بل زیرالتوا چھوڑ دیا گیا اور قانونی مدت پوری ہونے کے بعد وہ غیر مؤثر ہو گیا۔ مذکورہ کمیونٹیوں کے کئی رہنماؤں نے پارلیمان میں اپنی کم نمائندگی پر عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ اگرچہ سیاسی اور مذہبی رہنماؤں نے مذہبی اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ بارے بیشتر عہد و پیمان کیے مگر عقیدے کی بنیاد پر تشدد اور عدم رواداری کا مظاہرہ کرنے والوں کو سزا سے استثنیٰ کا سلسلہ جاری رہا۔ عدم تحفظ کے بڑھتے ہوئے احساس کے باعث بعض مذہبی اقلیتوں کی طرف سے پُرامن سکونت کی تلاش میں پاکستان چھوڑنے کی اطلاعات بھی منظرِ عام پر آئیں۔ آئین سمیت قوانین میں امتیازی دفعات بدستور موجود رہیں۔ حکومت نے 2012 میں تضحیک مذہب قانون میں ترمیم کے موضوع پر سرے سے گفتگو ہی نہیں کی۔ مذہبی اقلیتوں کو اُن مذہبی پاسبانوں سے بچانے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی گئی جن کی مذہبی حساسیت نے قانون کے حرکت میں آنے کا انتظار نہیں کیا اور نہ ہی توہین رسالت یا قرآن کو جلانے جیسے الزامات کی سچائی معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک مسیحی بچی پر تضحیک مذہب کا الزام عائد ہونے کے بعد تضحیک مذہب قانون ایک مرتبہ پھر زیر بحث بنا رہا۔ بعدازاں الزامات من گھڑت ثابت ہوئے مگر اُس سے قبل بچی کے اہل خانہ اور متعلقہ علاقے کی مسیحی کمیونٹی کو جنونیوں کے خوف کے باعث اپنے گھروں سے بے دخل ہونا پڑا۔ منافرت کے پھیلاؤ کا سلسلہ بلاروک ٹوک جاری رہا جس کا سب سے زیادہ نشانہ احمدی تھے۔ مرکزی شہروں کی دیواروں اور سرکاری و نجی بسوں میں آویزاں ایسے بیشتر پوسٹرز اور سٹیکرز نظر آئے جن میں مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ کم از کم احمدیوں کا سماجی بائیکاٹ ضرور کریں۔ مذہبی اقلیتوں کی عبادت گاہوں اور قبرستانوں کی مسماری اور بے حُرمتی معمول کا کام تھا۔ گزشتہ برسوں کی طرح قبضہ گیروں کی جانب سے مذہبی اقلیتوں کے قبرستانوں پر قبضہ کی متعدد اطلاعات منظرِ عام پر آئیں۔ جوں ہی کسی انتہا پسند / دہشت گرد کی جانب سے واقعہ کی ذمہ داری قبول کی گئی اُسی لمحے فرقہ وارانہ تشدد یا مذہبی اقلیتوں کے خلاف تشدد کی تحقیقات سرد خانے کی نظر ہو گئی۔ 2012 میں کسی

بھی بڑے دہشت گردانہ حملے میں ملوث مجرموں کو گرفتار نہیں کیا جا سکا۔ 2012 میں پاکستان میں خودکشی کرنے والوں میں اچھی خاصی تعداد مذہبی اقلیتوں کی ہے۔ ایچ آر سی پی کی جانب سے میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق 2012 میں ملک میں رپورٹ کردہ خودکشی کے 1976 واقعات میں کم از کم 80 افراد غیر مسلم تھے۔ اِن میں 59 ہندو اور 21 مسیحی شامل تھے۔ اقدام خودکشی کرنے والے 873 افراد میں 42 غیر مسلم تھے جن میں 34 ہندو اور 8 مسیحی شامل تھے۔

فرقہ وارانہ تشدد

2012 میں پاکستان میں فرقہ وارانہ تشدد میں نمایاں اضافہ ہوا۔ پاکستانی طالبان اور لشکر جھنگوی سمیت کالعدم سُنی جنگجو شیعوں اور اُن کے مذہبی اجتماعات پر حملے کرنے کی ذمہ داری قبول کرتے رہے۔ اگرچہ بلوچستان کی ہزارہ برادری جو لسانی لحاظ سے ایک الگ کمیونٹی ہے، کو گزشتہ ڈیڑھ عشرے سے اپنے عقیدے کے باعث قتل وغارت کا نشانہ بنایا جا رہا ہے تاہم وہ 2013 میں کوئٹہ اور گردونواح کے دیگر شیعوں کی نسبت زیادہ حملوں کی زد میں رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہزارہ افراد اپنی نمایاں خصوصیات کے باعث باآسانی پہچانے جاسکتے ہیں۔ 2012 میں کوئٹہ اور اُس کے گردونواح میں تقریباً 119 ہزارہ افراد کو نشانہ بنا کر قتل کیا گیا۔ ایچ آر سی پی کے ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن نے صوبے میں انسانی حقوق کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے 15 مئی سے 19 مئی تک بلوچستان کا دورہ کیا اور ہزارہ برادری کے افراد سے ملاقات کی۔ اُنہیں یقین تھا کہ حکام چاہیں تو ریاست اُنہیں تحفظ فراہم کرنے کی استعداد رکھتی ہے۔ جون میں لشکر جھنگوی کے دہشت گردوں نے ہزارہ طلبا پر مشتمل بلوچستان آئی ٹی یونیورسٹی کی بس پر حملہ کر کے پانچ طلبا کو قتل کر دیا۔ ہزارہ برادری پر تسلسل کے ساتھ حملے ہوتے رہے ہیں جس کے باعث یونیورسٹی میں زیر تعلیم دیگر لسانی شناختوں سے تعلق رکھنے والے طلبا نے خوف کے باعث اُن بسوں پر سوار ہونے سے انکار کر دیا جن پر ہزارہ برادری کے طالب علم سوار ہوتے تھے۔ اپنے عقیدے کے باعث مظالم کا شکار ہزارہ برادری نے تحفظ کے حصول کی خاطر شہر کے دیگر دو مقامات کی جانب پسپائی اختیار کی۔ مذکورہ دو مقامات کو بھی حالیہ برسوں میں متعدد حملوں کا نشانہ بنایا گیا جن میں درجنوں لوگ ہلاک ہوئے ہیں۔ اگرچہ متاثرہ شیعہ مسلک میں سے زیادہ تر کوئٹہ کی ہزارہ برادری کو نشانہ بنایا گیا ہے مگر اِس میدان میں وہ تنہا نہیں تھے۔ فروری میں چلاس کے مقام پر 18 شیعوں کو ہلاک کر دیا گیا جو راولپنڈی سے گلگت بلگستان جا رہے تھے۔

اپریل میں، چلاس کے ایک قصبہ میں ایک ہجوم نے 9 شیعوں کو بسوں سے اتار کر گولیاں مار کر قتل کر دیا۔

موت کے گھر سے نکلنے کے لیے جان جوکھوں میں ڈالنے پر تیار

اگست میں ضلع مانسہرہ میں گلگت بلتستان جانے والی ایک بس کو نشانہ بنا کر 25 شیعوں کو ہلاک کیا گیا۔ قاتلوں نے مسافروں سے شناختی کارڈ لیے اور تصدیق کرنے کے بعد اُن میں شامل شیعوں کو قتل کر دیا۔ ستمبر میں کرم ایجنسی، پاراچنار مارکیٹ میں ایک کار بم دھماکہ ہوا جس میں 12 شیعہ افراد مارے گئے۔

نومبر میں راولپنڈی میں امام بارگاہ کے نزدیک ایک خودکش بم دھماکہ ہوا جس میں 12 افراد ہلاک اور 38 زخمی ہوئے۔ ایچ آر سی پی کی جانب سے میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق مسلم مسالک کے خلاف فرقہ وارانہ دہشت گردی کے 199 حملوں میں 531 افراد ہلاک ہوئے جن میں سے زیادہ تر شیعہ تھے۔ ان میں سے 78 افراد تین خودکش بم دھماکوں میں ہلاک ہوئے۔ مسلکی عقیدے کی بنیاد پر بہنے والے خون سے پاکستان کا کوئی حصہ بھی نہیں بچ سکا۔ کراچی (سندھ) میں ہونے والے 95 حملوں میں تقریباً 159 افراد مارے گئے جن میں سے زیادہ تر پیشہ ور ماہرین تھے۔ کوئٹہ میں 51 حملوں میں 130 افراد، مستونگ (بلوچستان) میں 5 حملوں میں 31 افراد؛ رحیم یار خان میں ایک حملے میں 22 افراد اور راولپنڈی (پنجاب) میں ایک حملے میں 23 افراد؛ ضلع کوہستان (خیبر پختونخوا) میں ایک حملے میں 19 افراد، ضلع مانسہرہ (خیبر پختونخوا) میں ایک حملے میں 19 افراد؛ کرم ایجنسی میں 9 حملوں میں 65 افراد، اورکزئی (فاٹا) میں ایک حملے میں 13 افراد، گلگت میں 18 حملوں میں 10 افراد اور دیامیر (گلگت بلتستان) میں ایک حملے میں 9 افراد مارے گئے۔ مذکورہ ہلاکتیں ٹارگٹ کلنگ، ویگنوں اور بسوں پر سوار شیعوں کو اتار کر اُن کے قتل، خودکش بم دھماکوں اور بم و گرینیڈ دھماکوں کے واقعات میں ہوئیں۔ حملہ آوروں نے مساجد، امام بارگاہوں، مدارس، مدارس کے طلبا و طالبات، مذہبی اجتماعات کو اور بسا اوقات کسی مخصوص مسلک سے تعلق رکھنے والی شخصیات کو نشانہ بنایا۔

ایک غیر سرکاری ادارے (این جی او) 'پاک انسٹی ٹیوٹ برائے مطالعہ امن' نے کشیدگی کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کی جس کے مطابق فرقہ وارانہ حملوں اور تصادموں کے 213 واقعات میں 563 افراد ہلاک اور 853 افراد زخمی ہوئے۔ تحقیق کے مطابق فرقہ وارانہ تشدد کے رپورٹ کردہ واقعات میں سے 85 فیصد کراچی، کوئٹہ، گلگت اور کرم ایجنسی میں پیش آئے ہیں۔

ایچ آر سی پی پورا سال فرقہ وارانہ قتل و غارت کے واقعات پر شدید تشویش کا اظہار کرتا ہے۔ کمیشن نے بار ہا کہا ہے کہ مسلکی دہشت گردی پر قابو پانے میں ناکامی کی بنیادی وجہ تمام ریاستی اداروں میں مذہبی انتہا پسندی کے لیے پائے جانے والے ہمدردانہ جذبات ہیں۔ کمیشن کے مطابق مذہبی تقاریب کو نشانہ بنانے کے بعد پولیس کے اقدامات فرقہ وارانہ قتل و غارت کو روکنے میں ناکام رہے ہیں کیونکہ مرض کے اسباب کی بجائے صرف اُس کی علامات پر توجہ دی گئی تھی۔

احمدی

احمدی افراد کے خلاف نفرت کے پھیلاؤ اور تشدد کی مہم سازی 2012 میں ملک بھر میں بلا روک ٹوک جاری رہی۔ زیرِ نظر سال کے دوران تقریباً 20 احمدیوں کو اُن کی مذہبی شناخت یا عقیدے کے باعث مار دیا گیا۔ قاتلوں کے حملوں کا سب سے بڑا مظاہرہ کراچی میں دیکھنے کو ملا جہاں 2012 میں 10 احمدیوں کو ہلاک کیا گیا، اُن میں سے چار کو ستمبر میں 10 دنوں کے دورانیے میں اور چار کو اکتوبر میں قتل کیا گیا۔

اکتوبر میں شہر میں ہونے والے حملے میں زخمی ہونے والا چوتھا احمدی نومبر میں ہلاک ہو گیا۔ دو احمدیوں کو سندھ کے علاقے نواب شاہ جبکہ دیگر دو کو بلوچستان کے شہر کوئٹہ میں ہلاک کیا گیا۔ دیگر چھ احمدیوں کو پنجاب کے اضلاع لیہ، سرگودھا، چنیوٹ اور سیالکوٹ، خیبر پختونخوا کے ضلع بنوں اور بلوچستان کے ضلع ہرنائی میں قتل کیا گیا۔ اس کے علاوہ 11 احمدیوں کو نشانہ زد حملوں میں زخمی کیا گیا۔ متعدد واقعات میں پولیس نے احمدیوں کی عبادت گاہوں سے کلمہ کی عبادت (اسلامی عقیدہ) کو ہٹا دیا یا پھر عبادت گاہوں کے میناروں کو گرا دیا۔ اِس قسم کے واقعات جولائی میں کھاریاں، مئی میں لاہور کے علاقوں گڑھی شاہو، سلطان پورہ اور مغل پورہ جبکہ ستمبر میں خوشاب میں پیش آئے۔ لاہور اور سرگودھا میں رہائش پذیر احمدیوں نے یہ شکایت بھی کی کہ پولیس نے اُنہیں عید الاضحیٰ پر جانوروں کی قربانی کرنے سے روکا ہے۔ متعدد مقامات سے احمدی طلبا کو ہراساں کرنے کے بیشتر واقعات پیش آئے۔ احمدیوں کو نشانہ بنانے کا عمل زندہ احمدی افراد تک محدود نہیں تھا۔ احمدیوں کے بیشتر قبرستانوں پر حملہ کیا گیا۔ بشمول لاہور کا وقوعہ جہاں درجن بھر مسلح افراد نے دسمبر میں ماڈل ٹاؤن میں احمدی

احمدیوں کے خلاف تشدد کا ایک مقبول عام مطالبہ

قبرستان میں قبروں پر نصب کُتبے تباہ کر دیے۔ اگست میں پولیس نے حافظ آباد میں ایک احمدی قبرستان میں خطبوں پر آویزاں قرآنی آیات اور مذہبی تعلیمات کو ہٹایا۔ مذکورہ ضلع میں ہی اکتوبر میں نامعلوم افراد نے ایک احمدی قبرستان میں قبروں پر آویزاں اسلامی تعلیمات کو مٹادیا۔ احمدیوں نے شکایت کی کہ اگرچہ حکام نے پاکستان میں احمدی کمیونٹی کے مرکز ربوہ میں اُن کی کانفرنس، ریلیوں اور دیگر اجتماعات پر پابندی عائد کردی مگر ربوہ اور اُس کے گردونواح میں احمدی مخالف مذہبی رہنماؤں کو نفرت انگیز ریلیاں منعقد کرنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔

عام انتخابات کا وقت قریب آ رہا ہے اور احمدی ملک میں واحد کمیونٹی ہے جو جداگانہ انتخابی فہرست میں شامل کی گئی ہے جبکہ دیگر تمام رجسٹرڈ ووٹوں کا اندراج مشترکہ فہرست میں کیا گیا ہے۔

مسیحی

پاکستان کی مذہبی اقلیتی کمیونٹیوں کو درپیش مسائل کے علاوہ پاکستان کے مسیحیوں کو مذہبی آزادی میں درپیش مشکلات کا اندازہ سال کے دوران اُن کی عبادت گاہوں پر ہونے والے متعدد حملوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ کراچی میں گرجا گھروں پر حملہ کیا گیا جن میں سے 2 کو اکتوبر میں 10 دنوں کے مختصر عرصہ میں نشانہ بنایا گیا۔ اطلاعات کے مطابق مذکورہ حملوں میں پہلے حملے میں بجلی کی بندش کے خلاف احتجاج کرنے والے تقریباً 200 افراد نے مقدس کتب کی بے حرمتی کی اور گرجا گھر میں مقدس مریم کے مجسموں کو نقصان پہنچایا۔ پولیس

نے اقلیتوں کے حق میں تضحیک مذہب قانون کے استعمال کے شاذ و نادر وقوعے میں گرجا گھر کے پادری کی درخواست پر ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 299۔الف (کسی بھی گروہ کے مذہبی عقائد کی تضحیک کر کے اُس کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کا دانستہ اقدام) کے تحت اور لوٹ مار، توڑ پھوڑ اور چوری کے الزامات میں مظاہرین کے خلاف مقدمہ درج کیا۔ تضحیک مذہب کا سب سے معروف اور متنازعہ الزام ضابطہ تعزیرات پاکستان (پی پی سی) کی دفعہ 295-C سے جنم لیتا ہے جس کی سزا موت ہے۔ 295۔الف کے تحت مجرم کو جرمانے یا 10 برس تک قید کی سزا کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ مسیحی برادری کے بعض رہنماؤں نے اِس دلیل پر تضحیک مذہب پر مقدمے کے اندراج کی مخالفت کی کہ چونکہ اُنہوں نے کبھی بھی تضحیک مذہب قانون کی حمایت نہیں کی اور ایک مقدمے میں اس کے استعمال کی حمایت سے اصولاً وہ مستقبل میں اس کے غلط استعمال کے خلاف احتجاج نہیں کر سکیں۔ کراچی میں نشانہ بننے والے تقریباً نصف گرجا گھر کراچی میں بڑی مسیحی آبادی پر مشتمل علاقوں میں شمار ہونے والے علاقے عیسیٰ نگری میں قائم ہیں۔ مئی میں اقلیتی رکن پارلیمان سلیم کھوکھر کے گھر کے بالمقابل عیسیٰ نگری میں قائم چرچ سینٹ لُوقا پر حملہ کیا گیا۔

اکتوبر میں کراچی میں دو گرجا گھروں پر حملوں کے بعد رکن پارلیمان نے کہا کہ گرجا گھروں کو اس لیے نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ لوگ آزادی کے ساتھ عبادت نہ کر سکیں۔ اُنہوں نے کہا ''ہم سب پاکستانی ہیں اور ہماری عبادت گاہوں کو تحفظ فراہم ہونا چاہیے۔ مسیحی کمیونٹی کے رہنماؤں نے متعدد بار دیگر شہریوں کی توجہ رواداری، محبت، بھائی چارے اور دیگر مذاہب اور کمیونٹیوں کے لوگوں اور اقلیتوں کے لیے احترام بارے اسلام کے پیغام کی طرف دلائی۔ وفاقی دارالحکومت میں قائم آور لیڈی آف فاطمہ چرچ، کو دھمکی آمیز خط ملنے کے بعد پولیس نے کرسمس کے موقع پر اسلام آباد میں گرجا گھروں کی سکیورٹی میں اضافہ کر دیا۔ گرجا گھر کو 14 نومبر کو ایک خط موصول ہوا جس میں گرجا گھر کی انتظامیہ کو تعلیم نسواں کی حامی ملالہ یوسف کے لیے چرچ میں دعائیہ تقریب منعقد کرنے پر حملے کی دھمکی دی گئی جسے قبل ازیں طالبان نے سوات میں گولیاں مار کر زخمی کر دیا تھا۔ پاکستان میں مسیحی کمیونٹی کو انتہا پسندوں کے غم وغصہ کا اس لیے بھی سامنا ہے کہ مؤخر الذکر میں مغرب، بالخصوص امریکہ کے خلاف نفرت بھرے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس طرح کا ایک واقعہ 21 ستمبر کو پیش آیا جب حکومت نے سرکاری چھٹی اور 'یوم محبت رسولؐ' منانے کا اعلان کیا اور عوام سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلم اُمہ میں احتجاجی مظاہروں کا سبب بننے والی امریکی ڈائریکٹر کی جانب سے بنائی گئی اسلام مخالف فلم کے خلاف پُرامن احتجاج کریں۔ فلم کے خلاف احتجاج کرنے والے ایک ہجوم نے خیبر پختونخوا کے ضلع مردان میں سینٹ پال لُوتھر چرچ، ایک ہائی سکول، لائبریری، کمپیوٹر لیبارٹری اور پادریوں کے گھروں کو آگ لگا دی۔ سندھ کے

مسیحی کمیونٹی کو بسا اوقات احتجاج کی راہ اختیار کرنا پڑی

علاقے حیدرآباد میں ایک گرجا گھر پر حملہ کیا گیا جس دوران ایک نوجوان زخمی ہوگیا۔ تاہم گرجا گھروں پر حملے اُن مشکلات کے صرف ایک پہلو کی عکاسی کرتے ہیں جو پاکستان کی مسیحی کمیونٹی کو اُن کو عقیدے کے باعث درپیش ہیں۔ اُنہیں وسیع پیمانے پر امتیازی سلوک کا سامنا بھی ہے۔ ستمبر کے دوران ایک وقوعے میں پنجاب کے علاقے نارنگ منڈی میں حیوانیات ڈسپنسری کی عمارت جو کہ پولیس چوکی کے ساتھ ملحق ہے میں دو پولیس اہلکاروں نے اس وجہ سے ایک مسیحی مزدور کو پیٹا کہ اُس نے پولیس اہلکاروں کے زیر استعمال گلاس سے پانی پیا تھا۔ ریجنل پولیس افسر کو اپنی شکایات درج کراتے ہوئے متاثرہ فرد نثار مسیح نے بتایا کہ ''پولیس اہلکاروں نے اُسے آفس کُولر سے پانی پیتے دیکھا تو اُس نے اُس کا مذہب دریافت کیا۔ جب اُس نے بتایا کہ وہ مسیحی ہے تو اُنہوں نے کہا کہ اُسے مسلمانوں کا گلاس استعمال کرنے کی ہمت کیسے پیدا ہوئی۔ تب پولیس اہلکاروں نے نثار کو بیٹھ جانے کا کہا۔ جب وہ کرسی پر بیٹھا تو اُس کی سرزنش کی گئی اور اُسے فوری طور پر زمین پر بیٹھنے کے لیے کہا گیا''۔ اطلاعات کے مطابق بعدازاں پولیس اہلکاروں نے اُسے پیٹا اور بُرا بھلا کہا۔ ایک ملزم پولیس اہلکار کے اخباری بیان کے مطابق جب اُسے نثار کے عقیدے بارے علم نہیں تھا تو اُسے اُس کی جانب سے اُس کا گلاس استعمال کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ تاہم جب اُسے نثار کے عقیدے کا علم ہوا تو اُس نے اُسے کہا کہ مسیحی مسلمانوں کے زیر استعمال برتنوں کو استعمال نہیں کرسکتے البتہ اُس نے نثار کو بُرا بھلا کہنے یا پیٹنے سے انکار کیا۔ دسمبر میں پنجاب کے علاقے ننکانہ صاحب میں قرآن پاک کو جلانے کے الزام میں گرفتار 22 سالہ مسیحی لڑکا ندیم پولیس کی تحویل میں ہلاک ہوگیا۔ اُسے مقدمے کے اندراج کے بغیر حراست میں لیا گیا تھا اور پولیس

کے مطابق وہ تحفظاتی تحویل میں تھا جہاں وہ شدید بیمار ہوا اور بعدازاں ہلاک ہو گیا۔ پولیس کے مطابق ندیم کے باپ نے اُنہیں بتایا کہ اُس کا بیٹا ذہنی مریض ہے۔ پولیس افسران نے یہ انکشاف بھی کیا کہ پولیس کی تحویل میں آنے سے قبل ندیم رہائشیوں کی طرف سے تشدد کا شکار بھی ہوا تھا۔ نومبر میں لاہور میں 7 مسیحیوں کو اُس وقت زخمی کر دیا گیا جب اُنہوں نے مسیحی قبرستان پر قبضہ گیروں کے قبضے کی کوشش کی مزاحمت کی تھی۔ پولیس کے مطابق اُنہوں نے مبینہ قبضہ گیروں کو مذکورہ اراضی پر عمارات کی تعمیر سے روکا تھا۔

ہندو

1947ء میں جب پاکستان اور بھارت آزاد ممالک بنے تو لاکھوں ہندوؤں نے بھارت نقل مکانی کرنے کی بجائے پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان میں قیام پذیر ہندوؤں کی نسل نے دونوں ممالک کے مابین 1965 اور 1971 کی جنگوں کے دوران بھی پاکستان نہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ البتہ حالیہ برسوں میں اطلاعات موصول ہو رہی ہیں کہ ہندو عقیدے کی بنیاد پر امتیازی سلوک اور تشدد یا تشدد کے خطرے کے باعث پاکستان سے نقل مکانی کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ملک کے جنوبی حصے سندھ سے بیشتر ہندوؤں کی ملک سے نقل مکانی کی اطلاعات منظر عام پر آئی ہیں۔ علاوہ ازیں بلوچستان سے بھی جہاں صدیوں سے ہندو پُرامن زندگی گزار رہے تھے۔ بالائی سندھ کے سماجی، سیاسی، معاشی اور مذہبی ڈھانچے میں ہندوؤں کی شمولیت اُن کی بے دخلی کی راہ میں حائل رکاوٹ تھی جس میں اب تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ بالائی سندھ بھر میں ہندو فوجی آمر ضیاالحق کے دورِ حکومت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس دوران اُن کے مطابق پاکستان میں ہندو کمیونٹی کے استحصال کے جدید دور کا آغاز ہوا ہے۔ عدم رواداری کے علاوہ ہندووں کو ہر بار انتہا پسندوں کی جانب سے اشتعال انگیز کارروائیوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے جب یہ تصور کیا جاتا ہے کہ بھارت میں آباد مسلمانوں کو اُن کے عقیدے کے باعث نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ 2010 میں جب بھارتی ہائی کورٹ بابری مسجد جسے 1990 کی دہائی کے اوائل میں ہندو انتہا پسندوں نے منہدم کیا تھا، کی زمین کی ملکیت بارے فیصلہ کرنے والی تھی، سندھ کے ہندوؤں نے اپنے بچوں کو اور خواتین کو مسلم انتہا پسندوں کے حملوں کے خوف سے ہندو اکثریتی علاقوں میں بھیج دیا تھا۔ سندھ میں ہندوؤں کی بنیادی شکایت خوف و ہراس اور اُن کی نوجوان خواتین کی جبراً تبدیلی مذہب ہے جبکہ بلوچستان میں اُنہیں درپیش بنیادی مسئلہ اغوا برائے تاوان ہے۔ 15 مئی سے 19 مئی تک بلوچستان میں ایچ آر سی پی کے فیکٹ فائنڈنگ مشن نے کوئٹہ میں بلوچستان کے 17 اضلاع سے تعلق رکھنے والے اپنے سرگرم کور گروپ کو آرڈی نیٹرز سے ملاقات کی تاکہ متعلقہ اضلاع میں انسانی حقوق کی

پاکستانی ہندو نقل مکینوں نے ہندوستان میں پناہ کی درخواست دائر کی

صورت حال معلوم کی جا سکے۔صرف لورالائی سے ایچ آر سی پی کے کارکن نے کہا کہ اُن کے ضلع میں ہندو محفوظ ہیں۔کارکنوں نے بتایا کہ سبی،مستونگ،نوشکی، بولان، قلات،جھل مگسی اور ڈیرہ بگٹی کے اضلاع میں ہندو خود کو غیر محفوظ تصور کرتے ہیں یا پھر وہاں سے نقل مکانی کر گئے ہیں۔ایک معروف ہندو مذہبی رہنما کو قلات سے اغوا کرلیا گیا تھا۔لاقانونیت اور اغوا برائے تاوان کے واقعات کے باعث ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد ڈیرہ بگٹی اور خضدار کے اضلاع سے نقل مکانی کرگئی ہے۔بلوچستان کے ہندو مرکزی تاجر کمیونٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور نوشکی سے بیشتر ہندوؤں کی بھارت اور دیگر ممالک میں نقل مکانی سے مقامی سطح پر کاروباری میدان میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے۔اگست میں ایچ آر سی پی نے ان اطلاعات پر تشویش کا اظہار کیا کہ سندھ اور بلوچستان سے ہندو شہری بھارت نقل مکانی کر رہے ہیں اور کہا کہ سول سوسائٹی کے بارہا مطالبوں کے باوجود حکومت مذکورہ کمیونٹیوں کے تحفظات کا ازالہ کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ہے۔ایچ آر سی پی نے کہا کہ اِن اطلاعات سے پیدا ہونے والا غم وغصہ اِس انکشاف سے کچھ حد تک کم ہوا کہ سینکڑوں ہندو زیارت کے لیے بھارت جا رہے ہیں۔اُن میں سے زیادہ تر نے کہا کہ وہ پاکستان واپس لوٹیں گے۔جب کہ کچھ نے کہا وہ واپس نہیں پلٹیں گے۔ایچ آر سی پی نے بلوچستان اور سندھ سے ہندو شہریوں کی بھارت نقل مکانی کی مستقل اطلاعات کا حوالہ دے کر کہا کہ بعض عناصر کے مخصوص مفادات ہندوؤں کو بے دخلی پر مجبور کرنے کے لیے ہراساں کر رہے ہیں۔ان عناصر میں مذہبی انتہا پسند اور دیگر عناصر شامل ہیں جو اقلیتوں کی جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ایچ آر سی پی نے ہندوؤں کی بے دخلی کو انہیں تشدد، امتیازی سلوک اور اُن کی نوجوان عورتوں کی

جبراً مذہب تبدیلی جیسے مظالم سے تحفظ فراہم کرنے میں ریاستی ناکامی کی مثال قرار دیا ہے۔ ستمبر میں، میڈیا اطلاعات کے مطابق بھارتی ریاست راجستھان زیارت کے لیے جانے والے درجنوں پاکستانی ہندوؤں نے اپنے ملک میں مذہبی بنیاد پر مظالم کے باعث پاکستان واپس جانے سے انکار کر دیا۔ ستمبر میں کراچی میں ایک ہندو مندر پر دھاوا بولنے میں مشتبہ مسلمانوں کے ایک گروہ پر تضحیک مذہب کا الزام عائد کیا گیا۔ حملہ 21 ستمبر والے دن کیا گیا تھا جسے حکومت نے امریکہ میں بننے والی فلم کے خلاف پُرامن احتجاجی مظاہروں کو یقینی بنانے کے لیے 'یوم محبت رسولؐ' قرار دیا تھا۔

ایک مذہبی رہنما کی قیادت میں درجنوں مسلمان کراچی کے گرد و نواح میں آباد ہندو گوٹھ کے نام سے معروف ایک علاقے کے ارد گرد جمع ہوئے۔ مظاہرین نے سری کرشنا رام مندر پر حملہ کیا، مذہبی مجسموں کو توڑا، ایک ہندو مذہبی کتاب پھاڑ دی اور مندر کے منتظم کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ پی پی سی کی دفعہ 295۔الف کے تحت مقدمہ درج کیا گیا مگر کسی ملزم کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ دسمبر میں ایک تعمیراتی ٹھیکیدار نے پولیس کی ہمراہی میں کراچی میں ایک ہندو مندر اور بعض نزدیکی گھروں کو مسمار کر دیا۔ تعمیراتی ٹھیکیدار اور مقامی رہائشیوں کے مابین متنازعہ زمین کا عرصہ دراز سے تنازعہ چلا آ رہا تھا اور اطلاعات کے مطابق حسب سابق حالت کی برقراری کا فیصلہ کیا گیا۔ مقامی رہائشیوں نے کراچی پریس کلب کے باہر احتجاجی مظاہرہ کیا اور مذہبی اشیا کی واپسی کا مطالبہ کیا جو اُن کے مطابق مندر کی مسماری سے قبل حکام نے مندر سے ہتھیا لی تھی۔ اکتوبر میں قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق نے سفارش کی کہ سندھ حکومت مذہبی اقلیتوں کی عبادت گاہ پر حملہ کرنے والوں کے خلاف انسداد دہشت گردی کے قانون کے تحت مقدمہ درج کرے۔ کمیٹی نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ پولیس اسٹیشنوں میں نصب کیمروں کو عبادت گاہوں پر بھی نصب کیا جائے تاکہ حملہ آوروں کا سراغ لگانا ممکن ہو۔

جنوری میں 'قومی کمیشن برائے مقام نسواں (این سی ایس ڈبلیو) نے وزارت انسانی حقوق کو چار بلّوں کا مسودہ پیش کیا۔ اِن میں سے تین...... ہندو ازدواج قانون 2011، مسیحی ازدواج ترمیمی قانون 2011، مسیحی طلاق ترمیمی قانون 2011، پاکستان میں مذہبی اقلیتوں سے متعلقہ تھے۔ اس سے قبل این سی ایس ڈبلیو نے ہندوؤں اور مسیحیوں کے خانگی قوانین پر بحث کے لیے ایک مذاکرے کا اہتمام کیا تھا جس کے نتیجے میں ہندو کمیونٹی کے لیے بل کا ایک مسودہ تیار کیا گیا تھا۔ ازدواج اور طلاق سے متعلقہ مسیحیوں کے خانگی قانون کو مزید مؤثر بنانے کے لیے ترامیم تجویز کی گئیں۔ یہ توقع کی گئی کہ قانون کے نفاذ سے ہندوؤں کو اپنی ازدواجی حیثیت ثابت کرنے کے لیے قانونی دستاویزات تک رسائی کا موقع ملے گا۔ تاہم مذکورہ بل کا مسودہ قانون کی شکل اختیار نہ کر سکا۔

مذہب کی جبری تبدیلی

پاکستان بالخصوص سندھ کی ہندو کمیونٹی کئی برسوں سے شکایت کر رہی ہے کہ اُن کی نوجوان لڑکیوں سے زبردستی اسلام قبول کروایا جا رہا ہے۔ جبری تبدیلی مذہب کا معاملہ 2012 کے اوائل میں بہت زیادہ اجاگر ہوا۔ جب اطلاعات کے مطابق ایک 19 سالہ ہندو لڑکی رنکل کو میر پور ماتھیلو سے اغوا کیا گیا تھا۔ رنکل کے والد نے کہا کہ اُس کی بیٹی کے اغوا کا مقدمہ درج کروانے کے لیے اُسے بہت زیادہ تگ و دو کرنا پڑی۔ مقدمے کے اندراج کے بعد اُسے عدالتی احاطے میں خوف و ہراس کا سامنا کرنا پڑا۔ عدالتی احاطے کو مسلح مذہبی کارکنوں نے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ اغوا ہونے والی چار ہندو لڑکیوں رنکل کماری، ڈاکٹر لتا کماری، آشا موہن داس اور بھارتی نیرن داس کے اہل خانہ بھی پریس کانفرنس کے وقت موجود تھے۔ اُنہوں نے اذیت کا ذکر کیا جو اُنہیں اپنی بیٹیوں کے اغوا کے بعد جھیلنا پڑی تھی۔ اُنہوں نے کہا کہ لڑکیوں کو اغوا کیا گیا، اُنہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا اور مسلمانوں سے بیاہ دیا گیا۔ اُنہوں نے شکایت کی کہ پولیس اور ماتحت عدلیہ کی جانب سے اُنہیں کسی قسم کی مدد نہیں ملی۔ اُن کے مطابق ملزمان مسلح تھے اور اُنہیں بااثر مذہبی شخصیات کی پشت پناہی

ٹی وی پر تشہیر

جولائی میں ایک ٹیلی ویژن پروگرام میں ہندو لڑکے کی اسلام قبول کرنے کے وقوعے کی براہ راست نشریات نے اس تنقید کو جنم دیا کہ ملک کا الیکٹرانک میڈیا اخلاقی اقدار کو یا اپنے پروگراموں کی جائز حیثیت کا خیال رکھے بغیر چیزوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے میں کسی حد تک بھی جا سکتا ہے۔ ٹی وی پروگرام میں دکھایا گیا کہ ایک مذہبی رہنما کی قیادت میں ایک ہندو لڑکا اسلام قبول کر رہا ہے جبکہ سامعین اُس کے لیے اسلامی نام تجویز کر رہے ہیں۔ اتفاق رائے سے اُس کا دوسرا نام محمد عبداللہ رکھا گیا۔ اگرچہ اس امر کے شواہد موجود نہیں ہے کہ لڑکے نے اپنی مرضی کے خلاف اسلام قبول کیا ہے مگر ایک اخبار کے اداریے نے ذاتی و روحانی معاملات کو عوامی معاملات میں گھسیٹنے پر شدید تنقید کا نشانہ بنایا جبکہ کئی افراد نے اِس تنبیہہ کا اظہار کیا کہ اس طرح کے واقعات سے مذہب عوامی تفریح کا ذریعہ بن جائے گا۔ سول سوسائٹی کا بھی کہنا تھا کہ چینل نے یہ نہیں سوچا کہ پروگرام کی نشریات سے پاکستان کی مذہبی اقلیتوں کو کیا پیغام ملے گا اور اگر تبدیلی مذہب اسلام سے کسی دوسرے مذہب میں ہو تو مسلم آبادی کیا محسوس کرے گی۔ مذہب کی تبدیلی کے مذکورہ واقعے پر لوگوں کی جانب سے خوشی کا اظہار اور نتیجتاً ملنے والی مبارکبادیں اس امر کی واضح نشاندہی کرتی ہیں کہ پاکستان میں دیگر مذاہب کو اسلام جیسا رتبہ حاصل نہیں ہے۔ ایک اخبار کے اداریے میں کہا گیا کہ ''جس ملک میں اقلیتیں پہلے ہی دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت سے رہ رہی ہیں وہاں اس واقعے نے انہیں مزید مایوسی کی جانب دھکیلا ہے۔

اغوا، جبری تبدیلی مذہب اور جبری شادی کی روک تھام کا مطالبہ

حاصل تھی۔ ایچ آر سی پی کے کارکنوں نے کہا کہ کسی آدمی کا اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لینا قابلِ اعتراض نہیں مگر ایسے شخص کو اپنے خاندان کے ساتھ ملاقات کرنے کی آزادی ہونی چاہیے اور لڑکیاں اپنے اہلِ خانہ سے ملاقات نہیں کر سکتیں تو اس امر کو تقویت ملتی ہے کہ اُنہوں نے اپنی مرضی سے یہ اقدام نہیں کیا۔ بعدازاں پاکستان ہندو کونسل نے تین ہندو خواتین کی بازیابی کے لیے پٹیشن دائر کی۔ رنکل کے علاوہ دیگر دو خواتین جیکب آباد سے ڈاکٹر لتا کماری اور لاڑکانہ سے آشا موہن داس تھیں۔ اُن کے رشتہ داروں کا کہنا تھا کہ نوجوان خواتین کو اغوا کیا گیا، جبراً مذہب تبدیل کیا گیا اور اُن کی مرضی کے خلاف مسلمان مردوں سے اُن کا نکاح کیا گیا۔

12 مارچ کو رنکل کماری نے ایک پریس کانفرنس کے دوران کہا کہ اُس نے کسی قسم کے دباؤ کے بغیر اسلام قبول کیا ہے تاہم صحافیوں نے بتایا کہ جب لڑکی سے سوالات کیے جا رہے تھے تو دو باریش افراد اُسے تحریری نوٹس دیتے رہے۔ اُس کے بعد پریس کانفرنس اچانک ختم ہو گئی۔ جب باریش والے افراد نے لڑکی کو بازو سے پکڑا اور اُٹھ کر چلے گئے۔

26 مارچ کو سپریم کورٹ نے حکم دیا کہ رنکل کماری (جس کا نیا نام فریال شاہ رکھا گیا)، ڈاکٹر لتا کماری (نیا نام حفصہ بی بی) اور عاشا موہن داس (نیا نام حلیمہ بی بی) کو کراچی میں دارالامان میں بھیجا جائے تا کہ وہ کسی دباؤ کے بغیر اپنے مستقبل کا فیصلہ کر سکیں۔ بنچ نے اپنے حکم نامے میں اس امر کا اظہار کیا کہ اگرچہ خواتین نے نکاح کر کے اپنے خاوندوں کا چناؤ کیا ہے مگر یہ الزامات منظرِ عام پر آئے ہیں کہ اُنہوں نے دباؤ کے تحت اسلام قبول کیا ہے۔ 18 اپریل کو خواتین کو سپریم کورٹ میں پیش کیا گیا، کسی لڑکی نے بھی دورانِ سماعت گفتگو نہیں کی۔ بعدازاں اُنہیں رجسٹرار کے دفتر بھیجا گیا جہاں اُنہوں نے اپنا بیان قلمبند کروایا اور اپنے

خاوندوں کے ساتھ رہنے پر آمادگی ظاہر کی۔ عدالت نے کہا کہ مذکورہ عورتوں کو خوف سے آزاد ماحول میں سوچنے کے لیے کافی وقت دیا گیا تھا جہاں کوئی فریق بھی اُن سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ عدالت نے یہ بھی کہا کہ خواتین بالغ ہیں اور اپنی مرضی سے کہیں بھی جا سکتی ہیں۔ سندھ پولیس کو ہر پندھواڑے خواتین کی حالت بارے رپورٹ جمع کروانے کا کہا گیا۔ والدین بضدر ہے کہ نوجوان خواتین زیرِ دباؤ تھیں، اُنہیں دھمکایا گیا تھا اور والدین سے ملنے نہیں دیا گیا اور بالآخر اُنہیں اُن کے اغوا کاروں کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اکتوبر میں قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق نے سندھ میں ہندو لڑکیوں کی جبراً تبدیلی مذہب کے حوالے سے داخلہ ڈیپارٹمنٹ کو ہدایت کی کہ مجموعہ ضابطہ فوجداری میں ترامیم کی جائیں اور خواتین کے لیے محفوظ پناہ گاہیں قائم کی جائیں جہاں مغوی لڑکیوں کو عدالت میں اپنا بیان قلمبند کروانے سے پہلے ایک ماہ تک رہائش پذیر رکھا جائے۔ اپنے عقیدے کے باعث عدم محفوظ کمیونٹیوں کے لیے ایچ آر سی پی کے ماہرین گروپ جس میں ہندو کمیونٹی کے افراد شامل ہیں نے کہا کہ پولیس کو اُسی لمحے ایف آئی آر درج کر لینی چاہیے جب کسی مغوی کا کوئی رشتہ دار اُن سے رجوع کرے۔ اگر کوئی بالغ لڑکی اغوا کے بعد بازیاب ہو کر عدالت میں پیش ہو تو اُسے اپنا بیان قلمبند کروانے سے پہلے کم از کم ایک ماہ تک دارالامان میں رہنا چاہیے۔ تب ہی اُس سے پوچھنا چاہیے کہ وہ اپنے والدین اور مبینہ اغوا کاروں میں سے کس کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ تاہم گروپ کی رائے میں اگر مغویہ کمسن ہو تو اُسے فوری طور پر اُس کے والدین کے پاس بھیج دینا چاہیے۔

سِکھ

زیرِ نظر سال کے دوران پاکستان کی کم آبادی پر مشتمل سکھ آبادی کو بظاہر تشدد اور خوف و ہراس کا سامنا نہیں کرنا پڑا جس کا نشانہ ملک کی دیگر مذہبی اقلیتیں بنی ہیں مگر یہ ریلیف بھی نامکمل تھا۔ نومبر میں نامعلوم جنگجوؤں نے لنڈی کوتل کے گاؤں ٹبی کے رہائشی ایک تاجر مہندر سنگھ کو اُس کی ہربل میڈیسن دکان سے اغواہ کر لیا۔ سیاسی انتظامیہ کو مہندر کی رہائی کے لیے بارہا درخواستیں دی گئیں مگر اِس حوالے سے کوئی اقدام نہ کیا گیا۔ (8 جنوری 2013 کو ایک تھیلے سے مہندر کی مسخ شدہ نعش ملی۔ بیگ سے ایک تحریر ملی جس پر تحریر تھا کہ کالعدم جنگجو گروہ، لشکر اسلام کے لیے جاسوسی کرنے والے دیگر افراد کا بھی یہی حشر ہو گا۔ لشکر اسلام خیبر ایجنسی میں دیگر حریف گروہوں کے ساتھ کشیدگی کی حالت میں ہے) اُس سے قبل مہندر کے بھائی جسونت کو بھی جنگجوؤں نے اغوا کر لیا تھا مگر اُس کے بال مونڈھ کر اُسے رہا کر دیا گیا تھا۔ مارچ میں خیبر پختونخوا کے شہر مردان میں واقع 150 برس قدیم بابا کرم سنگھ گوردوارے کو لینڈ مافیا نے راتوں رات مسمار کر دیا۔ 35 فٹ اونچے گوردوارے کے علاوہ گوردوارے کے کنویں اور دیگر قدیم تعمیرات کو بھی مسمار کر دیا گیا۔ صوبے کی سکھ کمیونٹی

نے گوردوارے کی تعمیرِ نو اور اُن کے مقدس مقامات کے تحفظ کا مطالبہ کیا۔ پشاور کے دو مقامات پر رہائش پذیر سکھوں نے اغوا، چوری اور سکھ تاجروں پر حملوں سے تحفظ کا مطالبہ کیا اور کہا کہ حکام مذکورہ جرائم کا نوٹس نہیں لے رہے۔ پشاور میں 500 سکھ خاندان آباد ہیں جن میں زیادہ تر محلّہ جوگن شاہ میں ہیں۔ 200 برس قدیم گوردوارا بھی ہے۔ بعض سکھ گھرانے قائد آباد، پشاور میں بھی رہائش پذیر ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر خاندانوں نے سکیورٹی فورسز اور جنگجوؤں کی کارروائیوں کے باعث وادی تیراہ، خیبر ایجنسی اور کرم ایجنسی سے کشیدگی کے باعث نقل مکانی کی تھی۔ پاکستان اور بیرون ممالک کے سکھ زائرین نے ننکانہ صاحب، پنجاب میں واقع گوردوارہ، جنم آستھان پر دوران عرس حکومتی انتظامات پر اطمینان کا اظہار کیا۔ ننکانہ صاحب، سکھوں کے پہلے گُرو، گُرو نانک دیو کی جائے پیدائش ہے اور سکھ مت میں سب سے مقدس مقام ہے۔ وزیرِ داخلہ نے بھارتی وکلا کے ایک وفد سے ملاقات کے دوران کہا کہ پاکستان ننکانہ صاحب کو 'مقدس شہر' کا درجہ دے رہا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ فیصلہ بھارتی سکھوں اور دنیا کے دیگر مقامات پر آباد سکھوں کے لیے ایک خوش آئند اقدام ہے۔ موصوف وزیر نے یہ بھی کہا کہ پاکستان آنے والے بھارتی اپنے ویزے کی نوعیت سے قطع نظر ننکانہ صاحب کا دورہ کر سکتے ہیں۔ پاکستان آنے والے بھارتی شہری اور بھارت جانے والے پاکستانی عموماً صرف اُن شہروں کا دورہ کر سکتے ہیں جن کا ذکر اُن کے ویزوں میں ہوتا ہے۔

تضحیک مذہب قانون

ضابطہ تعزیرات پاکستان (پی پی سی) کی دفعات 295 سے 295 (ج) تک کو عموماً تضحیک مذہب کوڈ کہا جاتا ہے۔ اِن دفعات کے تحت سزاؤں میں سزائے موت (295 (ج) کے تحت)، عمر قید، مختلف مدت کے لیے قید اور جرمانہ شامل ہیں۔ پاکستان نے کسی کو بھی 295 (ج) کے تحت سزا نہیں دی۔ تاہم کئی ملزمان کو عدالتوں کے باہر یا جیلوں میں انتہا پسندوں کے ہاتھوں قتل کیا جا چکا ہے۔ انسانی حقوق کے کارکنوں کا کہنا ہے کہ قانون غیر ضروری طور پر وسیع اور مبہم ہے اور اس کا استعمال ذاتی تنازعات کو حل کرنے کے لیے اور مذہبی اقلیتوں کو نشانہ بنانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ 2011 میں دو نمایاں سیاستدانوں، گورنر پنجاب سلمان تاثیر اور وفاقی کابینہ میں شامل واحد اقلیتی رُکن شہباز بھٹی کو مذکورہ قانون میں ترمیم کا مطالبہ کرنے کی پاداش میں قتل کر دیا گیا۔ ایک مسیحی خاتون آسیہ بی بی تا حال جیل میں ہے جس کی حمایت گورنر پنجاب سلمان تاثیر کر رہے تھے۔ تضحیک مذہب کا قانون 2012 میں ایک دفعہ پھر زبان زد عام آیا جب اسلام آباد میں ایک کمسن مسیحی بچی پر قرآن کے صفحات جلانے کا جھوٹا الزام عائد کیا گیا۔ اگست میں اسلام آباد کے نواح میں واقع مہر آباد سے

پولیس نے اس وقت ایک مسیحی لڑکی رمشا کو گرفتار کرلیا جب اُس کے ہمسائے نے اُس پر قرآن کے صفحات جلانے کا الزام عائد کیا تھا۔ اطلاعات کے مطابق جب ایک مقامی رہنما خالد چشتی نے مسجد جانے والے افراد کو جلے ہوئے صفحات دکھائے تو مقامی رہائشی مشتعل ہو گئے جس کے بعد اُس نے رمشا کے گھر کا رُخ کرنے والے ہجوم کی قیادت کی۔ اسلام آباد میں رمنا پولیس اسٹیشن پر تعینات ایک پولیس اہلکار نے میڈیا کو بتایا کہ رمشا نے اعتراف جرم کرلیا ہے اور اُس کے خلاف پی پی سی کی دفعہ 295 (ب) (قرآن پاک کی دیدہ دانستہ بے حرمتی) کے تحت مقدمہ درج کیا گیا ہے۔ ایک ایسا جرم جس کی سزا عمر قید ہے۔ انسانی حقوق کے کارکنوں نے رمشا کے خلاف بالغ افراد کے لیے متعین فوجداری نظام انصاف کے تحت کارروائی کرنے کے فیصلے کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ بعدازاں اُس کا مقدمہ بچوں کی عدالت میں منتقل کر دیا گیا۔ رمشا کا مقدمہ برخواست ہونے کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ چار گواہوں میں سے ایک کا ضمیر بیدار ہو گیا تھا۔ ستمبر میں اُس وقت رمشا کی قسمت بدلی جب چند افراد نے یہ الزام عائد کیا کہ مقامی مذہبی رہنما نے بچی کو پھنسوانے کے لیے شہادت میں گڑبڑ کی ہے۔ مذہبی پیشوا خالد چشتی کے نائبین نے الزام عائد کیا کہ چشتی نے قرآن سے کچھ صفحات پھاڑ کر پلاسٹک کے تھیلے میں رکھے تھے اور مزید کہا کہ 16 اگست کو رمشا کو اُس کے گھر کے اردگرد نہیں دیکھا گیا تھا۔ پولیس کے مطابق چشتی کا خیال تھا کہ رمشا کو تضحیک مذہب کے جرم میں سزا دلوانے کے لیے محض قرآن کے چند متنوں کا جل جانا کافی نہیں ہے۔ چنانچہ اُس نے رمشا کے خلاف مقدمے کو مضبوط کرنے کے لیے راکھ والے تھیلے میں قرآن کے مزید دو صفحات رکھ دیے۔ لڑکی کے خلاف شہادت خلط ملط کرنے کے الزام میں چشتی کے خلاف مقدمہ درج کرلیا گیا۔ ایک اور ڈرامائی وقوعہ اُس وقت پیش آیا جب امام پیشوا کی درخواست ضمانت کی سماعت کے موقع پر تین گواہ اپنی شہادت سے مکر گئے جو اُنہوں نے قبل ازیں پولیس کو قلمبند کروائی تھی کہ چشتی نے قرآن سے دو صفحات پھاڑ کر اُنہیں راکھ والے ڈبے میں پھینکا تھا۔ تاہم چوتھا گواہ اپنے مؤقف پر قائم رہا۔ مذکورہ گواہ نے بتایا کہ جب اُس نے امام پیشوا سے پوچھا کہ وہ بیگ میں قرآن کے صفحات کو کیوں رکھ رہا ہے تو اُس نے جواب دیا کہ مسیحیوں سے علاقہ خالی کروانے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ مسیحی لڑکی کے مقدمے کی پیروی کرنے والے ایک وکیل نے کہا کہ ستمبر میں جب اُس کی ضمانت ہوئی تو اُس نے کہا کہ جب تک اُس کے تحفظ کا مناسب بندوبست نہیں ہوتا وہ چاہے گا کہ لڑکی جیل سے باہر نہ آئے۔ اُس نے بتایا کہ رمشا کے تحفظ کے لیے بیشتر محافظوں اور ایک مسلح گاڑی کی ضرورت ہے۔ جب پولیس نے کہا کہ اُس کے خلاف کوئی شہادت موجود نہیں تو رمشا کو بری کر دیا گیا اور اُس کے خلاف عائد الزامات کو بے بنیاد قرار دے دیا گیا۔ کمسن لڑکی نے رہائی کے بعد اپنے تحفظات بارے خدشات کا اظہار کیا۔ مغربی ممالک میں واقع سول سوسائٹی کی تین تنظیموں

سول سوسائٹی کی تنظیموں نے رمشا کے دفاع میں ریلیاں نکالیں

نے پاکستان سے باہر اُسے اور اُس کے اہل خانہ کو پناہ دینے کی پیشکش کی تاہم اُس نے جواب دیا کہ وہ اپنا ملک نہیں چھوڑنا چاہتی۔ الزام کے باعث صرف رمشا اور اُس کے اہل خانہ کو ہی اذیت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ رمشا پر تضحیک قرآن کا الزام عائد ہونے کے بعد اگست میں انتہا پسندوں کے خوف سے متعدد مسیحی گھرانے حیدر آباد، اسلام آباد سے نقل مکانی کر گئے۔ اطلاعات کے مطابق چند مقامی مذہبی رہنماؤں نے مسیحیوں کے گھروں کو جلانے کی دھمکی دی۔ دسمبر میں آل پاکستان علما کونسل کے چیئرمین اور معروف مذہبی شخصیت علامہ طاہر اشرفی نے رمشا کو 'قوم کی بیٹی' قرار دیا اور اُس کے تحفظ پر زور دیا۔ اِسے ایک ایسے ملک میں تبدیلی کا پیش خیمہ تصور کیا گیا جہاں اسلام کی توہین کے الزام تلے آنے والے افراد کو کبھی بھی بااثر عوامی شخصیات کی حمایت حاصل نہیں رہی۔ تاہم زیرِ نظر سال میں تضحیک مذہب کے الزام تلے آنے والے دیگر کئی افراد رمشا کی طرح خوش قسمت نہیں تھے۔ جولائی میں ہزاروں لوگوں نے بہاولپور میں پولیس اسٹیشن پر دھاوا بولا اور تضحیک قرآن کے الزام میں زیرِ تحویل شخص کو گھسیٹ کر تھانے سے باہر لے آئے جہاں اُسے تشدد کا نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا اور اُس کی نعش کو آگ لگا دی۔ حملے سے قبل بعض لوگوں نے مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر اعلانات کیے اور لوگوں سے مطالبہ کیا کہ وہ ملزم کو سزا دینے کے لیے تھانے کا رُخ کریں۔ ہجوم نے ملزم کو تھانے سے گھسیٹنے سے قبل متعدد پولیس گاڑیوں کو آگ لگا دی اور سات پولیس افسران کو زخمی کر دیا۔ اُنہوں نے علاقہ پولیس کے سربراہ کے گھر پر بھی حملہ کیا اور فرنیچر اور دیگر املاک کو آگ لگا دی۔

جون میں کراچی میں ایک مشتعل ہجوم نے پولیس اسٹیشن پر حملہ کرنے کی کوشش کی اور تضحیک قرآن کے

اقلیتی کمیونٹیوں کے افراد کے پاس تحفظ کے مطالبے کی کئی وجوہات ہیں

ملزم کو تھانے سے گھسیٹ کر باہر لانے کی کوشش کی۔ ہجوم تھانے کے باہر مجتمع ہوا اور مطالبہ کیا کہ ملزم کو اُس کے حوالے کیا جائے تاکہ وہ اُسے جان سے مار ڈالیں۔ پولیس نے ہوائی فائرنگ کی اور ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے آنسو گیس استعمال کیا۔ پولیس کی مدد کے لیے نیم فوجی دستوں کو بھی بلایا گیا۔

جون میں ہی کوئٹہ میں ایک شخص قتل اور 19 زخمی کر دیے گئے جب ایک ہجوم نے ایک پولیس اسٹیشن پر حملہ کر دیا جن کا مطالبہ تھا کہ تضحیک قرآن کا ملزم اُن کے حوالے کیا جائے۔ پولیس نے ذہنی معذور فرد کو گرفتار کیا جس کے بعد تشدد کی فضا پیدا ہوئی۔ انتظامیہ کے ایک سینئر اہلکار نے بتایا کہ مشتعل مظاہرین جن میں زیادہ تر افغان پناہ گزین تھے نے متعدد گاڑیوں کو آگ لگا دی اور پولیس پر پتھراؤ کیا۔ مظاہرین پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئے اور فائرنگ شروع کر دی جس کے باعث ایک سینئر پولیس افسر کے محافظین زخمی ہو گئے۔

ستمبر میں حیدر آباد میں ایک تاجر پر اُس وقت تضحیک مذہب کا الزام عائد کر دیا گیا جب اُس نے اسلام مخالف فلم کے خلاف احتجاج کرنے سے انکار کیا تھا۔ مذکورہ شخص نے اسلام مخالف فلم کے خلاف احتجاج کے باعث اپنی دکان کی بندش پر اعتراض کیا اور دیگر لوگوں کو بھی احتجاج نہ کرنے کی تلقین کی۔ اطلاعات کے مطابق ایک سینئر پولیس افسر نے ذرائع ابلاغ کو بتایا کہ مذکورہ شخص کے خلاف کسی قسم کی شہادت موجود نہیں تھی مگر ہجوم نے پولیس کو مجبور کیا کہ وہ اُس کے خلاف تضحیک مذہب کا مقدمہ درج کرے۔

اکتوبر میں سوئی ساؤدرن گیس کمپنی کالونی (ایس ایس جی سی) میں ایک 16 سالہ مسیحی لڑکے ریان ستاتن پر دوستوں کو موبائل کے ذریعے تضحیک مذہب پر مبنی پیغامات بھیجنے کا الزام عائد کیا گیا۔ اپنی زندگیوں کو

درپیش خطرات کے باعث لڑکے اور اُس کے اہل خانہ نے کالونی سے نقل مکانی اختیار کر لی۔ بعدازاں ایک مشتعل ہجوم نے اُن کے گھر پر دھاوا بولا اور گھر کے ساز وسامان کو سڑک پر پھینک کر آگ لگا دی۔ لڑکے کے خلاف پی پی سی کی دفعہ 295 (ج) کے تحت مقدمہ درج کر لیا گیا جس نے بتایا کہ مذکورہ پیغام اُسے کسی اور فرد کی جانب سے موصول ہوا تھا جو اُس نے پڑھے بغیر دیگر لوگوں کو ارسال کر دیا۔ میڈیا اطلاعات کے مطابق لڑکے کی ماں جو گیس کمپنی میں بطور سپرنٹنڈنٹ کے ملازمت کرتی تھی، کو برطرف کر دیا گیا اور لڑکے کو گرفتار کر لیا گیا۔

نومبر میں لاہور میں ایک خاتون ٹیچر پر الزام عائد کیا گیا کہ اُس نے اپنے شاگرد کو اس نوعیت کا ہوم ورک دیا ہے کہ جس میں رسول محمدؐ کے خلاف توہین آمیز حوالے شامل ہیں۔ سکول انتظامیہ نے اُس کے اقدامات کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا، اُسے ملازمت سے برطرف کر دیا اور اُسے سزا دینے کا مطالبہ کیا جس کے بعد مذکورہ خاتون روپوش ہونے پر مجبور ہو گئیں۔ سکول انتظامیہ نے دو معروف اخبارات کے پہلے صفحے پر اشتہارات کے ذریعے رسول کی مجوزہ توہین سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر کو تحویل میں لے لیا گیا مگر اُس کے وکیل نے کہا کہ پولیس نے محض مشتعل ہجوم کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے اُسے گرفتار کیا ہے۔ سکول انتظامیہ نے کہا کہ لوگوں کو مشتعل کرنے کے لیے نزدیکی مساجد میں اعلانات کیے گئے تھے۔ نومبر میں ہی خیبر پختونخوا کے ضلع چترال کی ایک عدالت نے توہین رسالت کے ملزم کو موت کی سزا سنائی اور اُس پر ایک لاکھ روپے جرمانہ عائد کیا۔ اطلاعات کے مطابق حضرت علی شاہ نے مارچ 2011 میں قابل اعتراض الفاظ کہے تھے۔

دسمبر میں، سندھ کے علاقے دادو میں ایک ہجوم نے پولیس اسٹیشن پر حملہ کر کے تضحیک قرآن کے ملزم کو تشدد کا نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا اور اُس کی نعش کو جلا ڈالا۔ تقریباً ایک ہزار افراد نے پولیس اسٹیشن پر حملہ کر دیا، پولیس اہلکاروں کو یرغمال بنا لیا اور اُن سے ملزم کو چھین لیا جسے چند گھنٹے قبل گرفتار کیا گیا تھا۔ اُس سے قبل نزدیکی مساجد میں اعلانات کر کے لوگوں کو مقدس کتاب کی تضحیک کے واقعے سے آگاہ کیا گیا تھا۔ پولیس نے سرائیکی زبان بولنے والے مذکورہ فرد کا نام اور شناخت معلوم نہ کی اور اس پر عائد الزام کی حقانیت جاننے کی اُس سے بھی کم کوشش کی اس سے قبل کہ ہجوم نے اُسے لاتوں اور ڈنڈوں کا نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا۔ پولیس نے ہجوم میں شامل بعض افراد کو گرفتار کیا۔ سات پولیس اہلکاروں کو بھی حراست میں لے لیا گیا اور اُن کے خلاف فرض کی ادائیگی سے غفلت برتنے کا مقدمہ درج کر لیا گیا۔

مذکورہ تمام واقعات کے باوجود حکام خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتے رہے۔ 2012 میں حکومت نے عوام میں تضحیک مذہب قانون کے غلط استعمال یا اس میں ترامیم کی ضرورت بارے شعور پھیلانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ قدامت پسند عناصر نے حکام کو خبردار کیا کہ رمشا کے وقوعے کو جواز بنا کر تضحیک مذہب کے قانون میں ترامیم پر غور نہ کیا جائے۔ 2012 میں پاکستان کی یونیورسل سلسلہ وار نظر ثانی کی سماعت کے موقع پر مشیر برائے قومی ہم آہنگی نے بتایا کہ لوگوں میں غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ پی پی پی کی دفعہ 295 (ج) کا غلط استعمال کیا جا رہا ہے۔ اُنہوں نے بتایا کہ اب تک درج ہونے والے مقدمات کی اکثریت مسلمانوں کے خلاف ہے۔ اُنہوں نے مزید کہا کہ خود مختار عدلیہ، آزاد میڈیا اور متحرک سول سوسائٹی لوگوں کو تضحیک مذہب قانون کے غلط استعمال سے تحفظ فراہم کرنے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ 2012 کے اختتام پر فراہم کردہ مجوزہ تحفظاتی بندوبست کارگر نظر نہیں آیا۔ اگر تحفظاتی بندوبست پر مامور افراد خامیوں کی درستگی میں دلچسپی نہیں لیں گے تو یہ 2012 میں بھی مؤثر ثابت نہیں ہوگا۔

سفارشات

1- اس امر کی فوری ضرورت ہے کہ قانونی اور عملی دونوں لحاظ سے پاکستان کی اقلیتوں کے تمام افراد کو یقین دہانی کرائی جائے کہ ریاست اُن کے تمام حقوق کو تحفظ فراہم کرے گی اور اُن کے خلاف تمام زیادتیوں کا پورے عزم کے ساتھ ازالہ کرے گی۔ مذہبی اقلیتوں کے خلاف نفرت انگیز تحریر و تقریر اور تشدد کا انسداد ہونا چاہیے۔

2- پاکستانی معاشرے میں پائی جانے والی عدم رواداری کی بنیادی وجہ 1980 اور 1990 کی دہائی میں تشکیل پانے والی ناقص پالیسیاں ہیں۔ اِس نقصان کا ازالہ مستقل بنیادوں پر اور باضابطہ ہونا چاہیے۔ تدریسی نصاب میں عدم رواداری پر مشتمل مواد ختم ہونا چاہئے اور نوجوانوں میں مقبول و معروف شخصیات کو رواداری کے فروغ پر زور دینا چاہئے۔ اس جدوجہد میں ذرائع ابلاغ اور سول سوسائٹی کو ریاست کا ساتھ دینا چاہیے۔ عقائد کے مابین ہم آہنگی عملی بنیادوں پر ہو اور اُس کا اظہار صرف دیوالی، کرسمس، عیدین، محرم یا ہولی کے مواقع پر لفاظی کے ذریعے نہیں ہونا چاہیے۔

3- مذہبی اقلیتوں کے لیے فوری طور پر ایک خود مختار اور قابل رسائی کمیشن قائم کیا جائے جسے عقیدے کے باعث امتیازی سلوک سے متعلقہ تمام شکایات کی سماعت کرنے کا اختیار حاصل ہو۔

4- پارلیمان میں مذہبی اقلیتوں کی نمائندگی کو براہ راست انتخابات کے ذریعے بڑھانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ اِس حوالے سے مرکزی، سیاسی جماعتوں کا کردار قابلِ تعریف نہیں رہا۔ آئندہ عام انتخابات میں سیاسی جماعتوں کو اپنی یہ خامی دور کرنی چاہیے۔

5- قانون توہینِ مذہب کے غلط استعمال سے شہریوں کی اموات اور ہراسیمگی کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ شہریوں کو مذکورہ قانون کے غلط استعمال کے نتیجے میں ہونے والی تباہی اور اِس کے غلط استعمال کے انسداد کے لیے ضروری بندوبست سے آگاہ کرنے کے لیے جامع منصوبہ بندی کی جائے۔

اظہار رائے کی آزادی

ہر شہری کو تقریر کرنے اور آزادی سے اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ پریس آزاد ہوگا۔ یہ آزادیاں ان معقول پابندیوں کے تابع ہوں گی، جو عظمت اسلام، ملک کی سلمیت یا ملکی دفاع یا غیر ممالک سے دوستانہ تعلقات یا امن عامہ یا اخلاقیات کے تحفظ یا توہین عدالت یا جرم کے ارتکاب کو روکنے، یا اس کی ترغیب کے امکانات کے پیش نظر قانون کے مطابق عائد کی جائیں گی۔ آئین پاکستان [آرٹیکل - 19]

ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور ظاہر کرنے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ ہر شخص آزادی کے ساتھ، بغیر کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہ سکے اور جس ذریعے سے بھی چاہے، ملکی سرحدوں سے بالاتر ہو کر خیالات و معلومات کی جستجو کر سکے، وصول کر سکے، ارسال کر سکے۔ انسانی حقوق کا عالمی اعلان [آرٹیکل - 19]

اظہار رائے کی آزادی سے مراد صرف معلومات کا بہاؤ، تمام سطحوں پر جوابدہی اور شفافیت ہی نہیں بلکہ اس سے مراد معاشرے کی کشادگی بھی ہے۔ یہ ایک جمہوری اور آزاد معاشرے کو جانچنے کا معیار ہے۔ کوئی بھی ملک اس وقت تک جمہوری اور ترقی پسند ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا جب تک وہ لوگوں کو بلا خوف وخطر اپنی رائے کے اظہار کا موقع اور اجازت نہیں دیتا۔ ذرائع ابلاغ کی ساکھ پر اٹھائے جانے والے سوالات کے علاوہ پاکستان میں شعبہ بذات خود بھی خطرناک ثابت ہوا ہے۔ زیر نظر سال کے دوران 14 صحافی اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے قتل ہوئے جس کے باعث پاکستان صحافیوں کے لیے ایشیا کا سب سے خطرناک ملک بن چکا ہے اور صحافیوں کے لیے پوری دنیا کے خطرناک ممالک کی فہرست میں شامل ہے۔ یہ ہلاکتیں برسوں سے جاری رجحان کے تسلسل کی عکاسی کرتی ہیں۔ 2012 میں قتل ہونے والے صحافیوں میں ثاقب خان، رحمت اللہ عابد، مشتاق خان، عبدالحق بلوچ، عبدالقادر حاجی زئی، رزاق گل، مکرم خان عاطف، سید طارق حسین، اسلم رضا، جمشید کھرل، عرفان ملک اور مرتضیٰ رضوی شامل ہیں۔ جہاں تک پاکستان میں اس بنیادی آزادی کے

تمام اطراف سے خطرات میں گھرے صحافی

استعمال کا تعلق ہے، زیرِنظر سال بہت خطرناک ثابت ہوا ہے کیونکہ صحافیوں اور دیگر شہریوں کو اپنی آراء کے اظہار کی پاداش میں نشانہ بنایا گیا۔ قومی سطح کے نیوز میڈیا کے بعض حلقوں پر فراڈ اور بدعنوانی کے الزامات عائد کئے گئے اور معروف ٹی وی اینکرز پر منصوبہ ساز انٹرویو کرنے اور ایک یا دوسرے فریق کی حمایت پر رقم وصول کرنے کا الزام عائد کیا گیا۔ ذرائع ابلاغ کے مواد کے معیار کو مقصدیت اور غیر جانبداری کے فقدان کے باعث تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ سول سوسائٹی اور بذات خود میڈیا سے منسلک متعدد افراد نے خواتین کی غیر مناسب تصویر کشی پر میڈیا کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (پیمرا) نے غیر شائستہ مواد نشر کرنے پر بعض میڈیا چینلز کو متعدد بار تنبیہ کی۔ اس سے بعض اوقات یہ تصور کیا گیا کہ ریگولیٹری اتھارٹی میڈیا کی جانب سے نشر کئے جانے والے مواد کے انتخاب کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

صحافیوں کا تحفظ

کئی سالوں سے پاکستان کا شمار صحافیوں کے لیے خطرناک ترین ملکوں میں ہوتا آ رہا ہے۔ حالیہ سال بھی یہاں صحافیوں کے لیے مشکلات جاری رہیں۔ آزاد میڈیا کے ذرائع ابلاغ کے اشاریہ کے تحت پاکستان کا نمبر لگاتار دوسرے سال سے صحافیوں کے لیے خطرناک اور غیر محفوظ 179 ملکوں کی فہرست میں سے 151 نمبر پر آ رہا ہے۔ صحافیوں کو دن دیہاڑے نشانہ بنا جاتا ہے اور انہیں ہر وقت خطرات کا سامنا رہتا ہے۔ صحافیوں کو لاحق خطرات مجرموں میں سزا سے استثنٰی کی احساس کی عکاسی کرتا ہے۔ بلوچستان اور فاٹا میں صحافیوں کو درپیش خطرات پاکستان میں دیگر مقامات کی نسبت کہیں زیادہ ہیں۔

ستمبر میں عبدالحق بلوچ جو کہ خضدار پریس کلب کے جنرل سیکرٹری تھے 2012 میں بلوچستان میں قتل ہونے والا تیسرا صحافی جبکہ خضدار ضلع میں 2000 سے قتل ہونے والا تیسرا صحافی تھا۔ اکتوبر میں خضدار پریس

کلب کے صدر کے دو بیٹوں کو مار دیا گیا جن میں سے ایک لڑکا موقع پر جاں بحق ہو گیا جبکہ دوسرا ایک دن بعد ہسپتال میں دم توڑ گیا۔ لڑکوں کو اچانک بیہمانہ قتل کے بارے میں یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے والد کا پیشہ ان کے زندگیوں پر اثر انداز ہوا۔ خضدار میں دو پریس کلب کے صدور اور ایک جنرل سیکرٹری پہلے ہی اپنے پیشے کی وجہ سے قتل کر دیئے گئے تھے۔ 2013 میں ہونے والے عام الیکشن کے بارے میں خدشات ہیں کہ یہ پاکستان کی تاریخ کے سب سے پُرخطر الیکشن ہوں گے۔ پاکستان میں صحافیوں کے لیے حالات بہتر ہونے کی بجائے اور زیادہ سنگین ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

جنوری

☆ حیدرآباد پریس کلب کے سابق صدر کی گاڑی اس کے دفتر کے باہر کھڑی تھی جس پر نامعلوم موٹر سائیکل سوار نے حملہ کیا اور آٹھ گولیوں سے گاڑی کو نشانہ بنایا۔ مہیش کمار روزنامہ سندھ میں بھی کام کرتے ہیں۔ یہ دوسری دفعہ تھا جب ان کی گاڑی کو نشانہ بنایا گیا۔

☆ مشہور ٹی وی اینکر اور صحافی نجم سیٹھی نے یہ واضح کیا کہ ان کو ریاستی اور غیر ریاستی عناصر کی طرف سے مسلسل دھمکیاں موصول ہوتی رہی ہیں۔ سیٹھی نے پاکستان واپسی پر دعویٰ کرتے ہوئے کہا کہ ان کو حفاظتی وجوہات کی بناء پر ملک چھوڑ کر تین ماہ تک باہر رہنا پڑا۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ موجودہ جمہوری دور میں بھی خفیہ اداروں کے اہلکاروں نے اپنے ہی شہریوں کو دھمکیاں دیں۔ پنجاب حکومت

7 Journalists killed 2012

Razzaq Gul

Abdul Haq Baloch

Rehmatullah Abid

Saqib Khan

Mukarram Khan Aatif

ان کے لیے 2012 کا سال جان لیوا ثابت ہوا

نے نجم سیٹھی کی رہائش گاہ پر مسلسل سکیورٹی مہیا کی۔

☆ سینئر صحافی مکرم خان عاطف کو طالبان جنگجوؤں نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ مکرم اس وقت خیبر پختونخوا کے ضلع چارسدہ میں نماز ادا کر رہے تھے۔ مکرم خان وائس آف امریکہ پشتو سروس کے ایک رکن بھی تھے اور مہمند ایجنسی پریس کلب کے سابقہ صدر بھی۔ تحریک طالبان پاکستان نے اس حملے کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے کہا کہ مکرم کو اس لیے نشانہ بنایا گیا کیوں کہ وہ غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے سامنے ہمارے خلاف پروپیگنڈہ کر رہا تھا۔

☆ لاہور میں چار نامعلوم افراد جو کہ موٹر سائیکل پر سوار تھے نے ''پاکستان ٹوڈے'' کے بیورو چیف عاطق مسعود بٹ کے گھر پر حملہ کیا۔ گھر کے کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے، پولیس نے مقدمہ درج کر لیا۔

☆ دو صحافی، غلام الدین، سنئیر پروڈیوسر اور محمد عاطف خان، ایسوسی ایٹ پروڈیوسر دونوں سما ٹی وی کے لیے کام کر رہے تھے دونوں کو ان کے اہل خانہ سمیت کو قتل کی دھمکیاں ملیں۔ یہ سب ایک دستاویزی فلم کو چلانے کے ردعمل میں سامنے آیا جس میں مذہبی مدرسوں میں تشدد کے واقعات کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس دستاویزی فلم میں کراچی کے ایک مدرسہ میں بچے کے ساتھ زیادتی اور تشدد کے واقعات کو افشاں کیا گیا تھا۔ دونوں حضرات کو اپنے اہل خانہ کے ہمراہ چھپنا پڑا۔

فروری

☆ ڈیرہ اسماعیل خان میں نامعلوم افراد نے جیو نیوز کے رپورٹر سعید اللہ مروت کے گھر ہینڈ گرنیڈ پھینکا۔ خوش قسمتی سے گرنیڈ پھٹ نہیں سکا۔ سعید اللہ کو رپورٹنگ کرنے کی وجہ سے دھمکیاں مل رہی تھیں۔

☆ سینیئر ٹی وی اینکر عاصمہ شیرازی کو بھی کالعدم تنظیموں سے خطرناک دھمکیاں موصول ہوئیں۔ یہ سب عاصمہ شیرازی کے ایک پروگرام کی میزبانی کے بعد ہوا جس میں انہوں نے لوگوں کی روزمرہ زندگی میں کالعدم گروہوں کی بلا روک ٹوک مداخلت کو بحث کا حصہ بنایا۔ مذہبی جماعتوں نے اس کے خلاف آن لائن مہم شروع کی اور اس کے موبائل فون پر دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ انہوں نے یہ تقاضا کیا کہ وہ ایک پروگرام نشر کرے جس میں کالعدم گروہوں کے رہنماؤں کو بلایا جائے اور ان کا نقطہ نظر لیا جائے۔

مارچ

☆ نوابشاہ میں نامعلوم حملہ آوروں نے جیو نیوز کی ڈیجیٹل سیٹلائٹ گاڑی پر حملہ کیا اور اسے آگ لگا دی۔ جس میں دو افراد زخمی بھی ہوئے۔ پولیس کے وہاں پہنچنے سے پہلے نامعلوم افراد وہاں سے بھاگ چکے تھے۔

☆ بلوچستان کے سیاستدان شاہ زین بگٹی کے محافظوں نے ایک نجی ٹی وی کے رپورٹر کو اس وقت مارا جب وہ بگٹی کی امریکی سفارتخانے کے سیاسی کونسلر کے ساتھ اسلام آباد میں میٹنگ کو ریکارڈ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ متعلقہ صحافی کو جان سے مارنے کی دھمکیاں بھی دی گئیں بعد میں شاہ زین بگٹی اور اس کے محافظوں کے خلاف مقدمہ درج کیا گیا۔

☆ ایسوسی ایٹس پریس کراچی کے سینئر نمائندے آصف خان کو تحریک طالبان سے دھمکیاں موصول ہوئیں اور نوکری چھوڑنے کا کہا گیا۔ ان کو ایک خط موصول ہوا جس میں کہا گیا کہ وہ مغرب کی حمایت میں رپورٹنگ کرنا چھوڑ دیں اور یہ دھمکی پہلی اور آخری ہے۔ خان نے خط کے متعلق تفصیل اپنے مالک کو بتائی جنہوں نے اسے نوکری چھوڑ دینے کا مشورہ دیا تا کہ مستقبل میں دھمکیوں سے بچا جا سکے۔ ایک مقامی اخبار اور ایک نیوز ٹی وی میں کام کرنے والے صحافی عرفان ملک کو چار نا معلوم حملہ آوروں نے جھنگ میں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ قتل کی وجوہات معلوم نہ ہو سکیں۔

☆ سرفراز وسترو جو کہ ایک سینئر صحافی اور سندھ ڈیلی کے چیف رپورٹر ہیں کو گوہر زمان شاہ نامی شخص نے گولی مار کر زخمی کر دیا۔ ان کو ہسپتال داخل کرایا گیا ان کے جسم سے ایک سے زائد گولیاں نکالی گئیں۔ پولیس نے مقدمہ درج کر لیا مگر ملزم کو گرفتار نہیں کیا جا سکا۔

اپریل

☆ اورکزئی ایجنسی میں 'دی نیوز' اور جیو نیوز کے نمائندے کو طالبان نے دھمکیاں دیں کہ اگر اس نے رپورٹنگ بند نہ کی تو اس کو خطرناک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس علاقے میں فوجی کارروائی کی رپورٹنگ کی وجہ سے اسے چوتھی مرتبہ دھمکی موصول ہوئی تھی۔

☆ مرتضی رضوی جو کہ ڈان کے میگزین ایڈیٹر تھے کو کراچی کے ایک آرٹس سٹوڈیو میں گلا گھونٹ جاں بحق کر دیا گیا۔

مئی

☆ جامشورو میں سندھ ٹی وی کے لیے کام کرنے والے دو نمائندوں کو ایک سابقہ رکن پارلیمنٹ اور ضلع ناظم جامشورو کے نوکروں نے تشدد کا نشانہ بنایا۔ دو میں سے ایک صحافی عزیز پلاری کو سابقہ قانون ساز کے متعلق تنقید کرنے پر انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ صحافی کا یہ کہنا تھا کہ اس کو اس لے مارا گیا کہ اس نے سابقہ قانون ساز ممبر کو سرکاری سکول کے اساتذہ کو ذاتی نوکر بطور استعمال کی خبر دی تھی۔ دوسرے صحافی، اسماعیل بریجو پر اس

لیے تشدد کیا کہ اس نے عزیز پلاری کو مارنے کی خبر جاری کی تھی۔ طارق کمال، جو کہ ایک مقامی سندھی اخبار میں اسسٹنٹ چیف رپورٹر تھا، اپنے ایک دوست کے ہمراہ مئی کو کراچی سے غائب ہوگئے۔ دونوں افراد کی لاشیں 10 مئی کو ملیں۔ دونوں کے سر میں گولی ماری گئی تھی۔

☆ رزاق گل، بلوچستان میں ایکسپریس نیوز کے نمائندے تھے ان کو تربت میں اپنے گھر کے قریب سے اغواء کرلیا گیا اور اگلے دن ان کی لاش موصول ہوئی۔ لاش پر پندرہ گولیوں کے اور تشدد کے نشانات ملے۔ گزشتہ تین سالوں میں بلوچستان میں قتل ہونے والے صحافیوں میں گل کا اکیسواں نمبر تھا۔

☆ شکیل انجم جو کہ دی نیوز میں ایک سینئر صحافی ہیں کی اسلام آباد رہائش گاہ پر دوسری دفعہ 6 سے زائد مسلح افراد نے حملہ کیا۔ حملے کے وقت شکیل اپنے گھر پر موجود نہیں تھا۔ اسی طرح کا ایک حملہ 2006 میں بھی شکیل کے گھر پر ہوا تھا جس میں اس کے بیٹے کو گولی لگی اور وہ شدید زخمی ہوگیا تھا۔ مقدمہ دائر کیا گیا مگر حملہ آور نامعلوم رہے۔

☆ عبدالقادر مجازی جو کہ ایک جزوی طور صحافی تھے کو بلوچستان کے ضلع واشک میں گولی مار کر قتل کیا گیا۔ وہ ایک نجی بلوچی زبان کے ٹی وی چینل کے لیے کام کرتے تھے اور وہ گھر واپس جا رہے تھے جب ایک موٹر سائیکل سوار مسلح شخص نے ان کو گولی ماردی۔ بعدازاں وہ ہسپتال میں جاں بحق ہوگئے۔ مسلح افراد نے تربت کلب کے صدر ارشاد اختر کے گھر پر بھی گولیاں برسائیں۔ متعلقہ صحافی اور ان کے گھر والے زخمی ہونے سے بچ گئے۔ حملے کا مقصد صحافی کو اپنا پیغام دینا تھا۔ بلوچستان یونین آف جرنلسٹ نے واقع کی بھرپور مذمت کی اور چیف جسٹس سے ازخود نوٹس لینے کی اپیل کی۔

جون

☆ مسلح موٹر سائیکل سوار حملہ آوروں نے کراچی میں آج ٹی وی پر فائرنگ کی۔ دو افراد جس میں ایک سیکیورٹی گارڈ شامل تھا زخمی ہوئے۔ طالبان نے حملے کی ذمہ داری قبول کی اور دیگر چینل جو طالبان کا موقف پیش نہیں کرتے کو بھی دھمکیاں ملیں۔

جولائی

☆ ایکسپریس نیوز کے رپورٹر نے شیخ زاید ہسپتال رحیم یار خان میں ینگ ڈاکٹرز ایسوسی ایشن کے تحت ہونے والی ہڑتال کے نتیجے میں عمر رسیدہ مریضوں کی حالت زار کی کہانی دکھانے کی کوشش کی ڈاکٹروں نے صحافیوں اور کیمرہ مین پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں ان کے کافی لوگ زخمی ہوئے۔ پولیس کی طرف سے صحافیوں

کو بحفاظت بچانے کے لیے مداخلت کرنی پڑی۔ ڈاکٹر شاہد قریشی جو کہ برطانوی پاکستان صحافی ہیں، نے اپنے لاہور میں موجود گھر کو تباہ ہونے پر وزیر اعظم اور صدر سے شکایت کی۔ ڈاکٹر شاہد قریشی، مقتول صحافی فیصل قریشی کے بڑے بھائی کو شک تھا کہ اس جارحانہ حملے کی وجہ ایک دستاویزی فلم کا بنانا تھا جو کہ ایک قتل کے متعلق ہے۔

ستمبر

☆ جماعت اسلامی کے زیر تحت منعقد ہونے والی ایک ریلی کے دوران کراچی چیپٹر کے ڈیلی ٹائم اخبار کے دفتر پر حملہ ہوا۔ مسلح افراد نے گولیاں برسائیں اور عمارت میں گھسنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اخبار میں کام کرنے والے عملے سے کام بند کروانے کی کوشش کی۔ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا مگر دفتری املاک کو نقصان پہنچا۔

☆ ایک نجی ٹی وی چینل اے آر وائی نیوز کے ملازم عامر کو اس وقت قتل کر دیا گیا جب وہ پشاور میں ایک پرتشدد احتجاج کو ریکارڈ کرنے کے لیے خبر نشر کر رہے تھے۔ مظاہرین ایک فلم کے خلاف احتجاج کر رہے تھے جس میں رسول پاکؐ کی شان میں گستاخی کی گئی تھی۔ عامر اس وقت شدید زخمی ہوا جب تین گولیاں گاڑی کو آ کر لگیں اور وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جاں بحق ہو گیا۔ گولیاں بظاہر ایک مقامی سینما کے چوکیدار نے چلائیں جو کہ ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے چلائی گئیں تھیں۔

☆ عبدالحق بلوچ جو کہ خضدار پولیس کلب کے جنرل سیکرٹری تھے کو نامعلوم مسلح افراد نے گولی مار کر

مایوسی کے عالم میں ایک پکار

ہلاک کر دیا۔کسی بھی گروہ نے اس واقع کی ذمہ داری قبول نہیں کی لیکن یہ بڑا واضح اور سادہ ٹارگٹ کلنگ کا کیس تھا۔بلوچستان یونین آف جرنلسٹ نے حملے کی بھر پور مذمت کی۔

اکتوبر

☆ مشتاق کھنڈ جو کہ ایک نجی ٹی نیوز چینل دھرتی ٹی وی کے رپورٹر تھے اس وقت قتل ہوئے جب نامعلوم حملہ آوروں نے سر عام پاکستان پیپلز پارٹی کی خیر پور میں ہونے والی عوامی میٹنگ پر فائرنگ کی۔

☆ خضدار پریس کلب کے صدر کے دو بیٹوں کو موٹر سائیکل سوار نامعلوم حملہ آوروں نے گولیاں ماریں۔دو میں سے ایک نوجوان موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا جبکہ دوسرا زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دوسرے دن جاں کی بازی ہار گیا۔یہ تشویش ناک قتل اس تشدد کی لہر کی ایک کڑی ہے جس میں خضدار پریس کلب کے دو موجودہ صدر اور ایک جنرل سیکرٹری قتل ہوئے تھے۔

نومبر

☆ ثاقب خان جو کہ ایک اردو اخبار کے فوٹو جرنسلٹ تھے، محرم میں کراچی کے ایک شیعہ علاقے میں ہونے والے بم دھماکے میں شدید زخمی ہونے کی وجہ سے جاں بحق ہوئے۔خان وہاں ایک بم دھماکے کی کوریج کر رہے تھے جو تھوڑی دیر پہلے وہاں ہوا تھا اور اس کے اگلے ہی لمحے ایک دوسرا دھماکہ ہوا جو کہ ان کی موت کی وجہ بنا۔

☆ کالم نگار ماروی سرمد اپنی جان بچانے میں اس وقت کامیاب رہیں جب وہ اسلام آباد میں اپنے دفتر سے واپس اپنے گھر جا رہی تھیں۔نامعلوم حملہ آور جو کہ کالے رنگ کی کار میں سوار تھے اور جس کے شیشے بھی سیاہ تھے نے ان کی کار پر دو دفعہ فائرنگ کی۔ان کی کار گولیوں کی زد سے بچ گئی اور وہ تیز رفتاری سے وہاں سے نکل کر قریبی پولیس تھانہ میں پہنچ گئیں اور بعد ازاں شکایت درج کرائی۔

☆ سینئر صحافی اور دنیا ٹی وی کے اینکر محمد مالک کی گاڑی کو لاہور میں چند نامعلوم اوباشوں نے گولیوں کا نشانہ بنایا گاڑی گھر کے اندر موجود تھی گولیاں اس سے آ کر ٹکرائیں لیکن اس حملے میں کوئی زخمی نہیں ہوا۔

☆ دو صحافی سید طارق حسین اور اسلم راجہ کو کراچی میں ٹارگٹ کلنگ کے نتیجے میں گولیاں مار کر قتل کر دیا گیا۔دونوں صحافی جو کہ ایک مقامی ہفت روزہ اخبار کے لیے کام کرتے تھے، موٹر سائیکل پر سوار تھے جب ان کو نامعلوم افراد نے گولیاں ماریں دونوں موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔

☆ رحمت اللہ عابد ایک سینئر صحافی جو کہ ڈیلی اردو دنیا اور ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کو پنجگور جو کہ

بلوچستان کا ایک علاقہ ہے میں گولی مار کر جاں بحق کر دیا گیا۔ موٹر سائیکل سوار حملہ آوروں نے ان پر گولیاں چلائیں جو کہ ان موقع پر ہلاکت کی وجہ بنا۔

☆ حامد میر جو کہ جیو نیوز کے ٹی اینکر ہیں، اپنی زندگی کو اس وقت بچانے میں کامیاب ہو گئے جب بم ناکارہ بنانے والے ماہرین نے ان کی کار سے لگے بم کو ناکارہ بنا دیا۔

☆ بم کار کے نیچے لگا ہوا تھا جس کی نشاندہی ایک ہمسائے ڈرائیور نے کی۔ تحریک طالبان نے اس کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے کہا کہ یہ حملہ حامد میر کی ملالہ یوسف زئی پر حملے کی کوریج کا بدلہ تھا۔ ملالہ یوسف زئی سوات میں خواتین کی تعلیم کے حق میں ایک نوعمر حامی کارکن ہیں۔

دسمبر

☆ سندھ میں دو صحافی، ارباب بھیل جن کا تعلق دھرتی ٹی وی سے ہے اور مشتاق قمبر جن کا تعلق ڈیلی سندھ ایکسپریس سے ہے کو اُس وقت شدید دھمکیاں ملیں جب انہوں نے ایک معصوم ہندو بچی سے زیادتی کے واقعہ کو رپورٹ کیا۔ 6 سالہ معصوم بچی سے زیادتی کرنے والے اصل مجرم نے صحافیوں کو کال کی اور کہا کہ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس واقعہ کی پیروی کرنا چھوڑ دو۔ مشتاق قمبر کو جسمانی طور پر بھی تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور ان کو مسلسل دھمکیاں بھی موصول ہوتی رہیں۔

☆ مہمند ایجنسی میں دو صحافیوں کو بغیر وارنٹ کے گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔ سکیورٹی فورسز نے مہمند ایجنسی کے پریس کلب پر چھاپا مارا اور سعید بادشاہ اور کفایت اللہ کو حراست میں لے لیا۔ مقامی صحافیوں نے احتجاج کیا اور پشاور باجوڑ سڑک کو بند کر دیا ان کا یہ مطالبہ تھا کہ صحافیوں کو بری کیا جائے۔

☆ ایک صحافی جمشید کو اس وقت گولی مار کر ہلاک کیا گیا جب مسلح افراد کے گروہ نے کوئٹہ۔ سکھر ہائی وے پر بس کی تلاشی لی اور چھ افراد کو اغواء کر لیا۔ تین افراد جن میں صحافی بھی شامل تھا انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی اور ان کو گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ مقتول صحافی کوئٹہ میں ایک اخبار کے لیے کام کرتے تھے۔

سال 2012 میں ہونے والے صحافیوں کے قتل کے مجرم قانون کی پکڑ سے دور رہے اور 2012 میں بھی قتل ہونے والے صحافیوں کے قاتلوں کو پکڑنے یا سزا دینے کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ سال 2000 میں سے اب تک پاکستان میں کل 80 صحافی قتل ہوئے جن میں سے صرف ایک مقدمہ میں مجرموں کو پکڑنے کی کوشش کی گئی اور وہ صرف امریکی صحافی ڈینیل پرل کے قتل کا واقعہ ہے۔ صحافیوں کے قتل کے متعلق بہت زیادہ اہمیت کے حامل مقدمات کو بھی حل نہیں کیا گیا اور مجرم آزادی کے ساتھ گھومتے رہے۔ حکومتی

اقدامات سے یہ واضح طور پر لگتا ہے کہ قاتلوں کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کی اس کی ذمہ داری اس وقت پوری ہو جاتی ہے جب کوئی دہشت گرد یا عسکری تنظیم واقعے کی ذمہ داری قبول کر لیتی ہے۔ بہت سی تحقیقات کی گئیں اور کمیشن بنائے گئے تاکہ صحافیوں کے قتل بارے تحقیقات کی جا سکیں لیکن کوئی ٹھوس نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ مشہور صحافی ولی خان بابر اور سلیم شہزاد کے قتل کے مقدمات نے میڈیا میں کافی کوریج حاصل کی لیکن بدقسمتی سے ان واقعات کے ذمہ داران کو پکڑا نہیں گیا۔ ولی خان بابر جو کہ جیو نیوز کے رپورٹر تھے، ان کو کراچی شہر کی ایک معروف سڑک پر گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ان کے قتل کے آخری چشم دید گواہ کو بھی دسمبر 2012 میں گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ مدعی کے وکیل دھمکیوں کی وجہ سے عدالتی کارروائی کو درمیان میں ہی چھوڑ گئے۔ اس دوران گواہ کے تحفظ بارے بہت زیادہ باتیں ہوئیں۔ تاہم سال 2012 میں اس حکمت عملی کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔

سلیم شہزاد کے کیس بارے بنائے گئے عدالتی کمیشن نے سال 2012 میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ خفیہ ادارے پر انگلی اٹھانے کے باوجود کمیشن قتل کے کسی انفرادی ذمہ دار کو سامنے لانے میں ناکام رہا۔ مرحوم کے گھر والوں نے اور سول سوسائٹی نے رپورٹ کو مایوس کن ٹھہرایا۔

متن کا معیار

اقوام متحدہ کے مطابق آزادی رائے کا حق اسی وقت ایک حقیقت بن سکتا ہے۔ جب خبروں کے صارفین کے پاس ذرائع بلاغ بارے معیاری تعلیم ہوتا کہ وہ موصول ہونے والی معلومات کا بہتر طور پر تجزیہ کر سکیں اور اگر ذرائع ابلاغ غلط خبر شائع کریں تو انہیں ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔ پاکستان میں میڈیا اور صارفین جانچنے کے عمل میں غلطی کا شکار ہیں۔

پاکستان میں میڈیا ہمیشہ سنسنی خبریں دیتا رہتا ہے۔ رائے اور خبر میں فرق غیر واضح ہو چکا ہے۔ ٹی وی ذرائع پر تحقیقی دستاویزات منصفانہ نہیں ہوتیں۔ بہت سے ٹی وی چینلز جو حالیہ سالوں میں بنے ہیں زیادہ تر اسی طرح کے خیالات رکھتے ہیں۔ مواد سارے ذرائع ابلاغ میں ایک جیسا ہوتا ہے جبکہ خبروں کا شائع کرنے کا طریقہ اہم خبر بن جاتا ہے۔ میڈیا متعلق تنقید کرنے والے ان چینلیز پر تحقیق میں کمی اور معائنہ سازی کے فقدان کا الزام لگاتے ہیں۔ میڈیا کا مختلف امور پر بہت تھوڑے وقت کے لیے توجہ دینا بہت سے اہم مسائل اور معاملات کو فراموش کر دیتا ہے۔ 2012 میں میڈیا کے رابطہ کاروں کی غیر جانبداری کھل کر سامنے آئی۔ جب بہت سارے اہم رابطوں کاروں کی ویڈیو ریکارڈنگز منظر عام پر آئیں اس قسم کے واقعات نے میڈیا کی غیر

ٹی وی ڈرامہ فنکار اُردو زبان میں غیر ملکی ڈرامہ نشر ہونے کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں

جانب داری کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔

میڈیا میں پیش کردہ عورتوں کی غیر مناسب تصویر کشی اور اس کے علاوہ متحرک اور آزاد عورتوں کو برے انداز میں پیش کرنا اور عورتوں کے ساتھ جنسی تشدد اور زیادتی کے کیسز کو نشر کرتے ہوئے میڈیا بالکل غیر حساسیت کا مظاہرہ کرتا آیا ہے۔ زیادتی کا شکار ہونے والی خواتین کی پوشیدگی کو جھٹلایا جاتا ہے اور زیادتی کے ایک واقعہ جس میں خیبر پختونخواہ کے علاقے کرک سے تعلق رکھنے والی خاتون جس کا نام عظمٰی ایوب تھا، کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی گئی میڈیا نے اس خاتون کا تعاقب جاری رکھا اور اسے اپنی زیادتی کا واقعہ بیان کرنے پر مجبور کر دیا۔

2012 میں خواتین کے عالمی دن کے موقع پر سول سوسائٹی اور میڈیا کے پیشہ ور حضرات نے میڈیا کو عورتوں کے بہتر تشخص کو ابھارنے پر زور دیا۔ کاروباری اور تشہیری اداروں پر بھی زور دیا گیا کہ خواتین کے کردار کو توہین آمیز طریقے سے پیش نہ کیا جائے اور ان پر چھاپ لگانے کا عمل بھی روکا جائے۔ مخصوص معاملات پر میڈیا کی خاموشی بھی تنقید کی زد میں ہے۔ دیہاتی علاقوں کی آواز کو شامل نہ کرنے سے زیادہ تر آبادی کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی اقلیتوں کے مسائل، فرقہ وارانہ فسادات اور کالعدم تنظیموں کے کردار جس کے تحت مذہبی اور فرقہ وارانہ حملے کئے جا رہے ہیں کو مناسب کوریج نہیں دی جا رہی۔ بلوچستان، فاٹا اور دوسرے دہشت گردی سے متاثرہ علاقوں کو قومی میڈیا پر بہت کم رسائی دی جاتی ہے۔

پاکستان کے قریبی ہمسایہ ممالک کو بھی کوئی خاص اہمیت میڈیا میں نہیں دی جاتی جو معاملات میڈیا کی توجہ کا مرکز ہیں ان کا چناؤ معاملات کی حساسیت اور فوری ضرورت پر نہیں ہوتا بلکہ چینلز کی بہتات کی وجہ سے ہوتا ہے جس کی نتیجہ میں وہ مسائل جن پر میڈیا کو خاص توجہ دینی چاہئے پس پشت چلے جاتے ہیں۔نو جوانوں کے مسائل پر توجہ نہ دینے پر بھی میڈیا کو تنقید کا سامنا ہے۔ بچوں کے پرگرام کی بہت کم تعداد 2012 تک جاری رہی۔

میڈیا میں احتساب

میڈیا کسی بھی ملک میں ناانصافیوں کو اجاگر اور لوگوں کے مفاد کا تحفظ کرتا ہے۔البتہ حالیہ سال میڈیا خود ان مقاصد سے ہٹتا دکھائی دیا۔2012 میں ایک بہت بڑا تاجر ملک ریاض چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چوہدری کے بیٹے ارشد افتخار کو خفیہ رقوم کی منتقلی کے حوالے سے اہم خبروں کی زینت بنا رہا۔ جون میں میڈیا کے دو اہم رابطہ کار مہر بخاری اور مبشر لقمان نے ملک افتخار کا انٹرویو کیا آگے جا کر جو ویڈیو منظر عام پر آئی اس کے مطابق یہ انٹرویو پہلے سے تیار کردہ تھا یہ دو رابطہ کار ملک ریاض کو اپنی پوزیشن واضح کرنے کا موقعہ دے رہے تھے۔اس ویڈو نے میڈیا اور صارفین میں سنسنی پیدا کردی میڈیا کی صداقت پر سوال اٹھائے گئے۔ کچھ اہم میڈیا ماہرین کا یقین ہے کہ اس ویڈیو نے اس بیماری کو بے نقاب کیا جو بہت پہلے سرایت کر چکی تھی۔انہوں نے میڈیا کی شفافیت اور ایسے اصولوں پر زور دیا جن کی مدد سے آئندہ کے لیے ایسے واقعات کو روکا جائے۔ اس واقعے کے بالکل اگلے مہینے جب ابھی تک خفیہ ویڈیو کے منظر عام کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بحث ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی کہ میڈیا کے دو رابطہ کار حامد میر اور ابصار عالم نے سپریم کورٹ آف پاکستان میں درخواست دی کہ ایسا کمیشن بنایا جائے جس کے تحت مختلف میڈیا چینلز کے مالکان اور رابطہ کاروں کی معاشی آمدنی کا پتہ چلایا جائے۔اس درخواست میں الزام لگایا گیا کہ وفاقی حکومت برائے اطلاعات ونشریات کے پاس چار بلین کا فنڈ ہے جو وہ مختلف جگہوں پر استعمال کرتی ہے۔ وزارت اطلاعات ونشریات نے الزام کی تردید کی کہ فنڈز صرف بیمار اور ریٹائرڈ صحافی کی بہتری کے لیے ہے۔ دسمبر میں سپریم کورٹ نے وزارت انفارمیشن سے فنڈز پر معلومات دینے کا حکم دیا اور واضح فیصلہ نہ آنے تک فنڈز کو روکنے کا بھی حکم دیا۔سال کے آخر تک ابھی مسئلے کا فیصلہ ہونا باقی تھا۔

حکمت عملی اور قانون سازی میں مسائل

جو چند احتیاطی تدابیر صحافیوں کے تحفظ اور عوام کو اطلاعت کی فراہمی کی آزادی کے لیے بنائی گئیں قانون کا حصہ نہ بن سکیں۔ پنجاب آزادی اطلاعات کا مسودہ 2012 متعارف کرایا گیا جس کے تحت پنجاب

کے سارے ادارے قانون کے تحت پابند ہوں گے کہ وہ اپنے روزمرہ کی کارکردگی، ڈھانچہ اور آئین کے متعلق معلومات عوام کو فراہم کریں گے۔ مسودہ کو سال کے آخر تک صوبائی کابینہ سے منظوری نہیں دی جاسکی۔

6 نومبر یو۔این آفس، پارلیمنٹیرینز اور ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان نے صحافیوں کے تحفظ کے مسودہ پر دستخط کئے۔ بہت سے بین الاقوامی اور لوکل اداروں کو صحافیوں کے تحفظ کے لیے پاکستان آنے کی دعوت دی گئی جو صحافیوں کے لیے سب سے خطرناک ملک سمجھا جاتا ہے۔ یو۔این متحرک پلان II کے تحت 2017 تک کی پالیسی 2013 میں منتخب کی گئی۔ یہ صحافیوں کے تحفظ اور آزادی رائے کا حق دلانے کے لیے ملک میں ایک اچھا قدم دکھائی دیتا ہے۔ اگست میں اعلیٰ عدلیہ کے سابق جسٹس وجیہ الدین احمد اور مذہبی رہنما قاضی حسین احمد نے سپریم کورٹ میں درخواست دائر کی کہ پیمرا کو غیر مناسب مواد پیش کرنے سے روکا جائے۔ درخواست سے سپریم کورٹ نے پیمرا سے وضاحت طلب کی کہ وہ سب سے پہلے ٹرم فحاشی کی وضاحت کرے تاکہ پھر پتہ چلایا جاسکے کہ آیا زیر بحث مواد نامناسب ہے یا نہیں۔ سپریم کورٹ نے نوٹ کیا پیمرا نے ایسی کوئی واضح پالیسی وضع نہیں کی جس سے بات کی معقولیت کو پرکھا جائے۔

شفاف ٹرائل ایکٹ 2012 متفقہ طور پر نیشنل اسمبلی میں منظور ہوا۔ دسمبر میں ایک قرارداد پیش ہوئی جس نے سوسائٹی میں ملا جلا ردعمل حاصل کیا اس ایکٹ کے تحت سکیورٹی ایجنسیوں کو اختیار دیا گیا کہ شہریوں کی کالز ریکارڈز کی جاتی ہیں تاکہ دہشت گردوں کو پکڑا جائے۔ وفاقی کابینہ نے قانون کا تحفظ کیا اور دعویٰ کیا کہ جدید طریق کار اور آلات اور تحقیقات کے لیے یہ قانون ضروری ہے۔ انسانی حقوق کی تنظیموں نے اسے شہریوں کی آزادی پر کاری ضرب قرار دیا۔ یہ قانون سکیورٹی ایجنسیوں کو فون کالز، پیغامات، انٹرنیٹ پیغامات کو خفیہ طور پر ریکارڈ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس قانون میں ایسی بہت سی گنجائش پائی جاتی ہے جس کے تحت اس قانون کو ذاتی اور سیاسی مفادات کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

سماجی میڈیا اور ویب

پاکستانیوں سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ تک رسائی بہت بڑھ گئی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں فیس بک استعمال کرنے والوں کی تعداد 2011 میں 18 ملین تھی جو کہ 2013 تک تقریباً 3.6 ملین مزید بڑھ گئی ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ معلومات کے لیے فیس بک اور ٹویٹر کا استعمال کرتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر معلومات کی ترسیل آزاد سمجھی جاتی ہے لیکن پاکستان میں ایسا نہیں۔ ستمبر میں یوٹیوب پر دکھائی جانے والی فلم جس میں نبی کریمؐ کی شان میں گستاخی کی گئی (توہین آمیز ویڈیو) کے نتیجے میں یوٹیوب کو پاکستان میں

یو ٹیوب پر پابندی عائد کردی گئی

بند کر دیا گیا۔اس ویڈیو نے پوری اسلامی امہ میں مظاہروں اور مذمت کو پیدا کیا لیکن یہ مذمت اور مظاہرے ایک مہینہ کے اندر کم پڑ گئے۔البتہ پاکستان میں یوٹیوب پر بین کو اس شرط پر قائم رکھا گیا کہ ویڈیو کو یوٹیوب سے ہٹائے جانے تک بین رہے گا۔تاہم ایسا نہ ہونے پرنتیجتاً 2012 کے آخر تک پابندی جاری رہی۔ بہت سارے فنکاروں، سول سوسائٹی اور شہریوں نے بین کے خلاف احتجاج کیا اور اس بین کو آزادی رائے کی خلاف ورزی اور پاکستان میں شہریوں کو معلومات تک رسائی پر پابندی گردانا۔ویب سائٹوں پر پابندی پاکستان میں کوئی نئی بات نہیں۔حکومت پر بہت عرصہ سے قوم پرست بلوچ رہنماؤں کی ویب سائٹوں پر پابندی کا الزام بھی رہا۔ بلوچ حال اور پہلی بلوچ انگلش زبان، بلوچ نیوز 2010 سے بندھیں۔کافی سالوں سے بی بی سی اور بعض بین الاقوامی ایجنسیاں پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی کو ریاستی ادارہ قرار دے رہی ہیں۔قومی پرست ویب سائٹس کو غلط معلومات پھیلانے کے الزام میں بند کیا جا رہا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف حکومتی اجازت ملنے والا مواد ہی عوام کے لیے موجود ہے۔

عوام کے لیے آزادی اظہار

اصطلاح آزادی کا صرف یہ مطلب نہیں کہ صرف صحافی اور میڈیا والے ہی وہ کہیں جو کہنا چاہتے بلکہ تمام لوگوں کو یہ اصطلاح حق دیتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں نہ صرف انضباط کے ذریعے بلکہ حرکات سکنات، فنکارانہ اور ذاتی انتخاب میں بھی آزادی ہو بغیر کسی خوف اور مداخلت کے اس میں لوگوں کی خلوت شامل ہے۔ پاکستان کا تسلسل سے صحافیوں کے لیے خطرناک ملکوں میں شمار ہوتا ہے لیکن ماحول ایسا ہے کہ عام آدمی بھی جرمانے یا سزا کے ڈر سے کھل کر اپنا اظہار نہیں کر سکتا۔سوات کی تیرہ سالہ لڑکی ملالہ یوسف زئی عورتوں میں تعلیم کے فروغ کو اجاگر کرنے کی وجہ سے طالبان کی دہشت گردی کا نشانہ بنی۔اسی پس منظر میں سوات کی تیرہ سالہ لڑکی ملالہ یوسف زئی کو عورتوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے طالبان نے دہشت گردی کا نشانہ بنایا۔

شیری رحمان: تضحیک مذہب قانون میں اصلاح کا مطالبہ کرنے پر خطرات کا سامنا

نومبر 2010 میں پاکستانی سیاست دان اور امریکہ میں پاکستانی سفیر شیری رحمان نے مذہبی توہین پر سزا موت کو ختم کرنے کا بل پیش کیا۔ اس وقت بہت سے ٹی وی چینلز پر شیری رحمان توہین رسالت کے قانون پر بات کرنے آئیں۔ فہیم اختر گل جو کہ ملتان کا رہائشی ہے اس نے ایک عدالت میں درخواست دی کہ شیری رحمان پر توہین رسالت کا کیس درج کیا جائے اس کی نظر میں شیری رحمان نے توہین رسالت قانون پر غلط بات کی جس کی وجہ سے وہ توہین رسالت کی مرتکب ٹھہرتی ہیں۔ اس قسم کے دلچسپ واقعات کا بنیادی طور پر یہ مطلب ہوا کہ کوئی بھی کی بھی وقت ٹی وی پر توہین رسالت کا مرتکب ہوسکتا ہے اگر اس کے خیالات کسی بھی پاکستانی کے لیے قابل قبول نہ ہوں۔

مئی میں ایک واقعہ دیکھنے میں آیا جس میں خیبر پختونخوا کے ضلع کوہستان کے بہت سے لڑکے اور لڑکیاں کسی شادی کی تقریب میں ناچتے اور لطف اندوز ہوتے دکھائی دیئے۔ آگے چل کر ایک علاقے کے مولوی اور اس کے ساتھیوں نے چار لڑکیوں اور دو لڑکوں کے خلاف غیر اسلامی حرکات کرنے پر فتویٰ جاری کر دیا۔ فتویٰ کے بعد اس بات کا قومی امکان تھا کہ ان لڑکوں اور لڑکیوں کو قتل کر دیا جائے گا۔ جون میں مولوی کو پولیس نے حراست میں لے لیا جس نے دعویٰ کیا کہ یہ قبائلی حریف ہونے کی وجہ سے کیس بنا۔ افواہ یہ تھی کہ لڑکیوں اور لڑکوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ سپریم کورٹ کے کیس پر ازخود نوٹس پر حکام نے سپریم کورٹ کو آگاہ کیا کہ لڑکے اور لڑکیاں زندہ ہیں۔ البتہ سال کے ختم ہونے تک یہ بے یقینی رہی کہ کیا واقعی ایسا ہی ہے۔

سفارشات

1۔ انسانی حقوق، مثبت اقدار، جمہوریت، دہشت گردی کے مقابلے اور آزاد و شفاف معلومات تک انسان کی رسائی کو مضبوط کرنے میں ذرائع ابلاغ کو مثبت کردار ادا کرنا چاہئے۔

2۔ صحافیوں کو بے دریغ قتل کے مجرموں کا قانونی زد میں نہ آنے کے سلسلے کو فی الفور ختم ہونا چاہئے۔ قاتلوں

کی شناخت ہونی چاہیے اوران کے خلاف قانونی کارروائی ہونی چاہیے تا کہ آزادی اظہار رائے اور صحافیوں کے تحفظ کے بارے میں حکومتی عزم ظاہر ہو۔

3۔ ایسا ماحول جہاں افراد کو اپنی آراء دینے پر قتل کیا جائے وہاں صرف سول سوسائٹی خطرات کا شکار نہیں ہوتی، حکومت کو عدم برداشت کے خلاف اور دوسروں کی رائے کو قبول کرنے کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں۔

4۔ صحافیوں کو دہشت گردی کی جگہ یا لڑائی والے علاقوں میں رپورٹ کرنے کے لیے بھیجنے سے پہلے نامساعد حالات سے لڑنے کی تربیت دی جائے۔ ان کے لیے باقاعدہ حفاظتی سازوسامان اور ہنگامی امدادی علاج کا بندوبست ہونا چاہیے۔

اجتماع کی آزادی

ہر شخص کو پرامن طور پر بغیر کسی ہتھیار کے' اجتماع کرنے کا حق حاصل ہوگا' بشرطیکہ اس سلسلے میں مفاد عامہ کے پیش نظر کوئی معقول قانونی پابندی عائد نہ کردی گئی ہو۔ آئین پاکستان [آرٹیکل- 16]

ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ آزادی سے پرامن اجتماع منعقد کرے اور تنظیم بنائے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل- 20 (1)]

اجتماع کی آزادی سے مراد نہ صرف پرامن اجتماع کے انعقاد اور اس میں شرکت کرنے کا استحقاق ہے بلکہ اس عمل میں ناجائز مداخلت سے تحفظ کا حق بھی ہے۔ چونکہ اجتماع عوامی مقامات پر منعقد ہوتے ہیں، اس لیے یہ شرکاء، قانون نافذ کرنے والے اہلکاروں، دیگر سرکاری حکام اور متعلقہ عناصر کے طرز عمل کے مشاہدے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ پرامن اجتماع کا حق دنیا بھر میں جمہوری نظام کا بنیادی اصول تصور کیا جاتا ہے اور اظہار رائے کی آزادی اور انجمن سازی کی آزادی سمیت دیگر انسانی حقوق کے تحفظ کی بنیادی شرط ہے۔ درحقیقت یو این خصوصی رپورٹیٹر برائے آزادی اجتماع کے دائرہ اختیار میں انجمن سازی کی آزادی بھی شامل ہے۔ سیاسی تگ ودود، ثقافتی، معاشی، سماجی اور مذہبی سرگرمیوں میں مشغول لوگوں کے لیے اجتماع کی آزادی ایک متحرک قوت کے طور پر کام آتی ہے۔ دیگر حقوق کے ساتھ اس کا لازمی تعلق آزادی اجتماع کو بیشتر انسانی حقوق کے لیے ریاستی احترام کے تعین کرنے والے ایک معیار کی حیثیت مل جاتی ہے۔ اجتماع کی آزادی بین الاقوامی میثاق برائے شہری وسیاسی حقوق (دفعہ 21) سمیت انسانی حقوق کے بین الاقوامی معاہدات میں شامل ہے۔ اور بین الاقوامی میثاق برائے معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے۔ پرامن

رسولؐ کے احترام کے مطالبے کے لیے شہری احتجاج کرتے ہوئے

اجتماع کا حق بین الاقوامی میثاق برائے شہری وسیاسی حقوق کے تحت ایک مطلق حق نہیں ہے۔ تاہم یواین خصوصی رپورٹیٹر برائے آزادی اجتماع کی رائے میں اس حقیقت کہ اجتماع کی آزادی پر چند پابندیاں عائد کی جاسکتی ہیں، کا مطلب ہے کہ آزادی کو ایک متعین شدہ اصول تصور کیا جائے گا جبکہ اس پر پابندیاں استثنیٰ کے زمرے میں آئیں گی۔ خصوصی رپورٹیر نے انسانی حقوق کی کمیٹی برائے آزادی نقل وحرکت کے عمومی تبصرہ نمبر 27(1999) کا حوالہ بھی دیا جس کے مطابق ''پابندیاں عائد کرنے والے قوانین اختیار کرتے وقت ریاستیں ہمیشہ اس اصول کم مدنظر رکھیں گی۔ پابندی کے مابین، اصول اور استثنیٰ کے مابین تعلق کی سمت درست رہنی چاہئے''۔ اس کا مطلب ہے کہ کسی بھی جمہوری معاشرے میں عائد ہونے والی پابندیاں ناگزیر نوعیت کی ہونی چاہئیں۔ قانونی بنیاد پر مبنی ہوں اور ان کا نفاذ کرنے والا قانون قابل رسائی اور جامع ہو۔

اگرچہ پاکستان کے آئین (دفعہ 16) میں پرامن اجتماع کی آزادی کے حق کی ضمانت دی گئی ہے مگر ملک کے متعدد علاقوں میں پائے جانے والی فضا اور بسا اوقات عائد ہونے والی پابندیوں کے باعث اس حق کا استعمال شدید متاثر ہورہا ہے۔ 2012 میں ملکی بدامنی کی روک تھام کا جواز بنا کر پاکستان میں اس حق کو محدود کیا گیا۔ دوسری طرف پرتشدد اجتماع اور احتجاجی مظاہروں کے رجحان میں بھی اضافہ دیکھنے کو ملا ہے۔ 2012 میں پرامن اور متشدد دونوں طرح کے احتجاجی مظاہروں میں اضافہ ہوا ہے۔ لوگوں کی بڑی تعداد عوامی مقامات پر مجتمع ہوجاتی تھی اور بجلی کی قلت، ایندھن کی عدم دستیابی یا اس کی قیمت میں اضافہ، لاقانونیت، پاکستانی قبائلی علاقوں میں ڈرون حملے، امریکی پادری کی جانب سے قرآن پاک کی مبینہ بے حرمتی اور تضحیک

مذہب تصور کیا جانے والے انٹرنیٹ پر پھیلائے گئے مواد کے خلاف احتجاج منعقد کرتی تھی۔ پنجاب میں حکمران سیاسی جماعت سمیت بعض دیگر سیاسی جماعتوں نے لوڈ شیڈنگ کے خلاف ریلیوں کا انعقاد کیا اور اس کا مورد الزام مرکزی حکومت کو ٹھہرایا۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ نے بھی طویل لوڈ شیڈنگ کے خلاف ہونے والے احتجاجی مظاہرے میں شرکت کی۔ امن عامہ کے نام پر احتجاجی مظاہروں کو محدود کرنے کے لیے پابندیاں عائد کی گئیں تاہم بعض اوقات شہریوں کے گروہوں اور سیاسی جماعتوں نے ان پابندیوں کو بالائے طاق رکھ دیا۔ پورے سال کے دوران مظاہرین کو گرفتار کیا گیا، انہیں مارا پیٹا گیا اور حتیٰ کہ پرامن اجتماع کرنے پر بھی لوگوں کو حراست میں لیا گیا کیونکہ انہوں نے احتجاج کے باعث سڑکوں پر ٹریفک کو بند کر دیا تھا۔

پرامن اجتماع کا حق

ملک کی عدالتوں نے بارہا کہا ہے کہ مظاہروں کا انعقاد اور اجتماع کی آزادی کا استعمال جمہوری ڈھانچے کے بنیادی عناصر ہیں اور ان حقوق کا آزادانہ استعمال ہونا چاہئے۔ عدالتوں نے اس امر کی توثیق کی ہے کہ اجتماع کی آزادی پر پابندی عائد نہیں کی جاسکتی یا اسے غیر قانونی اجتماع کے معنوں میں نہیں لیا جاسکتا۔ تاہم عدالتوں نے قانون کے تحت عائد کی گئی معقول پابندیوں کو قبول کیا ہے۔ حال ہی میں سال 2012 میں کیے گئے فیصلوں 2012 پی ایل ڈی 681 ایس سی اور 2012 سی ایل سی 714 ایس ایچ سی میں اس کا اعتراف کیا گیا ہے۔ تمام صوبوں میں نافذ پولیس ایکٹ کی دفعات 32-30 کے مطابق پولیس گلیوں اور شاہراہوں

بلوچوں نے جبری گمشدگان کی واپسی کے مطالبے کے لیے بڑے اجتماعات کا انعقاد کیا

وغیرہ پرامن عامہ قائم رکھنے کی ذمہ دار ہے اور اجازت نامے کے بغیر منعقد اجتماعات/جلوسوں کو منتشر کیا جا سکتا ہے۔ اگر چہ مسائل کا شکار عام لوگ اجتماعات منعقد کرنے یا جلوس نکالنے کی اجازت شاذ و نادر ہی حاصل کرتے ہیں، تاہم سیاسی جماعتیں اجازت نامہ کے لیے درخواست جمع کرواتی ہیں۔ بعض اوقات پاکستان تحریک انصاف (پی ٹی آئی) کے قائد عمران خان اور عوامی مسلم لیگ (اے ایم ایل) کے سربراہ شیخ رشید جیسے سیاسی رہنماؤں کو امن عامہ کے مفاد میں اجازت دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ بالخصوص ڈرون حملے کے خلاف فاٹا وزیرستان میں پی ٹی آئی کو دہشت گردوں کے حملوں کے باعث ریلی منعقد کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا گیا۔ البتہ ریلی منعقد ہوئی مگر اسے وزیرستان داخل ہونے سے منع کر دیا گیا۔ بعض اجتماعات خصوصی طور پر سیاسی اور مذہبی اجتماعات کو دہشت گردانہ حملوں کا نشانہ بنایا گیا مگر زیادہ تر ان سے محفوظ رہے۔ تاہم شیعہ مسلمانوں نے اپنے مذہبی اجتماعات کو دہشت گردوں کے حملوں سے تحفظ فراہم کرنے میں حکومتی ناکامی کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ بلوچستان کی شیعہ ہزارہ کمیونٹی کے اراکین نے بارہا اپنے پُر اثر مگر غیر متشدد مظاہروں میں اپنے غم و غصہ کا اعلان کیا کہ ان کے افراد کو ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ جنوری میں ہزارہ ڈیموکریٹک پارٹی نے بلوچستان اسمبلی کے باہر تین ہزارہ افراد کے قتل کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا۔ چند مثالیں ذیل میں بیان کی جاتی ہیں جو شہریوں کی جانب سے اپنے حق اجتماع کے استعمال کی نشاندہی کرتی ہیں۔

☆ شیعہ علماء کونسل نے اپریل میں گلگت شہر میں شیعوں کی ٹارگٹ کلنگ کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا اور گلگت بلتستان کے وزیر اعلیٰ کے استعفیٰ کا مطالبہ کیا۔

☆ مئی میں درجنوں خواجہ سراؤں نے احتجاج کیا اور کہا کہ سپریم کورٹ کے حکم کے باوجود ووٹر فہرستوں میں ان کے ناموں کا اندراج نہیں کیا جا رہا۔ انہوں نے الیکشن کمیشن دفتر کے باہر دھرنا بھی دیا۔

☆ جنوری میں پنجاب کے ضلع رحیم یار خان میں سینکڑوں کسانوں نے کپاس اور کماد کی فصل کی کم قیمت کے خلاف احتجاج کیا۔

☆ جنوری میں سینکڑوں مسیحوں نے پنجاب حکومت کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا جس میں انہوں نے الزام عائد کیا کہ گڑھی شاہو لاہور میں ان کی دو ایکڑ زمین پر غیر قانونی قبضہ کر لیا گیا ہے۔

☆ جنوری میں سیاسی کارکنوں اور تاجروں نے ڈیرہ اللہ یار میں قومی شاہراہ کو بلاک کر کے سندھ اور بلوچستان کے مابین ٹریفک کا سلسلہ منقطع کر دیا وہ بلوچستان کے ضلع جعفرآباد میں اغواء کے بڑھتے ہوئے واقعات کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔

☆ خیبر ایجنسی، فاٹا کے رہائشیوں نے اپنے علاقہ میں فوجی آپریشن اور کرفیو کے نفاذ کے خلاف پشاور میں

گورنر ہاؤس کے باہر احتجاجی دھرنا دیا۔

☆ مارچ میں درجنوں خواتین بھٹہ مزدوروں نے خواتین کے عالمی دن کے موقع پر احتجاج کیا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ کم از کم تنخواہ کے قانون پر عملدرآمد کروایا جائے اور ان کے حقوق کو تحفظ فراہم کیا جائے۔

☆ جون میں پاکستان متحدہ محاذ کے ساتھ منسلک کسانوں نے لاہور میں گورنر ہاؤس کے باہر احتجاجی مظاہرہ کیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وفاقی حکومت زرعی شعبہ کو نظرانداز کر رہی ہے۔

☆ جون میں گمشدہ افراد کے رشتہ داروں نے اسلام آباد میں ریلی نکالی۔

دہشت گردی اور اجتماع کی آزادی

☆ ذیل میں چند واقعات بیان کئے جاتے ہیں جن میں 2012 میں سیاسی و مذہبی اجتماعات کو دہشت گردی کے حملوں کا نشانہ بنایا۔

☆ فروری میں کراچی کے مافیا زدہ علاقہ لیاری میں ایک 10 سالہ بچہ زخمی ہو گیا جب پیپلز پارٹی کی ریلی پر حملہ کیا گیا تھا۔

☆ جون میں کوئٹہ میں عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی) کی ریلی میں بم دھماکہ ہوا جس کے باعث سات افراد ہلاک اور 17 زخمی ہو گئے۔

☆ اکتوبر میں صوبہ سندھ کے ضلع خیرپور میں پی پی پی کی ریلی کو نشانہ بنایا گیا۔ 6 افراد ہلاک اور 10 زخمی ہوئے۔

☆ اکتوبر میں ملتان میں پی پی پی کے کارکنوں کی ایک تقریب کے مقام پر ایک بم برآمد ہوا اور اسے ناکارہ

متشدد مظاہرین کا متشدد پولیس کے ساتھ تصادم

بنایا گیا۔تقریب سے سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے خطاب کرنا تھا۔

☆ نومبر میں ڈیرہ اسماعیل خان میں محرم کے جلوس کو بم دھماکے کا نشانہ بنایا گیا جس کے نتیجے میں تین بچے جاں اور 27 افراد زخمی ہو گئے۔

نومبر میں ہی راولپنڈی میں واقع ایک امام بارگاہ کے نزدیک شیعوں کے مذہبی اجتماع میں خودکش بم دھماکہ ہوا۔ 20 لوگ ہلاک اور 40 سے زائد زخمی ہوئے۔

☆ اسی دن کراچی میں شیعوں کی عبادت گاہ کو دو بم دھماکوں کا نشانہ بنایا گیا جس میں دو افراد ہلاک اور 30 زخمی ہو گئے۔

☆ 2013 کے عام انتخابات قریب آ رہے ہیں جبکہ ملک بھر میں سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ ملک میں امن عامہ کی ابتر صورتحال کے باعث ان کے لیے عوامی جلسوں اور ریلیوں کا انعقاد مشکل ہوگا جس سے ان کی انتخابی مہم شدید متاثر ہوگی۔ان خدشات کا زیادہ تر اظہار بلوچستان اور خیبر پختونخوا کے کشیدگی زدہ علاقوں کے بارے میں کیا گیا جہاں سال کے دوران سیاسی اجتماعات کو نشانہ بنایا گیا۔

حق کا ناجائز استعمال

جون میں پنجاب کے تمام شہروں میں توانائی کی قلت اور غیر اعلانیہ لوڈ شیڈنگ کے خلاف احتجاجی مظاہروں کی ایک متشدد لہر شروع ہوئی۔ مظاہرین عموماً شاہراہوں پر اکٹھے ہوتے تھے اور بجلی کی فراہمی کی کمپنیوں کے دفاتر پر حملہ کرتے تھے۔ پولیس نے امن عامہ بحال کرنے کی کوشش کی جن کے باعث تین مظاہرین ہلاک اور درجنوں زخمی ہو گئے۔خانیوال میں مظاہرین نے سیاستدانوں کی زیر ملکیت فیکٹریوں اور بجلی فراہمی کی مقامی کمپنی کے دفتر کو آگ لگا دی۔ چیچہ وطنی میں دو پولیس سٹیشنوں، بجلی فراہمی کے دفاتر، کاروں اور موٹر سائیکلوں کو آگ لگا دی گئی۔ کمالیہ۔ چیچہ وطنی سڑک کئی گھنٹوں تک بند رہی۔ جی ٹی روڈ کو کئی مقامات پر کئی دفعہ بند کیا گیا۔مظاہرین نے ایمبولینسوں کو گزرنے کی اجازت بھی نہ دی۔ سال کے سب سے زیادہ متشدد احتجاجوں کا مظاہرہ امریکی پروڈیوسر کی جانب سے بنائی گئی فلم کے خلاف دیکھا گیا جس کو رسولؐ کی کردار کشی کے مترادف تصور کیا گیا تھا۔لوگ ہجوموں کی شکل میں گلیوں میں نکلے، امریکی پرچم جلائے، سرکاری و نجی املاک کو تباہ کیا اور پولیس مزاحمت پر شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ستمبر کے آخر میں جب حکومت نے یوم محبت رسولؐ کا اعلان کیا اور لوگوں سے مطالبہ کیا کہ وہ فلم کے خلاف پرامن احتجاج کریں تو احتجاجی مظاہروں میں تشدد

ٹائروں کا جلنا اور سڑک کی بندش آزادی کی حد کا امتحان ہے

کے دوران کراچی میں 12 جبکہ پشاور میں 7 افراد ہلاک ہوگئے۔ اس کے علاوہ ملک کے مختلف شہروں میں پولیس کے ساتھ تصادم اور بعض اوقات دیگر مظاہرین کے ساتھ تصادم کے نتیجے میں 200 افراد زخمی ہوگئے۔ مارچ میں کراچی کے مختلف مقامات پر بڑے احتجاجی مظاہرے دیکھنے کو ملے جن میں کراچی کے علاقے لیاری میں گینگ تشدد کے خاتمے کے لیے شروع کیے جانے والی سکیورٹی فورسز کے آپریشن کے خاتمے کی اپیل کی گئی۔ مظاہرین نے پولیس کی گاڑیوں پر حملہ کیا اور ان پر پٹرول بم پھینکے جبکہ پولیس نے انہیں منتشر کرنے کے لیے لاٹھی چارج کیا اور آنسو گیس کا استعمال کیا۔ کئی پولیس اہلکار اور مظاہرین زخمی ہوئے۔ جون میں ڈنڈہ بردار افراد نے راولپنڈی شہر کا مارچ کیا اور لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ مقامی تاجروں کے مطالبے پر شہر کی بڑی مارکیٹوں میں بجلی کی بندش کے خلاف شٹر ڈاؤن ہڑتال کریں۔ اگرچہ پولیس نے تاجروں کو تحفظ فراہم کرنے کی یقین دہانی کروائی تھی مگر وہ ان لوگوں کو روکنے میں ناکام رہی جو مارکیٹ میں دکانداروں کو بزور طاقت دکانیں بند کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ مئی میں لوگوں کی بڑی تعداد مجوزہ الگ مہاجر صوبے کے تصور کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے کراچی میں اکٹھی ہوئی۔ پولیس نے عوامی تحریک اور پیپلز امن کمیٹی کی منعقد کردہ ریلی پر فائرنگ کی جس پر لوگ متشدد ہو گئے جس کے نتیجے میں دو افراد ہلاک اور 29 زخمی ہوگئے۔ سی این جی کی قیمت میں اضافے، ہفتے میں کئی دنوں تک اس کی فراہمی کی بندش اور پبلک ٹرانسپورٹ کی عدم دستیابی کے خلاف احتجاجوں نے پنجاب کے کئی شہروں میں روزمرہ زندگی کو شدید متاثر کیا۔ پبلک ٹرانسپورٹرز، مسافرین اور سی این جی سٹیشنوں کے ملازمین نے ان مظاہروں میں شرکت کی۔ کراچی اور اسلام آباد میں بعض مظاہروں کے دوران پولیس اور مظاہرین میں لڑائی ہوئی جس کے باعث متعدد افراد زخمی ہوگئے۔ مظاہروں کے باعث

راولپنڈی اور اسلام آباد کے درمیان ٹریفک معطل ہوگئی۔ بعدازاں وزارت پٹرولیم نے سی این جی سٹیشنوں کے مالکان اورٹرانسپورٹرز ایسوسی ایشنوں کوسی این جی کی قیمتوں میں کمی کی یقین دہانی کروائی جس پرانہوں نے احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ ختم کیا۔

حق اجتماع پر عائد پابندیاں

2012 کے اوائل میں پنجاب حکومت نے مال روڈ لاہور جیسی مصروف شاہراہوں پر ریلیوں، جلوسوں اوراحتجاجی مظاہروں کی نگرانی کرنے اوران پر پابندیاں عائد کرنے کی پالیسی کا اعلان کیا تاکہ وہاں پر جاری تجارتی سرگرمیوں پرمنفی اثر نہ پڑے۔ ناصر باغ لاہور اور عتیق اسٹیڈیم راولپنڈی جیسی مقرر کردہ جگہوں پر احتجاجی مظاہروں کی اجازت دی گئی۔ پنجاب اسمبلی کو ذمہ داری تفویض کی گئی کہ وہ اپنے نمائندگان کے طور پر اسمبلی کے عملے کوناصر باغ بھیجے گی جوضلعی انتظامیہ کے تعاون سے وہاں مظاہرین سے عرضداشتیں وصول کرے گا۔ پالیسی کے تحت پولیس کوطاقت کے استعمال سے منع کردیا گیااور ضابطے کی خلاف کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کا فیصلہ کیا گیا۔عوام کی جانب سے اجتماع کی آزادی کے حق کواستعمال کرنے اور حکام کی جانب سے اس حق پر پابندیاں عائد کرنے کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

☆ لیڈی ہیلتھ ورکرز (ایل ایچ ڈبلیو) نے پہلے کی طرح سال بھراحتجاجی مظاہروں، سڑک کنارے اجتماعات اورسرکاری عمارتوں کی جانب ریلیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ان کا مطالبہ تھا کہ انہیں مستقل ملازمین قرار دیا جائے اوران کی تنخواہ بڑھائی جائے۔ مارچ میں جب انہوں نے احتجاجی مظاہرہ منعقد کرنے کے لیےاسلام آباد میں سپریم کورٹ کا رُخ کیا تو پولیس نے انہیں شدید تشدد کا نشانہ بنایا۔

☆ مئی میں خواجہ سراءکمیونٹی کے افراد راولپنڈی میں مجتمع ہوئے اور کنٹونمنٹ بورڈ کی جانب سے ان کی کیمونٹی کے لوگوں کو جائیداد کی منتقلی میں غیرضروری تاخیر کے خلاف احتجاج کیا۔ وہ چکلالہ کنٹونمنٹ بورڈ (سی سی بی) کے باہر پُرامن اجتماع کررہے تھے کہ سکیورٹی عملے نے انہیں تشدد کا نشانہ بنا کر منتشر کردیا۔

☆ مارچ میں اپنی تنخواہوں میں اضافے کا مطالبہ کرنے والی سینکڑوں نرسوں اور پیرا میڈکس کو فائرنگ، لاٹھی چارج، آنسوگیس اور بدسلوکی کا سامنا کرنا پڑا ہے اور پولیس اہلکاروں نے انہیں گھسیٹا جب وہ گورنر ہاؤس کراچی کی طرف پیش قدمی کررہی تھیں۔

☆ مئی میں پولیس نے کوئٹہ میں مظاہرین کلرکوں پرآنسوگیس پھینکی جب انہوں نے کم اوقات کار اور رہائش

مظاہرین کے ساتھ نبٹنے میں آنسو گیس اور لاٹھی چارج کو ترجیح دی گئی

الاؤنس کے مطالبات کی منظوری کے لیے وزیراعلیٰ اسلم رئیسانی کے سیکرٹریٹ کی جانب رُخ کیا۔

☆ جون میں پولیس نے کراچی میں پی ٹی آئی کی زیرقیادت عدلیہ کی حمایت میں نکالی گئی ریلی کے شرکاء پر لاٹھی چارج کیا اور متعدد پارٹی رہنماؤں کو گرفتار کرلیا۔ ریلی پی ٹی آئی کے چیئرمین عمران خان کی ہدایت پر چیف جسٹس کے بیٹے کے خلاف مقدمے کے بعد عدلیہ کی حمایت میں نکالی گئی ریلیوں کا حصہ تھی۔

☆ اگست میں سندھ کے اضلاع قمبر شہداد کوٹ اور لاڑکانہ میں زرعی پانی کی مصنوعی قلت کے خلاف احتجاج کرنے والے کاشتکاروں کو پولیس نے لاٹھی چارج کا نشانہ بنایا۔

اجتماع کی آزادی پر دفعہ 144 کا نفاذ

اجتماع کی آزادی کی حدود و قیود کا تعین سندھ ہائیکورٹ کے حالیہ فیصلے میں کیا گیا جس میں وضاحت کی گئی کہ جب ریاست اپنے شہریوں کو آئین کی دفعات 16 اور 17(2) سے مستفید ہونے سے روکے گی تو تین چیزوں کا ہونا لازمی ہے۔ اول، متنازعہ پابندی قانون کے ذریعے عائد کی گئی ہو، چنانچہ انتظامیہ محض انتظامی مصلحت یا آسانی کی وجوہات کے باعث اس حوالے سے عمومی اختیار فرض نہیں کرسکتی اور اسے قانون میں واضح طور پر لکھی ہوئی کوئی چیز دکھانی چاہیئے۔ دوئم، عدالت مطمئن ہو کہ قانون کی نفاذ کردہ پابندی معقول ہے۔ ثالثاً، پابندی متاثرہ انسانی حقوق سے متعلقہ معاملے سے تعلق رکھتی ہو۔ مجموعہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ 144 کے مطابق ضلعی حکومت کسی ناگوار امر یا ممکنہ خطرے کے ہنگامی حالات میں عارضی حکم نامے جاری کرسکتی

ہے اگر فوری روک تھام یا تلافی مطلوب ہو۔اس دفعہ کے تحت اختیارات کا استعمال اس وقت کیا جا سکتا جب حکام سمجھیں کہ یہ حکم نامہ اس کے حکم سے قانونی لحاظ سے مامور کسی شخص کی مداخلت، تکلیف، نقصان، انسانی زندگی، صحت، تحفظ کو خطرہ، یا امن عامہ میں خلل یا فساد یا ہنگامے کو روک سکتا ہے یا اس حکم نامے کا مقصد اس کو روکنا ہے (دفعہ 144)۔البتہ یہ اختیار نوعیت کے لحاظ سے غیر معمولی ہے کیونکہ اس کے باعث شہریوں کے بنیادی حقوق معطل ہو جاتے ہیں۔

دفعہ 144 کے تحت عائد کردہ پابندی کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

☆ جنوری میں ریس کورس پولیس نے مال روڈ پر ریلیوں پر دفعہ 144 کے نفاذ کی خلاف ورزی کے جرم میں لاہور چیمبر آف تجارت وصنعت (ایل سی سی آئی) کے صدر سمیت 35 اراکین کے خلاف مقدمہ درج کر لیا۔احتجاجی مظاہرے کا انعقاد ایل سی سی آئی نے صنعتوں کو گیس فراہمی کی بندش کے خلاف کیا تھا۔

☆ اپریل میں سندھ حکومت نے ایک ہندو لڑکی کے مبینہ جبری تبدیلی مذہب کے مقدمے کی سماعت کے دوران دفعہ 144 کے تحت سندھ کے پانچ اضلاع میں 10 دنوں کے لیے ریلیوں اور جلوسوں پر پابندی عائد کر دی۔

☆ مئی میں مال روڈ پر بہتر تنخواہ پیکج کا مطالبہ کرنے والے اساتذہ کو دفعہ 144 کی خلاف ورزی پر پولیس نے گرفتار کر لیا۔

☆ ستمبر میں سندھ حکومت نے دفعہ 144 نافذ کرتے ہوئے کراچی ڈویژن کی حدود میں تین دنوں کے لیے جلوسوں، ریلیوں اور عوامی جلسوں کے انعقاد پر پابندی کر دی ہے۔حکومت نے مذکورہ پابندی حالیہ ریلیوں میں شر انگیزوں کے تشدد کو مدنظر رکھ کر عائد کیں جن میں کئی افراد ہلاک اور املاک کو نقصان پہنچا تھا۔

سفارشات

1۔ مرکزی اقلیتی فرقے کے مذہبی اجتماعات کو تحفظ فراہم کرنے میں حکومتی ناکامی کا مطلب انہیں اجتماع کی آزادی سے محروم کرنا ہے۔شر پسندوں کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لیے اور مذہبی ومسلکی اقلیتوں کے مابین رواداری کے فروغ کے لیے سول سوسائٹی اور کمیونٹی و مذہبی رہنماؤں کے تعاون سے ایک جامع حکمت عملی اپنانے اور اس پر عمل درآمد کرنے کی ضرورت ہے تا کہ مذہبی اجتماعات کے تحفظ کو یقینی بنایا جا سکے۔

2۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ سیاسی اجتماعات کو دہشت گردی کے حملوں سے تحفظ کی فراہمی کو اپنی پہلی ترجیح قرار دے بصورت دیگر ملک کے بڑے حصوں میں جمہوری حقوق کے حصول اور سیاسی سرگرمیوں کو شدید نقصان پہنچے گا۔اس حوالے سے آتشی اسلحہ اور دھماکہ خیز مواد تک آسان رسائی (16) بھی ختم کی جائے۔

3۔ اجتماع پر دفعہ 144 کا غیر ضروری استعمال بند کیا جائے۔ پرامن اجتماع پر پابندی کا استعمال نہایت شاذونادر واقعات میں اور جہاں عوامی مفاد کو ممکنہ نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو صرف وہیں ہونا چاہیئے۔

4۔ پولیس اور ہجوم کو کنٹرول کرنے والے دیگر اداروں کی تربیت پر خصوصی توجہ دی جائے تا کہ طاقت کے غیر ضروری استعمال کو روکا جا سکے۔انہیں یہ بھی بتایا جائے کہ شہریوں کی جانب سے پرامن اجتماع کے حق کے ناجائز استعمال سے وہ ضبط کرنے یا کم سے کم طاقت استعمال کرنے کی ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں ہو جاتے۔

5۔ 2012 میں ہونے والے بڑے احتجاجی مظاہرے لوگوں کے اضطراب کی عکاسی کرتے ہیں جس کا اظہار انہوں نے فیصلہ سازوں کی توجہ کے حصول میں ناکامی پر کیا۔ پرامن اجتماع کے حق کے حصول کے عمل میں لوگوں کی معاونت کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت کو لوگوں کے مطالبات پر توجہ دینی چاہیئے تا کہ وہ شاہراہوں کا رُخ نہ کریں۔

انجمن سازی کی آزادی

ہر شہری کو تنظیم سازی اور یونین سازی کا حق حاصل ہوگا، بشرطیکہ اس سلسلے میں پاکستان کے اقتدار اعلیٰ، ملک کی سالمیت،
امن عامہ یا اخلاق کے مفاد میں قانون کے تحت کوئی معقول پابندی عائد نہ کی گئی ہو۔ آئین پاکستان [آرٹیکل - 17]
ہر شخص کو پرامن اجتماع کرنے اور تنظیم بنانے کی آزادی ہے۔ کسی شخص کو کسی تنظیم میں شامل ہونے کے لیے مجبور نہیں کیا
جانا چاہیے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل 20-2,1]

پاکستان انجمن سازی کی بنیادی بین الاقوامی دستاویزات کی توثیق کر چکا ہے۔ جن دستاویزات پر دستخط ہوئے ان میں شہری اور سیاسی حقوق کے بین الاقوامی معاہدہ، بین الاقوامی معاہدہ برائے معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق اور آئی ایل او کنونشن 87 جو کہ آزادی انجمن اور انجمن بنانے کے حقوق کے تحفظ کے متعلق ہے، شامل ہیں۔ آئین پاکستان ہر شہری کو انجمن بنانے کے حقوق کی یقین دہانی کراتا ہے۔ توثیق شدہ معاہدوں کے باوجود، اس آزادی کو عملی جامہ پہنانے کی راہ میں کافی رکاوٹیں حائل ہیں۔ کچھ قوانین کی وجہ سے اور کچھ ان پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔

آزادی انجمن سازی نے پاکستان میں کافی اتار چڑھاؤ دیکھا ہے۔ اگرچہ اس آزادی کا فوجی ادوار میں کھلم کھلا انکار کیا گیا مگر دیگر قدرے بہتر ادوار میں بھی اس کے متعلق خدشات برقرار رہے۔ آزادی کا مطلب ٹریڈ یونین کے بنانے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس حق کا دائرہ کار سول سوسائٹی کی تنظیموں، خیراتی اداروں یا سیاسی جماعتوں تک بھی بڑھتا ہے۔ اس میں آزادانہ کام کرنے، ناجائز مداخلت سے تحفظ، سرمایہ اور وسائل تک رسائی اور قومی معاملات میں شرکت شامل ہے۔ انجمن سازی کی آزادی میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا مؤثر ازالہ اور جواب دہی کا فطری حق بھی شامل ہے۔ ریاست کا فریضہ اس حوالے صرف شہریوں

حیدرآباد: لیڈی ہیلتھ ورکرز اپنی تنخواہوں کی عدم ادائیگی کے خلاف نعرے لگا رہی ہیں

کے حق میں عدم مداخلت تک محدود نہیں ہے۔ اسے غیر ریاستی عناصر کو اس حق کی پامالی سے بھی روکنا چاہیے۔ آزادی سے استفادے کو آسان بنانے کے لیے سازگار ماحول کی تشکیل کے لیے بامعنی اقدامات ضروری ہیں۔

یواین کے خصوصی رپورٹیر برائے حقوق پرامن اجتماع اور انجمن سازی نے یواین کی ہیومن رائٹس کونسل کو 2012 میں ایک رپورٹ جمع کرائی جس میں پاکستان میں درپیش مسائل کو نمایاں کیا گیا۔ خصوصی رپورٹیر نے یہ کہا کہ اس نے اپنے دورے کے متعلق جو درخواست ستمبر 2011 میں گورنمنٹ آف پاکستان کو بھیجی تھی اس پر ابھی تک کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ نومبر 2011 میں خصوصی رپورٹیر نے تمام یواین رکن ریاستوں کو، انسانی حقوق کے قومی اداروں، انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے علاقائی طریق، غیر سرکاری اداروں اور دیگر بااثر فریق کو ایک سوالنامہ بھیجا تاکہ ان عملی اقدام کی نشاندہی ہو سکے جو پرامن اجتماع اور انجمن سازی کے حق کو بڑھاتے اور تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر 87 جواب موصول ہوئے اور ان کی بنیاد پر خصوصی رپورٹیر کی 2012 پہلی موضوعی رپورٹ مرتب ہوئی۔ پاکستان نے سوالنامے کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ٹریڈ یونین پر پابندی

2012 میں ٹریڈ یونین سازی پر کچھ پابندیاں دیکھنے کو ملیں جس کی وجہ سے آزادی سے تنظیم بنانے میں رکاوٹیں محسوس ہوئیں۔ اس میں وہ قانونی شرائط بھی شامل ہیں جو ٹریڈ یونین بنانے میں رکاوٹ ہیں۔ پنجاب میں 50 یا اس سے کم مزدور اور دوسرے صوبوں میں 20 یا اس سے کم مزدور یونین نہیں بنا سکتے۔ غیر رسمی مزدور

پشاور میں واپڈا ہائیڈروالیکٹرک سنٹرل لیبر یونین احتجاج کرتے ہوئے

یا پھر ایسے مزدور جو پورے وقت کے لیے کام کرتے ہیں لیکن ملازمت کا ثبوت نہیں رکھتے وہ بھی ٹریڈ یونین بنانے کے لیے نااہل ہیں۔

ٹریڈ یونین کے رہنماؤں کی جان کو بھی خطرہ لاحق رہا بالخصوص ان عناصر کی طرف سے جو مزدوروں کے اکٹھا ہونے کی جدوجہد سے پریشان حال تھے۔ جولائی میں، لاہور اکاؤنٹنٹ جنرل آفس میں آل پاکستان کلرک ایسوسی ایشن کے صدر الٰہی بخش کو نامعلوم افراد نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اکاؤنٹنٹ جنرل آفس میں آل پاکستان کلرک ایسوسی ایشن کے اراکین الٰہی بخش کی زیر قیادت گزشتہ 12 دن سے ہڑتال پر تھے۔

جھنگ میں واپڈا یونین کے رہنما کا قتل اور 2011 میں پی آئی اے کے اہلکاروں کی یونین کے صدر کا قتل ہوا۔ قاتلوں کی پہچان 2012 کے اختتام تک نہ ہوسکی اور نہ ہی قاتلوں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا گیا۔ فیصل آباد کے چھ پاورلومز یونین کے رہنماؤں جن کو 594 سال سزا ہوئی تھی کا کٹھن وقت جاری رہا چونکہ وہ اپنی سزا کا تیسرا سال کاٹ رہے ہیں۔ مزدوروں نے اتنی بے حد سخت سزا کی مذمت کی اور اس کو ایک سازش تصور کیا جس کے تحت مزدوروں کے حقوق کی جدوجہد کرنے والی یونینز کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 2012 کے اختتام پر اس اپیل کی جو اس سزا کے خلاف ہائی کورٹ میں داخل کرائی گئی تھی کی سماعت شروع نہیں ہوئی تھی۔ [تفصیل کے لیے باب ''لیبر'' دیکھیے]

سیاسی وابستگی کے باعث خطرات کا سامنا

اگرچہ سیاسی، مذہبی جماعتوں پر انجمن سازی کے حوالے سے کوئی پابندی نہیں تھی، لیکن سیاسی جماعتوں

بشیر بلور کے قتل نے طالبان کے خلاف فیصلہ کُن کارروائی کے مطالبے کو جنم دیا

کے متحرک رہنماؤں کے خلاف ایک تشدد کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح کا تشدد سب سے زیادہ صوبہ بلوچستان اور صوبہ خیبر پختونخوا کے بیشتر حصوں میں اور کراچی میں دیکھنے کو ملا۔

سیاسی وابستگی کے پیش نظر خطرات کے باعث 2012 میں کراچی میں مختلف واقعات میں تقریباً 3,105 افراد قتل ہوئے، جن میں سے 356 افراد سیاسی طور پر انتہائی فعال تھے۔

دسمبر میں طالبان نے بشیر احمد بلور جو کہ عوامی نیشنل پارٹی کے رہنما اور خیبر پختونخوا حکومت کے وزیر تھے، کی شہادت کی ذمہ داری قبول کی۔ پشاور کے بم حملے میں دیگر 8 افراد بھی قتل ہوئے۔ طالبان کے ایک ترجمان نے کہا کہ اُنہوں نے بدلہ لینے کے لیے ایک ذیلی تنظیم بنائی ہے جس نے بلور کو نشانہ بنایا۔ اس نے اے این پی اور متحدہ قومی موومنٹ ایک سیاسی جماعت جس کو کراچی میں کافی اکثریت حاصل ہے کو بھی دھمکی دی کہ دونوں جماعتیں ان کے گروہ کا اہم حدف ہیں۔ ضلع نوشہرہ میں اے این پی کی ایک عوامی تقریب کے مقام پر ہونے والے بم دھماکے میں پانچ لوگ قتل ہوئے جبکہ 26 افراد زخمی ہوئے۔ ضلع ٹانک کے اے این پی کے صدر کو گولی مار کر ہلاک کیا گیا اور شب قدر کے اے این پی کے جوائنٹ سیکرٹری کو ان کے 3 ساتھیوں کے ہمراہ مردان میں قتل کیا گیا۔ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ ان کی جماعت سے وابستگی واقعہ کا سبب بنی۔ سال 2013 کے ہونے والے عمومی انتخابات ملکی تاریخ کے سب سے متشدد انتخابات تصور کیے جا رہے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے فعال رکن اور رہنماؤں کے لیے سکیورٹی کی صورت حال مزید خطرناک ہو چکی ہے۔

ہدف شدہ غیر سرکاری تنظیمیں

مرد و خواتین جو این جی اوز یا پھر سول سوسائٹی کا حصہ بن کر کام کر رہے ہیں اُنہوں نے محسوس کیا کہ تنظیم کے ساتھ ان کی وابستگی ان کی زندگی کے لیے خاطر خواہ خطرات کی وجہ بنی ہے۔ صوبہ خیبر پختونخوا اور اس کے

پاکستان میں انجمن سازی کی آزادی

ذیل میں یواین کے خصوصی رپورٹیر برائے آزادی پرامن اجتماع وانجمن سازی، مائنہ کیائی کی رپورٹ **2012** سے ایک اقتباس بیان کیا جاتا ہے۔

پاکستان 231,JAL30/12/2011 مقدمہ نمبر پاکستان PAK17/2010 ریاستی ردعمل تاحال کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔انسانی حقوق کے کارکن کا مبینہ قتل

مشاہدات:232 خصوصی رپورٹیر نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ حکومت پاکستان کی جانب سے رپورٹنگ دورانیہ کے درمیان ارسال کردہ خط میں عائد الزامات کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ان کے خیال میں ان کے دائرہ کار میں شامل حکومتوں کی جانب سے جوابات کا موصول ہونا انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور حکومتوں کی جانب سے تعاون کے مترادف تصور کیا جاتا ہے۔خصوصی رپورٹیر نے حکام پر زور دیا کہ وہ خط وکتابت میں اٹھائے گئے تمام تحفظات کے مفصل جوابات فراہم کریں۔

233. خصوصی رپورٹیر نے کمیشن برائے انسانی حقوق سے تعلق رکھنے والے زرطیف آفریدی کی ماورائے قتل پر بھی گہری تشویش کا اظہار کیا۔وہ پاکستان میں پرامن اجتماع اور انجمن سازی کی آزادی کا استعمال کرنے والے افراد کو جسمانی اور نفسیاتی سلامتی کے متعلق انتہائی فکر مند ہیں بالخصوص ایچ آر سی پی کے لیے کام کرنے والوں کے بارے میں جیسا کہ 2011 کے اوائل میں تنظیم کے دیگر دوارا کین مسٹر صدیق عیدو اور مسٹر نعیم صابر کو اغوا کر کے قتل کر دیا گیا تھا۔وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جو لوگ پرامن آزادی اجتماع اور انجمن سازی کے حقوق کا استعمال کرتے ہیں ریاست کا فرض ہے کہ ان کو تحفظ فراہم کرے۔

زرطیف آفریدی کے قتل کے متعلق مکمل اور آزاد تحقیقات کرائی جائیں اور ذمہ داران کو جوابدہ ہونا چاہیے۔انہوں نے حکومت سے درخواست کی کہ وہ انہیں بالائے ذکر مقدمہ کے متعلق کی گئی تحقیقات بارے آگاہ کرتی رہے۔

خصوصی رپورٹیر نے دوبارہ ہیومن رائٹس کونسل کی قرارداد نمبر 15/21 کا حوالہ دیا اور بالخصوص چارٹر پیرا گراف 1 کا تذکرہ کیا جو تمام ریاستوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تمام افراد کے پرامن اجتماع اور آزادانہ،انجمن سازی کے حقوق کا احترام اور تحفظ کرے بشمول انتخابات کے تناظر میں اور ان میں اقلیتی یا اختلافی آراوعقائد کا اظہار کرنے والے انسانی حقوق کے مدافعین ،ٹریڈ یونین کے رہنما اور مہاجرین سمیت وہ تمام لوگ شامل ہیں جو ان حقوق کا استعمال اور فروغ چاہتے ہیں۔مزید براں یہ مطالبہ بھی کیا کہ اس امر کو یقینی بنانے کے لیے تمام ضروری اقدامات اٹھائے جائیں کہ پرامن اجتماع اور انجمن سازی کی آزادی کے آزادانہ استعمال پر عائد پابندیاں انسانی حقوق کے بین الاقوامی قانون کے تحت ان پر عائد شدہ فرائض کی مطابقت میں ہوں۔خصوصی رپورٹیر نے حکومت پاکستان کو دسمبر 2011 میں پاکستان دورے کے لیے دی گئی درخواست کی یاد دہانی کرائی جس کا جواب موصول ہونا ابھی باقی ہے۔ اس حوالے سے قرارداد 15/21 کے 0P6 کے مطابق ہے ہیومن رائٹس کونسل کا ریاستوں سے مطالبہ ہے کہ وہ خصوصی رپوٹیر کے کام میں ان کی معاونت کرے،ان کی طرف سے مانگی گئی تمام ضروری معلومات فراہم کرے اور دورے کے حوالے سے ان کی کی گئی درخواست پر ازارہ عنایت غور کریں۔

ساتھ فاٹا کے علاقے میں اس قسم کے خطرات شدید تھے۔ جو لوگ خواتین اور تعلیم کے فروغ کے لیے کام کر رہے تھے ان کو زیادہ خطرات کا سامنا تھا۔

مئی 2012 میں، خیبر پختونخوا کے ضلع کوہستان میں سیاسی طور پر مضبوط ایک مذہبی پیشوا نے این جی اوز میں کام کرنے والی خواتین کو خبردار کیا کہ وہ کوہستان میں داخل نہ ہوں اور یہ دھمکی دی کہ اگر کسی خاتون نے اس تنبیہہ کو نظرانداز کیا تو اُس کی مقامی افراد کے ساتھ شادی کر دی جائے گی۔ مذہبی پیشوا نے یہ الزام لگایا کہ این جی اوز مغربی ایجنڈے پر کام کرتی ہیں اور کہا کہ این جی اوز کے ملازمین کو ہرگز یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ ترقی کے نام پر مقامی خواتین پر اثر انداز ہوں۔ سرکاری سطح پر اس دھمکی کا زبانی یا دیگر طریقے سے کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔

خواتین کے حقوق کا ایک ادارہ جس کا نام سوسائٹی فار اپریزل اینڈ وومین ایمپاورمنٹ ان رورل ایریاز (SAWERA) ہے اور فاٹا میں واقع ہے۔4 جولائی کو اس کی سربراہ فریدہ آفریدی کو ان کے گھر کے باہر دو مسلح موٹر سائیکل سواروں نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ خواتین کی مدد کرنے کی وجہ سے انھیں مسلسل دھمکیاں موصول ہو رہی تھیں۔

سول سوسائٹی کی تنظیمیں حکومت کو بار بار یہ کہتی رہیں کہ این جی اوز ملازمین اور انسانی حقوق کے محافظوں کی حالت کو بہتر بنایا جائے بالخصوص ان علاقوں میں جہاں شدت پسند جنگجو زیادہ سرگرم ہیں لیکن صورت حال میں یقینی طور پر 2012 میں بہتری نہ آئی۔

کالعدم تنظیمیں

قانون کے دائرہ کار میں رہ کر کام کرنے والی تنظیموں کے لیے اگرچہ کافی مشکلات رہیں مگر خلاف قانون کام کرنے والے گروپ اور تنظیمیں بغیر کسی مشکل کے کام کرتی دکھائی دیے۔ گزشتہ سالوں کی طرح، متعدد تنظیمیں جن کو تشدد پسندی اور دہشت گردی کی بنا پر حکومت نے کالعدم قرار دے دیا تھا، مختلف نام تبدیل کر کے کام کرتی رہیں۔ جنوری میں کالعدم تنظیم سپاہ صحابہ نے اسلام آباد میں ایک جلسہ منعقد کیا اور وزیر داخلہ سے مطالبہ کیا کہ وہ مقامی پولیس چیف سے جواب طلبی کریں اور متعلقہ پولیس اسٹیشن کے سربراہ کو برطرف کریں۔

فروری میں بہاولپور سے تعلق رکھنے والے ایک کالعدم گروہ نے یونیورسٹی آف پشاور کے کیمپس میں لیکچر دیا۔ لیکچر کے متعلق پوسٹر ایک دن پہلے ہی لگا دیے گئے تھے مگر یونیورسٹی انتظامیہ کوئی کارروائی کرنے میں

ناکام رہی۔ لیکچر اس تنظیم کی رکن سازی کے متعلق تھا اور ایک خبر کے مطابق کیمپس میں 30 افراد نے رکن سازی کا فارم بھرا۔

2012 میں وفاقی وزیر داخلہ نے اہل سنت والجماعت جس کا پرانا نام سپاہ صحابہ پاکستان تھا کا نام بھی فرقہ وارانہ تشدد میں ملوث ہونے کی بنا پر کالعدم تنظیموں کی فہرست میں ڈال دیا۔ اس پابندی کے بعد پاکستان میں گزشتہ گیارہ سالوں سے لے کر اب تک کالعدم تنظیموں کی تعداد 45 تک بڑھ گئی۔ اہل سنت والجماعت کے سربراہ نے اس پابندی کو چیلنج کرنے کا اعلان کیا۔ اس پابندی کے باوجود اہل سنت والجماعت کے سربراہ اور حافظ سعید جو کہ ایک دوسری کالعدم تنظیم جماعت الدعوۃ کے سربراہ ہیں نے ایک احتجاج اور دھرنے میں شرکت کی جو کہ دفاع کونسل پاکستان کی طرف سے وفاقی دارالحکومت میں منعقد کیا گیا تھا۔

سفارشات

1- ریاست کے لیے بہترین وقت ہے کہ وہ انجمن سازی کی آزادی کو جو بین الاقوامی، قومی اور قومی قانونی دستاویزات میں درج ہے صحیح معنوں میں یقینی بنائے اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں فی الفور اور مؤثر ازالہ کرے۔

2- انجمن سازی کے حق کو کسی خلا میں تو استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اس حوالے سے مجموعی طور پر صورت حال کو بہتر بنانے کی اشد ضرورت ہے۔ غیر ریاستی عناصر کو اس حق کی خلاف ورزی روکنے کے لیے کارروائی کرنے کے ساتھ ساتھ حق کو باآسانی قابل نفاذ بنانے اور اس اہم انسانی حق کی اہمیت بارے شعور اجاگر کرنے کے لیے ایک جامع حکمت عملی بنانے کی ضرورت ہے۔

3- پاکستان کو یو این سپیشل رپورٹیر برائے آزدی انجمن سازی کی پاکستان دورہ کی درخواست بلا تاخیر منظور کرنی چاہیے اور دورے کے دوران ان کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنا چاہیے۔

4- مرد و خواتین کو این جی او سے وابستگی کی بنا پر لاحق خطرات بالکل بھی قابل برداشت نہیں اور اس معاملے کو ترجیحاتی بنیادوں پر طے کرنا چاہیے۔ حکام کو این جی اوز ورکرز کو درپیش خطرات یا تشدد پر خاموش تماشائی کا کردار ادا نہیں کرنا چاہئے۔

4-فروغ جمہوریت

سیاسی عمل میں شرکت

ریاست اپنے اختیارات، عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔
جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور سماجی انصاف کے اصولوں کا جو تصور اسلام نے پیش کیا ہے، اس کی مکمل پاسداری کی جائے گی۔
بنیادی حقوق کی مکمل ضمانت دی جائے گی جہاں تک کہ قانون اور اخلاق عامہ اس کی اجازت دیں۔
آئین پاکستان [دیباچہ]
ریاست علاقائی سطح پر منتخب نمائندوں کے ذریعے مقامی حکومت کے (بلدیاتی) اداروں کی حوصلہ افزائی کرے گی، اور ان (بلدیاتی) اداروں میں کسانوں، مزدوروں اور عورتوں کو خصوصی نمائندگی دینے کا اہتمام کیا جائے گا۔
آئین پاکستان [آرٹیکل-32]
۔۔۔ یہ ضروری ہے کہ انسانی حقوق کو قانون کی عمل داری کے ذریعے یقینی بنایا جائے، ورنہ انسان عاجز آ کر جبر و استبداد اور ظلم کے خلاف خود بغاوت پر مجبور ہو جائے گا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [ابتدائیہ]
تمام انسان آزاد اور حقوق و عزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوتی ہے۔ انھیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل-1]
ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طریقے سے منتخب کیے گئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔
ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق حاصل ہے۔
عوام کی مرضی حکومت کے اختیار و اقتدار کی بنیاد ہو گی۔ اس مرضی کے اظہار کے لیے متعین مدت کے بعد ایسے حقیقی انتخاب منعقد کرائے جائیں گے، جن میں عام اور مساوی حق رائے دہی کا استعمال خفیہ رائے شماری یا اس جیسے کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے شماری کے ذریعے کیا جائے گا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل-21]

سیاسی عمل میں شرکت کو اِس اصول کی بنیاد پر ایک بنیادی حق سمجھا جاتا ہے کہ کروڑوں افراد پر مشتمل معاشرہ صرف اِس صورت میں بہتر کام اور ترقی کر سکتا ہے اگر وہ یکجا عضو کی طرح کام کرے جس میں ہر آدمی

انتخابات سے متعلقہ مشاورت

کی رائے کو اہمیت دی جائے اور وہ سیاسی عمل کا حصہ تصور کیا جاتا ہو۔ جن معاشروں میں سیاسی قیادت اپنے افراد کے ساتھ تعلق منقطع کر دیتی ہے وہ جمہوری طرز پر کام کرنا ترک کر دیتے ہیں اور حکام کی توجہ حاصل کرنے کے لیے تشدد کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ پاکستان اِسی طرح کا معاشرہ بنتا جا رہا ہے۔ 2012 میں ملک بالخصوص کراچی، کشیدگی زدہ علاقوں، بلوچستان، فاٹا اور خیبر پختونخوا کے علاقوں میں سیاست زدہ تشدد کا بہت زیادہ مظاہرہ کیا گیا ہے۔ سیاسی جماعتوں نے اپنا کنٹرول برقرار رکھنے کے لیے اپنے جنگجو گروہوں کو قائم رکھا۔ زیرِنظر سال اِس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ حکومت کا آخری سال تھا کیونکہ 2013 کے اوائل میں انتخابات کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ سال کے دوران کئی جماعتوں کے اندرونی انتخابات کا مشاہدہ کیا گیا جو جمہوری نوعیت کے نہیں تھے۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان (ای سی پی) بھی حرکت میں آیا اور ووٹرز فہرست کی اشاعت اور صاف وشفاف انتخابات کے انعقاد کو یقینی بنانے کا ذمہ دار قرار پایا۔

الیکشن کمیشن آف پاکستان

اگرچہ بعض سیاسی گروہوں کی جانب سے ای سی پی کی غیر جانبداری کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کیا گیا مگر اس امر پر اتفاق کا اظہار کیا گیا کہ ای سی پی کے سربراہ اور اراکین کی تقرریاں سیاسی بنیاد پر عمل میں نہیں لائی گئیں اور پاکستان میں یہ معمولی پیش رفت نہیں ہے۔ جولائی میں تمام مرکزی سیاسی جماعتوں نے جسٹس (ر) فخر الدین جی ابراہیم کو چیف الیکشن کمشنر بنانے پر اتفاق کا اظہار کیا۔ اِس امر کا مشاہدہ کیا گیا کہ تمام ای سی پی اراکین مرد تھے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ شاید ملک میں کوئی بھی خاتون ای سی پی کا رُکن بننے کی اہل

نہیں ہے۔ ایچ آر سی پی نے اس چیز کا نوٹس لیا اور ای سی پی میں خواتین کی نمائندگی کی ضرورت پر زور دیا۔ صاف وشفاف انتخابات کے انعقاد کو یقینی بنانے کے لیے سیاسی جماعتوں کو متعدد تجاویز پیش کی گئیں اور عہد و پیمان کیے گئے۔ بدقسمتی سے سیاسی جماعتوں میں عدم اتفاق کے باعث ای سی پی اپنے متعدد وعدوں سے پیچھے ہٹ گیا۔ ایسا ایک وعدہ اُن حلقہ انتخابات میں انتخابی نتائج کو کالعدم قرار دینا تھا جہاں خواتین کے 10 فیصد سے کم ووٹ کاسٹ ہوں گے۔ اس تجویز سے قبل ای سی پی نے فریقین کے ساتھ مئی میں چھ مشاورتی اجلاس کیے تھے۔ تاہم ستمبر میں ایک مشاورتی اجلاس کے دوران اِس تجویز کو ناقابلِ نفاذ قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا۔

دوسرا وعدہ جس سے پسپائی اختیار کی گئی وہ سمندر پار پاکستانیوں کو ووٹ کاسٹ کرنے کا حق دینے سے متعلق ہے۔ فروری میں ای سی پی نے اعلان کیا کہ سینتیس لاکھ (3.7 ملین) بیرون ملک پاکستانیوں کو ووٹ کا حق دے دیا گیا ہے اگرچہ اس بارے میں تفصیلی منصوبہ جاری نہ کیا گیا۔ تاہم ستمبر کے آخر میں ای سی پی نے بیرون ملک پاکستانیوں کو ووٹ ڈالنے کے لیے مطلوبہ سہولیات کی فراہمی سے معذوری ظاہر کی۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ دنیا بھر میں موجود پاکستانیوں کی انتخابات میں شمولیت کے لیے مناسب انتظامات کے لیے مطلوبہ وقت کی کمی ہے۔ ایچ آر سی پی کے خیال میں دنیا کے کسی بھی خطّے میں آباد پاکستانیوں کو ووٹ ڈالنے کا حق ملنا چاہیے کیونکہ حق کے معاملے سے قطع نظر وہ زرِ مبادلہ بھیج کر پاکستان کی معیشت میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تاہم ای سی پی نے انتخابات کے عمل کو ممکنہ حد تک غیر جانبدار اور صاف وشفاف بنانے کے لیے چند ضروری اقدامات کیے۔ ستمبر میں ای سی پی کے ایڈیشنل سیکرٹری نے اعلان کیا کہ الیکشن کمیشن انتخابات میں بے ضابطگیوں کی روک تھام کے لیے نشانی / انگوٹھے کی سراغ رسانی کے لیے ٹیکنالوجی متعارف کروائے گا۔ اگر

ای سی پی آزاد وشفاف انتخابات کے لیے پُرعزم

شکایات موصول ہوئیں کہ کسی حلقہ انتخاب میں دھاندلی یا بے ضابطگی سرزد ہوئی ہے تو وہاں کے ووٹوں کو تصدیق کے لیے نادرا کے پاس بھیجا جائے گا۔ اگر ووٹ جعلی قرار پائے گئے تو متعلقہ حلقہ انتخاب کے انتخابی نتائج کالعدم قرار دیے جائیں گے اور وہاں نئے سرے سے انتخاب ہوگا۔ صاف وشفاف انتخابات کے لیے اس طرح کے نئے طریقوں کو سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی کی جانب سے سراہا گیا۔ ای سی پی کے کام میں شفافیت متعارف کروانے کے لیے دوسرا اقدام جولائی میں ووٹر فہرستوں کا اجرا ہے۔ ای سی پی کے سربراہ نے کہا کہ 47 ملین مردوں اور 36 ملین خواتین پر مشتمل 84 ملین ووٹر رجسٹر ہوئے ہیں اور یہ فہرست گھر گھر دورہ کر کے مرتب کی گئی ہے۔ ووٹروں کو اپنا ووٹ چیک کرنے اور پولنگ اسٹیشن معلوم کرنے کے حوالے سے اُنہیں مختصر پیغام رسانی خدمت (ایس ایچ ایس) کی سہولت فراہم کی گئی۔ ستمبر میں سپریم کورٹ نے دہری شہریت رکھنے والے اراکین اسمبلی کو نااہل قرار دے دیا اور کہا کہ وہ کوئی پبلک عہدہ نہیں رکھ سکتے۔ نتیجے کے طور پر ای سی پی نے سپریم کورٹ کے فیصلے کی مطابقت میں 11 اراکین اسمبلی کو نااہل قرار دے دیا۔ اُن میں زاہد اقبال، فرح ناز اصفہانی، محمد اخلاق، اشرف چوہان، نادیہ گبول، آمنہ بٹر، جمیل اعوان، وسیم قادر، فرحت محمود خان، ندیم خادم اور احمد علی شاہ شامل تھے۔ دسمبر میں ای سی پی نے کراچی میں انتخابات سے قبل نئی حلقہ بندیاں کروانے کا فیصلہ کیا باوجود اس امر کے کہ کراچی کی مرکزی جماعت ایم کیو ایم نے اِس فیصلے کی خلاف ورزی کی تھی۔ متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) نے دو نظر ثانی پٹیشنیں دائر کر کے اس فیصلے کو چیلنج کیا۔ ای سی پی کے سیکرٹری نے کہا کہ نئی حلقہ بندیاں کرنے کا فیصلہ سپریم کورٹ کے دو فیصلوں، آئین اور قانون کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ اُنہوں نے مزید کہا کہ حلقہ بندیوں کا عمل شفاف اور قانون کے مطابق ہوگا اور اس کے باعث شہر میں امن وامان کی صورت حال کنٹرول کرنے میں مدد ملے گی۔

سیاسی جماعتیں

اگرچہ بلوچ، شیعہ ہزارہ اور مذہبی اقلیتوں سمیت تمام ستم زدہ گروہوں کے لیے الگ الگ سیاسی جماعتیں موجود ہیں مگر زیادہ تر جماعتوں میں جمہوری روح کی کمی کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ 2012 میں پاکستان میں 162 رجسٹرڈ جماعتیں تھیں جن میں سے بہت کم دعویٰ کر سکتی ہیں کہ اُن جماعتوں کے اندرونی انتخابات صاف وشفاف تھے۔ سول سوسائٹی تنظیموں کی رپورٹس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیادہ تر جماعتیں بامعنی جماعتی انتخابات منعقد کروانے میں ناکام رہی ہیں۔ اس کی بجائے محض دکھاوے کے انتخابات کروائے گئے جس کے باعث پرانے عہدیدار ہی اہم عہدے برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ تقریباً تمام سیاسی جماعتوں نے عموی

دوسرے دن، دوسرا قتل: کراچی میں سیاست زدہ تشدد عروج پر تھا

انتخابات کے قریب اندرونی جماعتی انتخابات کروائے جس کا بنیادی مقصد جمہوری رُوح کی پیروی کی بجائے محض ای سی پی کی شرائط پر پورا اترنا تھا۔ انتخابات کی آمد کے موقع پر نئے اور غیر حقیقی تصورات کے حامی بھی منظر عام پر آنا شروع ہو گئے ہیں۔ ایک پاکستانی نژاد کینیڈین مذہبی رہنما اور سابقہ سیاستدان طاہر القادری پاکستان واپس آئے اور دسمبر 2012 میں ایک بڑی ریلی نکالی۔ اُنہوں نے یہ کہتے ہوئے الیکشن کمیشن اور حکومت کو چیلنج کیا کہ وہ حکومت کو ایک دیانتدار اور شفاف ادارے کے قیام کے لیے تین ہفتوں کا وقت دے رہے ہیں جو انتخابی اصلاحات متعارف کروائے گا اور صاف وشفاف انتخابات کے لیے راہ ہموار کرے گا۔ اُنہوں نے خبردار بھی کیا کہ اگر 10 جنوری تک اُن کا مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا تو 14 جنوری کو لاکھوں لوگ اسلام آباد کی طرف مارچ کریں گے جو نظام کی تباہی کا شکار ہوگا۔ بعدازاں اُنہوں نے حکومتی جماعتوں کے ساتھ معاہدہ کیا جس کی پاسداری کے بہت کم امکانات تھے۔ بالعموم ملک جبکہ بالخصوص کراچی میں امن عامہ کی ابتر صورت حال کی بنیادی وجہ سیاسی جماعتوں کے مسلح گروہ ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ کراچی میں ٹارگٹ کلنگ معمول کی چیز ہے اور قاتلوں کو کبھی بھی گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ سیاسی کارکنوں کو بلا روک ٹوک نشانہ بنایا جا رہا ہے جبکہ حکومتی کارروائیاں بہت کم بارآور ثابت ہوئی ہیں۔ نومبر میں سینیٹ نے اس مسئلے کا نوٹس لیا تھا اور سب کی رائے تھی کہ کراچی میں سیاسی جماعتوں کے مسلح گروہ موجود ہیں جس پر ایوان نے اکثریتی ووٹوں سے قرارداد منظور کی کہ شہر کو اسلحہ سے پاک کرنے کے لیے حکومت کو موثر اقدامات کرنے چاہئیں۔

مردم شماری میں تاخیر

پاکستان میں مردم شماری کا عمل ہمیشہ تاخیر کا شکار رہا ہے۔ تازہ مردم شماری جس کے 2008 میں ہونے کے امکانات تھے، متعدد عوامل کے باعث تاخیر کا شکار ہوگئی۔ پاکستان کی سول سوسائٹی گزشتہ پانچ برسوں سے حکام کو ملک میں مردم شماری کی اہمیت اور اس کے التوا کے نقصانات سے آگاہ کر رہی ہے مگر اس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

فروری میں سابق رکن پارلیمان ماروی میمن نے چیف جسٹس سے اپیل کی کہ وہ بروقت مردم شماری کرانے میں حکومتی ناکامی کا ازخود نوٹس لیں۔ طے شدہ شیڈول کے مطابق مردم شماری کا عمل 2011 کے اختتام تک مکمل ہونا تھا مگر یہ شروع ہی نہیں ہوسکا۔ انہوں نے اِس بات کی درست نشاندہی کی کہ جائز انتخابات تب ہی ممکن ہوسکتے ہیں اگر ملکی آبادی کی تعداد بارے علم ہو۔ چیف الیکشن کمشنر نے بھی کہا کہ مردم شماری کی تکمیل کے بغیر حلقہ بندیوں کا عمل غیر مؤثر ثابت ہوگا۔ متروک معلومات کی بنیاد پر ہونے والے انتخاباتی بجٹ سے متعلقہ اور ترقیاتی فیصلے مختلف جماعتوں میں اختلافات کا باعث بنتے ہیں اور فنڈز کی غلط تخصیص کا سبب بنتے ہیں۔

منتخب شدہ وزیر اعظم کی نااہلی

2011 کا سال امید کی معمولی سی کرن کے ساتھ اختتام پذیر ہوا تھا کہ انتظامیہ اور عدلیہ کے مابین جاری کشیدگی کسی طرح ختم ہو جائے گی۔ تاہم بدقسمتی سے وہ واقعہ رونما ہو گیا جس کی پیشین گوئی متعدد سیاسی مبصرین نے کی تھی۔ یوسف رضا گیلانی بطور وزیر اعظم اپنی مدت پوری نہ کر سکے۔ ایک غیر معمولی فیصلے میں پاکستان کی سپریم کورٹ (ایس سی) نے الیکشن کمیشن آف پاکستان (ای سی پی) کو ہدایت کی کہ وہ سید یوسف رضا گیلانی کی ارکان کی رکنیت کو ختم قرار دے جس کا نفاذ 26 اپریل 2012 سے تصور ہو۔ سپیکر قومی اسمبلی فہمیدہ مرزا نے قرار دیا تھا کہ سزایابی کے نتیجے میں وزیر اعظم کی رکنیت اسمبلی ختم نہیں ہوسکتی جس کے خلاف سپریم کورٹ میں پٹیشنیں دائر کی گئی تھیں جن کو منظور کرتے ہوئے سپریم کورٹ نے وزیر اعظم کی نااہلی کا مذکورہ فیصلہ سُنایا۔ بعض قانونی ماہرین اور سیاسی تجزیہ کاروں نے اِس فیصلے کو نرم بغاوت قرار دیا۔ مسٹر گیلانی کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما راجہ پرویز اشرف نئے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔

سیاسی کارکنوں پر حملے

سیاسی جماعتوں کے مسلح گروہوں اور ملک میں بڑھتی ہوئی شدت پسندی کے باعث سال 2012 بھر میں سیاسی کارکنوں کو نشانہ بنایا جاتا رہا۔ اِس حوالے سے ایک بڑا واقعہ عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی) کے

سینکڑوں سیاسی کارکن موت کا شکار ہوئے

رہنما اور خیبر پختونخوا کے سینئر وزیر بشیر احمد بلور کی ہلاکت ہے۔ یاسمین ضیا دھماکے کے وقت اپنے گھر میں موجود نہ ہونے کے باعث بچ گئیں مگر اُن کا گھر تباہ ہوگیا۔ حالیہ برسوں سے خیبر پختونخوا کی سب سے بڑی سیاسی جماعت اے این پی کو اُس کے مذہبی جدت پسندی کے نظریے کے باعث طالبان اور دیگر شدت پسندوں کی جانب سے مسلسل نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اِسی طرح حالیہ برسوں میں کراچی میں تشدد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے اور بڑی سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ کراچی میں صرف 2012 میں 356 سیاسی کارکنوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ ایک پریس کانفرنس میں سندھ کے سابق وزیر داخلہ نے دعویٰ کیا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے 150 سے زائد کارکن 2012 میں کراچی میں نشانہ بنے ہیں۔ (انجمن سازی کی آزادی والا باب بھی ملاحظہ کریں)

پارلیمان کی کارکردگی

پارلیمان کے پانچویں جاری سال کے دوران قومی اسمبلی نے 17 قوانین منظور کیے۔ قومی کمیشن برائے انسانی حقوق بل 2012، پہلا بل تھا جو مئی 2012 میں منظور ہوا۔ پاکستان کی قومی اسمبلی نے دسمبر میں تحقیقات برائے شفاف ٹرائل بل 2012، جیسا متنازعہ بل منظور کیا جس کے باعث دہشت گردوں کی گرفتاری کے لیے سکیورٹی ایجنسیوں کو نجی کمیونیکیشن کی سراغ رسانی کی اجازت دے کر اُنہیں لوگوں کی نجی

زندگی میں مداخلت کی اجازت دی گئی۔ دوسری جانب قومی اسمبلی نے 2012 میں مفت اور لازمی تعلیم کے حق کا بل منظور کیا تا کہ آئین کی دفعہ 25 الف کی رُو سے وفاقی حکومت اور دارالحکومتی علاقہ اسلام آباد (آئی سی ٹی) کے سکولوں میں 5 سے 16 برس کی عمر کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کی جائے۔ بیسویں ترمیم اِس برس منظور ہوئی جو غیر جانبدار نگران حکومت، طاقتور اور خودمختار الیکشن کمیشن کے قیام اور انتخابات کے بعد اختیارات کی پُرامن منتقلی کو یقینی بنائے گی۔ (قوانین وقانون سازی کا باب بھی ملاحظہ کریں)

خواتین کی شرکت

زیرِنظر سال میں قومی اسمبلی کی 342 نشستوں میں خواتین نشستوں کی تعداد 60 رہی باوجود اِس امر کے کہ وہ آبادی کے آدھے حصے پر مشتمل ہیں۔ مگر اِن خواتین اراکین قومی اسمبلی کی کارکردگی ظاہر کرتی ہے کہ اُنہوں نے اپنی نمائندگی سے بڑھ کر کام کرنے کا مظاہرہ کیا ہے۔ گزشتہ چار برسوں میں خواتین کے حقوق کے لیے چھ قراردادیں منظور ہوئیں اور کام کار کے مقامات پر ہراسیمگی، تیزاب کے حملے اور فرسودہ روایات کے خاتمے سمیت متعدد قوانین منظور ہوئے۔ ستمبر کے آخر میں اسلام آباد میں ایک روزہ گول میز کانفرنس کے دوران خواتین اراکین پارلیمان اور پارٹی رہنماؤں نے کہا کہ وہ 2013 کے انتخابات میں جیتی ہوئی نشستوں پر کم از کم 10 فیصد کوٹہ خواتین کو دینے کے لیے اپنی جماعتوں کے اندر اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ چونکہ خواتین کی بہت کم تعداد سیاسی عمل میں سرگرم حصہ لینے کی حالت میں ہے اس لیے اُنہیں بہت زیادہ رکاوٹوں اور امتیازی سلوک کا سامنا ہے۔ سیاست میں قائدانہ کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھنے

خیبر پختونخوا میں سیاسی کارکنوں نے انتہا پسندوں کے آگے پسپا ہونے سے انکار کردیا

والی خواتین کردار کشی کا نشانہ بنتی ہیں۔ اِس طرح کا ایک واقعہ 2012 میں بہت زیادہ معروف ہوا جس میں وزیرِ خارجہ حنا ربانی کھر کے خلاف غیر اخلاقی زبان استعمال کی گئی تھی۔

اقلیتیں

حکومت نے کابینہ کی ہدایت پر آئینی ترمیمی ایکٹ 2012 پیش کیا جس کا مقصد قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں اقلیتوں کی نشستوں میں اضافہ کرنا تھا۔ اس ترمیم میں تجویز پیش کی گئی کہ قومی اسمبلیوں میں اقلیتوں کے لیے 4 مزید نشستیں ہونی چاہئیں جبکہ پنجاب، سندھ، خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں اُن کے لیے بالترتیب 10، 12، 9 اور 4 نشستوں تک اضافہ کیا جائے۔ یہ بل سال کے آخر پر پیش ہوا جو اقلیتوں کے لیے مفید ثابت نہ ہوا۔ 2012 میں متعدد گرجا گھر (بشمول ایک فیصل آباد میں، ایک مردان میں اور چھ سندھ میں)، تین ہندو مندر، اور ایک احمدی عبادت گاہ اُن عبادت گاہوں میں شامل ہے جنھیں نقصان پہنچایا گیا یا تباہ کیا گیا۔ کھاریاں میں پنجاب پولیس نے احمدی عبادت گاہ کے میناروں کو مسمار کیا جبکہ زیادہ تر واقعات کے مجرموں کی شناخت نہ ہوسکی۔ سیاسی سرگرمی بالخصوص انتخابات میں احمدیوں کی شمولیت محدود رہی۔ وہ صرف اُن کے لیے جداگانہ انتخابی فہرستوں کو ماننے سے انکار پر انتخابی عمل سے باہر رہے۔ اس لحاظ سے ملک کے خواجہ سرا خوش قسمت ثابت ہوئے کیونکہ سپریم کورٹ کے حکم پر اُنہیں رجسٹرڈ ووٹر کا درجہ دے دیا گیا۔

سفارشات

1- انتخابات سے قبل کے عرصہ میں الیکشن کمیشن اور سیاسی جماعتوں کی طرف سے ووٹروں کو سیاسی عمل میں مشغول کرنے کی تگ ودو کا مشاہدہ کیا گیا۔ جمہوری اصولوں کی پاسداری کے لیے ضروری ہے کہ عوام کو انتخابات کے درمیانی عرصہ میں بھی سیاسی عمل میں مشغول رکھا جائے۔

2- جمہوری حقوق کا آزادانہ استعمال تشدد کے باعث شدید متاثر ہوا ہے۔ سیاسی کارکنوں پر حملے قابل مذمت ہیں اور تمام سیاسی کارکنوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کرنے چاہئیں۔

3- سیاسی جماعتوں کو چاہیے کہ وہ عمومی انتخابات میں اپنے خواتین اور اقلیتی اراکین میں سے زیادہ امیدوار نامزد کریں کیونکہ اُن کی نمائندگی بہت زیادہ کم ہے۔ خواتین کو انتخابی عمل بالخصوص ووٹنگ سے محروم کرنے کی منظّم کوششوں کی بنیادی وجہ اس حوالے سے مؤثر اقدامات کرنے میں حکام کی ناکامی ہے۔

4- انتخابی عمل کو صاف و شفاف بنانے کے لیے ای سی پی کو نئے ضوابط نافذ کرنے چاہئیں اور نئی تجاویز متعارف کروانی چاہئیں۔

5- محروم طبقوں کے حقوق

عورتیں

تمام شہری قانون کے روبرو، مساویانہ حیثیت رکھتے ہیں اور مساویانہ قانونی تحفظ کے حق دار ہیں، محض جنس کی بنا پر کسی شہری کے خلاف امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔

کسی بھی شہری کو، جو پاکستان کی سروسز میں تقرری کی اہلیت رکھتا ہے، محض جنس کی بنا پر اسے تقرری کے سلسلے میں امتیازی سلوک کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

قومی زندگی کے تمام شعبوں میں، خواتین کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔ ریاست، شادی، خاندان اور ماں کو تحفظ فراہم کرے گی۔

ریاست اس بات کو یقینی بنائے گی کہ خواتین کو ان شعبوں میں ملازم نہ رکھا جائے جو ان کی جنس سے مطابقت نہیں رکھتے۔

آئین پاکستان [آرٹیکل نمبر 25-27-35-37]

تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور وقار اور حقوق کے سلسلے میں مساویانہ حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔

اس اعلان میں جن آزادیوں اور حقوق کا ذکر ہے، ہر انسان ان پر بغیر کسی قسم کی تفریق کے حق رکھتا ہے۔

تمام انسان قانون کے روبرو مساویانہ حیثیت رکھتے ہیں اور بغیر کسی تفریق کے، مساویانہ قانونی تحفظ کے مستحق ہیں۔

ہر بالغ مرد اور عورت، شادی کے دوران اور شادی کے خاتمہ کے سلسلے میں مساویانہ حقوق رکھتا ہے۔

شادی مرد و زن کی آزادانہ اور مکمل رضامندی کے مطابق طے پانی چاہیے۔

ہر فرد کو اپنے ملک کی پبلک سروس تک مساویانہ رسائی کا حق حاصل ہے۔

ماں اور بچہ خصوصی سلوک اور مدد کے مستحق ہیں۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل 1-2-7-16`21(2)-25(2)]

خواتین کے خلاف تشدد کا سلسلہ جاری رہا۔ خواتین کو اپنے حقوق مثلاً تعلیم، کام اور بالعموم اپنی زندگی کے متعلق فیصلوں میں اپنی رائے کا اظہار کرنے پر حملوں کا نشانہ بنایا گیا اور قتل کیا گیا۔ سفاکانہ جرائم مثال کے طور پر تیزاب پھینکنے اور غیرت کے نام پر قتل کے واقعات ان حملوں کو روکنے کے لیے کیے جانے والے منظم اقدامات اور قانونی کارروائی کے بغیر برقرار رہے۔ مثال کے طور پر جون میں کوہستان میں چار خواتین کو ایک

شادی کی تقریب میں گانے اور رقص کرنے پر ایک قبائلی جرگے، جس نے ان کے اس فعل کو شرمناک قرار دیا، کے حکم پر پھانسی دے دی گئی۔ اگرچہ ان کے رشتہ داروں نے اس کی تردید کی۔ سال کا ایک اور ہولناک وقوعہ ایک کم سن عیسائی بچی رمشا مسیح سے تعلق رکھتا تھا جسے قرآن کے اوراق جلانے کے جھوٹے الزامات پر تضحیک مذہب قانون کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ (دیکھئے باب ''ضمیر، فکر اور عقیدے کی آزادی'')

خواتین کے لیے پناہ گاہوں کے قیام کی ضرورت کو نظر انداز کیا جاتا رہا جس طرح کہ تربیت یافتہ عملے کی کمی کے باعث پولیس رپورٹنگ اور تحقیقاتی نظام کے معاملے میں ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں نے متعدد مظاہروں اور سرگرمیوں کے ذریعے 8 مارچ کو خواتین کے عالمی دن میں گہری دلچسپی لی۔ حکومت پنجاب نے اس دن اپنے ''خواتین کے اختیارات کے پیکیج کا اعلان کیا۔ یہ پالیسی اور تجاویز کی ایک ایسی فہرست تھی جس کا مقصد خواتین کے حقوق کے تحفظ اور ان کی معاشرتی و معاشی حیثیت کو بہتر بنانا تھا۔ اس پیکج میں مندرجہ ذیل اقدامات مثال کے طور پر وہ طریقہ کار جس کے ذریعے خواتین کو زمین ورثے میں ملی ہے، میں بہتری لانا، کام کرنے کی جگہ پر جنسی ہراسیمگی کے واقعات سے نمٹنے کے لیے ایک محتسب کی تعیناتی اور تیزاب حملوں سے متاثر ہونے والی خواتین کو تحفظ اور طبی امداد کی فراہمی شامل تھے۔ یہ تجاویز قابل تحسین تھیں لیکن زیر جائزہ سال کے آخر تک ان پر عملدرآمد نہیں کیا جا سکا تھا۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق ملک بھر میں 2012 کے دوران خودکشی کا ارتکاب کرنے والے ایک 1,976 افراد میں 626 خواتین شامل تھیں۔ اقدام خودکشی کرنے والے

غربت خواتین کو درپیش روایاتی مظالم میں اضافے کا سبب بنی

873افراد میں 382 خواتین تھیں۔

معاشی اور معاشرتی حقوق (چیلنج اور مواقع)

ایسا ملک جو معاشی وسائل کی غیر مساوی تقسیم کا حامل رہا ہے وہاں زیر جائزہ سال میں خواتین (بالخصوص نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی) کے معاشی اور معاشرتی مقام میں اضافے کے لیے چند اقدامات کیئے گئے۔ اگرچہ یہ اقدامات خواتین کو اختیار دینے کے حوالے سے زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوئے، تاہم اس شعبے میں خواتین کی حالت میں بہتری یقیناً نمایاں تھی۔ حکومت پنجاب نے صوبے میں خواتین کے لیے چند معاشی مواقع کا اعلان کیا ان میں سے ایک اہم اقدام خواتین کو چھوٹے قرضے فراہم کرنے کے لیے حکومتی زیر ملکیت پنجاب بنک میں دو ارب روپے کے فنڈ کا قیام تھا۔ سرکاری نوکریوں کے لیے خواتین عہدیداروں کا کوٹہ پانچ فیصد سے بڑھا کر پندرہ فیصد کر دیا گیا (اگرچہ ان پر مناسب عملدرآمد نہیں کیا گیا) جبکہ 2013 کے بجٹ میں خواتین کی فلاح و بہبود مثال کے طور پر جن کا ذکر خواتین کی خودمختاری کے پیکج میں کیا گیا ہے، کے لیے چودہ ارب روپے مختص کیئے گئے۔

صوبائی حکومت نے ترقیاتی ادارہ برائے خواتین میں تیس نئی آسامیوں کا بھی اضافہ کیا، جس نے 2012 میں پندرہ لاکھ آٹھ ہزار روپے جاری کیئے۔ یہ بات واضح نہیں تھی کہ بہت سے اقدامات جو کہ بظاہر قابل تعریف تھے، کا کتنا اثر پڑے گا۔ دیہی خواتین کی ضروریات جنہیں معاشی اور خودمختاری کے منصوبے کے طور پر تسلیم کیا گیا تھا، کو سرکاری اور سول سوسائٹی گروہوں کے ذریعے متعارف کرایا گیا۔ بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کے تحت پیشہ وارانہ مہارت کے فروغ کا لائحہ عمل متعارف کرایا گیا جس میں ہر حصہ دار کو ہیلتھ انشورنس کے علاوہ 12 امریکی ڈالر ماہوار بھی دیئے جاتے تھے۔ ایک بار پھر اس بات کی خاطر خواہ تفصیلات سامنے نہیں آئیں کہ ان منصوبوں پر کس حد تک عملدرآمد کیا گیا۔ تعلیمی ادارے پیشہ وارانہ مہارت کے کورس متعارف کرانے میں سرگرم نظر آئے اور فیصل آباد یونیورسٹی نے دیہی خواتین کے لیے پیشہ وارانہ تربیتی کیمپ کا انعقاد کیا تاکہ وہ اپنے معیار زندگی کو بہتر بنا سکیں۔ کورس میں سلائی، فنون لطیفہ اور دستکاری، کھانا پکانے اور فیشن ڈیزائننگ کے بارے میں رہنمائی فراہم کی گئی۔ یونیسکو اور دیہی میڈیا نیٹ ورک، جو ایک غیر منافع بخش ادارہ ہے اور جس کا مقصد پاکستان میں آزاد دیہی میڈیا کو ترقی دینا ہے، نے تین روزہ صلاحیت سازی ورکشاپ کا اہتمام کیا جس میں دیہی خواتین کو صحافتی تحریر اور رپورٹنگ کے بنیادی اصولوں کے بارے میں تعلیم دی گئی۔ ورکشاپ میں شرکاء کو خواتین کے خلاف تشدد اور ان کے حقوق سے متعلق مسائل کا احساس دلانے پر بھی توجہ دی

گئی، جس کا بنیادی مقصد شرکاء میں ان کے حقوق کے متعلق سمجھ بوجھ میں اضافہ کرنا اور حکومتی عہدیداروں یا کسی اور کے ہاتھوں تشدد، ہراسیمگی اور امتیازی سلوک کے کسی بھی واقعے کے بارے اطلاع دینے کی صلاحیت فراہم کرنا تھا۔

مارچ میں ایک تنظیم ایکشن ایڈ، جو محروم طبقات کے حقوق کے لیے جدوجہد کرتی ہے، نے پشاور میں علاقے کی کسان خواتین کے ساتھ ایک مکالمے کا انعقاد کیا۔ گفتگو کا بنیادی مقصد حکومت کو زرعی پالیسی 2005 کے نفاذ پر قائل کرنا تھا۔ اس حوالے سے مطالبہ کیا گیا کہ صوبے میں خوراک کے عدم تحفظ کی بڑھتی ہوئی سطح کے باعث خیبر پختونخوا کی خواتین کسانوں پر خصوصی توجہ دی جائے کیونکہ وہاں زیادہ تر گھرانوں کی 30 فیصد آمدنی صحت یا تعلیم کی بجائے خوراک پر صرف ہوتی ہے۔ ٹریڈ یونین میں خواتین کی نمائندگی انتہائی کم تھی اور ملک میں ٹریڈ یونینوں میں خواتین کی نمائندگی کا تناسب صرف دو فیصد تھا۔ پاکستان کی 7,382 ٹریڈ یونینز کے ساتھ 4,487 خواتین وابستہ تھیں۔ گھر میں رہ کر کام کرنے والے مزدور جن میں زیادہ اکثریت خواتین کی ہے، کے حقوق کے معاملے پر سول سوسائٹی کے اراکین نے خصوصی توجہ دی کیونکہ اعداد وشمار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ گھر رہ کر کام کرنے والی مزدور خواتین کی تعداد میں سالانہ 8.91 فیصد اضافہ ہوتا ہے اور انہیں قانونی تحفظ بھی حاصل نہیں۔ سول سوسائٹی نے گھر پر رہ کر کام کرنے والے مزدوروں کے لیے پالیسیوں کے نفاذ اور انہیں متعلقہ صوبوں کے لیبر ڈیپارٹمنٹ میں رجسٹر کرانے کے لئے حکومت پر شدید دباؤ ڈالا۔ ہوم نیٹ پاکستان جو ایک غیر منافع بخش ادارہ ہے اور جو گھر پر رہ کر کام کرنے والے مزدوروں کے لیے کام کرتا ہے، کے مطابق پالیسیوں کے نفاذ سے 41.9 فیصد شہری اور 70.50 فیصد دیہی خواتین مزدوروں کو اندراج شدہ مزدوروں کا درجہ حاصل ہو جائے گا جس کی بدولت وہ ملک میں مزدوروں کے حقوق کے فوائد مثال کے طور پر پینشن سے استفادہ حاصل کر سکیں گی۔ اٹھارویں ترمیم کے تحت بہت سے وفاقی منصوبے صوبوں کے تحویل میں آنے سے وسائل کی قلیل تخصیص اور ترجیحات کے صحیح تعین کے باعث کچھ مراکز مثال کے طور پر حادثاتی مراکز برائے خواتین پر کم از کم وقتی طور پر نہایت منفی اثرات مرتب ہوئے۔ جون میں خیبر پختونخواہ حکومت نے اپنے حادثاتی مراکز برائے خواتین میں سے چار کو بند کر دیا۔ ان مراکز نے پناہ گاوں کے علاوہ طبی امداد فراہم کرتے ہوئے 5300 خواتین کی مدد کی تھی۔ ان میں سے ایک مرکز سوات میں اور دیگر تین صوبے کے اضلاع کوہاٹ، ایبٹ آباد اور پشاور میں واقع تھے۔ ان مراکز میں سے پنجاب کے بارہ مراکز کے بارے میں تا حال کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا تھا کہ وہاں کام جاری رکھا جائے یا نہیں۔ خیبر پختونخوا کی وزارت کھیل نے ایک خوش آئند پیش رفت کرتے ہوئے خواتین کو کھیلوں میں یکساں مواقع فراہم کرنے کا عزم کیا۔ وزارت نے

افرادی قوت میں خواتین کا انتہائی اہم کردار مگر غیر تسلیم شدہ

پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن سے قومی کھیلوں کی تقاریب میں خواتین کے قومی کھیلوں کے مقابلے منعقد کرانے کا بھی مطالبہ کیا۔ ملک کے دور دراز کے علاقوں کی خواتین کو ضروری نگہداشت صحت اور تعلیمی اداروں تک رسائی میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور بعض اوقات یہ رسائی تقریباً ناممکن تھی۔ زیر جائزہ سال کے دوران ان شعبوں تک رسائی میں اضافے کے لیے مثبت اقدامات نہیں کیے گئے۔ اتمان خیل قومی تحریک کے ایک جرگے نے باجوڑ، مالاکنڈ اور مہمند ایجنسی کے دور دراز کے گاؤں میں خواتین کے لیے تعلیم اور صحت کی مناسب سہولیات کا مطالبہ کیا کیونکہ ان خواتین کو بنیادی انسانی حقوق سے مسلسل محروم رکھا گیا تھا۔

قانونی وسیاسی میدان

یو این نسواں کے مطابق دنیا میں وزارتی سطح کی نشستوں پر براجمان خواتین کا تناسب جو 2005 میں 14.2 فیصد تھا اب وہ بڑھ کر 2012 میں 16.7 فیصد ہو گیا ہے۔ اس وقت پارلیمنٹ میں موجود خواتین کے تناسب کے حوالے سے دنیا کے تمام ممالک کی فہرست میں پاکستان کا 52 واں نمبر ہے۔ پاکستان کی پارلیمنٹ میں خواتین کی نمائندگی اگرچہ دیگر اسلامی ممالک سے زیادہ ہے تاہم اس حوالے سے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ خواتین کی نمائندگی بالخصوص بلوچستان میں انتہائی کم اور فاٹا کے علاقوں میں مکمل ناپید تھی۔ خواتین کی نمائندگی دوسرے شعبوں مثال کے طور پر ان علاقوں کی خواتین سے متعلق مسائل کے حوالے سے قومی

2012 میں نمایاں مقام حاصل کرنے والی خواتین

ملالہ یوسف زئی۔ مینگورہ، سوات میں ایک چودہ سالہ لڑکی ملالہ یوسف زئی کو طالبان نے خواتین کے حقوق اور تعلیم کے فروغ کے لیے کام کرنے پر گولی ماردی۔ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالتے ہوئے تعلیم کے بنیادی حق کے لیے آواز اٹھانے میں اس کی بہادری کو عالمی توجہ ملی۔ اس حملے کے بعد پائے جانے والے غصے اور اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالتے ہوئے بہادری سے تعلیم کے بنیادی حق کے لیے آواز اٹھانے پر اسے جو داد ملی اس کے باعث یو این نے 10 نومبر کو'ملالہ ڈے' کے طور پر منایا، جس کا مقصد دنیا بھر میں موجود ان لاکھوں خواتین پر توجہ دینا تھا جن کے تعلیم کے حق سے انکار کیا گیا تھا۔ اس وقوعے کے نتیجے میں پاکستان کو عالمی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ خواتین کی تعلیم کے لیے پالیسیاں تشکیل دے۔

شرمین عبید چنائے: ان کی آسکر ایوارڈ جیتنے والی دستاویزی فلم 'سیونگ فیس' جو تیزاب حملوں کا نشانہ بننے والی خاتون کے متعلق تھی، نے تیزاب سے جھلسنے والی خواتین کو ''تیزاب حملوں کی روک تھام کے ایکٹ'' کے نفاذ کے لیے مہم چلانے پر آمادہ کیا۔

شاد بیگم: دیر سے تعلق رکھنے والی سماجی کارکن شاد بیگم کو ایک انتہائی قدامت پرست علاقے میں معاشرتی اور سیاسی حقوق کے لیے جدوجہد کرنے پر مارچ 2012 میں ''بین الاقوامی ایوارڈ برائے جرات مند خواتین'' سے نوازا گیا۔

زبیدہ مصطفیٰ: ایک سنیئر صحافی زبیدہ مصطفیٰ کو انٹرنیشنل ویمنز میڈیا فاؤنڈیشن نے تعلیم کے متعلق جامع تحریریں لکھنے پر سالانہ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ دیا۔ ڈان میڈیا گروپ جہاں انہوں نے 33 سال تک کام کیا، نے انہیں خراج تحسین پیش کرنے کے لیے صحافتی عمدگی کے ایک نئے ایوارڈ کا اعلان کیا جسے زبیدہ مصطفیٰ ایوارڈ کا نام دیا گیا۔

مقامی حکومتی نظام کی بحالی کا مطالبہ کرتے ہوئے

پالیسیوں کی تشکیل کے لیے بھی ضروری ہے۔ چند ایسی خواتین بھی ہیں جو براہ راست انتخابات میں حصہ لینے کے بعد پارلیمنٹ کی رکن منتخب ہوئیں۔ اس وقت پارلیمنٹ میں خواتین کے لیے 60 نشستیں مخصوص ہیں جن پر خواتین کو ان کی پارٹی کی انتخابی صلاحیت کی بنیاد پر نامزد کیا جاتا ہے۔ نشستوں کی تقسیم اس طرح سے کی جاتی ہے۔ پارلیمنٹ میں 35 نشستیں پنجاب، 14 سندھ، 8 خیبر پختونخوا اور تین بلوچستان کے لیے مختص ہیں۔ 2011 میں سپریم کورٹ کے 17 ججوں میں ایک بھی خاتون شامل نہیں تھی۔ ملکی تاریخ میں کسی خاتون کو کبھی بھی اعلیٰ عدالت کے عہدے پر ترقی نہیں دی گئی۔

ہائیکورٹ کے 103 ججوں میں صرف تین خواتین جج تھیں۔ ان میں سے ہائیکورٹ کی تین خواتین ججوں کی تقرری 2012 میں کی گئی تھی۔ خواتین اراکین پارلیمنٹ قانون سازی کے اقدامات کے حوالے سے اپنے مرد ہم منصبوں سے زیادہ سرگرم تھیں اور حالیہ دور حکومت میں 53 میں سے بیس پرائیویٹ اراکین کے بل خواتین نے پیش کیے۔ سال کے دوران ایک انقلابی کارنامہ کمیشن برائے مقام نسواں (این سی ایس ڈبلیو) کو خودمختاری کا درجہ دینا تھا۔ جنوری میں کمیشن برائے مقام نسواں بل قومی اسمبلی میں اتفاق رائے سے منظور کرلیا گیا۔ مختلف سیاسی جماعتوں کی جانب سے پیش کردہ 40 ترامیم اور تجاویز کو بل میں شامل کیا گیا۔ فروری میں سینیٹ نے بل کی منظوری دے دی۔ 8 مارچ کو خواتین کے دن کے موقع پر صدر نے بل پر دستخط کر دیئے اور اسے قانون کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ سالانہ ترقیاتی منصوبے کے مطابق فاٹا میں خواتین کی ترقی اور بچوں کے تحفظ کے لیے اقدامات کئے جانے تھے، لیکن انجام دہی کے عمل میں قبائلی علاقوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ان

علاقوں میں خواتین امتیازی سلوک کا شکار طبقہ رہیں۔ خواتین قانون سازوں نے پنجاب کی کابینہ میں ایک خاتون نمائندے کا مطالبہ کیا کیونکہ ان کا یہ نقطہ نظر تھا کہ ایک خاتون نمائندے کی موجودگی سے صنف سے متعلقہ مسائل کے خاتمے میں مدد ملی گی۔

وراثت

اکتوبر میں ترقیاتی ادارہ برائے خواتین پنجاب نے پنجاب سال گزاری ضوابط 1988 میں ترامیم کرنے کا اعلان کیا جس کے نتیجے میں خواتین کے جائیداد کے حق کے تحفظ کے لیے ضلعی کمیٹیاں تشکیل دی جاسکیں گی۔ پنجاب کے دیہی علاقوں میں خواتین کو عام طور پر اپنے والدین کی جائیداد اور بالخصوص اراضی میں سے ان کا حصہ نہیں دیا جاتا۔

زمین کے مالک کے مرنے پر اس کے ورثاء میں زمین کی تقسیم کے لیے ریونیو افسروں کی ضرورت تھی بجائے اس کے کہ ورثا کے درخواست دینے کا انتظار کیا جائے۔ جعل سازی سے بچنے کے لیے ایک مخصوص کمیٹی تشکیل دی جانی تھی تا کہ اس بات کو یقینی بنایا جاسکے کہ کسی قسم کی بے قاعدگیاں سرزد نہ ہوں۔ 5 جون کو خیبر پختونخوا حکومت نے خواتین کے ملکیتی حقوق کے نفاذ کے ایکٹ 2012 کی منظوری دی جو کہ قانون کے مطابق خواتین کے جائیداد کی ملکیت کے حق کا تحفظ کرتا ہے۔ اس قانون کی خلاف کرنے والوں کو کم از کم پانچ سال قید کی سزا اور پچاس ہزار روپے کا جرمانہ کیا جائے گا۔

تعلیم

یونیسکو کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق پاکستان میں کم از کم 51 لاکھ بچے سکول نہیں جاتے جن میں خواتین کا تناسب 63 فیصد ہے۔ ایک ہزار سالہ اہداف کے منصوبے کے تحت یہ توقع تھی کہ سال 2015 کے آخر تک پاکستان لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کے اعداد وشمار میں برابری حاصل کرلے گا۔ موجود صورتحال کے مطابق خواتین کی شرح خواندگی 42 فیصد اور مردوں کی 74 فیصد ہے۔ پنجاب میں صوبائی حکومت نے خواتین کی تعلیم کے فروغ کے لیے بہاولپور، سیالکوٹ، فیصل آباد اور ملتان کے اضلاع میں 4 نئی یونیورسٹیاں قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ 2011 میں خیبر پختونخوا کے ضلع چارسدہ کے دورافتادہ علاقوں میں اساتذہ کی کمی کے باعث کم از کم 20 گرلز سکول بند کردیئے گئے۔ خیبر پختونخوا حکومت نے خواتین کی مکتبی تعلیم کے لیے ایک ٹھوس اقدام کرتے ہوئے اپنے تعلیمی بجٹ کا ستر فیصد حصہ خواتین کی تعلیم کے لیے مختص کردیا جس سے ان گرلز

سکولوں کی تعمیر نو میں مدد ملنے کی امید تھی، جنہیں صوبے میں موجود دہشت گردوں نے تباہ کر دیا تھا۔ بلوچستان جہاں سکولوں سے بچوں کے اخراج کی شرح سب سے زیادہ تھی وہاں صرف 23 فیصد لڑکیوں کا پرائمری سکولوں میں اندراج تھا۔ لڑکیوں کے پرائمری، مڈل اور ہائی سکول کی کمی کے علاوہ ذرائع نقل وحمل کے مسائل کے باعث بہت سی لڑکیاں اپنی تعلیم ترک کرنے پر مجبور تھیں۔

انتخابی عمل میں خواتین کی شمولیت

ایچ آر سی پی نے الیکشن کمیشن آف پاکستان میں ایک خاتون نمائندے کی ضرورت کی تجویز پیش کی تاکہ خواتین کو بہتر طریقے سے نظام میں شامل کیا جا سکے۔ مردان اور میانوالی جیسے متعدد پولنگ سٹیشنوں میں خواتین کو ضمنی انتخابات، جو کہ سال کے شروع میں منعقد ہوئے، میں ووٹ ڈالنے سے روکا گیا۔ قومی کمیشن برائے مقام نسواں نے الیکشن کمیشن کو خواتین کے حقوق کو نظر انداز کرنے کے خلاف کارروائی کرنے پر زور دیا، لیکن اس حوالے سے کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ ستمبر میں 15 سیاسی جماعتوں سے مشاورتوں سے کچھ دیر پہلے الیکشن کمیشن نے ایسے پولنگ سٹیشن، جہاں دس فیصد سے کم خواتین نے ووٹ ڈالے وہاں نئے سرے سے پولنگ کی تجویز پیش کی۔ اس کارروائی کا مقصد انتخابی عمل میں خواتین کی شمولیت میں اضافہ کرنا تھا۔ لیکن جب بعد میں سیاسی جماعتوں نے اس تجویز کی مخالفت کی تو الیکشن کمیشن نے اس پر عمل نہیں کیا۔

ہراسیمگی

اکتوبر میں پنجاب ویمن ڈویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ نے خواتین کے بہتر تحفظ کے لیے کام کرنے کی جگہ پر خواتین کو ہراسیمگی سے تحفظ فراہم کرنے کے بل 2012 کی تجویز پیش کی۔ اگرچہ بل کو تاحال نافذ نہیں کیا گیا۔

فروری 2011 میں ہائر ایجوکیشن کمیشن (ایچ ای سی) نے ہراسیمگی مخالف پالیسی تشکیل دی تھی جس کے تحت تمام یونیورسٹیوں کے لیے نفاذ کا طریقہ کار فراہم کرنا ضروری تھا۔ فروری 2012 کے اشتراک 138 یونیورسٹیوں میں سے صرف 98 نے اس پر عمل کیا تھا۔ اپریل میں یونیورسٹی آف ویٹرنئی اینڈ اینیمل سائنس لاہور کے دو اساتذہ کے خلاف دو طالبات کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کی شکایات درج کرائی گئیں۔ دونوں اساتذہ کو معطل کر دیا گیا لیکن انہوں نے الزامات کی تردید کی۔ یونیورسٹی آف ایجوکیشن کی ایک معلّمہ نے ایک مرد پروفیسر کے خلاف ہراسیمگی کی شکایت درج کرائی۔

جولائی میں طالبات نے ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ کے شعبہ ادب اور ڈیزائن کے دو اساتذہ کے خلاف جنسی ہراسیمگی کی شکایت درج کرائی۔ سرکاری اور نجی شعبوں سے تعلق رکھنے والی خواتین بالخصوص نرسوں، اساتذہ اور پولیس افسروں کے طور پر کام کرنے والی خواتین نے شکایات درج کرائی تھیں۔ عمر کوٹ، سندھ میں ایک لیڈی ہیلتھ ورکر نے ضلعی ہیلتھ افسر کو اپنے ساتھ کام کرنے والے مرد ساتھیوں کے خلاف شکایت درج کرائی۔

خواتین اور قانون کا نفاذ

پاکستان میں پولیس فورس کا 0.86 فیصد حصہ خواتین پر مشتمل ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی بیوروکریٹ کے عہدے تک نہیں پہنچ سکی۔ پورے پاکستان میں 19 خواتین پولیس سٹیشن اور 3,700 خواتین پولیس اہلکار تھیں۔ خواتین پولیس اہلکاروں کو اپنے پیشے میں انتہائی کم اختیارات حاصل رہے۔ ان میں سے چند اعلیٰ درجے کے عہدوں پر براجمان تھیں۔ لاہور جہاں کل 80 پولیس سٹیشن تھے وہاں ایک بھی خاتون پولیس اہلکار پولیس سٹیشن کی سربراہ نہیں تھی۔ حتیٰ کہ شہر میں خواتین پولیس وارڈنز کو بھی سڑکوں پر گشت کرنے کی ذمہ داری نہیں سونپی گئی۔ سال کے دوران کئے گئے کچھ مثبت اقدامات میں ضلع مالاکنڈ میں خواتین کے خلاف تشدد کے واقعات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایک خواتین پولیس سٹیشن اور خاندانی عدالتوں کا قیام شامل تھا۔ گلگت بلتستان جو کہ خواتین مخالف علاقوں میں سے ایک ہے وہاں ایک خاتون ٹریفک وارڈن طاہرہ یوسب کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس (ڈی ایس پی) کے عہدے پر ترقی دی گئی تھی۔

زبان زد عام تھپڑ جس نے رکن پارلیمان کو پارلیمان کی رکنیت سے محروم کیا

جیلوں میں قید خواتین

پاکستان کی جیلوں میں قید 75,000 ہزار قیدیوں میں سے 1,100 خواتین تھیں۔ پاکستان میں قیدیوں کو درپیش متعدد مشکلات کے علاوہ بہت سی خواتین قیدیوں کے اہل خانہ اب مزید ان کا خیال یا ان سے رابطہ نہیں رکھتے تھے۔ یہ معاملہ بالخصوص ان تین درجن کے قریب خواتین کے ساتھ تھا جنہیں موت کی سزا سنائی گئی تھی۔ خواتین قیدیوں کو معیاری طبی امداد کی کمی کا بھی سامنا تھا کیونکہ زیادہ تر جیلیں جہاں خواتین کو رکھا جاتا تھا، وہاں لیڈی ڈاکٹر مکمل طور پر دستیاب نہیں تھیں اور بہت سی جیلوں میں ایک بھی خاتون یا مرد ڈاکٹر نہیں تھا۔ (باب ''جیلیں، قیدی اور گمشدگیاں'' میں دیکھیں)

لاہور کے جیل روڈ پر واقع خواتین پولیس سٹیشن کے بارے میں اطلاع ملی کہ اس کا حوالات والا حصہ گزرنے والوں کو نظر آتا تھا۔ جبکہ غسل خانے کی دیوار صرف چار فٹ اونچی تھی۔ یہ تمام پہلو خواتین قیدیوں کی خلوت کی خلاف ورزی کا سبب بنے۔ خواتین کو مقرر وقت سے کہیں زیادہ عرصے تک قید میں رکھنے کی بھی اطلاعات ملیں جبکہ اٹھارہ سال سے کم نوجوان لڑکیوں کے لیے علیحدہ کمرے موجود نہیں تھے۔

خواتین کے خلاف تشدد

خواتین کے خلاف تشدد کے واقعات کی اطلاعات ملک بھر سے ملتی رہیں۔ طالبان نے سوات میں ملالہ یوسف زئی پر حملہ کیا اور دیگر متعدد حملوں نے خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والوں کو لاحق خطرات کو بھی نمایاں کیا۔

جولائی میں فاٹا میں واقع دیہی علاقوں میں آپریزل اینڈ ویمن ایمپاورمنٹ کی سوسائٹی کی ایگزیکٹو ڈائریکٹر فریدہ آفریدی کو ان کے گھر کے باہر دو موٹر سائیکل سوار مسلح افراد نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ انہیں خواتین کی مدد کرنے پر دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کے قاتلوں کا تعلق علاقے میں موجود انتہا پسند عناصر سے تھا۔ صوبہ خیبر پختونخوا اور اس کے پڑوس میں واقع فاٹا کے علاقوں میں خواتین اور وہ تمام لوگ جو خواتین کے حقوق کی ترقی کے لیے کام کرتے تھے کو دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مئی میں خیبر پختونخوا کے ضلع کوہستان میں ایک بااثر مذہبی پیشوا نے این جی او کی خواتین کارکنوں کو کوہستان میں داخل ہونے سے منع کیا اور خلاف ورزی کرنے والی خواتین کی شادی زبردستی مقامی افراد سے کرانے کی دھمکی دی۔ حکومت نے دھمکی دینے کے جرم میں مذہبی پیشوا کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ تیزاب پھینکنے اور جلانے کے جرم کا بل 2012 دسمبر، 2012 میں پرائیویٹ رکن کے بل کے طور پر قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ یہ بل

جامع ہونے کے علاوہ خبر سازی، بحالی کے لیے معاوضے، تفتیشی شواہد اکٹھے کرنے اور متاثرہ شخص اور گواہ کے تحفظ کے طریقہ کار کا احاطہ بھی کرتا تھا۔ بل قومی اسمبلی میں پیش کئے جانے کے بعد اسے بحث، جو کبھی نہیں کی گئی، کے لیے وزارتوں کو بھیجا گیا۔ اس بل کو بجٹ کے اجلاس کے فوراً بعد پیش کئے جانے کی توقع تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ سول سوسائٹی نے بھی اس بل کو پیش کرنے کے لیے صوبائی اسمبلیوں پر دباؤ ڈالا لیکن سال کے آخر تک کسی بھی اسمبلی نے اس حوالے سے کوئی اقدام نہیں کیا۔

غیرت کے نام پر قتل

نام نہاد غیرت کے نام پر قتل پاکستان میں خواتین کے خلاف تشدد کی سب سے زیادہ گھناؤنی اور مستقل قسم رہی۔ ایچ آر سی پی کی میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق 2012 میں تقریباً 913 لڑکیوں اور عورتوں کو غیرت کے نام پر قتل کیا گیا۔ ان میں کم از کم 99 کمسن بچیاں شامل تھیں۔ یہ مانا جاتا تھا کہ رپورٹنگ کے خلاء کے باعث ان حملوں سے متاثر ہونے والی خواتین کی تعداد، پیش کئے گئے اعداد و شمار سے زیادہ تھی۔ غیرت کے نام پر قتل ہونے والی 913 خواتین میں کم از کم 604 کو اکثر کسی ثبوت کے بغیر مردوں کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھنے کا الزام عائد کرنے کے بعد قتل کیا گیا۔ 191 خواتین کو اس لیے قتل کیا گیا کیونکہ انہوں نے اپنی پسند اور اپنے خاندان کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی۔ یہ واقعات اکثریتی آبادی کے عقائد تک محدود نہیں تھے۔ کم از کم سات ہندو اور چھ عیسائی خواتین بھی اس جرم کا نشانہ بنیں۔ ان جرائم کے مرتکب افراد عام طور پر ان خواتین کے قریبی رشتے دار تھے۔ 202 واقعات میں مجرم متاثرہ شخص کے بھائی، 71 واقعات میں باپ، 209 واقعات میں خاوند، 61 واقعات میں سسرال والے اور 138 واقعات میں مجرم متاثرہ خواتین کے دیگر قریبی رشتہ دار تھے۔ نشانہ بننے والوں میں سے کم از کم 16 افراد کو قتل سے پہلے جنسی زیادتی اور 13 کو گینگ ریپ کا نشانہ بنایا گیا۔

زیر جائزہ سال میں پیش آنے والے واقعات اسی رجحان کی نشاندہی کرتے ہیں جس کی نشاندہی ماضی میں کی گئی تھی۔ ہر عمر کی خواتین کو ناجائز تعلقات کے معمولی سے شبے کی بنا پر قتل اور سرعام رسوا کیا گیا اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا، کیونکہ انہیں غیر مردوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ ان واقعات میں انصاف اکثر سمجھ سے بالاتر رہا کیونکہ نشانہ بننے والے خواتین کے اہل خانہ تقریباً ہمیشہ قتل کے جرم میں شامل تھے اور وہ قانونی کارروائی میں رکاوٹیں ڈالتے تھے۔

میڈیا کی خبروں کے مطابق حال ہی میں جیل سے رہا ہونے والے ایک نوجوان نے اپنی دو بہنوں کو اس

بنا پر گولی مار کر قتل کر دیا کہ وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ فون پر باتیں کرتی تھیں۔ اگر چہ ان کے باپ نے بیان دیا کہ لڑکیاں معصوم تھیں اور اس کے بیٹے نے انہیں محض اس لیے گولی ماری کہ وہ وقت پر دوپہر کا کھانا نہ ملنے پر ناراض تھا۔

جیکب آباد سندھ کے ایک نزدیکی گاؤں فہد خان پنہور میں ایک نوجوان کو چند لوگوں نے قتل کر دیا جن کا وہ مقروض تھا، جبکہ اس واقعے کو غیرت کے نام پر قتل ظاہر کرنے کے لیے اس کے علاوہ ایک معصوم لڑکی کو بھی قتل کر دیا۔ غیرت سے متعلق جرائم کے الزامات کے خطرات کے شکار لوگوں کو بہت کم ریاستی تحفظ یا حمایت ملی، لہذا جب جوڑے گھر سے بھاگتے تھے تو وہ زیادہ تر بے گھر رہتے تھے اور بھاگتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ دارالامان جہاں کاری قرار دی گئیں خواتین پناہ لیتی تھیں ان میں بھی حفاظتی اقدامات کی کمی تھی۔ چکوال کے ایک دارالامان کے احاطے، جہاں سکیورٹی معائنے کے بغیر مردوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں، میں ایک خاتون کو اس کے بھائی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ایک اور وقوعے میں چند خواتین کو اس کے مرد رشتہ دار جو کہ ایک وکیل بھی تھا، نے سندھ ہائی کورٹ کی کھلی عدالت میں غیرت کے نام پر گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ اس علاقے کے داخلی راستے میں تین حفاظتی چوکیاں تھیں جس سے یا تو سخت کوتاہی یا اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں نے ہتھیار اندر جانے کی اجازت دی۔

کچھ واقعات میں مقتولین کو موت کے بعد بھی تکلیف میں مبتلا کیا گیا جیسا کہ سندھ میں ہوا جہاں 'کارنجو قبرستان' (رسوا ہونے والوں کے لیے قبرستان) نامی علیحدہ قبرستان تھا جہاں غیرت کے نام پر قتل ہونے والے مقتولین کی مناسب تدفین نہیں کی جاتی تھی اور ان کی نماز جنازہ بھی ادا نہیں کی جاتی تھی اور حتیٰ کہ ان کے اہل خانہ کو بھی ان کی قبر پر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

برادری کے دباؤ کے باعث شہادتوں کا ملنا مشکل تھا کیونکہ گواہی دینا ذلت آمیز جرم کو معاف کرنے سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

اگر چہ سال کے دوران چند مخصوص واقعات میں سے چند میں تھوڑی بہت کارروائی کی گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ عدالتوں نے غیرت سے متعلق جرائم کے ملزمان کے تحفظ کے لیے ان کے حق میں احکامات جاری کیے اور قانون کے نفاذ پر عملدرآمد کرایا۔ ایک لڑکی نے اپنے کزن کے ساتھ بھاگنے کے لیے اپنے خاوند کو چھوڑ دیا اور اپنے کزن سے شادی کرنے کے لیے مجسٹریٹ سے آزاد منشا کا سٹرفکیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس کے بہن بھائیوں اور کزنوں نے اس پر رضامند ہوگئے جبکہ اس کا باپ اور سابقہ شوہر رضامند نہیں تھے۔ اگر چہ سندھ ہائیکورٹ نے پولیس کو جوڑے کو گرفتار کرنے سے روک دیا اور اس کی بجائے انہیں تحفظ فراہم

کرنے کو کہا۔ ایک اور قوعے میں منیر حسین ماڑی گاؤں میں ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کو غیرت کے نام پر قتل کئے جانے اور کسی تفتیش کے بغیر دفنائے جانے کی اطلاعات ملیں۔ ایس ایچ او نے عدالتی مجسٹریٹ کو ایک درخواست دی جس کے جواب میں اس نے لڑکی کے اہل خانہ کی جانب سے مزاحمت کے باوجود مزید تفتیش کے لیے لاش کی قبر کشائی کا مطالبہ کیا۔ شکار پور میں ایک مخالف قبیلے کی جانب سے دو لڑکیوں کے اغواء کے بعد ایک جرگے نے انہیں کاری قرار دے دیا۔ اگرچہ جب میڈیا نے اس معاملے کا نوٹس لیا اور ان کو محفوظ رکھنے کے لیے دباؤ بڑھایا تو پولیس نے انہیں تحفظ فراہم کیا۔

گھریلو تشدد

یہ بات ہر طرح سے واضح ہے کہ گھروں میں خواتین کے خلاف تشدد اتنا ہی سرایت شدہ ہے جتنا پہلے تھا۔ گھریلو تشدد کے مجرم خاص طور پر خاوند باپ اور بھائی اور سسرالی تھے۔ خواتین کو ان کے خاوندوں کے اہل خانہ کی جانب سے جلائے جانے کے بہت سے واقعات منظر عام پر آئے۔ ایچ آر سی پی کی میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق 2012 میں ملک بھر میں کم از کم 41 لڑکیاں تیزاب حملوں کا نشانہ بنیں۔ اکثر اوقات بدکاری کے شبے میں خواتین کی ٹانگیں کاٹ دی گئیں۔ 37 خواتین کی تذلیل کرنے کے لیے ان کے سر مونڈھ دیئے گئے اور مختلف واقعات میں 49 خواتین کو جلا دیا گیا۔ زیادہ تر واقعات میں مجرم متاثرہ خواتین کے رشتہ دار تھے۔ عورت فاؤنڈیشن کے مطابق 2012 میں گھریلو تشدد کے واقعات پچھلے سال کے مقابلے میں 7 فیصد زیادہ ہیں۔ تنظیم کے اعداد و شمار کے مطابق جنوری سے دسمبر 2012 کے عرصے کے دوران گھریلو تشدد کے

ایک مطالبہ جس پر عموماً توجہ نہیں دی گئی

پاکستانی قیدیوں میں سب سے زیادہ مشکلات کا شکار خواتین قیدی تھیں۔

4,585 واقعات پیش آئے۔ جیلوں میں قید خواتین پاکستان میں غیر محفوظ ترین قیدی تھیں۔ 2012 کے دوران میڈیا میں منظر عام پر آنے والے سنگین واقعات میں سے چند ایک خون ریزی اور غصے کے باعث کئے جانے والے وحشت ناک اقدامات معلوم ہوتے تھے، جن میں خواتین کو ان کے گھروں میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

ملتان میں ایک خاتون کو اپنے زیورات اپنے خاوند کی دوسری بیوی کے حوالے کرنے کے انکار پر اس کی ساس نے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا۔ لیاقت آباد لاہور میں ایک خاتون کو سسرالیوں نے ہلاک کر دیا کیونکہ وہ طبی وجوہات کی بنا پر بچے پیدا کرنے سے معذور تھی، اور انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ شدید بیماری کے باعث ہلاک ہوئی۔ اگرچہ پولیس کو اس کی گردن پر رسی کے نشان نظر آئے جو اس کو پھانسی دینے کے لیے استعمال کی گئی تھی۔ بہاولپور میں جب ایک شخص کو پتہ چلا کہ اس کی بیوی نے غیر ازدواجی تعلقات استوار کئے ہوئے ہیں تو اس نے اس کی ٹانگیں توڑ دیں اور 15 دن تک ایک الماری میں بند کر کے رکھا۔ جب اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو اس شخص نے اس پر تیزاب پھینک دیا۔ اس کو تب رہائی ملی جب اس کا بھائی تالا توڑ کر گھر میں داخل ہوا اور اسے بدصورت اور فاقہ کشی کی حالت میں پایا۔

جبری تبدیلی مذہب اور جبری شادیاں

ہندو لڑکیوں کی اکثر اغواء کے بعد جبری تبدیلی مذہب پاکستان میں بالخصوص سندھ کی ہندو برادری کی متواتر شکایات تھیں۔ لڑکیوں کا مذہب تبدیل کرنے کے بعد ان کو اپنے ہندو خاندان سے ملنے سے منع کیا جاتا

جبری تبدیلی مذہب کے خاتمے کا مطالبہ

تھا۔اس سال وسیع پیمانے پر موصول شدہ واقعات رنکل کماری، لتا کماری اور آشا کماری سے تعلق رکھتے تھے۔ (باب فکر وضمیر اور مذہب کی آزادی میں دیکھئے)

رشتہ ازدواج میں خواتین غیر مساوی حصہ دار رہیں اور ان کے اہل خانہ نے تنازعات حل کرنے یا دیگر مالی، ثقافتی وجوہات کے عوض اپنی بیٹیاں عنایت کیں۔ چونکہ بہت سی جبری شادیاں غیر توجہ شدہ اور غیر اطلاع شدہ تھیں، اس لیے صحیح اعداد وشمار آسانی سے دستیاب نہیں تھے، لیکن رپورٹس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ صرف جنوری کے مہینے میں پاکستان کے 31 اضلاع میں جبری شادیوں کے 338 واقعات پیش آئے۔لڑکیوں کے جوان ہونے یا حتیٰ کہ سن بلوغت تک پہنچنے سے پہلے شادی کرنے کا رواج ایک نمایاں مسئلہ رہا۔ 2012 میں ایک وقوعے میں ساہیوال میں ایک پنچائت نے ایک پانچ سالہ لڑکی کی شادی ایک چھ سالہ لڑکے سے کر دی کیونکہ لڑکی کا بھائی لڑکے کی بہن کو لے کر بھاگ گیا تھا۔لڑکی کے باپ کو حق انتخاب دیا گیا کہ اگر اس نے اپنی بیٹی دینے سے انکار کیا تو اسے پنچائت کو دس لاکھ روپے ادا کرنا ہوں گے۔ اس مروجہ موضوع کے خلاف فعالیت غیر سرکاری اور سول سوسائٹی کی تنظیموں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ مارچ میں ایکشن ایڈ نے لڑکیوں کی کم عمری میں شادیوں کے خلاف ایک قومی اجلاس منعقد کیا۔ اجلاس میں لڑکیوں کی شادی کی جائز عمر سولہ سال کی بجائے

18 سال کرنے اور بچوں کی شادیوں کا اہتمام کرنے والوں کی سزا کو بڑھانے کے لیے بچوں کی شادیوں کے قانون 1929 میں ترمیم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ ایکشن ایڈ کے ایک سروے سے اس بات کی بھی نشاندہی ہوئی کہ خیبر پختونخوا کے اضلاع چارسدہ اور مردان میں سولہ سال سے کم عمر 74 فیصد لڑکیوں کی شادی کی گئی۔ اگرچہ حکومت کی جانب سے اس مسئلے کا مقابلہ کرنے کے لیے حکمت عملی سے متعلق اہداف پر عملدرآمد کرنے کے لیے ٹھوس اقدامات نہیں کیئے گئے۔

سفارشات

1- خواتین دوست قانون سازی کی بروقت نفاذ کی ضرورت ہے۔

2- خواتین کے لیے حکومت کے مجوزہ منصوبوں اور پالیسیوں جنہیں نظرانداز کیا گیا ہے، کو صحیح طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔

3- خواتین کو کام کرنے کی جگہ پر بہتر مواقع اور ان کے حقوق کو تحفظ فراہم کرتے ہوئے انہیں معاشرتی و معاشی شعبوں میں مناسب جگہ دینے کی ضرورت ہے۔

4- خواتین کو عدلیہ میں زیادہ نمائندگی دینے کے لیے اور زیادہ خواتین کو ججوں کے طور پر تعینات کرنے کی ضرورت ہے۔

5- خواتین کو زیادہ وسائل فراہم کرنے کے لیے قانون نافذ کرنے والے اداروں میں ان کی زیادہ نمائندگی کی ضرورت ہے۔

بچے

چودہ برس سے کم عمر بچے کو کسی فیکٹری یا دکان یا کسی دوسرے خطرناک پیشے میں ملازم نہیں رکھا جائے گا۔

آئین پاکستان [آرٹیکل-11(3)]

ریاست، شادی، خاندان، ماں اور بچے کو تحفظ فراہم کرے گی — آئین پاکستان [آرٹیکل - 35]

ریاست اس بات کو یقینی بنانے کے لیے تمام ضروری اقدامات کرے گی۔۔۔ کہ بچوں کو ان پیشوں میں ملازم نہیں رکھا جائے گا جو ان کی عمر سے مطابقت نہیں رکھتے۔۔۔ — آئین پاکستان [آرٹیکل 37-(e)]

۔۔۔بچپن خاص توجہ اور مدد کا مستحق ہے۔ — [بچوں کے حقوق کے متعلق اقوام متحدہ کے کنونشن کا دیباچہ]

بچوں کے متعلق عمل میں لائی گئی تمام کارروائیوں میں، چاہے وہ سرکاری یا نجی سوشل ویلفیئر اداروں کی طرف سے عدالتوں، انتظامیہ سے تعلق رکھنے والے حکام یا قانون ساز اداروں کی طرف سے عمل میں لائی گئی ہوں، بچوں کے بہترین مفادات کو اولین فوقیت دی جائے گی۔ — بچوں کے حقوق کے متعلق اقوام متحدہ کا کنونشن [آرٹیکل نمبر 3 (1)]

بچوں کے حقوق کا تحفظ ایک مرتبہ پھر حکومت کی ترجیحات میں شامل نہیں تھا اور سال کے دوران متعدد وعدوں اور مثبت پیش گوئیوں کے باوجود بچوں کے حقوق کی پامالیوں کے واقعات بنیادی طور پر غیر تبدیل شدہ رہے۔ ملک کے لیے انسانی حقوق کی کونسل اور بچوں کے حقوق کی کمیٹی کی جانب سے یواین کے عالمی سلسلہ وار جائزے (2008-2012) کے موقع پر دی جانے والی تجاویز نے اس بات کی نشاندہی کی کہ پاکستان بچوں کے حقوق عہد و پیماں کے حوالے سے بہت پیچھے تھا، کیونکہ آدھی سے زائد تجاویز بچوں کے حقوق سے تعلق رکھتی تھیں۔ 2012 میں یونیسف کی جانب سے پاکستان میں خواتین اور بچوں کے مواقعاتی تجزیے نے بھی ملک میں بچوں کے حقوق کی صورت حال کی ہولناک تصویر کشی کی۔

لڑکیوں کی تعلیم کو لاحق خطرات پاکستان میں ایک دفعہ پھر ایک تشویشناک مسئلے کے طور پر سامنے آئے اور ان کی جھلک بالخصوص خواتین کی تعلیم کی حمایت کرنے والی سوات سے تعلق رکھنے والی ملالہ یوسف زئی پر

غیر یقینی مستقبل سے دوچار

حملے کے بعد دکھائی دی۔ کسی بھی صوبے نے پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 25 اے کے تسلیم کردہ حق کو نافذ کرنے کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کے متعلق قوانین متعارف کرانے کے لیے قابل ذکر اقدامات نہیں کیے۔ اگرچہ 2012 میں پولیو کے واقعات میں مجموعی طور پر پچھلے سال کے مقابلے میں کمی واقع ہوئی، تاہم پولیو سے آزاد پاکستان کا ہدف ابھی کافی دور تھا۔ سال 2012 کے آخر میں ملک میں خسرے کی وبا کے نتیجے میں سینکڑوں بچے ہلاک ہونے کے باعث بچوں کی صحت کے حوالے سے بھی شدید رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ ستمبر میں پنجاب، بلوچستان اور سندھ کے اضلاع کو ایک مرتبہ پھر سیلاب کی تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ یونیسف نے اندازہ لگایا کہ کم از کم چودہ لاکھ بچے متاثرے ہوئے تھے جن میں سے تین لاکھ نوے ہزار بچوں کی عمر پانچ سال سے کم تھی۔ 2012 میں پاکستان کے شمال۔ جنوبی علاقوں میں ڈرون حملوں کے باعث کم از کم 176 بچوں کے ہلاک ہونے کی اطلاعات ملیں۔

سال کی چند مثبت پیش رفتوں میں قومی اسمبلی کی جانب سے ''بچوں کے حقوق کے پارلیمانی فورم' (پی ایف سی آر) کا قیام تھا، جس کا بنیادی مقصد ملک میں بچوں کے حقوق کے تحفظ اور وفاقی سطح پر مفت اور لازمی تعلیم کے حق کے ایکٹ 2012 کی منظوری، پولیو کے واقعات میں کمی اور 2013 کو بچوں کے حقوق کا سال قرار دینے کو یقینی بنانا تھا۔ ایک چودہ سالہ عیسائی لڑکی رمشا مسیح، جس پر نومبر میں قرآن کی توہین کا الزام عائد کیا گیا تھا، کی رہائی کو اس قانون کے تحت بے بنیادی الزامات کے تحت شہریوں کی ٹارگٹنگ کو بے نقاب کرنے کی ایک کوشش کے طور پر خوش آمدید کہا گیا۔ اس فیصلے سے پہلے اس مقدمے کی دنیا بھر میں مذمت کی گئی تھی۔

صحت

پاکستان کے معاشی سروے کے مطابق کم عمر بچوں کی شرح اموات کے معاملے میں پاکستان دیگر ایشیائی ممالک سے بہت پیچھے ہے اور یہ شرح 1,000 پیدائشوں میں سے 63.26 اموات تھی اور پانچ سال سے کم

عمر بچوں کی شرح اموات 1,000 زندہ پیدائشوں میں سے 86.5 اموات تھی۔ ان دونوں میں گزشتہ سال کے مقابلے میں کمی ہوئی لیکن یہ ایک ہزار سالہ ترقیاتی اہداف کے حصول کے لیے ناکافی تھا۔ پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن پاکستان میں صحت کے شعبے کی مایوس کن صورت حال کا ذمہ دار صحت کے شعبے کے لیے کم بجٹ کو ٹھہراتی ہے اور اس نے تجویز پیش کی ہے کہ جی ڈی پی کا کم از کم چھ فیصد حصہ صحت پر خرچ ہونا چاہیے۔

پاکستان بدستور دنیا کے ان تین ممالک میں سے ایک ہے جہاں اب بھی پولیو موجود ہے، دیگر دو ممالک میں افغانستان اور نائجیریا شامل ہیں۔ 2011 میں پاکستان کے 60 اضلاع میں پولیو کے 198 واقعات منظر عام پر آیا جبکہ 2012 میں 28 اضلاع بشمول گلگت، جہاں پہلی مرتبہ پولیو کا واقعہ منظر عام پر میں پولیو کے 58 واقعات منظر عام پر آئے۔ پولیو کی ویکسین سے انکار کی شرح بھی 2011 کے مقابلے میں 60 فیصد تک کم ہوگئی۔ پاکستان کے انسداد پولیو پروگرام اور یونیسف کے مطابق اکتوبر کی پولیو مہم سے پانچ لاکھ سے زائد بچے محروم رہ گئے جن میں 45,000 ایسے بچے شامل تھے جن کے والدین نے قطرے پلانے سے انکار کر دیا تھا۔ طالبان، جنھوں نے حفاظتی ٹیکوں اور ادویات پر پابندی لگا دی تھی، کی موجودگی کے باعث خیبر پختونخوا اور فاٹا پولیو ویکسین انتظامیہ کے لیے انتہائی دشوار علاقے رہے۔ شمالی اور جنوبی وزیرستان میں خاص طور پر یہ معاملہ تھا جہاں نتیجتاً 2012 میں پولیو کے سب سے زیادہ واقعات منظر عام پر آئے۔ خیبر پختونخوا (27) اور فاٹا (20)۔ پاکستان میں حملوں کے ایک سلسلے، جن کا الزام اسلامی جنگجوؤں پر عائد کیا جاتا تھا، میں بچوں کو انسداد پولیو کی ویکسین دینے والی پانچ خواتین ہیلتھ ورکرز کو گولی مار کے ہلاک کر دیا گیا۔ مقتولین میں سے ایک 17 سالہ سکول کی طالبہ تھی جس نے رضاکارانہ طور پر ایک ویکسی نیٹر کے طور پر کام کیا۔

2012 میں پاکستان میں خسرے کی وبا پھوٹ پڑی جس کے نتیجے میں 306 بچے جاں بحق ہوگئے۔ 2012 میں خسرے کے واقعات میں گزشتہ سال کے مقابلے میں 5 گنا اضافہ ہوا، جب کل 64 اموات کی اطلاعات موصول ہوئی تھیں۔ یہ اضافہ صوبہ سندھ میں نمایاں تھا، جہاں 2012 میں خسرے کے باعث 210 بچے ہلاک ہوئے جبکہ گزشتہ سال وہاں 28 بچے ہلاک ہوئے تھے۔ 2012 کے دوران خسرے کے کل 14,687 واقعات قلمبند کیے گئے، (2011 کے 3,890 واقعات کے مقابلے میں) اور ان میں سے 1,879 واقعات سیلاب متاثرہ اضلاع میں منظر عام پر آئے۔ عالمی ادارہ صحت نے اس بات کی تصدیق کی کہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں یہ شدید اضافہ معمول کی حفاظتی ادویات کی ناکافی فراہمی کا نتیجہ تھا۔ پاکستان کے معاشرتی اور معیار زندگی کی جانچ (2011-2010) کے جائزے کے مطابق، پاکستان میں حفاظتی ادویات کی معمول کی کوریج 65 فیصد کے قریب تھی، جو کہ معمول کی امیونائزیشن کی مقرر کردہ 80 فیصد

لاہور کے ایک ہسپتال میں غفلت کے باعث لگنے والی آگ سے متعدد نومولود ہلاک ہو گئے

کی شرح سے خاصی کم تھی۔

یو این کے مطابق پاکستان میں ایک کروڑ سے زائد بچے غذائی قلت، 35 لاکھ کے قریب بچے شدید غذائی قلت اور 17 لاکھ بچے شدید ترین غذائی قلت کا شکار ہیں، جو ان کے قوت مدافعت کے نظام کو کمزور کرنے اور اکثر موت کا سبب بنتا ہے۔ایک تنظیم ''بچوں کو غذائی قلت سے بچائیں'' کی جاری کردہ رپورٹ نے فروری 2012 میں اس بات کی نشاندہی کی کہ پاکستان، بنگلہ دیش، انڈیا، نائجیریا اور پیرو پوری کا دنیا میں پائی جانے والی غذائی قلت میں آدھے سے زیادہ حصہ ہے اور پاکستان میں پانچ سال سے کم عمر بچوں کی شرح اموات 35 فیصد ہے۔رپورٹ میں یہ بھی خبردار کیا گیا کہ اگر متحد ہو کر کوئی اقدام نہ کیا گیا تو اگلے 15 سالوں میں پاکستان میں غیر نمو پذیر بچوں کی شرح دنیا میں سب سے زیادہ ہو جائے گی۔شدید غذائی قلت بارے مقامی سطح کے پراجیکٹ، جس کا سنگ بنیاد سندھ کے شعبہ صحت نے 10 سیلاب متاثرہ اضلاع میں غذا کی صورت حال کا اندازہ لگانے کے لیے رکھا تھا، کے حقائق کے مطابق وہ 1,469,415 بچے جن کا معائنہ کیا گیا ان میں سے 167,350 معتدل غذائی قلت اور 71,936 شدید غذائی قلت کا شکار پائے گئے۔

تعلیم

پاکستان میں 2012 میں تعلیم کی صورت حال بچوں کو بنیادی حقوق فراہم کرنے میں حکومت کی مستقل ناکامی کی ایک اور مثال ہے۔شرح خواندگی اور معیار تعلیم دونوں ہی کافی غیر اطمینان بخش تھے اور ملک میں

بڑھتے ہوئے سکیورٹی خدشات کے باعث بہتری کے کسی بھی امکان پر ضرب لگی۔

یونیسکو نے اکتوبر 2012 میں اپنی رپورٹ ''تعلیم سب کے لیے کا عالمی جائزہ'' جاری کی جس نے پاکستان میں تعلیم کی صورت کے متعلق انتہائی مایوس کن اعداد و شمار پیش کیے۔ رپورٹ کے مطابق تعلیمی ترقی کے گوشوارے میں پاکستان کا 113 واں نمبر ہے، جو کہ علاقائی ممالک مثال کے طور پر انڈیا (102)، اور بھوٹان (90) سے کہیں زیادہ بدتر ہے۔ اعداد کے لحاظ سے رپورٹ نے شمار کیا کہ پاکستان میں پانچ سے نو سال تک کی عمر کے تقریباً 51 لاکھ بچے سکول نہیں جاتے تھے جو کہ پوری دنیا میں سکول نہ جانے والے بچوں کی دوسری سب سے بڑی تعداد ہے۔ اگر عمر کا دائرہ بڑھا کر اس میں بالغوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ بات واضح ہوگی کہ کل ڈھائی کروڑ بچوں کا سکولوں میں اندراج نہیں۔ رپورٹ نے اس بات کی بھی نشاندہی کی کہ پاکستان کی جانب سے 2015 تک ''پوری دنیا میں ابتدائی تعلیم سب کے لیے'' ایک ہزار سالہ ترقیاتی ہدف کا حصول غیر متوقع تھا۔ پاکستان تعلیم پر خرچ کی جانے والی رقم کے حوالے سے بھی دیگر جنوبی ایشیائی ممالک سے کافی پیچھے تھا۔ پاکستان میں تعلیم پر خرچ کیا جانے والا جی این پی کا 2.8 فیصد جنوبی ایشیا میں سب سے کم اور صرف بنگلہ دیش کے 2.4 فیصد سے زیادہ تھا۔

بچوں کے تحفظ اور بحالی کی تنظیم (سپارک) جس نے 2011 میں پاکستانی بچوں کی صورت حال پر اپنی توجہ مرکوز رکھی، کی رپورٹ نے بھی ایسے ہی اعداد و شمار پیش کیے اور اس بات کی نشاندہی کی کہ پاکستان میں ڈھائی کروڑ بچے سکول نہیں جاتے، جبکہ 70 لاکھ بچوں کو کسی قسم کی ابتدائی تعلیم مہیا نہیں کی گئی۔ سکولوں کے بنیادی ڈھانچے کے بارے میں رپورٹ نے اس بات پر غور کیا کہ سندھ میں صورت حال سب سے زیادہ خطرناک تھی، جہاں 35 فیصد سکول عمارت کے بغیر تھے اور بہت سے سکولوں کی چاردیواری نہیں تھی۔ خیبر پختونخوا، بلوچستان اور پنجاب میں ایسے سکولوں کی شرح بالترتیب 18,23 اور 10 فیصد تھی۔ رپورٹ نے یہ تخمینہ بھی لگایا کہ پاکستان بھر میں تقریباً 35 ہزار فرضی سکول ہیں جو مسلسل سرکاری عطیات وصول کر رہے ہیں۔ سٹینفورڈ لا سکول (Stanford law school) اور نیویارک یونیورسٹی کی 2012 میں جاری کردہ ایک رپورٹ جس کا عنوان ''ڈرون کی زد میں'' تھا، نے اس بات کی نشاندہی کی کہ ڈرون حملوں سے متاثر ہونے والے علاقوں میں حملوں کے خدشے یا ان حملوں کے مالی اور جذباتی اثرات کے باعث بچوں کو سکولوں سے اٹھا لیا گیا۔

2012 سوات کی رہنے والی ایک 13 سالہ لڑکی ملالہ یوسف زئی، جسے طالبان نے گولی ماردی جو کہ تعلیم نسواں کے لیے اس کی حمایت سے پریشان تھے، پر ہونے والے خوفناک حملے کے حوالے سے بھی جانا جاتا

راولپنڈی: مرکزی شہروں میں بھی سکول عمارتوں سے محروم ہیں

ہے۔اس حملے کی پوری دنیا میں مذمت کی گئی اور اس نے پاکستان میں خواتین کی تعلیم بلکہ کمی کے مسئلے کو اجاگر کیا۔ای ایف اے جی ایم کے مطابق پاکستان میں سکول جانے کی عمر کی تقریباً 63 فیصد لڑکیاں سکول نہیں جاتی تھیں۔ملالہ پر حملے کے جواب میں اقوام متحدہ نے پاکستان میں غیر مراعات یافتہ لڑکیوں کو تعلیم مہیا کرنے کے لیے لڑکیوں کا ایک نیا عالمی فنڈ ''ملالہ فنڈ'' قائم کیا اور ملالہ اور دنیا بھر کی اُن دیگر لڑکیوں کی حمایت میں 10 نومبر کو ''ملالہ ڈے'' قرار دیا، جن کے تعلیم کے حق کو نظر انداز کیا گیا تھا۔پاکستان نے بھی پیرس میں دسمبر 2012 میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس، جس کا عنوان ملالہ کی حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوں، 'تعلیم نسواں کے لیے اُٹھ ہوں' تھا میں ایک کروڑ امریکی ڈالر کا عطیہ دینے پر رضامندی ظاہر کی۔

جب سال ختم ہونے کو تھا، تب پارلیمنٹ نے وفاقی علاقوں میں 5 سے 16 سال کی درمیانی عمر کے بچوں کو مفت تعلیم کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کے حق کے ایکٹ 2012 کی منظوری دی۔اس قانون کے تحت اب وفاقی حکومت اپنی حدود میں بچوں کو مفت درسی کتب اور یونیفارم مہیا کرنے کے علاوہ اس بات کو بھی یقینی بنائے گی کہ کوئی بھی بچہ سکول میں داخلے سے محروم نہ رہے اور یہ کہ سکولوں میں پڑھے لکھے اساتذہ ہوں۔سکول سے پہلے کی مفت تعلیم، نومولود بچوں کی نگہداشت اور مفت طبی اور دانتوں کے معائنے کی سہولیات بھی فراہم کی جانی تھیں اور کسی بچے کو جسمانی سزا دینے یا نفسیاتی طور پر ہراساں کرنے کی ممانعت تھی۔طالب علموں سے کوئی بھی فیس بشمول ٹیوشن فیس وصول نہیں کی جانی تھی اور حکومت نے سکول کی عمارات، کھیل کے میدان، لیبارٹریاں اور دیگر سہولیات فراہم کرنی تھیں۔قانون کے تحت نجی سکولوں کی جانب

سے ایک جماعت میں 10 فیصد پسماندہ طالب علموں کو مفت تعلیم فراہم کرنا ضروری تھا اور سکول کے انتظامات کے لیے کمیٹیاں بھی تشکیل دی جانی تھیں جنہوں نے والدین کو اس بات پر قائل کرنے کے لیے کہ وہ اپنے بچے سکول بھیجیں، کمیونٹی کے ساتھ تعاون کرنا تھا۔ صوبائی سطح پر 2012 کے آخر تک چاروں صوبوں میں سے کسی نے بھی ایسا قانون متعارف نہیں کرایا تھا۔

وزیراعظم نے نومبر 2012 میں بےنظیر انکم سپورٹ کے تحت وسیلہ تعلیم سکیم کا سنگ بنیاد بھی رکھا، جس کا مقصد اگلے چار برسوں میں 30 لاکھ بچوں کا پرائمری سکولوں میں اندراج کرانا تھا۔

حقوق کی پامالیاں اور بچوں کا تحفظ

3 اکتوبر 2012 کو پاکستان کے عالمی سلسلہ وار جائزے (یو پی آر) کا انعقاد انسانی حقوق کونسل جنیوا میں کیا گیا، جہاں کونسل نے ملک میں انسانی حقوق کی صورت حال بہتر بنانے کے لیے حکومت پاکستان کو 163 تجاویز پیش کیں اور 50 فیصد سے زائد تجاویز بچوں کے حقوق سے تعلق رکھتی تھیں۔ یو پی آر کے دوران دی گئی تجاویز میں تمام زیرالتوا بلوں بشمول فوجداری قانون کی ترمیم (بچوں کا تحفظ) کے بل 2009، بچوں کے حقوق کے کمیشن کے بل 2009، جسمانی سزا کی ممانعت کے بل، بچوں کی شادی کی ممانعت (ترمیم) کے بل اور بچوں کے حقوق کے چارٹر کے بل 2009 کی منظوری شامل تھی۔ قومی کمیشن بل اور بچوں کے حقوق کا بل سال کے اختتام پر قانون سازی کے آخر مراحل میں تھے اور انہیں جلد ہی کابینہ میں پیش کیے جانے کی امید تھی۔ بچوں کے حقوق کے بل میں جرم کی ذمہ داری کی عمر 7 سال سے بڑھا کر 10 سال کرنے کی تجویز پیش کی گئی، اور اس میں بچوں کو عریانی اور جسمانی سزا سے تحفظ فراہم کرنے کے لیے دفعات بھی شامل کی گئیں۔

پنجاب میں سماجی فلاح کے محکمے اور یونیسف نے 2011 میں بچوں کے تحفظ کی ایک پالیسی تشکیل دی، جو جائزوں اور ترامیم کے دیگر متعدد مراحل سے گزری، لیکن صوبائی حکومتوں کی جانب سے اس کی سرکاری طور پر منظوری باقی تھی۔ اگرچہ جون 2012 میں پنجاب یوتھ پالیسی کا افتتاح کیا گیا جس میں 15 اور 29 سال کی درمیانی عمر کے افراد کی معاونت کا بندوبست کیا گیا تھا اور اس کا مقصد ترقی نوجوانان کے لیے ذرائع اور مددگار فضا فراہم کرتا تھا۔ ایسی ہی پالیسیاں دوسرے صوبوں کے لیے بھی زیرغور تھیں۔

جون 2011 میں سندھ اسمبلی نے انتہائی تشہیر شدہ سندھ چائلڈ پروٹیکشن اتھارٹی ایکٹ 2011 کی منظوری دی لیکن ایک سال بعد بھی حکومت اتھارٹی کی تشکیل جس کا اس قانون نے اختیار دیا تھا اور خط و کتابت کے ضوابط کا اعلان نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے لیے کوئی بھی بجٹ مختص نہیں کیا گیا تھا۔ بچوں کے تحفظ اور فلاح

بچے ملالہ کی حمایت کا اظہار کرتے ہوئے

و بہبود کے کمیشن جو کہ خیبر پختونخوا میں 2011 میں قائم کیا گیا تھا، نے پشاور، مردان، صوابی، بونیر، سوات، کوہاٹ، ایبٹ آباد اور چارسدہ اضلاع میں بچوں کے تحفظ کے مراکز قائم کیے تھے اور اپنے آغاز سے لے کر اب تک 7,000 سے زائد کیس نمٹائے تھے۔ بلوچستان کے بچوں کے تحفظ کے بل 2011، جس پر 2011 کے آخر میں صوبائی اسمبلی میں غور وخوض کیا گیا تھا، کے تحت بلوچستان میں بھی ایسے ہی ادارے کے قیام کی تجویز پیش کی گئی تھی۔

قومی اسمبلی نے جولائی 2012 میں بچوں کے حقوق کے متعلق پارلیمانی مجلس تشکیل دی، جس کا بیان کردہ مقصد ملک میں بچوں کی فلاح کو توجہ کا مرکز بنانا تھا۔ بچوں کے عالمی دن کے موقع پر پی ایف سی آر کی منعقد کردہ تقریب کے موقع پر وزیراعظم نے 2013 کو بچوں کا سال قرار دیا اور پی ایف سی آر کو اپنا ایجنڈا متعارف کرانے کے لیے 3 کروڑ روپے کا اعلان کیا۔ انہوں نے کہا کہ پی ایف سی آر اس امر کو یقینی بنانے کے لیے قائم کیا گیا تھا کہ ارکان پارلیمنٹ بچوں کے لیے تعلیم، صحت کی نگہداشت، خوارک، قوت بخش غذا اور تحفظ اور محفوظ ماحول کے فروغ میں مصروف اداروں کی نگرانی کی ذمہ داری لیں۔ انہوں نے بچوں کی متوازن ترقی کو یقینی بنانے کے لیے وزارت اطلاعات ونشریات کو 2013 میں نشر کیے جانے والے بچوں کے مخصوص تفریحی اور تعلیمی پروگراموں میں شامل ہونے کی ہدایت بھی کی۔ پی ایف سی آر نے نومبر 2012 میں (اپنے قیام کے 4 ماہ بعد) اپنا پہلا اجلاس پارلیمنٹ ہاؤس میں منعقد کیا۔ پہلے اجلاس میں اس نے غیر سرکاری اداروں (NGOs) کو بین الاقوامی معاونت کا ناجائز استعمال کرنے پر جوابدہ بنائے رکھنے کے طریقوں پر

بحث کرنے کا انتخاب کیا۔کم سن بچوں جن کو گارڈین اینڈ وارڈا ایکٹ 1890 کے تحت سر پرستوں کے حوالے کر دیا گیا تھا، کی مناسب پرورش اور فلاح و بہبود کو یقینی بنانے کے لیے پاکستان کے کمیشن برائے قانون وانصاف نے مئی 2012 میں ضوابط میں تبدیلی لانے کی تجویز پیش کی تھی کہ سر پرست کو اس امر پر مجبور کیا کہ وہ ہر تین ماہ بعد بچے کو عدالت میں پیش کرے گا تا کہ اس امر کا پتہ لگایا جا سکے کہ اس کی پرورش کن حالات میں کی جاری ہے۔ قانون میں ترمیم کی شدید ضرورت تھی اور اس وقت ایل جے سی پی نے معاملے کو اجاگر کر کے درست سمت میں قدم اٹھایا تھا۔

محتسب کے دفتر میں قائم بچوں کے وفاقی شکایتی مرکز (سی سی او) نے ستمبر 2012 میں بچوں کی صورت حال پر ایک رپورٹ شائع کی۔ یہ رپورٹ اس تحقیق کا نتیجہ تھی جس کی ذمہ داری صوبائی سی سی اوز اور یونیسف نے مشترکہ طور پر لی تھی اور یہ پاکستان میں بچوں کے حقوق، صحت، تعلیم اور چائلڈ لیبر کی صورت حال کی ایک جامع سرگزشت تھی۔ یہ قرار دیتے ہوئے کہ پاکستان میں بچوں کے حقوق کی مجموعی صورتحال کافی غیر اطمینان بخش ہے، اس نے خاص تجاویز پیش کیں کہ پاکستان کیسے بچوں کے حقوق کی پالیسی تشکیل دیتے ہوئے، بچوں کے حقوق کا کمیشن قائم کرتے ہوئے اور خواتین میں متعدد تبدیلیاں کرتے ہوئے اور بچوں کی بہتری کے لیے لائحہ عمل کے نفاذ سمیت دیگر مثبت پیش رفت کر سکتا ہے۔

اکتوبر 2012 میں ناروے سے تعلق رکھنے والے بچوں کے سابق محتسب کی کنسلٹنٹ کے طور پر خدمات حاصل کی گئی تھیں اور رپورٹ کی تکمیل کی تاریخ فروری 2013 مقرر کی گئی تھی۔ جہاں تک وفاقی سی سی او کی کارکردگی کا تعلق ہے تو اس نے 2011 میں 143 شکایات وصول کیں جن میں سے 41 قابل سماعت اور 102 نا قابل سماعت قرار پائیں۔ نا قابل سماعت شکایات میں 65 کو صوبائی دفاتر کے سپرد کر دیا گیا۔ 2011 میں موصول شدہ شکایات میں سے زیادہ تر صوبائی تعلیمی محکموں کے خلاف تھیں۔ پنجاب کے سی سی او نے 2011 میں 2,218 شکایات درج کیں، جن میں سے 1,848 کا ازالہ کیا گیا جبکہ سال کے اختتام پر باقی شکایات کی تحقیقات جاری تھیں۔ 89 شکایات بچوں نے خود درج کرائی تھیں۔ موصول شدہ شکایات میں سے زیادہ تر شکایات تعلیمی محکموں اور پولیس کے خلاف تھیں۔ 2012 کے آخر میں پنجاب کے شہروں لاہور، راولپنڈی، ملتان، سرگودھا، خوشاب، میانوالی، عیسیٰ خیل، بھلوال، فیصل آباد، قصور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، جہلم، اٹک، چکوال، کٹاس، اخلاص پور، پتوکی اور مظفر گڑھ میں بچوں کے شکایتی بکس کے دفاتر قائم کر دیئے گئے تھے۔

بچوں کے خلاف تشدد

1989 میں قائم کردہ ایک این جی او' ساحل' ، جو کہ خاص طور پر بچوں پر جنسی تشدد اور ان کے استحصال کے خلاف کام کرتی ہے، کے مطابق 2012 کے پہلے چھ ماہ کے دوران بچوں پر جنسی تشدد کے 1,573 واقعات منظر عام پر آئے، جبکہ 2011 میں اتنی ہی مدت کے دوران 2,023 واقعات پیش آئے تھے۔ صوبہ وار تقسیم سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ بچوں پر تشدد کے اطلاع شدہ واقعات کی تعداد کے حوالے سے پنجاب بدستور سب سے آگے تھا اور ان واقعات کی تعداد 1,092 تھی، جبکہ سندھ سے 314، خیبر پختونخواہ سے 62، وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں سے 52، بلوچستان سے 33، آزاد جموں کشمیر سے 16 اور گلگت سے 4 واقعات کی اطلاعات ملیں۔ اس رپورٹ کے مثبت مشاہدات میں سے ایک یہ تھا کہ مجموعی طور پر ایسے واقعات جن کی پولیس کو اطلاع دی گئی، کی تعداد میں اضافہ ہوا اور لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کے زیادہ واقعات کا تھانوں میں اندراج کیا گیا۔ گزشتہ سال ساحل نے بچوں پر جنسی تشدد کے کل 2,942 واقعات کی اطلاع دی۔

ستمبر 2012 میں جاری کردہ سپارک کی ایک رپورٹ کے حقائق کے مطابق 2011 میں بچوں کے اغواء کے تقریباً 7,000 واقعات منظر عام پر آئے، جس میں سے 3,090 بچے صرف کراچی سے اغواء ہوئے۔ لاہور پولیس کے فراہم کردہ اعداد وشمار پر مبنی ایک رپورٹ سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یکم جنوری سے نومبر تک منظر عام پر آنے والے بچوں کے اغواء کے 41 واقعات میں سے 14 سال تک کی عمر کے بیس بچوں کو تاوان کے لیے اغواء کیا گیا جن میں سے دو کو قتل کر دیا گیا۔ پندرہ متاثرین کو باحفاظت بازیاب کرالیا گیا، دو بچے اپنی مدد آپ کے تحت اپنے گھر پہنچے اور ایک کو تاحال بازیاب نہیں کرایا جاسکا تھا۔

سٹین فورڈ لاء کالج اور نیویارک یونیورسٹی نے اپنی رپورٹ میں پاکستان میں ڈرون حملوں کے متعلق اعداد وشمار جو کہ بیورو آف انویسٹی گیٹو جرنلزم برطانیہ کے اندازوں پر مبنی تھے، کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں جون 2004 سے لے کر وسط ستمبر 2012 تک ڈرون حملوں میں 176 بچے مارے جاچکے ہیں۔

2012 میں یو این کے سیکرٹری جنرل نے سلامتی کونسل کو بچوں اور مسلح تنازعات پر مبنی ایک رپورٹ جمع کرائی جو کہ اس معاملے پر مامور اقوام متحدہ کے اہلکار کے کام پر مبنی تھی۔ اس رپوٹ نے 23 ممالک میں تنازعات کا احاطہ کیا جن میں سے 16 ممالک سلامتی کونسل کے چارٹر پر موجود تھے اور سات ممالک کولمبیا،

کوئٹہ: دہشت گردی نے بچوں کو بھی نہ چھوڑا

انڈیا، پاکستان، فلپائن، سری لنکا، تھائی لینڈ کی جنوبی سرحد کے ساتھ واقع صوبے اور یمن اس میں شامل نہیں تھے۔ پاکستان نے یہ کہتے ہوئے رپورٹ پر اعتراض کیا کہ اقوام متحدہ کا نمائندہ پاکستان کو شامل کرتے ہوئے اپنے دائرہ اختیار سے باہر رہ کر کام کر رہا تھا اور یہ کہ رپورٹ میں ایسی صورت حال شامل کی گئی ہیں جو تنازعات نہیں بلکہ دہشت گردوں اور جرائم پیشہ افراد کی کارروائیاں تھیں۔ پاکستان نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی قرارداد کے حق میں ووٹ ڈالنے سے بھی اجتناب کیا جس کا مقصد ان مسلح گروہوں پر پابندیاں عائد کرنے پر رضامندی ظاہر کرنا تھا، جو بچوں کے حقوق کو مسلسل پامال کر رہے تھے۔ پاکستان کے ووٹنگ میں حصہ نہ لینے کے فیصلے کو بالخصوص اقوام متحدہ کے بچوں اور تنازعات کے نمائندے، ہیومن رائٹس واچ اور بچوں اور مسلح تنازعات کی واچ لسٹ نے شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور انہوں نے اسے بچوں کے لئے نقصان دہ قرار دیا اور اس بات پر زور دیا کہ متاثر ہونے والے بچوں کو اقوام متحدہ کی توجہ درکار ہے اس بات سے قطع نظر کہ ان کا ملک کونسل کے چارٹر میں شامل ہے یا نہیں۔

چائلڈ لیبر

2011 میں وفاقی ادارہ شماریات کی جانب سے 2012 میں آئی ایل او کے تعاون سے ایک تازہ سروے مکمل کرنے کے وعدوں کے باوجود چائلڈ لیبر سے متعلق ایک سرکاری ملک گیر سروے کی تعمیل نہیں کی گئی۔ پاکستان چائلڈ لیبر کے تازہ ترین اعداد و شمار قلم بند کرنے کے حوالے سے دیگر جنوبی ایشیا ممالک سے بہت پیچھے ہے۔ بنگلہ دیش نے چائلڈ لیبر سے متعلق آخری سروے 6-2005 میں، سری لنکا نے 2009 اور

بھٹہ مزدوری کا شکار بچے

نیپال نے 2011 میں منعقد کیا تھا جبکہ پاکستان میں آخری سروے 1996 میں منعقد کیا گیا تھا۔ 2011 میں چائلڈ لیبر کی بدترین صورتوں کے بارے میں امریکی شعبہ محنت کے ستمبر 2012 جاری کردہ حقائق یہ ظاہر کرتے تھے کہ پاکستان ان 27 ممالک (ان 144 ممالک میں سے ایک جن کا جائزہ لیا گیا) میں سے ایک تھا جنہوں نے چائلڈ لیبر کی بدترین صورتوں کے خاتمے کی کوششوں میں کوئی پیش قدمی نہیں کی۔ غیر سرکاری اعداد وشمار کے مطابق پاکستان میں ایک کروڑ بچے چائلڈ لیبر کا شکار تھے۔ سپارک نے دعویٰ کیا کہ صرف خیبر پختونخوا میں تقریباً پندرہ لاکھ بچے چائلڈ لیبر کا شکار تھے۔ 2012 میں پاکستان کے یو پی آر کے دوران، آئی ایل او کے ماہرین کی کمیٹی نے کام کرنے والے کم از کم عمر سے نچلی عمر کے بچوں کی ایک بڑی تعداد کے حوالے سے تشویش کا اظہار کیا اور انہوں نے حکومت پر زور دیا کہ وہ اس حوالے سے اقدامات اٹھائیں۔

بلوچستان میں امن وامان کی بگڑی ہوئی صورتحال کے باعث بھی صوبے میں چائلڈ لیبر میں اضافہ ہوا ہے۔ ایک عوامی سیمینار کے موقع پر بلوچستان کے شعبہ محنت کے عہدیداروں نے کہا وہ امن وامان کی صورتحال کے باعث کوئٹہ سے باہر چائلڈ لیبر کی صورتحال کا جائزہ لینے سے قاصر ہیں۔ اس امر کی بھی نشاندہی کی گئی کہ بلوچستان اسمبلی میں متعلقہ قائمہ کمیٹیوں کی کمی کے باعث صوبے میں بچوں کی گروی مشقت کی ممانعت کے حوالے سے قانون سازی کے عمل کی رفتار کم ہوئی۔

آئین کی اٹھارہویں ترمیم کی منظوری کے بعد پنجاب واحد صوبہ تھا جس نے بچوں کی ملازمت کو باضابطہ بنانے کے قانون، جو کہ ہو بہو بچوں کی ملازمت کے وفاقی قانون 1991 جیسا تھا، کی منظوری دی۔

2012 میں چاروں صوبوں کے شعبہ محنت چائلڈ لیبر سے متعلق ایک نئے قانون جو کہ ای سی اے 1991 کی جگہ لے گا، کا مسودہ تیار کرنے پر متفق ہوگئے۔ آئی ایل او کے کنونشن نمبر 138 اور 182 میں مجوزہ قانون کے تحت 14 سال سے کم عمر بچوں کی ملازمت کی ممانعت کے قانون (پی ای سی اے) کا مسودہ پنجاب کے شعبہ محنت میں زیرِ غور تھا۔

محتسب کے دفتر میں قائم بچوں کے متعلق شکایات کے وفاقی دفتر کی جاری کردہ رپورٹ ''پاکستان میں بچوں کی صورتحال'' میں پاکستان میں چائلڈ لیبر کو کم کرنے کے لیے ''کام کے بدلے نقدی'' کا اصول استعمال کرنے کی تجویز پیش کی۔ سول سوسائٹی کی تنظیموں نے سال بھر کے دوران بچوں کی گھریلو مشقت کو بچوں کے لیے ممنوعہ پیشوں میں شامل کرنے کے لیے سرگرم ہو کر مہم چلائی لیکن ایسی کسی بھی ترمیم کو عملی جامہ نہیں پہنایا گیا۔ پنجاب میں تجویز کردہ پی ای سی اے نے بھی گھریلو مشقت کو ممنوعہ پیشوں کی فہرست میں شامل نہیں کیا۔

بچوں کے مقدمات کا عدالتی بندوبست

جوینائل جسٹس سسٹم آرڈیننس 2000، میں واضح دفعات کے باوجود یہ سال بھی جوینائل عدالت کے قیام یا فوجداری مقدمات میں ملوث بچوں کو مستقل مفت قانونی معاونت کی فراہمی کے بغیر گزر گیا۔ پولیس کی حراست میں تشدد بھی ایک روایت کے طور پر جاری رہا اور اگست 2012 میں پنجاب کے ضلع جھنگ میں پولیس کی تحویل میں ایک بچے کی ہلاکت کی اطلاع ملی۔ اے جی ایچ ایس بچوں کے حقوق کے یونٹ جو کہ بچوں کے حقوق کے تحفظ اور فروغ کا ایک منصوبہ ہے، نے 2012 میں پنجاب کی بچوں کی جیلوں میں تقریباً 100 بچوں کے انٹرویو کیے جن میں سے 95 فیصد بچوں نے پولیس کی تحویل میں مختلف درجات کے تشدد کی شکایت کی۔ مئی 2012 میں آئین کے آرٹیکل 89 کے تحت بچوں کے مقدمات کے عدالتی بندوبست کے آرڈیننس 2012 کی منظوری دی گئی جس نے وفاقی حکومت کو اس قانون کو وفاقی دارالحکومت اسلام آباد کے علاقوں تک پھیلانے کا اختیار دیا۔ قانون میں شامل ہونے والی نئی شق کے مطابق وفاقی حکومت وفاقی دارالحکومت کے علاقوں میں بچوں کی عدالت کی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت قائم کردہ انسداد دہشت گردی کی عدالت کو نامزد کر سکتی ہے۔ سپارک کی آخری رپورٹ کے مطابق پاستان کی جیلوں میں کم سن قیدیوں کی تعداد 2010 میں 1,228 سے بڑھ کر 2011 میں 1,421 ہوگئی تھی۔ جیلوں میں اذیتیں برداشت کرنے والے بچوں کی تعداد اور حالت میں 2012 کے دوران کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں آئی۔ مندرجہ ذیل جدول میں 2012 کے آخر تک پاکستان کے چاروں صوبوں میں کم سن

قیدیوں کی تعداد بتائی گئی ہے۔ یہ معلومات صوبائی شعبہ جیل خانہ جات نے 2012 کے اختتام پر فراہم کی تھیں۔

پاکستان کی جیلوں کے کم سن مکین

صوبہ	سزا یافتہ قیدی	زیر سماعت
پنجاب	91 (بشمول ایک خاتون)	668
بلوچستان	17	29
سندھ	19	233
خیبر پختونخوا	187	7
کل تعداد	**314**	**957**

پیدائش کا اندراج

ہر بچے کو پیدائش کے وقت اپنے اندراج کا حق حاصل ہے۔ اندراج کی بدولت بچے کو ایک سرکاری شناخت، ایک تصدیق شدہ نام اور قومیت حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ بچے جن کے پاس سرکاری پیدائش کا سرٹیفکیٹ نہیں ہوتا وہ لازمی طور پر اپنے تمام حقوق بشمول تعلیم، نگہداشت صحت، شراکت اور تحفظ کی رسائی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ بچوں کی عمر کتنی ہے یا وہ کون ہیں، کسی دستاویز کی عدم موجودگی کے باعث غیر اندراج شدہ بچے صحت اور تعلیم جیسی بنیادی سہولیات تک رسائی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ غیر اندراج شدہ بچے بلا استثنیٰ، غریب لوگوں اور پسے ہوئے طبقے کے بچے ہوتے ہیں اور پیدائش کے وقت ان کے اندراج کے فقدان سے ان کی محرومیت اور غربت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسلام آباد کی ایک این جی او پلان انٹرنیشنل پاکستان نے ڈائریکٹوریٹ آف میونسپل ایڈمنسٹریشن (ڈی ایم اے) کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی اور نادرا کے تعاون سے بچوں کی پیدائش کے اندراج کا ایک یونٹ ڈائریکٹوریٹ آف میونسپل کارپوریشن کی حدود میں قائم کیا۔ اس یونٹ کا مقصد دارالحکومت کے علاقے میں بچوں کی پیدائش کے اندراج کو باضابطہ بنانا اور اسے قومی ڈیٹا بیس کے ساتھ منسلک کرنا تھا۔ نادرا نے لاہور کی ضلعی حکومت کے ساتھ ایک معاہدے پر بھی دستخط کئے جس کے مطابق اگر سرٹیفکیٹ بچے کی پیدائش کے 60 دن کے اندر حاصل کیا جائے تو اس پر فیس وصول نہیں کی جاتی تھی۔ اس سال پیدائش کے اندراج کی شرح کے اعداد و شمار دستیاب نہیں تھے۔ یونیسیف کے دستیاب شدہ

اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں 2001 اور 2009 کے درمیان صرف 27 فیصد پیدائشوں کا اندراج ہوا۔ یونیسف کی 2011 کی رپورٹ ''دنیا بھر کے بچوں کی صورتحال'' کے مطابق صوبوں کے لحاظ سے پیدائش کے اندراج کے اعداد و شمار یہ تھے۔ سندھ اور خیبر پختونخوا (بیس فیصد) اور آزاد کشمیر (چوبیس فیصد) جبکہ پنجاب میں یہ شرح 77 فیصد نسبتاً زیادہ تھی اور یہ عالمی اندراج کے قریب ترین تھی۔ بلوچستان اور فاٹا میں صورتحال بدترین تھی، جہاں پیدائش کے وقت صرف ایک فیصد بچوں کا اندراج ہوا۔ نیشنل ڈیٹا بیس اینڈ رجسٹریشن اتھارٹی آرڈیننس 2000 کا مقصد تمام لوگوں کا اندراج تھا لیکن یہ قانون مہاجر بچوں، لاوارث بچوں اور غیر شناخت شدہ والدین کے بچوں کے اندراج پر توجہ دینے میں ناکام رہا۔ اپریل 2010 میں اس آرڈیننس میں ترمیم، جس کا مقصد ان بچوں، جن کے والدین نامعلوم تھے، کے اندراج کے لیے قانون میں ایک شق کا اضافہ کرنا تھا، کی تجویز پیش کی گئی۔ لیکن اس کے بعد اس حوالے سے کسی بھی پیش رفت کی اطلاع نہیں ملی۔

جسمانی سزا

بچوں کے خلاف قانونی لحاظ سے غیر ممنوع تشدد کے خاتمے سے متعلق بچوں کی تمام جسمانی سزاؤں کے خاتمے کے عالمی اقدام کی عالمی رپورٹ 2012 نے پاکستان کی نشاندہی دنیا کے ان 26 ممالک کی ہے، جہاں جسمانی سزا کی مکمل طور پر ممانعت نہیں ہے جبکہ اس ملک کی حکومت نے لوگوں سے تمام جگہوں پر ممانعت کا قانون وضع کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

دارالحکومت اسلام آباد کے علاقوں کے لئے مفت اور لازمی تعلیم کے حق کے ایکٹ 2012 جو اس سال متعارف کرایا گیا تھا، نے سرکاری سکولوں میں پانچ سے سولہ سال تک کی عمر کے بچوں کی جسمانی سزا کی ممانعت کی تھی۔ اگرچہ نجی اور سرکاری اداروں میں تمام بچوں کے لیے جسمانی سزا پر مکمل پابندی لگانے کے لیے ایک مخصوص قانون، جسمانی سزا کی ممانعت کا بل 2010، قومی اسمبلی میں زیرِ نظر سال کے دوران التواء کا شکار رہا جبکہ جسمانی سزا پہلے جیسی شدت سے ہی عائد کی جاتی رہی۔ بلوچستان کا جسمانی سزا کی ممانعت کا بل 2011 سے تیاری کے مرحلے میں ہے اور یہ 2012 کے آخر تک صوبائی اسمبلی میں پیش نہیں کیا گیا تھا۔

میڈیا کی رپورٹوں نے جسمانی سزا کے کم از کم 23 واقعات کی نشاندہی کی، جہاں طالب علموں کو بے رحمی سے زدوکوب کیا گیا، جس کے نتیجے میں وہ بری طرح زخمی ہوئے یا ان کی موت واقع ہوگئی۔ پنجاب میں منظر عام پر آنے والے واقعات کے نتیجے میں 2 بچوں کی موت (احسن ابدال اور لاہور میں) واقع ہوگئی، دو

رجحانات جن کے باعث سکولوں میں شرح اخراج میں اضافہ ہوا

بچوں نے خیبر پختونخوا میں سزا کے خوف سے خودکشی کا ارتکاب کیا اور 8 واقعات میں استاد کی مسلسل مار کے باعث طالب علموں کے ہاتھ/ پاؤں کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ ایک واحد مثال جہاں تھوڑی بہت قانونی کارروائی کی گئی وہ حسن ابدال سے تعلق رکھنے والے 15 سالہ طالب علم کا واقع ہے جو اپنے استاد کے تشدد کے باعث جاں بحق ہو گیا تھا۔ استاد کو تشدد اور قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ضلعی تعلیمی حکام نے واقعے کی تحقیقات کے لیے ایک تین رکنی کمیٹی تشکیل دی اور اس نے استاد کو اس جرم کا قصوروار ٹھہرایا۔ ٹیم کی درخواست پر استاد کو پینشن اور دیگر سہولیات دیئے بغیر اس کی ملازمت کو بھی ختم کر دیا گیا۔ تشدد مدرسوں میں دی جانے والی تعلیم کا فطری حصہ رہا۔ اپریل 2012 میں کبیر والا میں پانچ سال سے کم عمر بچوں کو مدرسے کے باغیچے سے پھول توڑنے پر بے رحمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ بعدازاں اسی مہینے میں لاہور کے ایک مدرسے میں ایک طالب علم کو تشدد کر کے ہلاک کر دیا گیا۔ (اوپر حوالہ دیا گیا ہے)

ایچ آر سی پی کی میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق، 2012 میں خودکشی کرنے والے 1,976 افراد میں سے تقریباً 188 کم سن بچے تھے۔ اسی عرصے کے دوران 8,730 افراد جنہوں نے اپنی جان لینے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے، ان میں سے 76 افراد 18 سال سے کم عمر تھے۔ ان میں سے متعدد واقعات میں بچوں کی جانب سے خودکشی یا اقدام خودکشی کا ارتکاب کرنے کی وجہ شدید غربت تھی۔ اپریل میں راولپنڈی میں ایک بارہ سالہ لڑکا عثمان سکول سے اٹھائے جانے پر اتنا پریشان تھا کہ اس نے پھانسی لے لی۔ اس کے والدین نے اسے سکول چھوڑنے پر مجبور کیا تھا کہ کیونکہ وہ اس کی تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ عثمان کے والدین نے اسے اپنے خاندان کو سہارا دینے کے لیے آٹو ورکشاپ پر کام شروع کرنے کا بھی کہا تھا۔

غربت اور ذہنی دباؤ کا تعلق متواتر عسکریت پسندی اور فوجی آپریشنوں جن کا مقصد عسکریت پسندوں کو شکست دینا تھا، سے ہے اور انہوں نے جنگ زدہ علاقوں اور ان کے گردنواح کے علاقوں کے بچوں پر اپنے نشانات ثبت کئے ہیں۔ ایک تیرہ سالہ لڑکا کامران خان، خیبر پختونخوا کے قصبے شبقدر سے تعلق رکھتا تھا۔ شب قدر فاٹا کے جنگ سے متاثرہ علاقے مہمند ایجنسی سے ملحق ہے۔ مارچ میں کامران نے اپنے گھر کے باہر خود پر پٹرول چھڑکا اور آگ لگالی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے اہل خانہ اسے نیا سکول یونیفارم خرید کر نہیں دے سکتے تھے۔ ایک ہفتے کے بعد کامران ایک فوجی ہسپتال میں دم توڑ گیا۔ انتہائی غریب خاندان کو امید تھی کہ کامران اور اس کے بڑے بھائی کو سکول میں رکھتے ہوئے وہ خود کو غربت سے باہر نکال سکتے ہیں۔ کامران کی ماں نے پہلے ہی اپنے پانچویں بچے کو کسی اور کے سپرد کر دیا تھا کیونکہ وہ اس کی پرورش نہیں کر سکتے تھے۔ کامران کی موت نے شبقدر جو کہ پشاور سے دو گھنٹوں کی مسافت پر واقع ہے کہ لوگوں کو نہ صرف یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ایک بچے نے کپڑوں کے ایک جوڑے کے لیے اپنی زندگی کا خاتمہ کیوں کیا، بلکہ اس سے اس بات کی اہمیت بھی ظاہر ہوتی تھی کہ جنگ زدہ علاقوں میں غریب خاندانوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے کتنی مدد درکار تھی۔

بے گھر اور معذور بچے

2012 میں پاکستان نے بے گھر بچوں کی تعداد یا ان کی حالت زار کو کم کرنے میں کوئی پیش رفت نہیں کی اور نہ ہی ان کے تحفظ کے لیے ایک موثر لائحہ عمل متعارف کرایا۔ سپارک کی 2011 کی سالانہ رپورٹ نے تخمینہ لگایا کہ پاکستان میں بے گھر بچوں کی تعداد پندرہ لاکھ ہے۔ سی سی او کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ بے گھر بچوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ بالخصوص 2005 کے زلزلے اور 2010 کے سیلابوں کے بعد، جن کے باعث لاکھوں بچے بے گھر یا یتیم ہو گئے۔

سال کے دوران کئے گئے چند خال خال اقدامات کے سوا معذور بچے بھی ملک کی آبادی کا ایک انتہائی نظرانداز شدہ طبقہ تھے۔ پاکستان بیت المال نے مخصوص تعلیم اور سماجی بہبود کے ڈائریکٹر جنرل اور دارالحکومت کے انتظامی و ترقیاتی وزارت کے تحت کام کرنے والے اسلام آباد کے مخصوص تعلیم کے چار مراکز کے بچوں کو 90,000 ویل چیئرز، 20,000 سفید چھڑیاں اور 30,000 ہزار آلات سماعت فراہم کئے۔ اکتوبر میں دارالحکومتی انتظامی و ترقیاتی ادارے (سی اے ڈی) کے سیکرٹری نے معذور افراد کو ترجیحی بنیادوں پر علاج معالج کی مفت فراہمی کے لیے تمام ہسپتالوں میں مخصوص بینچ قائم کرنے کا اعلان کیا۔ دسمبر میں وفاقی وزیر برائے

زندہ رہنے کے لیے کوڑا کرکٹ ٹھکانے لگانے پر مجبور

دارالحکومتی انتظامیہ وترقیاتی امور نے معذور افراد کے لیے ڈگری کالج قائم کرنے کے حوالے سے حکومتی منصوبوں کا بھی اعلان کیا۔صوبائی سطح پر پنجاب کے وزیراعلیٰ نے پنجاب تعلیم وقف فنڈ کومخصوص بچوں کو سکالرشپ فراہم کرنے کا حکم دیا۔انہوں نے مزید کہا پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی تعلیمی ووچر سکیم کے تحت مستحق معذور بچوں کومفت تعلیم فراہم کرنے کے لیے ووچر بھی دیئے جائیں۔انہوں نے کہا کہ صوبائی حکومت مخصوص بچوں کوتعلیم اورصلاحیت سازی کی تربیت فراہم کرنے کے لیے ایک جامع پالیسی تشکیل دے گی۔ سالانہ ترقیاتی پروگرام 13-2012 کےتحت سندھ کےمخصوص تعلیم کےمنصوبے کے لیے چھ منصوبوں کی منظوری دی گئی۔ یہ منصوبے معذوری کےمتعلق آگاہی میں اضافہ کرنے،اساتذہ کی تربیت اور موجودہ تعلیمی سہولیات کی بہتری کےمتعلق تھے۔

کم سنی کی عمر میں شادیاں

سماجی رویوں اور کم سنی کی عمر میں شادی کےمتعلق سرکاری پالیسیوں میں کوئی معنی خیز تبدیلی نہیں دیکھی گئی۔ ونی اورسوارا جیسی رسمیں سال بھر جاری رہیں اور گزشتہ سال خواتین مخالف سرگرمیوں کی روک تھام (فوجداری قانون کی ترمیم) کےایکٹ 2011 کی منظوری کے باوجود مجرموں کے خلاف بہت کم کارروائی کی گئی۔ الیکٹرانک میڈیا نے کم عمر بچوں کی جبری شادیوں کے 30 واقعات کی نشاندہی کی،جن میں سے پانچ واقعات سوارا اور 12 ونی کے تھے،اوران میں سے زیادہ تر واقعات سندھ اور خیبر پختونخوا میں پیش آئے۔ مئی

فیصل آباد: بعض اوقات کمسنی کی شادی کو روکا بھی گیا

2012 میں کمیشن برائے قانون وانصاف، پاکستان نے پنچائیت یا جرگے کی مداخلت کے ذریعے تنازعات کے تصفیے کے لیے لڑکیوں کی زبردستی شادی کرنے کے واقعات کا سخت نوٹس لیا۔ ایل جے پی سی نے ان لوگوں کو سخت سزا دینے کے لیے متعلقہ قانون میں ترمیم کی تجویز پیش کی جو ''بدل صلح'' کے طور پر کسی خاتون کی شادی کی ترغیب دیتے ہیں، اس کے لیے اکساتے ہیں، اس کا مطالبہ کرتے ہیں یا لڑکی وصول کرتے ہیں۔ کمیشن نے تجویز پیش کی کہ ایسے اقدام کی سزا بڑھا کر زیادہ سے زیادہ 14 سال کر دی جائے لیکن یہ سزا 10 سال بمعہ جرمانہ سے کم نہیں ہونی چاہیے۔

اقوام متحدہ کے آبادیاتی فنڈ کی ایک رپورٹ جس کا عنوان ''کم سنی کی عمر میں شادی، کم سنی کی عمر میں شادی کا خاتمہ'' تھا، میں اس بات کا نوٹس لیا گیا کہ عالمی سطح پر کم سنی کی عمر میں شادیوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور اگر یہ رجحان جاری رہا تو اس شرح میں 14 فیصد تک اضافہ ہو سکتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق جنوبی ایشیا میں کم سنی کی عمر میں شادی کی شرح سب سے زیادہ چالیس فیصد ہے۔

رپورٹ میں کہا گیا کہ پاکستان میں ہر سال حمل سے متعلقہ زخم کے تقریباً 5,000 واقعات پیش آتے ہیں اور کم عمر لڑکیاں غیر موزوں طور پر قبل از وقت حمل سے متاثر ہوتی ہیں۔ یو این ایف پی اے ماں کی صحت میں بہتری لانے کے لیے پاکستان میں حمل سے متعلقہ زخم کے علاج کے لیے ایک منصوبے کا آغاز کیا گیا جس کا بنیادی مقصد کم سنی کی عمر میں شادی، قبل از وقت شادی اور حمل سے متعلقہ زخم کے بیچ تعلق کے بارے میں آگاہی پیدا کرنا تھا۔ اس ادارے نے کم سنی کی عمر میں شادی اور کم عمری میں حمل کے خاتمے کے لیے ایک پروگرام شروع کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔

کسی بھی صوبے نے شادی کے لیے لڑکوں کی طرح لڑکیوں کی قانونی طور پر جائز عمر کو 16 سال سے بڑھا کر 18 سال مقرر کرنے کے لیے کم سنی کی عمر میں شادی کی روک تھام کے ایکٹ 1929 میں ترمیم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ دسمبر میں خیبر پختونخوا حکومت نے شادی کے لیے کم سے کم عمر 18 سال مقرر کرنے کے لیے جلد ہی صوبائی اسمبلی میں ایک بل پیش کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ دسمبر میں ایسے ہی مطالبے کی قرارداد پنجاب اسمبلی کے سیکرٹریٹ میں بھی جمع کرائی گئی۔ صوبائی اسمبلی کے ایک رکن مجلس قانون ساز نے کم سنی کی عمر میں شادی پر پابندی عائد کرنے کے لیے خیبر پختونخوا اسمبلی میں ایک پرائیویٹ ممبر کا بل پیش کیا لیکن سال کے آخر تک بل کے حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں دیکھی گئی۔

سفارشات

1- حکومت کو پاکستان کے دوسرے عالمی مرحلہ وار جائزے کے دوران انسانی حقوق کونسل اور بچوں کے حقوق کی کمیٹی کی جانب سے دی گئی تجاویز کو مدنظر رکھتے ہوئے فوری طور پر مناسب اصلاحی اقدامات کرنے چاہئیں۔

2- بچوں کے حقوق کے متعلق زیرالتوا، قوانین کی فوری طور پر منظوری دی جائے۔ علاوہ ازیں، ہر صوبائی حکومت کو بچوں کے حقوق کے متعلق پالیسی تشکیل دینی چاہیے جو ایک بنیادی ساخت فراہم کرتی ہو جس کے اندر بچوں کے حقوق کے تحفظ کا نظام کام کرسکتا ہو۔ سندھ کے بچوں کے حقوق کا محکمہ فوری طور پر قائم کیا جائے اور اسے 2011 میں منظور شدہ قوانین میں بیان کردہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا چاہیے۔

3- حکومت پاکستان کو پولیو اور خسرے جیسی بیماریوں کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے بچوں کی صحت کے اقدامات/پالیسی کو سخت بنانا چاہیے۔

4- چاروں صوبوں کو مزید تاخیر کیے بغیر ''مفت اور لازمی تعلیم کے حق کے ایکٹ'' کی منظوری دینی چاہیے۔ حکومت کو سول سوسائٹی کے تعاون سے جسمانی سزا کے خلاف ایک بڑی مہم شروع کرنی چاہیے۔ تعلیم میں جنسی عدم مساوات پر قابو پانے کے لیے مخصوص پروگرام تیار کیے جانے چاہئیں۔

5- حکومت کو بچوں کے حقوق سے متعلق درست اور تازہ ترین معلومات کی دستیابی کو یقینی بنانے کے لیے تمام ضروری اقدامات کرنے چاہئیں۔ چائلڈ لیبر کا شکار اور بے گھر بچوں کی تعداد کو قلم بند کرنے کے لیے تازے سروے منعقد کیے جائیں کیونکہ ایسی معلومات کی غیر موجودگی میں مؤثر پالیسی سازی اختیار نہیں کی جاسکتی۔

6- حکومت کو معذور بچوں پر زیادہ توجہ دینی چاہیے اور جس حد تک ممکن ہو سکے مرکزی دھارے کی سرگرمیوں میں ان کی شمولیت کو یقینی بنانا چاہیے۔

7- پولیس حراست کے دوران اور جیلوں میں بچوں پر تشدد کا سختی سے معائنہ کیا جانا چاہیے اور اس کی مکمل ممانعت اور ریاست کے وہ کارندے جو تشدد کے ذمہ دار پائے جائیں ان کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کے لیے تمام ممکنہ اقدامات کیے جانے چاہئیں۔

محنت کش

ریاست ہر قسم کے استحصال کے خاتمے اور اس بنیادی اصول کہ ’’ہر ایک سے اس کی قابلیت کے مطابق کام‘‘ اور ’’ہر ایک کو اس کے کام کے مطابق معاوضہ‘‘ پر عمل درآمد یقینی بنانے کے لیے مناسب اقدامات بروئے کار لائے گی۔

آئین پاکستان - [آرٹیکل- 3]

غلامی نہ تو موجود ہے اور نہ اس کی اجازت ہے کوئی بھی قانون کسی بھی شکل میں، پاکستان میں اس کی اجازت فراہم نہیں کرے گا اور نہ ہی اسے پاکستان میں متعارف کرانے کی کوشش کرے گا۔ ہر قسم کی جبری مشقت اور انسانوں کی تجارت پر پابندی عائد ہے۔ چودہ سال سے کم عمر کے کسی بھی بچے کو کسی فیکٹری یا کان یا کسی دوسرے خطرناک پیشے میں ملازم نہیں رکھا جائے گا۔ آئین پاکستان [آرٹیکل 11-(3-1)]

ہر شہری کو تنظیم سازی اور یونین سازی کا حق حاصل ہوگا۔ سوائے اس کے کہ، پاکستان کے اقتدار اعلیٰ اور سالمیت کے مفاد میں، یا امن عامہ اور اخلاق کے تحفظ کے لیے قانون کے تحت معقول پابندیاں عائد کی جائیں۔

آئین پاکستان [آرٹیکل 17-(i)]

ریاست منصفانہ اور مشفقانہ شرائط کار متعارف کرانے کی پابند ہوگی۔ آئین پاکستان [آرٹیکل - 37-(c)]

جنس، ذات، رنگ اور نسل سے بالاتر، ریاست، عوام کی فلاح اور بہبود کو یقینی بنائے گی اور دولت کے ارتکاز اور تقسیم اور پیداوار کے ذرائع کو، چند ہاتھوں میں سمٹنے سے روک کر، عوام کا معیار زندگی بہتر بنائے گی۔ ریاست، آجر اور ملازم، جاگیردار اور مزارع کے حقوق کے درمیان منصفانہ توازن قائم کرنے کی کوشش کرے گی اور ملک کے وسائل کے مطابق تمام شہریوں کو کام اور روزگار اور آرام کے مناسب مواقع سے روشناس کرائے گی اور ان کی تفریح کے لیے مواقع کی فراہمی کو بھی یقینی بنائے گی۔ ریاست، حکومت پاکستان کی ملازمت یا دوسرے اداروں میں خدمات سرانجام دینے والے تمام افراد کو لازمی بیمہ یا دیگر ذرائع سے سماجی تحفظ فراہم کرے گی اور جنس، ذات، رنگ اور نسل سے بالاتر، ان تمام افراد کو ضروریات زندگی مثلاً خوراک، لباس، رہائش، تعلیم اور طبی سہولیات فراہم کرے گی جو بے روزگاری، بیماری یا معذوری کی بنا پر مستقل یا عارضی طور پر روزی کمانے کے قابل نہیں۔۔۔ اور افراد کی آمدنیوں کے درمیان پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کی کوشش کرے گی۔ آئین پاکستان [آرٹیکل - 38 اے تا ای]

کسی شخص کو غلامی یا محکومی کی زنجیروں میں نہیں جکڑا جائے گا۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل- 4]

ہر شخص کو، معاشرے کا رکن ہونے کے ناطے، سماجی تحفظ کا حق حاصل ہے۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل - 22]

ہر شخص کو کام کرنے، پیشے کا انتخاب کرنے، منصفانہ اور مناسب شرائط کار طے کرنے اور بیروزگاری کے خلاف تحفظ کا حق حاصل ہے۔ ہر شخص کو کسی امتیاز کے بغیر، مساویانہ کام کے بدلے مساویانہ معاوضہ حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہر وہ شخص جو کام کرتا ہے اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے کام کے عوض منصفانہ اور مناسب معاوضہ وصول کرے تاکہ وہ اپنے اور اپنے خاندان کے وجود کو انسانی وقار کا اہل ثابت کر سکے اور اگر ضرورت پڑے تو اسے دیگر سماجی تحفظ کے ذرائع سے مستحکم بھی کر سکے۔ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر ہر شخص کو یونین بنانے اور اس میں شامل ہونے کا حق حاصل ہے۔
انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل 23(1 تا 4)]

ہر شخص کو آرام اور تفریح کا حق حاصل ہے۔ بشمول کام کرنے کی مدت کی مناسب حد اور تنخواہ کے ساتھ بوقت ضرورت چھٹی۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل - 24]

ہر شخص کو ایک ایسا معیار زندگی برقرار رکھنے کا حق حاصل ہے جو اس کی اور اس کے خاندان کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے کافی ہو۔ بشمول خوراک، لباس، رہائش، طبی سہولیات، ضروری سماجی خدمات اور بے روزگاری، بیماری، معذوری، بیوہ یا بوڑھا ہونے کی صورت میں، ایسے حالات میں جو اس کی دسترس سے باہر ہیں، عدم روزگار کی صورت میں تحفظ کا حق۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل 25-(1)]

ریاست معاشی استحصال یا کسی ایسے کام، جو خطرناک ثابت ہو سکتا ہے یا بچے کی تعلیم، صحت یا جسمانی، ذہنی، روحانی، اخلاقی یا سماجی نشوونما میں رکاوٹ بن سکتا ہے، کے خلاف بچے کے تحفظ کے حق کو تسلیم کرتی ہے۔
بچوں کے حقوق کے بارے میں اقوام متحدہ کا کنونشن[آرٹیکل 32-(1)]

گزشتہ برسوں کی طرح سال 2012 میں بھی پاکستان کے غریب محنت کش پالیسی سازوں کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہے جس کے نتیجے میں وہ خلاف ورزیاں اور حادثات جاری رہے جن سے باآسانی بچا جا سکتا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ قابل توجہ تنظیم سازی کے موثر حق کی نامنظوری، کام کرنے کی جگہ کو محفوظ بنانے سے عدم توجہی جو سینکڑوں جانوں کے ضیاع کا باعث بنی۔ مزید برآں عمومی طور پر مزدوروں کے مفاد کی نگہبانی میں حکومتی ناکامی شامل ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مزدوروں کے پاس نہ تو ملازمت کے تحریری حکم نامے ہوں جس کے باعث ان کے پاس ملازم ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہوتا، سازگار حالات کے باوجود بھی مزدوروں کی راہ میں روڑے اٹکائے گئے۔

2011 میں محنت کشوں کو جن مسائل کا سامنا تھا وہ 2012 میں بھی معمولی مثبت پیش رفت کے ساتھ جاری رہے ابتر معیشت کی موجودگی امن عامہ کی خراب صورتحال، بڑھتے ہوئے توانائی کے بحران اور ناکامی سے دوچار ہونے والی سرکاری و نجی صنعتوں نے ہزاروں اور لاکھوں لوگوں کو بے روزگار کر دیا ہے۔

سرکاری صنعتیں جو حال ہی میں نجی ہوئیں کے مزدوروں نے اپنے ساتھ ہونے والے غیر منصفانہ برتاؤ کیخلاف احتجاج کیا۔ موجودہ سرکاری نجی صنعتوں اور کارپوریشن کے مزدوروں نے بھی غیر منصفانہ برتاؤ کے

گنجے مظاہرین کا ایک گروہ لوڈ شیڈنگ کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے

خلاف احتجاج کیا۔ نجکاری کی منتظر حکومتی ملکیتی کمپنیوں میں کام کرنے والوں نے بھی ایسے کسی بھی ممکنہ اقدام کی پُرزور مخالفت کی۔

قانون برائے صنعتی تعلقات نے کام کرنے والوں کی واضح اکثریت کو تنظیم سازی کے حق سے محروم کردیا گیا ان میں سب سے واضح طور پر غیر رسمی اور ملازمت کا ثبوت نہ رکھنے والے مزدور شامل تھے بشمول اسلام آباد دارالحکومت اور بین الصوبائی اسٹیبلشمنٹ کے علاوہ مزدوری سے متعلقہ مسائل پر قانون سازی کا اختیار اب آئین کی اٹھارہویں ترمیم کی رُو سے قانون سازی کی متفقہ فہرست کی تحلیل کے نتیجے میں صوبوں کے پاس ہے۔ صوبائی حکومتوں نے اس نئے وجود میں آنے والے قانون سازی کے اختیار کو تندہی سے استعمال نہیں کیا اور زیادہ تر اہم مسائل حل کئے بغیر چھوڑ دیئے گئے۔ اجتماعی سودے بازی کے اختیار تک رسائی نہ ہونے کے باعث تنظیم کے بغیر کام کرنے والے مزدوروں کا استحصال جاری رہا۔ مزدوروں کی صحت اور حفاظت سے متعلق خود مختار قانون سازی کا وجود ہی نہیں تھا۔ مزدوروں کے معاملات پر اٹھارہویں آئینی ترمیم کے تحت قانون سازی کے اختیار کی وفاق سے صوبائی حکومتوں کو سونپ دی گئی ہے وفاقی حکومت کی قانون سازی اتھارٹی نے بین الاقوامی مزدور نمائندہ اداروں مثلاً میثاق کرنے کا وفاقی حکومت کا اختیار بدستور قائم ہے۔

کاروبار کی ترویج اور کرپشن کے تحفظ کے مقصد کے لیے 2003 میں فیکٹریوں کے معائنہ پر پابندی لگا

دی گئی جو ستمبر 2012 تک پورے ملک میں لاگو رہی۔ لاہور میں 25 مزدوروں کی جان لینے والے صنعتی تباہی کے واقعے نے پنجاب انتظامیہ کو صوبہ میں فیکٹریوں کے معائنہ کی بحالی کرنے پر مجبور کیا۔ پنجاب لیبر ڈیپارٹمنٹ میں عملہ کی کمی سے ظاہر ہوتا ہے کہ مزدوروں کے تحفظ یا ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے محض معائنے کی بحالی کافی نہیں ہے۔ آبادی کے لحاظ سے ملک کے دوسرے بڑے شہر اور صوبہ پنجاب کے دارالحکومت لاہور کی تمام فیکٹریوں کے معائنہ کے لیے صرف 13 انسپکٹر مہیا تھے۔ پورے صوبہ پنجاب کی تمام فیکٹریوں کے مکمل معائنے کے لیے سو انسپکٹرز کی دستیابی متوقع تھی۔ ان انسپکٹروں کو سرکاری ٹرانسپورٹ یا سفری خرچ تک مہیا نہیں کیا جاتا۔ ان میں سے زیادہ تر نے تسلیم کیا کہ انہیں معائنے کے لیے رسمی تربیت نہیں دی گئی تھی۔

صنعت کاروں نے اکثر اوقات خود کو مجبور محسوس نہیں کیا کہ وہ اپنے مزدوروں کو کم از کم معاوضہ ادا کریں یا مزدوروں کو سماجی تحفظ کی فراہمی یا کام کرنے کے لیے محفوظ ماحول مہیا کرنے کے لیے اقدامات کریں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کے کل 5 کروڑ 80 لاکھ مزدوروں میں سے صرف ایک لاکھ مزدور صوبائی محکمہ جات برائے سماجی تحفظ میں رجسٹرڈ ہیں۔ ان فوائد کے حصول کے لیے مزدور قانونی لحاظ سے بذات خود اپنی رجسٹریشن نہیں کروا سکتے ہیں۔ آجروں نے غیر رجسٹرڈ مزدوروں کو استعمال کرتے ہوئے نہ صرف اپنی جائز ذمہ داری ادا کرنے سے کوتاہی برتی بلکہ سال 2012 کی بدترین صنعتی تباہیوں میں بھی اپنا کردار ادا کیا۔

حکومت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے بھی مزدوروں کی زندگیوں کو بدتر حالات سے دوچار کیا جنہوں نے صرف اپنے فائدے کو زیادہ سے زیادہ کرنے کی غرض سے مزدوروں کے تحفظ پر خرچ کرنے سے گریز کیا۔ زیر جائزہ سال میں پاکستان کو اس وقت اپنی تاریخ کی بدترین صنعتی تباہی کا سامنا کرنا پڑا جب کراچی میں کپڑے کی فیکٹری میں آگ لگنے سے 270 مزدور ہلاک ہوگئے۔ اس آگ نے ایک بار پھر کام کرنے کی جگہ پر مزدوروں کو تحفظ دینے سے مکمل اجتناب اور ریسکیو سروس اور آگ سے نمٹنے والے حکومتی محکموں کی تیاری میں کمی کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ صنعتی تباہ کاریوں میں سینکڑوں ہلاکتوں کے علاوہ کام کرنے والے لوگ دہشت گردوں اور بھتہ خوروں کا بھی شکار رہے۔ کراچی میں تاجروں اور دکانداروں کو بھتہ خوروں کی طرف سے مسلسل دھمکیوں کا سامنا رہا جن کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کا تعلق مخصوص سیاسی گروہوں سے ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ متاثرین انصاف کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہے، مجرموں کی گرفتاری عمل میں نہیں لائی گئی۔ خاص طور پر ملک کے کشیدگی زدہ علاقے جہاں حملوں میں مزدوروں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے میں موجود خدشات کے پیش نظر مزدوروں کو معقول تحفظ دینے کی صورت میں انہیں ایسے حادثات سے بچایا جاسکتا تھا۔

چائلڈ لیبر بڑے پیمانے پر جاری رہی اور بچوں کو تحفظ دینے کے لیے قانون سازی پر عملدرآمد کو ترجیح نہ دی گئی۔

محنت کی منڈی

معاشی حالت، توانائی کا بحران اور امن عامہ کی صورتحال نے لوگوں کی ملازمت کی تلاش کے حوالے سے مشکلات کو بڑھا دیا ہے۔ پاکستان میں بیورو آف سٹیٹسٹکس کے مطابق پاکستان میں روزگار اور آبادی کا تناسب 50.3 فیصد تھا۔ زیرنظر سال میں روزگار کی پیداوار کو بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

پاکستان کا بڑا حصہ افرادی قوت کی شکل میں ہے اسے خارج کرنے سے صورتحال مزید خراب ہوگئی۔ پاکستان میں مزدوروں کے اعداد و شمار کو معلوم کرنے کے تین طریقے ہیں۔ آبادی کی مردم شماری، لیبر فورس سروے اور پاکستان کے درجہ بند گھر شماری سروے۔ ایل ایف ایس اور پی آئی ایچ ایس 'ورک' اور 'لیبر فورس' کی تعریف 'مردم شماری' سے کافی مختلف انداز میں کرتے ہیں ان دونوں سرویز کا فی تفصیلی انداز میں موجود ہے سے مردم شماری سینسر سے کافی مختلف ہیں۔

ان جائزوں کے مطابق 2012 (پاکستان میں) افرادی قوت کی تعداد پانچ کروڑ اسی لاکھ تھی۔ یہ تعداد ہر سال تین فیصد بڑھ جاتی ہے۔ ورلڈ بنک کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں بیروزگاری کی تین بڑی وجوہات ہیں جس میں بجلی کا بحران، نظم و نسق کا نہ ہونا اور سیاسی عدم استحکام شامل ہیں۔

پاکستان میں جز وقتی ملازمت کے لیے کوئی اعداد و شمار موجود نہیں جو کہ روزانہ بڑھ رہی ہے۔

بیروزگار مزدور فُٹ پاتھ پر بیٹھے کسی آجر کا انتظار کر رہے ہیں

مختلف ریاستی اداروں اور غیر سرکاری ادارے اخراجات کم کرنے کے چکر میں عملہ میں کمی کرنے جارہے ہیں۔ کراچی الیکٹرک سپلائی کمپنی پورا سال مزدوروں کو ان کی نوکری سے بے دخل کرتی رہی۔ اس نے سال کے آغاز میں 100 ملازمین کو نکالا گیا، مارچ میں 400، جون میں 4000 اور نومبر میں 108 ملازمین کو نکالا گیا۔ یہ کہا گیا کہ اُن ملازمین کو سالانہ کارکردگی کی بنیاد پر نکالا گیا ہے۔ ملازمین کی اکثریت کو نکالنے سے پہلے کوئی نوٹس نہیں دیا گیا۔ ملازمین کی اتنی بڑی تعداد کو مشکل حالات کی وجہ سے روزگار ڈھونڈنے میں کافی مشکلات کا سامنا رہا ہے۔

ہزاروں ملازمین کو کارخانوں بجلی اور گیس کی کمی کی وجہ سے بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا۔ غیر مستحکم معاشی عدم استحکام نے مزدوروں کی حالت کو مزید ابتر بنادیا ہے۔ پرامن احتجاج جو کہ مزدور کا حق ہے پر پابندیاں لگائی گئیں لیکن پھر بھی احتجاج جاری رہے۔ جنوری میں نادرا نے اپنے 81 ملازمین کو احتجاج کی وجہ سے نکال دیا۔

کام کار کے حالات، خطرات اور تشدد

ایسا ماحول جہاں پر اصول وضوابط اور بنیادی حقوق عمل پیرا نہ ہوں وہاں پر امید رکھنا بہتر نہ ہوگا کہ ملازم فکرمندی کے بغیر کام کرے گا۔ پنجاب میں 2003 سے صنعتوں کے معائنے پر پابندی نے مزدوروں کے حالات کو مزید ابتر کردیا۔ پنجاب حکومت نے یہ وضاحت پیش کی کہ یہ پابندی فیکٹری مالکان کی طرف سے لیبر ڈیپارٹمنٹ کی مبینہ کرپشن کے الزامات کے بعد لگائی گئی۔ سندھ نے بھی اس کی پیروی کی اور وزیر اعلیٰ نے 2003 میں فیکٹریوں کے معائنے پر پابندی لگادی۔ مزدوروں کے حقوق کے لیے لڑنے والے کارکنان نے پابندی کو ماننے سے انکار کردیا اور کہا کہ تجارتی پالیسیوں کے نام پر مزدور کے مفادات کا قتل عام ہو رہا ہے۔ پنجاب میں یہ پابندی 2012 میں اس وقت اٹھائی گئی جب ایک عمارت کے گرنے سے 25 افراد جاں بحق ہوگئے۔ حکومت پر کڑی تنقید کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ اس تباہی سے بچا جاسکتا تھا اگر کوئی معائنہ کی ٹیم وہاں معائنہ کرلیتی۔ اگرچہ کاغذی کارروائی کی حد تک معائنے موجود تھا لیکن واضح شواہد موجود تھے جن سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کام کرنے کی جگہ پر واضح نقصان دہ چیزیں دیکھنے میں آئیں۔

11 ستمبر کو پاکستان کی تاریخ کا بدترین حادثہ واقع ہوا۔ بلدیہ ٹاؤن کراچی میں ایک فیکٹری کو آگ لگ گئی۔ اس چار منزلہ عمارت میں فل الفور اخراج یا آگ پر قابو پانے کا انتظام نہیں تھا۔ کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ 500 ملازمین اس وقت کام میں مصروف تھے جن میں سے 270 جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایچ آر

کراچی فیکٹری میں آگ لگی ہوئی ہے: سنگین ترین صنعتی سانحہ

سی پی نے اس معاملے کو کافی تشویش کی نگاہ سے دیکھا کہ اگرچہ پورے کراچی کے فائر بریگیڈ کے عملے کی کوششیں اوران کے علاوہ پاکستان نیوی، ہوائی فوج اور کراچی پورٹ ٹرسٹ کے تعاون کے باوجود آگ کو بجھانے میں 48 گھنٹے سے زائدوقت لگا۔کمیشن نے کہا کہ اتنے بڑے اہم تجارتی اور معاشی شہر میں ہنگامی مدد کی خدمات کی یہ حالت ہے تو دیگر شہروں میں تباہ کن صورتحال پر فوری قابو پانے کے انتظامات بارے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ٹھیک اسی دن لاہور میں جوتے بنانے والی فیکٹری میں آگ لگ گئی۔ لاہور جو ملک کا دوسرا بڑا شہر ہے اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مزدوروں کو درپیش خطرات، ناقص حفاظتی انتظامات اور حکام کی مجرمانہ غفلت صرف ایک صوبے کا مسئلہ نہیں ہے اور آگ بجھانے والی چیزوں کے فقدان، عمارتیں بنانے کے اصولوں کی خلاف ورزی کی وجہ سے بڑے بڑے حادثے ہوتے ہیں۔عمومی نشاندہی اور تحقیقات کے باوجود کچھ نہیں کیا گیا۔

کان کنی کا کام پاکستان میں خطرناک صورتحال اختیار کر چکا ہے۔ ہر سال درجنوں کان کن نہ صرف نجی افراد اور کمپنیوں بلکہ ریاستی حکام کے زیر کنٹرول کانوں میں ہونے والے حادثات کے باعث ہلاک ہوجاتے ہیں۔جنوری میں فاٹا کے علاقے میں کوئلے کی کان میں دھماکے کی وجہ سے چار کارکن جاں بحق ہوگئے۔اسی مہینے کے اندر خیبر پختونخوا کے علاقے ایبٹ آباد میں دھماکے سے 13 کان کن مٹی کے اندر دب گئے۔علاقہ زمینی راستے سے منقطع رہا کیونکہ ریسکیو کا کام آٹھ گھنٹے دیر سے شروع ہوا۔دھماکہ خیز مواد کا استعمال، غیر سائنسی

کان کنی کے طریقے، حفاظتی سامان کی کمی اور نامناسب خارجی مواد کی وجہ سے کان کنی کے دوران حادثات اور اموات میں اضافہ ہوا ہے۔ کان کنی کی خطرات ملک کے پُرخطر جگہوں پر زیادہ ہوتے جارہے ہیں۔ جولائی میں کوئٹہ میں 7 کان کنوں کو اغواء کیا گیا، ان پر تشدد کیا گیا اور ماردیا گیا۔ کان کنوں نے پورے بلوچستان میں اس وحشیانہ قتل عام کے خلاف احتجاج کیا اور کان کن مزدوروں کے حفاظتی اقدامات پر زور دیا۔

بلوچستان اور فاٹا جو غیر محفوظ علاقے ہیں وہاں کم مزدوری دی جاتی ہے اور شدت پسندوں کے حملوں سے بچنے کے لیے کم اقدامات کئے گئے ہیں۔

مواقع کی کمی کی وجہ سے مزدور حضرات پرخطر نوکریاں کرنے پر مجبور ہیں۔ صورتحال حال یہ ہے کہ وہ لوگ سرحد عبور کرنے پر مجبور ہیں تا کہ بہتر مستقبل بنا سکیں اور ہر طرح کے خطرات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ فروری کے مہینے میں بلوچستان کے ضلع کیچ ایک تعمیراتی کمپنی کے سات مزدوروں کو گولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔ ایک عسکری گروپ نے ذمہ داری قبول کی مگر قاتلوں کو نہ پکڑا گیا۔ بلوچستان میں ایک اور واقعے میں سات کان کنوں کو مارا گیا اس کے لیے قاتلوں کو پکڑنے کے لیے صوبے کے چالیس ہزار کان کنوں نے ہڑتال کی۔

یونینوں کو درپیش خطرات

مزدور کی جانب سے یونین کی بحالی، تعمیر نو اور قائدانہ کردار ایک پُرخطر ترین کام ہے۔ یونین کے رہنماؤں کو نشانہ بنا کر مارا جاتا ہے تا کہ مزدور کے استحصال میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ہٹایا جاسکے۔ جولائی میں لیبر اکاؤنٹنٹ الٰہی بخش کو نامعلوم موٹر سائیکل سواروں نے گولی مار کر ہلاک کردیا جو اس وقت 12 دن سے ہڑتال پر تھے۔ واپڈا یونین لیڈر جھنگ اور پی آئی اے کے مزدوروں کے رہنماؤں کے قاتلوں کا 2012 تک نہ سراغ لگایا گیا اور نہ ان کو پکڑا گیا۔ فیصل آباد پاورلومز کے 6 مزدور رہنماؤں کو مسلسل 594 سال قید کی سزا سنائی گئی اس الزام پر کہ انہوں نے پاورلومز کے مالکان پر قاتلانہ حملے کئے ہیں۔ اس کی وجہ واضح طور پر سامنے آئی ہے کہ مزدور لوگ اپنی اجرت بڑھانے کے مطالبات نہ کریں۔ لاہور ہائی کورٹ نے اس سزا کے خلاف درخواست سماعت کے لیے منظور کرلی۔ لیکن 2012 کے اختتام تک کوئی کارروائی نہیں ہوئی ہے۔ لیبر قومی موومنٹ نے 10,000 مزدوروں کے ساتھ جلوس نکالا تا کہ اپنے رہنماؤں کو چھڑایا جاسکے اور اپنی اجرت کو بڑھانے کے لیے کوشش کی جاسکے۔ کام کے جگہوں پر عورتیں زیادہ مشکلات کا شکار نظر آتی ہیں وہ پُرخطر کام کرتی ہیں اور ان کو کم معاوضہ دیا جاتا ہے یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ خواتین کو زچگی کی چھٹیاں بھی نہیں دی

پاورلوم مزدوروں کی گرفتاری کے خلاف احتجاج

جاتی ہیں۔ ان کو کام کی جگہوں پر ہراساں کیا جاتا ہے۔ جنوری میں پنجاب ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے نگران افسر نے سکول کی استانی کو حراساں کیا جب خاتون نے افسر کے خلاف شکایت درج کرائی تو اس کو نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔ پنجاب ٹیچرز یونین کے احتجاج کی وجہ سے اس خاتون اس کی نوکری پر بحال کیا گیا اور نگران افسر کو نکال دیا گیا۔ یہ بڑا ہی نایاب موقع تھا جب عورت اپنے حقوق کے لیے کھڑی ہوئی۔ لیکن اکثر واقعات میں حراساں کیئے جانے کے مواقع پر عورتیں خاموش رہتی ہیں تاکہ ان کی نوکری نہ چلی جائے۔ اس کے علاوہ عورتوں کو مردوں کی نسبت کم معاوضہ دیا جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ گھریلو مزدوروں کو افرادی قوت میں گنا نہیں جاتا ہے جو کہ عورتوں کو اثر انداز کرتا ہے اور ان کو کئی حقوق جیسا کہ سوشل سکیورٹی فوائد اور کم از کم معاوضہ کے فوائد سے محروم رکھا جاتا ہے۔

کسانوں کی جدوجہد

پاکستان کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں جاگیردارانہ نظام بکثرت موجود ہے اور طاقت زمین کی ملکیت کے ساتھ منسلک ہے۔ زمین کے وسیع وعریض جاگیریں رکھنے والے اقتدار کے ایوانوں میں براجمان ہوتے ہیں۔ اور جاگیرداروں سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے خواہاں کسانوں کو ریاستی اداروں سے انصاف کی توقع نہ ہونے کے برابر ہے۔ درحقیقت وفاقی شرعی عدالت نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ زمینی اصلاحات غیر اسلامی اقدام ہے جس نے ان لوگوں کے لیے عدالت سے رجوع کرنے کے تمام راستے بند

کردیئے ہیں جو چاہ رہے تھے کہ زمین کی مساوی بنیاد پر تقسیم ہو۔ پورے پاکستان میں، زمین کے مالکان اور زمین کاشت کرنے والوں کے مابین مختلف قسم کے تعلقات پائے جاتے ہیں۔صوبہ پنجاب میں، کسانوں کی بڑی تعداد زمین کے مالکان کو پہلے سے طے شدہ رقم دیتے ہیں۔اس فصل کی جو وہ کاشت کرتے ہیں۔صوبہ سندھ کے زیادہ تر حصے میں اس قسم کے تعلقات کی نوعیت یکسر تبدیل ہے۔ غلامی کی ایک جدید قسم ہاری نظام کی صورت میں موجود ہے جس میں کسان کا کام صرف فصل اگانا ہے اور تمام فصل مالک کے حوالے کرنا ہے۔ پھر یہ جاگیردار کی ثوابدید پر ہے کہ وہ ہاری کو اس کے کام کا کتنا حصہ دے ہاری اتنا بھی نہیں کما سکتا کہ وہ اپنے روزمرہ کے معاملات کو نبٹا سکے۔اس کے لیے ان کو جاگیرداروں سے ادھار لینا پڑتا ہے۔ چونکہ وہ ادھار لی گئی رقم پر گراں قدر سود کو واپس نہیں کر پاتے، جو کہ اصل رقم سے بھی زیادہ ہوتا ہے، اس پر پورے کنبے کو دائمی غلامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔کسانوں کو ناجائز مقدمات میں ملوث کیا جارہا ہے۔ جب زمین کے مالکان کسانوں پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ان کی زمین سے بے دخل ہو جائیں بے شک وہ کسان وہاں کئی صدیوں سے کاشت کررہے ہوں اور اس صرف ایک ہی وجہ ہے کہ زمین کی قیمت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ مئی میں، ڈیرہ سہگل فارم مرید کے جو کہ پنجاب کا ایک قصبہ ہے کے کسانوں نے اپنے چار ساتھی کسانوں کی گرفتاری کیخلاف احتجاج کیا۔ یہ کسان گزشتہ چالیس سالوں سے زمینوں پر کام کررہے تھے۔اور اب ان کو وہاں سے زبردستی ہٹانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ کیونکہ زمین کو بیچنا تھا۔کسانوں کہ یہ دعویٰ تھا کہ ان کے خلاف پولیس نے مختلف اقسام کے اقدامات کئے جن میں مزدور بشمول خواتین اور بزرگ شامل تھے کو مارا گیا اور انہیں حراست میں لے لیا گیا۔ جب کسانوں نے اپنے چار ساتھیوں کی حراست کے خلاف بطور احتجاج سڑک بند کردی تو پولیس نے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے کارروائی کی اس سے قریب گزرتے ہوئے راہگیر کو گولی لگی اور وہ جاں بحق ہوگیا۔ایک پولیس والے کو بھی پتھر لگا جس کے بعد اس کی موت واقع ہوگئی۔

ایچ آر سی پی کے حقائق اکٹھے کرنے والی ایک ٹیم نے جائے وقوعہ کا دورہ کیا اور اپنے مشاہدے کی بنا پر یہ تحریر کیا کہ مظاہرین کسانوں کے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا۔اور پولیس نے ان کو منتشر کرنے کے لیے غیر مناسب اور حد سے زیادہ طاقت کا استعمال کیا جس میں آنسو گیس، لاٹھی چارج اور گولہ بارود کا استعمال شامل ہے۔ جو کہ تحقیقاتی ٹیم کے خیال میں بظاہر بلا جواز تھا۔

مظاہرین نے جواباً پولیس پر پتھراؤ کیا۔ قریب سے گزرتے ہوئے ایک راہگیر کو گولی لگی اور وہ ہسپتال جاتے ہوئے دم توڑ گیا۔مقتول کے بھائی نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کو پہلے پولیس والوں نے لاٹھی سے پیٹا اور پھر اسے ایک پولیس والے نے گولی مار کر ہلاک کردیا۔ ایک پولیس سب انسپکٹر پتھر لگنے سے زخمی ہوا جس کی

جاگیرداروں کی زیادتیاں: کسان رہنما سہتو بھوک ہڑتال پر بیٹھے ہیں

ہسپتال میں 13 دن کے بعد موت واقع ہوگئی۔ بہت سے ایسے افراد جو احتجاج میں موجود ہی نہیں تھے بعد میں ان کو بھی گرفتار کیا گیا اور ان پر قتل کا الزام لگایا گیا۔ مختلف ذرائع کے مطابق اگر چہ احتجاج کے وقت کوئی پچاس سے زیادہ افراد بھی جمع نہیں تھے مگر پولیس نے راہگیر شخص اور پولیس کے اے ایس آئی کے قتل کے الزام میں 32 افراد کو نامزد ملزم ٹھہرایا اور 200 سے زائد نامعلوم افراد کے نام بھی درج کیے۔ بعد میں پولیس نے پہلی بغیر تحقیقات اور ثبوت کے 200 افراد کا نام ایف آئی ار میں شامل کرلیا۔ ایچ آر سی پی کی ٹیم نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ پولیس کی واضح نفری کے باوجود جس نے بغیر جھجھک کے طاقت کا اظہار کیا۔ ایمر جنسی طبی سہولت یا ایمبولینس کی فراہمی کو یقینی نہ بنایا گیا۔ مزدوروں کے رہنماؤں نے واقعہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ ایک مثال ہے کہ کسانوں پر کتنا دباؤ ڈالا گیا۔

پانی تک مناسب رسائی کا نہ ہونا، کاشتکاروں کے لیے ایک بڑی رکاوٹ رہی ہے جس سے ان کے معاشیات پر کافی اثر پڑا ہے۔ صرف صوبہ سندھ میں ہی تقریباً تین ملین ایکڑ اراضی کو پانی کی دستیابی یا تو نہیں ہے یا پھر بہت کم ہے جس کی وجہ پانی چوری ہے یا پھر بااثر زمینداروں کے ہاتھوں پانی کے رُخ کی تبدیلی ہے۔ سندھ ہاری کمیٹی، ایک تنظیم جو کہ سندھ میں ہاریوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے کام کر رہی ہے، نے پانی تک رسائی کے لیے احتجاجی مظاہرہ کیے۔ سندھ ہاری کمیٹی کے ایک رہنما نے بھوک ہڑتال کی جو کہ تقریباً نوے روز تک جاری رہی۔ لیکن مسئلہ حکام کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اگر چہ آبادی کا ساٹھ فیصد حصہ بالواسطہ یا بلاواسطہ زراعت کے شعبے پر منحصر ہے۔ زراعت کے بنیادی ڈھانچے میں قابل اعتبار جدت اور

سرمایہ کاری کی کمی، زرعی لوازمات کی بلند قیمتیں کسان کی مزدوری مہارتوں سے لیس کرنے میں ناکامی اور سیم وتھور یہ وہ مسئلے ہیں جن کی وجہ سے زرعی پیداوار میں کمی ہوتی ہے اور کسانوں کو زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وسائل کی کمی نے لوگوں کو شہروں کی طرف رُخ کرنے پر مجبور کیا جہاں ان کو ان کی صلاحیت کے برعکس معمولی ملازمت کرنی پڑتی ہے۔

پورے پاکستان میں کسانوں کو درپیش مسائل کو تسلیم کرتے ہوئے ایچ آر سی پی نے گزشتہ ستمبر میں ملتان میں کسانوں کا دو روزہ کنونشن منعقد کرایا۔ کنونشن نے زمینی اصلاحات کے لیے یکساں زمینی استفادہ کاری کی تشکیل، بے زمین کاشتکار کی تکالیف میں کمی، کاشتکاروں کے زمینی حقوق کو تسلیم کرنا جنہوں نے بہت عرصے سے زمین فوج سے پٹہ پر لی ہوئی تھی کھیت پر کام کرنے والے مزدوروں کی اجرت کی شفاف واپسی، مزدوروں کے استحصال کے خلاف پرزور کارروائی، مزدور عورتوں کے حقوق کے تحفظ، کسان دوست پالیسی جس میں اشیاء کی تقسیم اور زرعی جنس کی خرید وفروخت شامل ہیں کے لیے اپیل کی۔ کنونشن میں موجود شرکاء نے اس بات پر دھیان دیا کہ ماہرین معاشیات کی تحقیق کے مطابق زمین کے غلط مالکان حقوق کی روایت جو ملک میں موجود ہے اور تعلیم کے بڑھنے میں بھی رکاوٹ ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ عام لوگوں میں غربت اور غذا کی کمی کا بھی باعث ہے۔ کنونشن نے تمام سیاسی جماعتوں کو کسانوں کے مفادات اور خدشات متعلق آگاہ کیا اور درخواست کی وہ اپنے پروگرام اور اپنی جماعت کے سیاسی منشور میں اس مسئلے کو اہم جگہ دیں۔ اگرچہ لفظوں کی حد تک مزدوروں کے نمائندگان انتخابات لڑنے کے لیے آزاد ہیں مگر وہ انتخابی مہم چلانے کے لیے لاکھوں روپوں کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے۔ قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی میں مزدوروں کے لیے کوئی کوٹہ مختص نہیں۔ مزدور اپنے اوپر اثر انداز ہونے والے معاملات میں کوئی رائے نہیں رکھتے اور خود کو معاملات سے خارج سمجھتے ہیں۔

اجرتیں اور پنشنیں

کم سے کم اجرت کا تنازعہ مزدوروں اور حکومت کے درمیان جاری رہا۔ اگرچہ پنجاب اور بلوچستان کی صوبائی حکومتوں 2012 میں کم سے کم اجرت سات ہزار سے بڑھا کر نو ہزار کردی گئی لیکن کم سے کم اجرت طے کرنے کا سوال صوبوں کے سپرد کیا گیا۔ صوبہ پنجاب، سندھ اور بلوچستان نے 2012 میں کم سے کم اجرت بارے نئے فیصلے لئے جبکہ خیبر پختونخواہ نے ایسا نہیں کیا۔ مئی میں وفاقی حکومت نے کم سے کم اجرت میں ایک ہزار روپے کا اضافہ کیا۔ یہ اس جگہ لاگو تھا جو وفاق کے زیر اثر تھا۔ مزدوروں نے اس اضافے کو مسترد کردیا کیونکہ یہ ناکافی تھا اور یکم مئی کے لیے ایک علامتی اشارے سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ بڑھائی گئی

سی این جی ایسوسی ایشن نے بھی احتجاجی مظاہرہ کیا

تنخواہ یا مزدوری مہنگائی کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ مزدور جماعتوں نے کم سے کم تنخواہ پندرہ ہزار سے بیس ہزار روپے تک بڑھانے کا مطالبہ کیا تا کہ مزدور بھی ضروریات زندگی پورا کرسکیں۔ آرڈیننس 1961 جو کم سے کم اجرت کے متعلق ہے، معاملات کے طریقہ کار کے متعلق آگاہی دیتا ہے کہ کیسے کمیٹی بنائی جائے جو کم سے کم اجرت کے معاملات طے کر سکے لیکن اس میں اجرت کو کن بنیادوں پر متعین کرنا ہے، یہ شامل نہیں ہے۔ یہ قانون وفاقی وصوبائی حکومتوں کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اجرت کو اپنی منشاء سے طے کرسکیں۔ تاہم یہ لازم ہے کہ مزدوروں کے نمائندگان کو چار رکنی کمیٹی میں شامل کیا جائے لیکن نمائندگان کبھی بھی کمیٹی کے فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہو سکے۔ مزدوروں کے نمائندگان، اگرچہ وہ مزدوروں کی اکثریت کے حامل بھی ہوں ان کا فیصلہ سازی کے عمل پر بہت محدود اثر ہوتا ہے۔

گزشتہ سال کم سے کم اجرت کو یقینی بنانے کا عمل کا مسئلہ جوں کا توں رہا ہے۔ مالکان جنہوں نے کم سے کم اجرت دینے سے انکار کیا ان کو انصاف کے کٹہرے میں نہیں لایا گیا۔ یا پھر ایسے واقعات کی اطلاع تک نہیں دی گئی کیونکہ ملازمین کو ڈر تھا کہ ایسا کرنے سے ان کو ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ عملدرآمد صرف اسی وقت ہی ممکن ہے جب شفاف منصفانہ طریقے سے احتساب کیا جائے۔ 2012 میں تنخواہوں کا نہ ملنا بہت زیادہ عناد حتیٰ کہ خودکشیوں کی وجہ بنا۔ سارا سال تنخواہوں کے نہ ملنے کے بہت سے واقعات سامنے آئے۔ ملتان میں عمر رسیدہ افراد کے گھر کی نگرانی کرنے والے افراد کو چھ ماہ تک تنخواہ نہیں دی گئی۔ ان کے ملازمت کے معاہدے 2011 میں ختم کئے گئے اور ان کے ملازمت کے معاہدے کو دوبارہ شروع نہیں کیا گیا جبکہ ان

سے کام لیا جاتا رہا۔

سماجی تحفظ منافعت (سوشل سکیورٹی سٹرفکیٹ) جو کہ حکومت کی ایک اہم ذمہ داری سمجھی جاتی ہے یہ بھی پاکستان میں مزدوروں کے بہت ہی تھوڑی طبقے کو میسر رہی۔ اس کے باوجود یہ یقین کیا جاتا رہا ہے کہ 58 ملین مزدوروں میں سے صرف 3.9 ملین مزدوروں کو سوشل سماجی تحفظ کے مسائل تک رسائی حاصل رہی۔ مزدوروں کے حقوق بارے کم علمی ایک اہم معاملہ ہے جس سے مزدوروں کے استحصال کے مواقع میں اضافہ ہوتا ہے۔ اولڈ ایج ای او آئی بی کے سرکاری ملازمین پر دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ موبائل ٹیم لے کر مختلف فیکٹریوں میں گئے ہیں تا کہ وہ مزدوروں کا اندراج کر سکیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے بہت کم رجوع دیکھا ہے کیونکہ مالکان اپنے مزدوروں کو دھمکیاں دیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ان مراعات کے لیے رقم خصوصاً مالکان کی جیب سے آتی ہے۔ ایک ملازم کے اندراج کے لیے مالک کو کم سے کم اجرت کا پانچ فیصد دینا پڑتا ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بڑی عمر کے افراد (جن کی عمر ساٹھ سال یا اس سے زیادہ ہو) جو کہ 1998 میں 7.34 ملین تھے ان کی تعداد بڑھ کر 2013 میں 11.19 ملین تک بڑھ جائے گی۔ جب کہ زندگی کی توقع بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ اعداد و شمار بھی اسی درجے کے ساتھ بڑھیں گے جیسا کہ بڑی عمر کے افراد کی تعداد بڑھتی ہے اسی تواتر سے سماجی تحفظ کے بہم پہنچانے کا دباؤ بھی بڑھتا ہے۔ ای او بی آئی جو کہ تقریباً 1.5 ملین لوگوں کو پنشن فراہم کرتی ہے وہ خود مالی مشکلات کا سامنا کر رہی تھی اور اطلاع کے مطابق مختلف اراضی متعلق بدعنوانیوں میں مبتلا رہی ہے۔ ای او آئی بی جو اپنے ملازمین کو تنخواہیں بڑی مشکل سے ادا کرتی ہے نے 16 ارب روپے کی زمین خریدی۔ یہ بنیادی قانون کی خلاف ورزی تھی کہ زمینی جائیداد میں ادارے کے کل مالیت کے 12.5 سے زائد سرمایہ کاری نہیں کی جا سکتی۔ مختلف مواقع پر پنشنرز نے اپنی شکایات کا اندراج مقتدر حلقوں کو پنشن کی رسید کیساتھ کرایا۔ بزرگ شہری اور جسمانی طور پر کمزور افراد کو لمبی قطاروں میں انتظار کرنا پڑا۔ بعض اوقات تو سارا سارا دن بھی انہیں پنشن کے لیے کھڑا رہنا پڑا۔ بہت سارے واقعات میں پنشنرز کو پنشن لینے کے لیے کئی کئی چکر لگانا پڑے۔ جناب صدر نے جولائی 2012 میں اس صورتحال کا جائزہ لیا اور ایک کمیٹی بنائی جس کا کام ایک بہتر حکمت عملی بنانا تھی جو پنشن کی تقسیم کو موثر بنا سکے۔ ستمبر 2012 میں وہ کمیٹی جو کہ چیئرمین نادرا، گورنر سٹیٹ بنک آف پاکستان، فنانس منسٹری کے سیکرٹری اور دیگر لوگوں پر مشتمل تھی نے برقی بنکاری کا نظام جو بائیومیٹرک سمارٹ کارڈ سے متعلق تھا متعارف کرایا۔ اس حکمت عملی کو اپریل 2013 کے آخر تک کارآمد ہونا تھا جس کے بعد تمام پنشنرز کو سمارٹ کارڈ جاری ہونا ہے جس کے مطابق وہ ملک بھر اس سے منتخب 600 بنک میں سے اپنی پنشن نکلوا سکتے ہیں۔

قوانین، حکمت عملی، سُقم

پاکستان میں مزدوروں کے سنگین مسائل کے مروجہ قوانین ایک طرف نظر آئے جبکہ پاکستان کی بین الاقوامی سطح پر انسانی حقوق اور مزدوروں کے متعلق معاہدے پر عائد ذمہ داری دوسری طرف نظر آئی۔ عملدرآمد اور ترجیحات کی کمی کا یہ مطلب نکلا کہ معروضی طور پر زیادہ تبدیلی نہیں آئی جبکہ انسانی حقوق کے متعلق نئے معاہدوں پر دستخط ہوئے ہیں اور ان کی توثیق ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی معاہدے جو کہ سماجی اقتصادی اور ثقافتی حقوق بارے ہوں کے متعلق مندرجات سے ہٹا کر۔ اور وہ کنونشن جو بچوں کے حقوق بارے ہوں، جس کا پاکستان بھی فریق ہے اس ملک نے 361 آئی ایل او کنونشن کی توثیق کی جس میں شق 34 پر عملدرآمد ہوا۔ آئی ایل او کنونشن جس کی پاکستان توثیق کرتا ہے۔ اس میں شامل ہیں جبری مزدوری (کنونشن 29)، انجمن کی آزادی اور متحد ہونے کے حقوق کا تحفظ (کنونشن 87)، متحد ہونا اور مشترکہ معاملہ طے کرنے کا حقوق (کنونشن 98) ایک جیسے کام کی منصفانہ اجرت (کنونشن 100) جبری مزدوری کا خاتمہ (کنونشن 105) ملازمت اور پیشہ میں امتیازی سلوک کا خاتمہ (کنونشن 111) شامل ہیں۔ ان ذمہ داریوں اور توثیق کے باوجود مختلف مزدور دشمن پالیسیوں پر عملدرآمد جاری رہا۔ آئین میں اٹھارویں ترمیم کے بعد قانون سازی کا جو اختیار وفاق سے صوبوں کو منتقل ہوا اس سے صوبوں میں عدم مساوات بڑھتی......صوبے اب وفاق کی جانچ پڑتال کے بغیر مزدوروں کے متعلق کوئی بھی قوانین مرتب کر سکتے ہیں۔ تاہم کچھ صوبوں نے اس نئے قانون سازی کے اختیارات سے بہتر فوائد حاصل کئے۔ اٹھارویں ترمیم کے نتیجے میں نیشنل انڈسٹریل ریلشنز کمیشن کے خاتمے کی وجہ سے قومی سطح پر وسیع صنعتی ٹریڈ یونین کا قیام ممکن نہ تھا۔ NIRC کے قوانین کو صوبائی انڈسٹریل ایکٹ کے ساتھ تبدیل کیا گیا جس کو چاروں صوبوں نے تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ اختیار کر لیا۔ انڈسٹریل ریلیشنز ایکٹ جو کہ پنجاب میں اختیار کیا گیا وہ یہ بیان کرتا ہے کہ ایک ٹریڈ یونین کو بنانے کے لیے کم سے کم ایک فیکٹری میں پچاس مزدوروں کا ہونا لازم ہے۔ وفاقی سطح پر آئینی خلاء کو پُر کرنے کے لیے انڈسٹریل ریلشنز آرڈیننس 2011 کا اجرا کیا گیا جس کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ کیونکہ اس میں مزدوروں کی انجمن کی آزادی کو غیر منطقی طریقے سے محدود کیا گیا جو کہ آئین پاکستان اور آئی ایل او کے بہت سے مندرجات کے خلاف تھا۔ مثال کے طور پر اگر کسی ادارے میں ایک سے زیادہ ٹریڈ یونین تھے تو اس میں سب سے زیادہ نمایاں ٹریڈ یونین ہی ہڑتال کا اعلان کر سکتی تھی۔ سال 2012 میں ٹریڈ یونین اور مزدور رہنماؤں کی اصرار اور طلب کے باوجود یہ قوانین اپنی جگہ قائم رہے۔ حالیہ ورلڈ بنک کے جائزہ کے مطابق، پاکستان

معذورافراد نے ملازمتوں میں کوٹے کے لیے احتجاج کیا

میں تقریباً ایک کروڑ خواتین گھریلو کام کاج کے حوالے سے ملازمت کرتے ہیں۔ ان قوانین کو کسی مزدوروں کے قوانین کے تحت کوئی تحفظ حاصل نہیں اور نہ ہی کوئی سماجی تحفظاتی مراعات (سوشل سکیورٹی بینیفٹس) حاصل ہیں۔ ان کی تنخواہوں کا مکمل انحصار مالکوں کی مہربانی پر منحصر ہے۔ بدسلوکی کے خلاف ان کو کوئی تحفظ حاصل نہیں۔ عمومی طور پر ایسے واقعات میں ان خواتین کو اپنے حقوق بارے یا تو بہت کم معلوم ہوتا ہے یا بالکل علم نہیں ہوتا۔ پنجاب حکومت نے گھریلو ملازمین بارے ایک حکمت عملی تیار کی ہے۔ گھریلو ملازمین کے متعلق پالیسی صوبائی کونسل برائے گھریلو ملازمین کے زیرنگرانی مرتب کی گئی ہے جو کہ پنجاب لیبر اینڈ ہیومن ریسورس ڈیپارٹمنٹ کے ماتحت ہے۔ ایک دفعہ پالیسی نافذ کرنے سے گھریلو ملازمین کو لیبر ڈیپارٹمنٹ رجسٹریشن کے مرحلے تک لے جائے گی چاہے وہ پنجاب کا شہری علاقہ ہو یا دیہی۔ رجسٹریشن سے گھریلو ملازمین کو سماجی تحفظ (سوشل سکیورٹی) اور دیگر قانونی حقوق کے متعلق آگاہی ملے گی۔ گھریلو ملازمین کے لیے سماجی تحفظ کا بل عورتوں کا بااختیار بنانے کے عمومی پیکج میں شامل ہے جو کہ وزیراعلیٰ پنجاب نے 2012 میں اعلان کیا تھا لیکن 2012 کے اختتام تک اس بل کی منظوری نہیں ہوسکی۔ اسی برس سول سوسائٹی کی تنظیموں نے گھریلو ملازمین بارے ایک قومی حکمت عملی کا خاکہ تیار کیا۔ حکمت عملی کے تجویز کنندگان نے محسوس کیا کہ پاکستان میں گھریلو ملازمین کی تعداد تقریباً دو کروڑ ہے۔ جن میں سب سے زیادہ تعداد خواتین کی ہے جن کے مفادات کا خیال کسی قومی قانون سازی میں نہیں رکھا گیا۔ پاکستان میں ایسے قوانین کی کمی ہے جو براہ راست مزدوروں کی پیشہ وارانہ حفاظت کو نبٹائے۔ مختلف قوانین کی منتخب شقیں جس میں ہر خط پیشے کے اصول 1963 اور فیکٹری ایکٹ

1934 کو اس سلسلے میں جاری رکھا گیا۔ فیکٹری ایکٹ جن مسائل کو نمٹا تا ہے اس میں کام کرنے کے دورانیہ اور کام کرنے والی جگہ کا ماحول کا صاف ستھرا ہونا شامل ہے اور مخصوص مندرجات شامل ہیں جو کہ بچوں کی مزدوری بارے ہیں۔ ایک اہم تنقید جو اس قانون بارے رہی وہ یہ ہے کہ متعلقہ قانون بہت فرسودہ ہے۔ مثال کے طور پر ایک فیکٹری کا مالک اپنے مزدوروں کی حفاظت کرنے سے غافل پایا جاتا ہے تو اسے صرف پانچ سو روپے جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ اس تنقید کو سامنے رکھتے ہوئے حکومت اکثر اوقات کھانے پینے کی کم قیمت اشیاء پر غریبوں کو معاونت دیتی رہتی ہے اشیاء خورونوش خوراک پر معاونت زیادہ تر یوٹیلیٹی سٹورز، رمضان پیکج اور سستی روٹی سکیم کے ذریعے دی جاتی ہیں۔ وزیر خزانہ کے مطابق حکومت نے 2000 نئے یوٹیلیٹی سٹورز کا منصوبہ بنایا تھا۔ جہاں سے بینظیر سپورٹ پروگرام بی آئی ایس پی کارڈ کے ذریعے اشیاء خورونوش معاونت والے نرخ پر مل سکیں تاہم اس طرح کی کوششیں جو سالہا سال سے کی جا رہی ہیں، ضرورت مند افراد کو فائدہ پہنچانے میں ناکام رہی ہیں کیونکہ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ معاونت کے اہداف کا تعین ممکن نہیں عالمگیر معاونت کے حمایت کرنے والے کہ اس سے 3.5 ملین 35 لاکھ خاندان کی مدد ہوگی مگر اس سے فوائد حاصل کرنے والے افراد کے معاشی حیثیت یا رتبہ کے بارے میں واقفیت کم ہی ہے۔ محنت کش طبقہ اور بہت سارے معاشیت کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ اس طرح کی معاونت سے عمومی طور پر امیر طبقہ ہی مستفید ہوتا ہے۔

مثبت عمل کے طور پر حکومت نے مختلف محکمہ جات اور اداروں میں مذہبی اقلیتوں کے لیے ملازمتوں کا کوٹہ مخصوص ہے۔ ایچ آر سی پی ماہرین کا گروپ جو مذہبی اقلیتوں کے حالات کے لیے مخصوص ہے ایک ڈھانچہ جو کہ مذہبی اقلیتوں کی برادری اور اکثریتی عقیدہ کے افراد پر مشتمل ہے، نے اس بات پر غور کیا کہ اقلیتوں کے لیے پانچ فیصد کوٹہ مخصوص ہے مگر یہ سارا کوٹہ تقریباً صفائی ستھرائی (خاکروب) سے مکمل کیا جاتا ہے۔

احتجاج

سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے ملازمین نے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے سارا سال مختلف مظاہرے کیے۔ ذرائع ابلاغ کے اطلاعات کے مطابق سرکاری سطح پر بجلی بنانے والی کمپنیوں اور آل پاکستان کلرک ایسوسی ایشن نے بکثرت احتجاج کیا۔ ان احتجاج کی مشترکہ وجوہات میں بجلی اور گیس کا بحران، مہنگائی، بے روزگاری، اغواء اور ملازمین کا قتل، کم تنخواہ، نجکاری اور نوکریوں کا مستقل نہ ہونا شامل تھا۔ کراچی میں صنعتکاروں اور مزدوروں کے احتجاج کی سب سے بڑی وجہ بھتہ خوری تھی جس کے خلاف شہر میں کوئی کارروائی

نہیں ہورہی تھی۔ مارچ میں، کراچی کی 350 ماربل کی فیکٹریاں بھتہ خوری کی وجہ سے احتجاجاً بند ہوئیں۔ چیئرمین آل پاکستان ماربل مائننگ لینڈ پراسینگ اینڈ ایکسپورٹ انڈسٹری ایسوسی ایشن نے کہا کہ گم نام افراد کا فیکٹری کو چلانے کے لیے پرچی کے ذریعے ایک معقول رقم کا مطالبہ روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔ جب بھتہ خوروں کی رقم کا تقاضہ پورا نہیں کیا گیا تو انہوں نے فیکٹری کو آگ لگا دی جس سے مزدوروں کی جان بھی خطرہ میں آئی اور ساز وسامان بھی تباہ ہوا۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے تحفظ فراہم کرنے اور بھتہ خوروں کو گرفتار کرنے میں بری طرح ناکام ہوئے۔ یوم مئی کے موقع پر مزدوروں نے پاکستان بھر میں ہزاروں ریلیاں نکالیں۔ معمولات زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد مثلاً سول سوسائٹی، طلباء، سیاسی جماعتوں کے نمائندگان نے ریلیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ زبوں حال حکومتی اداروں کے ملازمین نے اپنی شکایات کے متعلق آواز اٹھائی۔ مظاہرین نے مزدوروں کے قوانین کا مطالبہ کیا جو کہ آئین کے آرٹیکل 17-A کو یقینی بنائے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا اتحاد یا انجمن بناسکیں۔ ایک مطالبہ جو تسلسل کیساتھ سامنے آیا وہ کم سے کم اجرت میں بڑھوتری تھی۔ مزدوروں نے کم سے کم اجرت سات ہزار کی بجائے بیس ہزار کا مطالبہ کیا ہے۔ یکم مئی کو وفاقی حکومت نے کم سے کم اجرت بڑھا کر آٹھ ہزار روپے کردی۔ اسی دن پنجاب حکومت نے صوبہ پنجاب میں کم سے کم اجرت کو بڑھا کر نو ہزار کر دیا۔ بڑے پیمانے پر یہ شکایات موصول ہوئیں کہ گزشتہ کم سے کم اجرت پر عمل درآمد نہیں ہوا۔

پورے پاکستان میں توانائی کا بحران مزدوروں کے احتجاج کا سبب بنا۔ سارا ملک بجلی کے بحران کے زیر اثر رہا مگر چند صوبوں کو طویل المدت بجلی کے بحران کا سامنا رہا۔ بجلی بنانے والی کمپنیوں کے ملازمین نے سارا سال متعلقہ کمپنیوں کی تجویز کردہ نجکاری کے خلاف احتجاج کیا۔ زیر بحث سال کے دوران بہت سارے مظاہروں میں سے کچھ مظاہروں میں مزدوروں نے مقتدر حلقوں کی توجہ مبذول کرانے کے لیے تشدد کی راہ اختیار کی۔ دفاتر کی توڑ پھوڑ، گاڑیوں کا جلانا اور املاک کو نقصان پہنچانا، یہ وہ طریقے تھے جو احتجاج میں نظر آئے۔ مئی میں آل پاکستان کلرک ایسوسی ایشن کی جانب سے ایک احتجاج ہوا جو اس وقت پرتشدد ہو گیا جب ان کی چیف سیکرٹری سے ملنے والی ڈیمانڈ کو پورا نہیں ہونے دیا گیا۔ تقریباً دو ہزار ملازمین نے لاہور میں سول سیکرٹریٹ کو توڑنے پھوڑنے کی کوششیں کی۔ وہ عارضی ملازمین کی مستقلی کا مطالبہ کررہے تھے۔ تقریباً 200 ملازمین، جن میں خواتین بھی شامل ہیں کو گرفتار کیا گیا۔ دوسرے احتجاج ملازمین کے پرامن احتجاج سے شروع ہوئے لیکن جب پولیس نے احتجاج کو طاقت کے زور سے توڑنے کی کوشش کی تو مظاہرین بھی مشتعل ہوگئے۔ مئی میں ہی ٹیکنیکل ایجوکیشن اینڈ ویکیشنل ٹریننگ اتھارٹی (TEVTA) کے ملازمین کا

ینگ ڈاکٹروں نے بہتر سروس سٹرکچر کے لیے دھرنا دیا

پولیس سے ٹکراؤ ہوا جب وہ اپنی ملازمت کو مستقل کرنے اور تنخواہوں میں اضافے کے لیے احتجاج کر رہے تھے۔ بہت سارے TEVTA ملازمین لاٹھی چارج، پتھراؤ اور مار کٹائی کے نتیجے میں زخمی ہوئے۔ دونوں طرف کے حالات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ جس طرح پولیس نے ملازمین نے احتجاج کے دوران جو رویہ اختیار کیا اور دوسری طرف ملازمین میں جو مایوسی دیکھی گئی کہ جب وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کے پاس ان کے مسائل کے حل کے لیے صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ احتجاج کو جاری رکھنا تھا۔

پیشگی نوٹس یا مناسب معاوضے کے بغیر ملازمین کی برطرفی سال بھر احتجاجی مظاہروں کا سبب بنی رہی۔ اگست میں کینٹین سٹورز ڈیپارٹمنٹ (سی ایس ڈی) نے محض ایک دن قبل برطرفی کا نوٹس دے کر کم از کم 130 ملازمین کو فارغ کر دیا۔ پاکستان بھر کے سی ایس ڈی سٹور بطور احتجاج بند رہے۔ ورکروں نے سی ایس ڈی ہیڈ کوارٹرز کو بجلی فراہم کرنے والا مرکزی سوئچ بند کر دیا تا کہ انتظامیہ ان کے مطالبات پر توجہ دے۔ ورکروں نے صرف اس وقت احتجاج ختم کیا جب انتظامیہ نے برطرفی کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان بھر میں احتجاجوں کا دوسرا بڑا سبب ریاستی کمپنیوں کی مجوزہ نجکاری کا عمل تھا۔ اکتوبر میں ریلوے ورکز یونین نے پاکستان ریلوے (پی آر) کی نجکاری کے خلاف ملک بھر میں احتجاجی مظاہروں کی وارننگ دی۔ انہوں نے کہا کہ گزشتہ 12 برسوں کے دوران تقریباً 53,000 ملازمین کو برطرف کر دیا گیا ہے جبکہ افسران کے اخراجات پر آٹھ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ جولائی 2011 سے جون 2012 تک پی آر کو متعدد ٹرین روٹس کی بندش کے علاوہ تقریباً 35 ارب کا خسارہ برداشت کرنا پڑا ہے۔ پی آر اس حد تک مفلسی کا شکار تھا کہ

حکومت کو اسے ماہانہ اڑھائی ارب روپے کی امداد دینا پڑی کہ وہ حاضر سروس اور ریٹائرڈ ملازمین کی تنخواہیں ادا کر سکے۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف لیبر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ اور متعدد دیگر ماہرین کے مطابق ان حالات کا بنیادی سبب، سیاسی مداخلت اور نااہل و کرپٹ مینجمنٹ ہے۔

گروی مزدوری

غلامی کی جدید قسم گروی مزدوری کا شمار پاکستان کے سنگین مسائل میں ہوتا ہے۔ سول سوسائٹی کی تنظیموں اور یونینوں کی پرعزم جدوجہد نے اس امر کو یقینی بنایا ہے کہ یہ مسئلہ اجاگر ہوا ہے اور اس کو حل کرنے کے مطالبات سامنے آئے ہیں۔ اگرچہ مزدوروں کی بہت بڑی تعداد قرضے کے چنگل سے رہائی حاصل کر رہی ہے مگر اس کے باوجود اس مسئلے کی شدت میں کمی نہیں آئی۔ سندھ میں زرعی شعبے کے بعد گروی مزدوروں کی سب سے زیادہ تعداد پنجاب کی بھٹہ صنعت سے وابستہ ہے۔ بھٹہ مالکان ایسوسی ایشن کے سروے کے مطابق، پنجاب کے تقریباً 10,000 بھٹوں میں سے صرف 3,836 رجسٹرڈ ہیں۔ بانڈڈ لیبر لبریشن فرنٹ (بی ایل ایل ایف) کے ایک سروے کے مطابق تقریبا 80 فیصد بھٹہ مزدوروں کو قومی شناختی کارڈ جاری نہیں کئے گئے۔ بھٹوں کی رجسٹریشن کے فقدان، شناختی دستاویزات کی عدم موجودگی اور قانونی ذرائع تک رسائی بارے معلومات کی کمی کے باعث بھٹہ مزدوروں اور ان کے اہل خانہ کے لیے قرضے کی لعنت سے چھٹکارا پانا مشکل کام ہے۔ اگرچہ سرکاری لحاظ سے گروی مزدوری کے خاتمے کو دو عشرے بیت چکے ہیں مگر عملی لحاظ سے اس مسئلے

عمر کوٹ میں پولیس نے چھاپہ مار کر گروی مزدوروں کو بازیاب کیا

2012 میں سندھ میں رہا ہونے والے گروی مزدور

ضلع	رہا ہونے والے افراد کی تعداد
عمرکوٹ	1,433
میرپورخاص	1,780
سانگھڑ	988
بدین	516
ٹنڈو محمد خان	22
ٹنڈو الٰہیار	120
حیدرآباد	52
مٹھیاری	71
تھرپارکر	41
خیرپور	17
ٹھٹھہ	22
نواب شاہ	36
گھوٹکی	51
نوشہرو فیروز	14
کل	**5,163**

کی سنگینی ختم نہیں ہوئی۔ گروی عدالتوں سے فوری مدد کی فراہمی کے باعث کئی گروی مزدوروں نے آزادی حاصل کی ہے۔ تاہم اس مسئلے کو مستقل طور پر ختم کرنے کے لیے ذمہ داری اور آمادگی کی بہت قلت محسوس کی گئی ہے۔ گروی مزدور صحت کو مُضر حالات کار میں کئی گھنٹوں تک کام کرنے پر مجبور تھے اور وہ کاربن نان آکسائیڈ، نائٹروجن اور سلفرک آکسائیڈ جیسے فضلہ جات کے باعث سانس کی بیماریوں کا شکار ہوگئے۔ مزدوروں کو آلودہ زدہ ماحول میں کام کے دوران لگنے والی بیماریوں پر معاوضہ نہیں دیا گیا۔ بعض کو سرے سے تنخواہیں نہیں دی گئیں جبکہ بعض کو قانون کی مقرر کردہ تنخواہ سے بہت کم تنخواہ دی گئی تھی۔ حکومت نے تقریباً دو سال قبل اعلان کیا تھا کہ بھٹہ مزدور کی کم از کم تنخواہ 517 روپے فی 1000 اینٹ ہے۔ اپنے حقوق کا مطالبہ کی جرات کرنے والے مزدوروں کو جھوٹے مقدمات میں ملوث کر دیا گیا۔ مارچ میں پنجاب کے ضلع پاکپتن میں ایک بھٹہ مزدور منیر احمد کے خلاف جنسی حملے کا جھوٹا مقدمہ درج کیا گیا۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے کم از کم اجرت کا مطالبہ کیا تھا۔ انسانی حقوق کی بعض تنظیموں کے مطابق منیر احمد کے خلاف اس وجہ سے جھوٹا مقدمہ دائر کیا گیا کہ اس نے بھٹہ مالکان کے خلاف درخواست دائر کی تھی کہ انہوں نے اس پر حملہ کیا ہے اور دھمکی دی ہے کہ اگر وہ 517 روپے فی 1,000 اجرت کے مطالبہ پر قائم رہا تو اسے سنگین نتائج بھگتنا پڑیں گے۔ اس کا مطالبہ ہزار اینٹوں پر 517 روپے تھا۔ بھٹہ مالکان جنہوں نے احمد پر دھاوا بولا تھا، نے گرفتاری سے پہلے ہی عدالت سے ضمانت لے لی تھی۔ 2012 کے آخر تک منیر ساہیوال سنٹرل جیل میں قید رہا۔ ملک بھر سے اور بھی بہت سے کیسز سامنے آئے جن میں

مزدوروں کو اپنا حق مانگنے پر مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے لاہور میں جون میں مزدوروں اور محنت کشوں پر جبری مشقت بارے دو روزہ اجلاس منعقد کیا جس میں بہت سی تنظیموں نے مشاورت کے بعد جبری مشقت کو ایک غلامی قرار دیا اور ڈیمانڈ کیا کہ اس کا جڑ سے خاتمہ سرکار کی اولین ترجیح ہونی چاہیئے۔ اجلاس کے بعد تجاویز مرتب کی گئیں اور صوبائی حکومتوں کو مزدوروں پر جبری مشقت کے خاتمے کے ایکٹ 1992 پر عملدرآمد کرنے کے لیے کمیٹیاں بنانے کا کہا گیا۔ مزدوروں پر جبری مشقت کرنے والوں کی سزا میں اضافے کا کہا گیا اور مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی ذمہ داری پر بھی زور ڈالا گیا۔ سول سوسائٹی کی تنظیموں کی طرف سے احتجاج اور ہڑتالوں کے باوجود بہت سے مسائل ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ مزدور کی پریشانیاں مشقت سے آزاد ہونے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتیں۔ 2012 کے آخر تک کوئی بھی ایسا نظام نہیں تھا جس کے تحت اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ کہیں کام نہ ملنے کی صورت میں مزدور کو غلامی میں نہیں لیا جائے گا۔ جبری مشقت کے نظام کے تناظر میں اٹھارویں آئینی ترمیم کے نتیجے میں صرف پنجاب نے جبری مشقت کے نظام میں نئے قوانین متعارف کرائے ہیں جبکہ 2012 کے آخر تک کسی بھی اور صوبائی حکومت نے نئے قوانین نہیں اپنائے۔

اوپر دی گئی فہرست میں 2012 میں سندھ سے رہا ہونے والے جبری مشقت کے مزدوروں کی تعداد دکھائی گئی ہے۔ سندھ میں 2012 میں گروی مشقت پانے والے مزدوروں کی تعداد 5163 ہے جبکہ 2011 میں یہ 3407 تھی۔

بچوں کی مشقت

بڑھتی ہوئی غربت کی وجہ سے غریب خاندانوں کے وسائل میں کمی واقع ہوئی اور اس کی وجہ سے مزید بچے محنت مزدوری کی طرف گئے جیسے جیسے پاکستان میں غربت اور بے روزگاری بڑھی ویسے ہی والدین نے اپنے بچوں کو کام پر بھیجنا شروع کر دیا۔ وفاقی ادارہ برائے شماریات کے مطابق پاکستان میں پانچ اور چودہ سال کے درمیان عمر کے پینتیس لاکھ بچوں کو ملازمت میں بھرتی کیا گیا۔ یہ اعداد و شمار اندازے کے مطابق ہیں کیونکہ چائلڈ لیبر نے آخری سروے 1996 میں کیا تھا۔ ملازمت اور کام میں بھرتی کے لیے کم از کم عمر کے متعلق آئی ایل او کنونشن نمبر 135 کے مطابق 18 سال سے کم عمر کے کسی بھی شخص کو خطرناک کام کے ماحول میں ملازمت نہیں دی جائے گی۔ ترقی پذیر ممالک میں ملازمت کے لیے کم از کم چودہ سال مقرر کی گئی ہے۔ جبکہ پاکستان

بچے کھردری زمین پر ملائم ہاتھوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے

میں چودہ سال سے کم عمر بچے معمول کے مطابق ایسے ماحول میں بشمول ورکشاپ، بھٹوں اور کپڑا بننے والی فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں۔ جو ان کی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ بچوں کے حقوق کے کنونشن کے تحت یہ ان کے حقوق کی کھلی خلاف ورزی تھی۔ زیادہ تر بچوں کو غیر رسمی طور پر قصبوں میں، زرعی مددگار، گھریلو ملازمین کے طور پر ملازمت میں رکھا گیا۔ انہیں نہ صرف اپنے بچپن بلکہ تعلیم کے بنیادی حق سے بھی محروم کر دیا گیا۔ ان کو کام کے غیر محفوظ اور خطرناک حالات کا سامنا کرنا پڑا اور انہیں بدسلوکیوں سے تحفظ سے بھی محروم رکھا گیا۔ ان سے انسانی حقوق کے کنونشنز اور قومی قانونی سازی کے تحت وعدہ کیا گیا تھا۔ اکتوبر میں بچوں کے حقوق کے تحفظ کی تنظیم کی طرف سے منعقد کئے جانے والے سیمینار میں مطالبہ کیا گیا کہ چائلڈ لیبر کے متعلق فیکٹریوں کا الگ الگ معائنہ کیا جانا چاہئے اور یہ کہ ہر سکول کے نصاب میں چائلڈ لیبر کے خطرات کو نمایاں کیا جانا چاہئے۔ چائلڈ لیبر کا جبری مشقت کے ساتھ بھی گہرا تعلق دیکھا گیا۔ کیونکہ ان مزدوروں کے بچے غلامی میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے والدین کی طرف سے لیا گیا قرض بھی ان کے ذمے واجب الادا ہوتا ہے۔ جیسے ہی یہ بچے پانچ چھ سال کی عمر کو پہنچے انہیں کام کاج میں لگا دیا گیا۔ جنوری 2012 میں جاوید نامی گیارہ سالہ لڑکا راولپنڈی میں اپنے مالک کے گھر سے فرار ہو گیا جہاں وہ گھریلو ملازم تھا جب چائلڈ پروٹیکشن بیورو میں اس کا معائنہ کیا گیا تو اس کے ہاتھوں اور پاؤں پر جسمانی تشدد کے نشانات نمایاں تھے۔ بچے کو دو سال تک غلام بنا کر رکھا گیا جس کے باوجود اس کے آجروں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ (تفصیلات کے لیے باب ''بچے'' ملاحظہ کریں)

سفارشات

1۔ کسانوں کے حقوق کے تحفظ کے معنی خیز زمینی اصلاحات نافذ کی جائیں۔

2۔ کم از کم اجرت ایک پروقار رہن سہن پر اٹھنے والے ماہانہ خرچ کے مطابق ہونی چاہیے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ افراط زر کو بلحوظ خاطر رکھ کر مقرر کرنی چاہیے۔ یہ ملک بھر میں یکساں ہونی چاہیے۔

3۔ اگر آجر ملازمین کو ایک صحت مند اور محفوظ ماحول فراہم کرنے میں ناکام رہیں تو انہیں سخت سزا دی جائے۔ صنعتی اداروں کی انسپکشن/ معائنہ کا کام باقاعدگی سے ہونا چاہیے اور بدعنوانی کی روک تھام کے لیے معائنہ کاروں کی تقرری جانچ پڑتال کے عمل کے بعد کی جائے۔

4۔ تمام مزدوروں بشمول گھریلو زرعی ملازمین کو اپنی یونین بنانے کا حق دینا چاہیے اور اس حق کے بارے میں آگاہی کے لیے انہیں مدد فراہم کی جانی چاہیے۔

5۔ مزدوروں کی جبری مزدوری پر مجبور کرنے کی سزا، جبری مزدوری نظام (خاتمہ) ایکٹ 1992 کی رو سے بڑھائی جانی چاہیے، اور اس کا تعین موجودہ افراط زر کی شرح کی مطابقت میں ہونا چاہیے تاکہ اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔

6۔ حکومت کے توثیق شدہ آئی ایل او کنونشن 36 اور انسانی حقوق کے ان معاہدات جن پاکستان فریق ہے میں شامل مزدوروں کے حقوق کے نفاذ کے لیے موثر کوششیں ہونی چاہئیں۔

6- سماجی اور معاشی حقوق

تعلیم

ریاست، جہالت کا خاتمہ کرے گی اور کم از کم مدت میں مفت اور لازمی ثانوی تعلیم کا بندوبست کرے گی۔فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم تک عام شہری کی رسائی کو آسان بنایا جائے گا اور میرٹ کی بنیاد پر اعلیٰ تعلیم، سب کی دسترس میں لانے کی کوشش کی جائے گی۔

آئین پاکستان [آرٹیکل - 37 (بی) اور (سی)]

تعلیم پر ہر انسان کا حق ہے۔کم از کم، ابتدائی اور بنیادی سطحوں پر تعلیم مفت اور لازمی ہوگی۔فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم بھی، عام طور پر سب ہی لوگوں کو دستیاب ہوگی۔میرٹ کی بنیاد پر، اعلیٰ تعلیم پر بھی ہر شخص کا حق ہوگا۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور [آرٹیکل 26]

■ موجودہ میثاق پر دستخط کرنے والے ممالک ہر شہری کے تعلیم پر حق کو تسلیم کرتے ہیں۔وہ اس بات پر متفق ہیں کہ تعلیم انسانی شخصیت کی مکمل نشوونما اور اس میں وقار کا احساس پیدا کرنے کے لیے استعمال کی جائے گی اور تعلیم انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام کو مستحکم کرے گی۔وہ اس بات پر بھی اتفاق رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ تعلیم تمام افراد کو اس قابل بنائے گی کہ وہ مؤثر طور پر ایک آزاد معاشرے کی ذمہ داریوں میں شریک ہوسکیں۔فہم و فراست، تحمل اور برداشت کو تمام قوموں، نسلی، لسانی یا مذہبی گروہوں میں فروغ دیں اور امن کے فروغ کے لیے اقوام متحدہ کی کارروائیوں اور اصولوں کا پرچم سربلند کریں۔

■ تمام رکن ممالک جنہوں نے موجودہ میثاق پر دستخط کیے ہیں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس حق کے مکمل حصول کے لیے:

■ ابتدائی تعلیم لازمی اور تمام شہریوں کے لیے مفت دستیاب ہوگی

■ ثانوی تعلیم، اپنی مختلف اشکال میں......بشمول ٹیچنگ (درس و تدریس) اور ووکیشنل (پیشہ وارانہ) ہر شہری کو دستیاب ہوگی اور ہر شہری کو ثانوی تعلیم تک رسائی حاصل ہوگی...... ہر مناسب طریقے سے اور آخرکار ہر شہری کو تعلیم مفت اور اخراجات کے بغیر حاصل ہوگی۔

■ اعلیٰ تعلیم پر بھی ہر شہری کو مساویانہ حق حاصل ہوگا...... ہر شہری کو اعلیٰ تعلیم تک مکمل رسائی حاصل ہوگی......استعداد کی بنیاد پر...... ہر مناسب طریقے سے......اس طرح سے کہ آخرکار تعلیم مفت ہوگی۔

اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق کے بارے میں بین الاقوامی میثاق ......آرٹیکل نمبر 13

■ ریاست تمام بچوں کو جن کی عمریں 5 پانچ سے 16 سال کے درمیان ہیں۔مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرے گی...... ایسے طریقے سے جس کا تعین قانون کرے گا...... آئین پاکستان آرٹیکل 25(A)

خیبر پختونخوا: بڑے شہروں میں بھی ویران مقامات پر سکول قائم ہیں

میڈیا اور سول سوسائٹی نے سال 2012 میں متعدد بار پاکستان میں تعلیمی نظام کا تنقیدی جائزہ لیا۔ یہ گورنمنٹ کا آخری سال تھا، اٹھارویں ترمیم کے بعد تعلیم مہیا کرنے کی اصل ذمہ داری صوبائی حکومت کی تھی۔ تاہم مدرسوں اور سرکاری سکولوں میں پڑھنے والے بچوں کی اکثریت ترقی پسند اور روشن خیال تعلیم سے بے بہرہ رہی۔ پاکستان میں موجود تین متوازی نظام تعلیم ......سرکاری سکول، نجی انگریزی ذریعہ تعلیم کے سکول اور مدرسہ میں موجود واضح فرق سماجی رتبے کو، استطاعت اور جنس میں تقسیم کو مضبوط کرتا ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کے درجے پر بھی نظام تعلیم طالب علموں کو ان کے بنیادی حقوق، آزادیوں اور فرائض بارے آگاہ نہیں کرتا اور مثبت اقدار کو اور جمہوری احساس کو بڑھانے میں ناکام رہتا ہے۔

نیشنل ایجوکیشن پالیسی جو 2009 میں تیار کی گئی تھی کا سب سے بڑا مقصد 2015 تک پاکستان میں شرح خواندگی کو بڑھا کر 86 فیصد تک کرنا تھا۔ 2012 میں ملک کی شرح خواندگی 58 فیصد تک تھی۔

پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ ڈویژن کے عہدے داروں کے مطابق، پاکستان میں مالی سال 12-2011ء میں صرف ایک فیصد بہتری ہوئی جو کہ دو سال پہلے 57 فیصد ریکارڈ کی گئی تھی، اس شرح سے ملک 2015 تک 60-59 فیصد شرح خواندگی حاصل کرے گا جو کہ اپنے ہدف کے 26 فیصد کم ہے۔ سال 2012 میں میڈیا میں ہونے والی زیادہ تر بحث کا مرکز، کم شرح اندراج، ناکافی سرمائے کی ترسیل، فرسودہ طریق کار تعلیم، گورنمنٹ، اساتذہ اور انتظامیہ کی طرف سے اخلاق و ذمہ داری کی کمی اور اس موضوع پر قوانین کا فقدان تھا۔

2010 میں قدرتی آفات اور دہشت گردی کے ہاتھوں تباہ ہونے والے سکولوں کی مرمت، غریب

محکمہ تعلیم کے لیے ایک بے قابو مسئلہ کی طرح برقرار رہا۔ کم سے کم 121 سکول تعلیم مخالف دہشت گردوں کے ہاتھوں نشانہ بنے، بالخصوص لڑکیوں کی تعلیم کے دشمن۔ یہ سکول سب سے زیادہ پختونخوا اور فاٹا کے علاقے میں نشانہ بنے۔

تاہم، اس سال کا سب سے خوفزدہ کرنے والا حملہ آٹھویں جماعت کی طالب علم ملالہ یوسف زئی پر حملہ تھا، جو کہ خواتین کی تعلیم کے لیے ایک سرگرم حامی ہے، دہشت گردوں نے ملالہ کو اس کے گاؤں مینگورہ ضلع سوات میں حملے کا نشانہ بنایا۔ ملالہ حملے میں زخمی ہوئیں مگر زندہ بچ گئیں اور سال کے اختتام تک برطانیہ کے ایک ہسپتال میں زیر علاج رہیں۔

دو اہم قوانین جو کہ تعلیم کو صوبوں کے حوالے کرنے کے متعلق جاری کیے گئے جن میں ایک مفت اور لازمی تعلیم کا ایکٹ 2011 تھا اور دوسرا مفت اور لازمی تعلیم کا ایکٹ 2012 تھا دونوں بالترتیب سندھ اور وفاق کی سطح تک لاگو ہوئے۔

بجٹ کی تخصیص کے متعلق بحث

اٹھارویں ترمیم نے ابتدائی تعلیم کو بنیادی حقوق میں شامل کیا ہے۔ 12-2011 کے بجٹ میں پرائمری تعلیم پر مختص کی گئی رقم 26.3 ارب تھی، اور سیکنڈری تعلیم کے لیے 40.2 ارب مختص کیے گئے، یہ دونوں رقم ملا کر بھی ہائر ایجوکیشن پر مختص کی گئی رقم جو کہ 92.6 ارب تھی سے کم بنتی ہے۔ واضح طور پر ترجیحات ہائر ایجوکیشن کے لیے تھی۔ دوبارہ تخمینے پر جائزہ کے بعد ترجیحات میں تھوڑی تبدیلی آئی۔ پرائمری ایجوکیشن کے لیے مختص رقم میں تیزی سے اضافہ کر کے 45 ارب کر دیا گیا اور سیکنڈری ایجوکیشن کے لیے 51.3 ارب، جبکہ ہائر ایجوکیشن نے 99.8 ارب روپے وصول کیے۔ سال 13-2012 کے بجٹ میں پرائمری ایجوکیشن نے 71.6 ارب روپے اور سیکنڈری ایجوکیشن نے 69.4 ارب روپے وصول کیے۔ ہائر ایجوکیشن کے لیے بجٹ 113.5 ارب تھا۔ اس قسم کی ترجیحات سے، ملینیم ڈویلپمنٹ حدف 2 جو کہ یونیورسل پرائمری ایجوکیشن 2015 بارے ہے، ناحاصل ہونے والا خواب دکھائی دیتا ہے۔

ایک رپورٹ کے مطابق جو کہ ایک بڑے ماہر معاشیات حفیظ پاشا کی رہنمائی میں تیار کی گئی کے مطابق پبلک سیکٹر ڈویلپمنٹ پروگرام (PSDP) کا اصل حجم 08-2007 کے بجٹ لیول سے 7 فیصد کم تھا۔ 09-2008 کی نسبت 27 فیصد اور 10-2009 میں 17 فیصد کم۔ اس کمی کا بڑا مقصد بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے ساتھ کئے گئے معاہدوں کے تحت طے شدہ اہداف کے بجٹ میں خسارے پر قابو پانا تھا۔

جی ڈی پی شرح میں کم ٹیکس اور سکیورٹی اور امدادی رقم میں خاطر خواہ اضافے کے باعث اس طرح کے اقدامات اٹھانے کو لازمی تصور کیا گیا، پنجاب حکومت پر بھی سخت تنقید کی گئی کہ اس نے آئین کے آرٹیکل 25-A کے تحت مفت تعلیم کے حق کو یقینی نہیں بنایا اور دانش سکول اور لیپ ٹاپ سکیم پر پیسہ خرچ کیا۔ تاہم صوبے میں لیپ ٹاپ کی تقسیم کو طلبا نے کافی سراہا۔

سرکاری و نجی تقسیم

سالانہ دو فیصد آبادی میں اضافہ ہوا جو کہ ایشیا میں سب سے زیادہ ہے، اتنی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے پاکستان کے سرکاری شعبہ کے سکولوں کے لیے معیاری تعلیم کا باہم پہنچانا بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اس آبادی کے بیش بہا اضافے کا سرکاری سکولوں پر اعتماد نہ ہونے کے برابر ہے جو کہ خود رو نجی سکولوں میں بڑھوتری کا سبب بنا، اور جس نے پاکستان میں 2012 میں 30 فیصد بچوں کا اندراج کیا۔

نجی سکولوں کے متعلق یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اس نے معاشرے کے اشرافیہ اور ایک عام شہری کے درمیان تیزی سے پھیلتے ہوئے فرق کو بڑھانے میں کافی کردار ادا کیا ہے۔ تعلیم کے حوالے سے یکطرفہ نظام جو کہ طبقاتی، استطاعت کی صلاحیت اور نصاب تعلیم کی وجوہات کی بناء پر سرکاری سکولوں کے طالب علموں کے لیے کافی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ بالخصوص اس وقت جب وہ نوکری حاصل کرنے کے لیے عملی دنیا میں آتے ہیں۔ سرکاری سکولوں پر فرسودہ نصاب اور کم قابلیت رکھنے والے اساتذہ کی وجہ سے تنقید کی جاتی ہے اور رٹے بازی پر بھی زور دیا جاتا ہے جس سے سماجی، معاشی اور زبان کے متعلق مسائل میں اضافہ ہوتا ہے۔

کشیدہ حالات میں مکتبی تعلیم

سال کا سب سے ہولناک واقعہ ملالہ یوسف زئی پر شدت پسند جنگجوؤں کا حملہ تھا، ملالہ خیبر پختونخوا کے ایک ضلع سوات کی نوعمر لڑکی ہیں۔ ملالہ نے نہ صرف جنگجوؤں کے پرتشدد اقتدار کے زیر سایہ رہنے سے انکار کیا بلکہ وہ عورتوں کے حقوق برائے تعلیم کی بھی بہت بڑی حمایتی ہیں۔ اکتوبر میں تحریک طالبان پاکستان کے حملہ آوروں نے ملالہ یوسفزئی پر اس لیے حملہ کیا کہ وہ جنگجوؤں کے خلاف بولتی تھیں اور عورتوں کے حقوق برائے تعلیم پر بات کرتی تھیں۔ ملالہ اپنے شدید زخموں کے پیش نظر برطانیہ کے ایک ہسپتال میں داخل رہیں۔ اگرچہ وہ اس حملے میں زندہ بچ گئیں مگر نوعمر مہم جو کو صحت یاب ہونے کے لیے بہت عرصہ لگا۔

بچوں کے حقوق پر کام کرنے والی ایک تنظیم (SPARC) نے سال 2011 میں پاکستان میں بچوں کی حالت پر ایک رپورٹ لکھی، جس میں بتایا گیا کہ خیبر پختونخوا میں 6 لاکھ طلبا و طالبات کو اپنی تعلیم ایک سال

طلبا تعلیمی سلسلہ شروع کرنے کے لیے سکولوں کے ملبے پر واپس آ گے ہیں

کے لیے چھوڑ نا پڑی جس کی بنیادی وجہ زیر اثر اضلاع میں ہونے والی دہشت گردی تھی۔ پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز (PIPS) کے مرتب کردہ شماریات کے مطابق فاٹا اور خیبر پختونخوا کے مختلف علاقوں میں شدت پسند جنگجو تعلیم نظام کے خاتمے کے مقصد کے تحت سکولوں کو بموں سے تباہ کرتے رہے۔

سال 2012 میں کوئی 121 سکولوں کو نشانہ بنایا گیا جبکہ سال 2011 میں تباہ شدہ سکولوں کی تعداد 142 تھی۔ اس میں سے 80 حملے صرف خیبر پختونخوا میں سال 2012 میں ہوئے جبکہ 2011 میں 79 حملے ہوئے تھے۔ تاہم فاٹا میں گزشتہ سال کی نسبت حملوں کی تعداد میں کمی دیکھی گئی، 2012 میں 40 اور اس کے برعکس 2011 میں 56 تھی۔

خیبر پختونخوا کے 12 اضلاع میں سے حملوں کی اطلاعات ملیں جس کے مطابق صوابی (18)، چارسدہ (14) اور ہنگو میں بھی 4 حملے ہوئے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے سکولوں پر بھی حملے ہوئے اور اس کے ساتھ، بنوں، سوات اور ٹانک میں بھی ایک ایک سکول دہشت گردی کا شکار ہوئے۔ فاٹا میں مہمند ایجنسی میں (24)، خیبر (9)، باجوڑ (3)، ساؤتھ وزیرستان (2) اور کرزئی (1)، شمالی وزیرستان (1) اور جنوبی وزیرستان میں بھی ایک سکول حملے کا نشانہ بنا۔ بلوچستان کے ایک ضلع آواران کے ایک سکول پر بھی حملہ ہوا۔

سرکاری افسروں نے ہدف شدہ سکولوں کی تعمیر نو کے حوالے سے فنڈز کی عدم دستیابی بارے گہری تشویش کا اظہار کیا۔ خیبر پختونخوا کے سیکرٹری تعلیم نے یہ وضاحت پیش کی کہ حکومت نے سال 2012-13 واسطے صوبے کی تعلیمی ترقیاتی فنڈز کے لیے 6.7 ارب روپے مختص کیے ہیں۔

جون میں متحدہ عرب امارات (UAE) نے خیبر پختونخوا کے ضلع سوات میں 40 سکولوں اور دیگر تعلیمی اداروں کی تعمیر کے لیے سرمایہ فراہم کیا۔ میڈیا رپورٹ کے مطابق تقریباً 21000 لڑکے اورلڑکیاں پہلے سے ہی ان اداروں میں حاضر ہونا شروع ہو چکے تھے۔

فروری میں ایک کالعدم مذہبی گروہ نے پشاور یونیورسٹی کیمپس میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ یہ تقریب ممبر سازی کو بڑھانے کے لیے مہم سازی کے متعلق تھی جس میں کتابچے اور دیگر مواد تقسیم کیا گیا جن کے اندر متعلقہ گروہ کا ایجنڈا درج تھا۔ یونیورسٹی انتظامیہ اس گروہ کے خلاف کوئی بھی کارروائی کرنے میں ناکام رہی۔ موجودہ کشیدگی کی وجہ سے بلوچستان میں بھی تعلیم پر کافی بڑا اثر پڑا۔ ایچ آر سی پی کے ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن کو بلوچستان کے صوبائی سیکرٹری تعلیم نے بتایا کہ صوبے کے زیرِعتاب علاقوں میں اساتذہ کو ڈھونڈنا تک مشکل ہوگیا ہے جس سے تعلیم کے نظام میں رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔ ہزارہ کمیونٹی کے نوجوانوں پر حملے کے لیے بسوں کو نشانہ بنایا گیا جس سے کم و بیش 300 طالب علموں کو خود کو اعلیٰ تعلیم سے دور کرنا پڑا۔

قوانین اور حکمت عملی

اٹھارویں ترمیم کے تحت تعلیم کے شعبے کو صوبوں کے حوالے کر دیا گیا، آئین کے آرٹیکل 25-A کے تحت منظور شدہ تعلیمی حق اور اس کے متعلق دیگر امور کے نئے قوانین بارے قانون سازی صوبوں کی ذمہ داری بن چکی تھی۔ اگر چہ انتقال اقتدار کا سلسلہ آئین میں ترمیم کے ذریعے 2010 سے ہی شروع ہو چکا تھا، لیکن بدقسمتی سے جو صرف دو قوانین بنائے جاسکے وہ مفت اور لازمی تعلیم کا حق بارے قانون 2011 تھا جو کہ سندھ میں لاگو ہونا تھا اور دوسرا مفت اور لازمی تعلیم کا حق بارے قانون 2012 تھا جو کہ دارالحکومت میں رائج ہونا تھا۔ دیگر صوبوں کے اس بارے قوانین متعارف کرانا ابھی باقی ہے۔

سال 2012 میں پنجاب حکومت نے پنجاب وومنٹ ایمپاورمنٹ کے لیے کئی اقدامات متعارف کرائے جس میں اعلیٰ تعلیم اور سکولوں کی تعلیم کے متعلق معاہدے بھی شامل ہیں۔ پیکج میں پنجاب ایجوکیشن سیکٹر ریفارمز پروگرام کے فنڈز میں سے 60 فیصد لڑکیوں کے سکولوں میں غیر موجود سہولیات کو یقینی بنانے کے لیے مخصوص کیا گیا۔ خیبر پختونخوا کی کابینہ نے خیبر پختونخوا نجی سکولوں کے لیے ایک ریگولیٹری اتھارٹی بل 2012 منظور کیا جس کا مقصد ایک ریگولیٹری اتھارٹی کا قیام کرانا تھا جو صوبہ بھر میں نجی سکولوں کی رجسٹریشن انضباطی امور کو سرانجام دے۔ ریگولیٹری اتھارٹی کے پاس نجی سکولوں کے اساتذہ کی کم سے کم تعلیم کو جانچنے، ان کی تربیت، تنخواہوں اور دیگر نوکری کے متعلق امور کے بارے اختیار حاصل تھا۔

وفاقی حکومت نے پرائمری تعلیم بارے حکمت عملی وضع کی جسے وسیلہ تعلیم کا نام دیا گیا جس سے تیس لاکھ حاجت مند بچے تعلیم حاصل کر پائیں گے۔ چار سالہ تعلیمی پروگرام کے تحت غریب خاندانوں کے بچے بالخصوص لڑکیاں پرائمری سکولوں میں مفت تعلیم حاصل کر پائیں گی۔

مکتبی تعلیم کی حالت

قومی کمیشن برائے انسانی ترقی کے مطابق۔ پاکستان میں 19 ملین سکول کی عمر کے بچوں میں سے بارہ فیصد پانچویں جماعت سے آگے پڑھ پاتے ہیں۔ درحقیقت ہر 25 بچے جو پرائمری سکول کی عمر میں ہوں سے 22 بچے پانچویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے یا تو فیل ہو جاتے ہیں یا پھر سکول سے خارج کر دیئے جاتے ہیں۔ ان میں سے تہائی فیصد ہی پانچویں جماعت کامیابی سے پاس کر پاتا ہے۔ یونیسکو (UNESCO) کی ایک تازہ رپورٹ جو کہ عالمی جائزہ میں تعلیم سب کے لیے کے حوالے سے ہے میں یہ بتایا گیا ہے کہ کم سے کم 5.1 ملین پاکستانی بچے سکول تک نہیں جاسکتے اور بیان کردہ اعداد و شمار میں سے 63 فیصد لڑکیاں تھیں۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ پاکستان میں سکول جانے والی عمر کے بچوں کی تعداد 197.5 ملین تھی جبکہ 7.27 ملین بچے سکول نہیں جا رہے تھے۔

تمام سال منعقد ہونے والے مباحثوں اور اجلاسوں میں زور دیا گیا کہ تعلیم کے لیے کم پیسے مختص کرنا سکولوں میں بنیادی سہولیات کے فقدان کی طرف لے جائے گا۔ ایک اجلاس جو پاکستانی اتحاد برائے تعلیم کی طرف سے منعقد ہوا، میں یہ بتایا گیا کہ تقریباً 10.9 فیصد سکول پاکستان میں مناسب عمارت سے محروم ہیں۔ 37.78 فیصد چار دیواری سے محروم۔ 33.9 فیصد پینے کے پانی کی سہولت نہیں رکھتے تھے۔ 36.9 فیصد بیت الخلا سے محروم 59.6 فیصد سکولز میں بجلی نہیں تھی۔ مزید یہ 505 سکولز پنجاب میں، 11669 سندھ میں 1113 خیبر پختونخوا 681 بلوچستان میں 2705، آزاد کشمیر میں 183 گلگت بلتستان میں اور 908 فاٹا میں میں سکول کی مناسب عمارت سے محروم تھے۔

ماہرین تعلیم یقین رکھتے ہیں کہ ایسی سہولیات کی کمی ملک میں طلباء کے اخراج کو بڑھانے میں مدد کرتی ہیں۔ پاکستان میں سکولز کی عمارتیں پولنگ سٹیشن بنائی جاتی ہیں۔ قدرتی آفات میں ریلیف کیمپس اور یہاں تک کہ پولیس اسٹیشن فاٹا میں بتایا گیا کہ آرمی بھی ان کو کیمپس بطور استعمال کرتی ہے۔

تعلیم میں اس قسم کے خلل کے علاوہ گورنمنٹ نے سرکاری سکولوں کے خبروں کے مطابق اساتذہ کو غیر تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف رکھا۔ اطلاعات کے مطابق اساتذہ، پولیو کے خلاف مہم، چینی کی تقسیم کی نگرانی،

ووٹر لسٹیں بنانے اور اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کی ملاقاتوں کی تشکیل میں مصروف رہے۔

تعلیمی اداروں پر گورنمنٹ عہدہ داروں کے قبضے کی خبریں بھی 2012 میں موصول ہوئیں۔ سپریم کورٹ نے ایک کیس میں ایبٹ آباد ضلع کی انتظامی باڈی کو حکم دیا کہ وہ لڑکیوں کے سکول کو جس پر پولیس نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا کو آزاد کرائے۔ راولپنڈی میں لڑکیوں کے میڈیکل کالج کے ہاسٹل کو کئی سالوں تک قومی احتساب بیورو نے ناجائز اپنے قبضے میں رکھا اور وزیراعظم کی مداخلت کے باوجود ہاسٹل کو خالی نہیں کیا۔

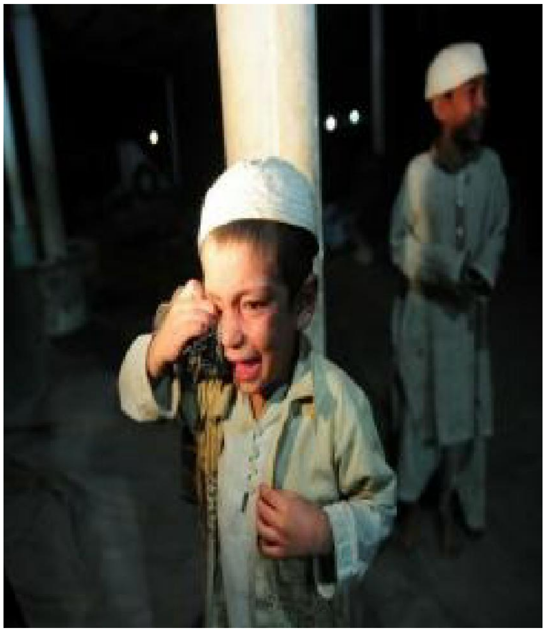

ایک مدرسے کا طالب علم

جسمانی سزا کی وجہ سے ہاتھ، پاؤں کا ٹوٹنا اور یہاں تک کہ طالب علموں کی خودکشی کے واقعات بھی 2012 میں سامنے آئے۔ یہاں تک کہ گورنمنٹ نے جسمانی سزا پر پابندی ایکٹ کے تحت سرکاری اور نجی اداروں میں جسمانی سزا پر پابندی لگائی لیکن یہ پرتشدد عمل جاری رہا، جس کے نتیجہ میں بہت سے طالب علموں نے سکول جانا چھوڑ دیا۔

باجوڑ ایجنسی کے ایک عہدیدار کے مطابق 2012 میں اندراج کی شرح بڑھی اور 39,000 طالب علم سکول میں داخل ہوئے۔ اس اضافے کی ایک وجہ 09-2008 کی جنگ کے نتیجے میں بے دخل خاندانوں کی ان کے وطن واپسی بھی بتائی جاتی ہے اور کسی حد تک ''ورلڈ فوڈ پروگرام'' کے نتیجے میں داخل شدہ طالب علم کو ہر دوسرے مہینے راشن کا ملنا بھی ایک وجہ ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے مسائل

ورلڈ اکنامکس 2011 کی رپورٹ میں نشاندہی کی گئی کہ اعلیٰ تعلیم، فنی تعلیم اور جدت بہتر علم کے بارہ میں سے تین ستون ہیں۔ اعلیٰ تعلیم پر مختص کیا جانے والا بجٹ تعلیمی بجٹ کا گیارہ فیصد ہے جبکہ یونیسکو کے

طلبا و اساتذہ سندھ یونیورسٹی میں امن وامان کا مطالبہ کرر ہے ہیں

مطابق اعلیٰ تعلیم کے لیے بجٹ تعلیمی بجٹ کا کم ازکم 25 فیصد ہونا چاہیے۔

سرکاری یونیورسٹیوں نے 2012 میں گورنمنٹ کی طرف سے فنڈز نہ ملنے پر معاشی دباؤ کا سامنا کیا۔ سرکاری یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر نے شکایت کی کہ صوبائی حکومتوں نے فنڈز کو بڑھانے کی تجاویز کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ وفاقی حکومت کی ذمہ داری ہے اور 2014 تک وفاق کی ذمہ داری رہے گی۔ ہزاروں ایسے طلباء جو وظائف حاصل کر چکے تھے کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ہائر ایجوکیشن کو مالی سال کے آخر تک 6.8 بلین فنڈز جو درکار تھے مہیا نہیں کیے گئے۔ 2012 میں ملک میں پہلی انفارمیشن یونیورسٹی جسے پنجاب ٹیکنالوجی یونیورسٹی کہا جاتا ہے بنی، دوسری نئی بات یہ تھی کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن نے پہلی بار ملک میں موجود یونیورسٹیوں کی درجہ بندی کی۔ بہت سی یونیورسٹیوں نے اس درجہ بندی کو جانبداری کا الزام لگاتے ہوئے تسلیم نہ کیا۔ ایک خوش آئند قدم یہ اٹھایا گیا کہ 1016 کنال زمین سوات یونیورسٹی کے لیے دی گئی اور خیبر پختونخوا میں صوابی یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ کچھ سرکاری یونیورسٹیوں کے عہدہ داروں نے شدید غم وغصے کا اظہار کیا کہ ان کے اپنے اداروں اور نئی یونیورسٹیوں کے قیام کے لیے ہائر ایجوکیشن کمیشن سے متوقع رقم نہیں ملی۔ پشاور یونیورسٹی نے دعویٰ کیا کہ 12-2011 میں یونیورسٹی کو ملنے والے فنڈز اس کے ٹوٹل فنڈ کے 50 فیصد تھے اور اسی طرح 70 فیصد سرکاری یونیورسٹیوں کو ہائر ایجوکیشن کمیشن کے فنڈز نہ ملنے پر معاشی بدحالی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ البتہ میڈیا نے یہ اجاگر کیا کہ خود ہائر ایجوکیشن کمیشن کو بھی معاشی بدحالی کا سامنا ہے کیونکہ حکومت نے 12-2011 میں ہائر ایجوکیشن کمیشن کو جو مطلوبہ 9 بلین روپے دینے تھے جو نہیں دے پائی۔

نومبر میں پنجاب گورنمنٹ کا لٹریسی پروموشن پروگرام بنایا گیا جس کا مقصد آبادی کے اس حصے کو ٹیکنیکل

تعلیم مہیا کرنا تھا جس کے پاس عام تعلیم حاصل کرنے کی رسائی نہیں ہوتی جس میں خواجہ سرا، قیدی اور مشقت کرنے والے بچے شامل ہیں۔ پروگرام میں 4236 نئے غیر بنیادی تعلیمی سکول 32 اضلاع قائم کرنا شامل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پہلے سے موجود 1204 سکول جن میں 190,000 بچوں کو رسمی تعلیم جو کہ جماعت اول سے پنجم تک ہے کا اندراج کرنا تھا۔

تعلیمی اداروں میں تشدد

ایک وقت میں یونیورسٹیوں میں طلبا تنظیموں کو مستقبل کے جمہوری سیاسی عمل میں شامل ہونے کے لیے نرسری پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ پچھلے چند عشروں میں طلبا کی سیاست بڑی پر اشتعال رہی ہے اور مختلف سیاسی جماعتوں کے ساتھ وابستگی کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔

2012 تک کیمپس میں اشتعال جاری رہا۔ پروفیسر بشیر احمد چنڑ جو کہ سندھ یونیورسٹی میں قتل ہوئے ان کے قتل پر طالب علموں اور اساتذہ نے احتجاج کیا اور اس پورے معاملے کی عدالتی انکوائری کا مطالبہ کیا۔ اساتذہ کی تنظیم نے رینجر اور پولیس ہٹائے جانے کا مطالبہ کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سارے اسلحے کو ضبط کرنے کا بھی مطالبہ بھی کیا۔ احتجاج اتنا بڑھ گیا کہ دو مہینوں تک تعلیمی سلسلہ رک گیا لیکن یونیورسٹی کھلنے کے بعد دو ہفتوں کے اندر ہی دوبارہ یونیورسٹی ایک طالب علم کے قتل کی وجہ سے بند کرنا پڑی۔ سندھ یونیورسٹی کے اساتذہ ہڑتال پر گئے اور وائس چانسلر کو ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ پروفیسرز کی تحریک کو ختم کرنے کے لیے ان کے رہنماؤں پر حملے کی

ہوم ورک میں پوچھا گیا سوال اس تباہی کا سبب بنا

خبریں بھی سامنے آئیں۔

ایمرسن کالج ملتان میں دو طلبا تنظیموں کے جھگڑے پر کم از کم 22 لڑکوں کو حراست میں لیا گیا۔ حملہ کی وجہ یہ بتائی گئی کہ مسلم سٹوڈنٹ فیڈ ریشن نے کالج میں اپنی تنظیم بنانا چاہی اور پیپلز سٹوڈنٹس فیڈ ریشن نے یہ کوشش ختم کرنے کے لیے کارروائی کی۔ گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج راولپنڈی میں پختون سٹوڈنٹ اور انصاف سٹوڈنٹ فیڈ ریشن میں تصادم کی وجہ سے 25 طلبا کو حراست میں لیا گیا۔ ان دونوں واقعات میں اسلحے کی بڑی تعداد کو ضبط کیا گیا۔

صنفی عدم مساوات کا مسئلہ

پاکستان میں بہت سارے عوامل جس میں دولت، جنس ثقافت اور جغرافیائی مقام شامل ہیں کی وجہ سے تعلیمی مواقعوں میں عدم مساوات جاری رہی۔ پاکستان کا تعلیمی میدان میں ایسے ہمسایہ مما لک کے ساتھ موازنہ، بالخصوص تعلیمی سطح پر جنسی عدم مساوات کے نتائج، دیہی اور شہری علاقوں میں سکول کی تعلیم تک رسائی اور تعلیم کے لیے مناسب بنیادی ڈھانچے کے حوالے سے پاکستان بہت پیچھے دکھائی دیتا ہے۔

طالبان نے صرف خیبر پختونخوا کی وادی سوات میں 1576 سکولوں میں سے 400 سے زائد سکولوں کو تباہ کر دیا۔ سرحد دیہی امدادی پروگرام کے عہدہ داران کے مطابق 70 فیصد سکول صرف لڑکیوں کے ختم کیے گئے۔

مثبت طور پر پنجاب اور خیبر پختونخوا کی حکومتوں نے عورتوں میں تعلیمی شرح کو بڑھانے کے لیے اپنی امداد کا اعلان کیا۔ پنجاب گورنمنٹ نے پورے پنجاب میں ایک خطیر رقم 520 بلین روپے ابتدائی سکولوں کو سیکنڈری سکول بنانے پر خرچ کی جبکہ خیبر پختونخوا کے صوبائی وزیر برائے تعلیم نے 70 فیصد صوبائی تعلیمی بجٹ کو سالانہ بنیادوں پر عورتوں کی تعلیم پر خرچ کرنے کا اعلان کیا۔

بین الاقوامی درجہ بندی اور شرح تعلیم

مارچ میں یونیسیف کے مطابق پاکستان میں 20 ملین بچے جس میں تقریباً 7.3 ملین پرائمری سکول کی عمر والے بچے سکولوں میں داخل نہیں تھے ایک رپورٹ جس کا عنوان پبلک فنانسنگ 12-2011 ہے اور جوانسٹی ٹیوٹ آف سوشل اینڈ پالیسی سائنسز نے جاری کی، کے مطابق ملک کی 63 فیصد آبادی نوجوانوں پر مشتمل ہے جن کی عمر 25 سال سے کم ہے، رپورٹ نے اس شرح کو مثبت طور پر گردانا اور واضح کیا کہ اس سے معاشی ترقی اور سماجی ترقی حاصل کی جاسکتی ہے لیکن افسوسناک خبر یہ ہے کہ یو ایس ایڈ کے مطابق تقریباً آدھی

نوجوان آبادی غیر تعلیم یافتہ اور دو تہائی بچے صرف پرائمری سکولوں میں ہیں جن میں سے تہائی کے بارے میں یہ رائے ہے کہ وہ سیکنڈری سکول پہنچنے سے پہلے سکولوں کو چھوڑ دیں گے۔

مجموعی طور پر ایک فیصد تعلیمی شرح میں اضافہ پورے سال میں کسی بھی لحاظ سے متاثر کن نہیں ہے۔ نوجوانوں میں تعلیمی شرح سابقہ 54 سے 55 فیصد بڑھی جو کہ ایک فیصد ہے۔ پاکستان میں سالانہ تعلیمی اخراجات اس کے تمام GDP کا 2 فیصد ہے جو کہ اس خطے میں سب سے کم ہے۔ اس کے مقابلے میں بنگلہ دیش اپنی تمام GDP کا 2.6 فیصد ہندوستان، 3.3 فیصد ایران، 5.2 فیصد اور نیپال 3.2 فیصد خرچ کرتا ہے۔ لٹریسی ریٹ کو پانے کے لیے ایک منصوبے کے تحت نیشنل کمیشن آف ہیومن ڈویلپمنٹ نے پاکستان میں 6200 تعلیمی مراکز کھولے جن میں 141,460 طالب علم کو بنیادی تعلیم کا سبق دیا جاتا ہے۔

پاکستان میں امتحانات میں غیر شفافیت

امتحانوں میں نقل کی خبریں طالب علموں کا گھروں میں پرچے حل کرنا اور امتحان کے نگرانوں کا پرچوں کو وقت سے پہلے عیاں کرنا ہر صوبے میں دیکھا گیا ہے۔ بہت سے علاقوں میں طالب علموں پر نقل کرتے ہوئے اور نگران امتحانات کا اس عمل میں آسانی پیدا کرنے پر مقدمات درج کیے گئے ہیں۔ پروفیسر بشیر احمد چنڑ کے قتل پر اساتذہ کی ہڑتال سے سندھ یونیورسٹی کے 6500 طالب علم اپنا Viva امتحان نہ دے سکے۔ امتحانات کے نتائج میں تاخیر کا بھی 2012 میں دور دورہ رہا۔

پرائیویٹ سکول

پاکستان میں نجی سکول غیر مسابقتی ماحول میں پروان چڑھے اور یہ استحصال شدہ حالت حیران کن طور پر بڑھی جس پر کوئی انظباطی سلسلہ نظر نہیں آیا۔ بہت سارے وعہدوں کے باوجود پورے 5 سال میں ملک بھر میں صوبائی حکومتیں نجی سکولوں کی نگرانی کے لیے کوئی بھی اختیاراتی کمیٹی نہ بنا سکیں۔ متفکر والدین نے فیسوں میں بے تحاشا اضافے اور دیگر غیر واضح تعلیمی اخراجات پر اپنی تشویش کو نظر انداز ہوتا محسوس کیا۔ 2012 کے آخر تک صرف خیبر پختونخوا کی صوبائی حکومت نے صوبے کے اندر نجی سکولوں کی نگرانی کرنے کے لیے ایک بل پاس کرتے ہوئے ادارہ بنانے کی کوشش کی۔ پنجاب میں آل پاکستان نجی سکولوں کی تنظیم نے پنجاب گورنمنٹ کے اس فیصلے پر کہ نجی سکولوں کی فیس 5000 ہونے پر دس ضرورت مند بچوں کو مفت داخلہ دیا جانے پر تسلیم کرنے سے مکمل طور انکار کر دیا۔ تنظیم نے کہا کہ پنجاب گورنمنٹ کو سرکاری سکولوں پر توجہ دینی چاہیے نہ کہ ہمیں اس قسم کے احکامات دینے چاہئیں۔

مدارس تعلیم

پاکستان میں مدرسہ کا رواج اس حقیقت کے پیش نظر کوئی حیران کن بات نہیں ہے کہ مدرسہ میں تعلیم کے ساتھ ساتھ کھانا اور رہائش بھی دی جاتی ہے جو کہ باقی سرکاری شعبہ میں نہیں ملتی۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق پاکستان میں 20,000 رجسٹرڈ مدرسہ ہیں جبکہ غیر اندراج شدہ مدرسوں کی تعداد اس سے زیادہ ہے۔ میڈیا کی رپورٹ کے مطابق تعلیم کا اختیار صوبوں کو منتقل ہونے سے انہوں نے اس چیز کو مشکل بنا دیا ہے کہ وہ مدرسہ کے

مدارس نے اُن کے لیے اپنے دروازے کھول دیے جو تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے

تعلیمی ماحول پر نظر رکھی جا سکے کیونکہ مدرسہ کو قومی سطح پر ان کے متعلقہ وفاقی بورڈ چلاتے ہیں۔ بہت سی میڈیا رپورٹس کے مطابق مدرسے غیر ملکی حکومتوں سے فنڈز لیتے ہیں اور ان کے نظریے کی تشہیر کرتے ہیں اور اکثر اوقات ان کے عدم برداشت اور نفرت کے ایجنڈے کو اپنے طلباء میں پھیلاتے ہیں۔ سال کے آخر تک وزارت خارجہ کی طرف سے قومی اسمبلی میں ایک رپورٹ پیش کی گئی جس میں 35 بیرونی ممالک کے 2673 غیر ملکی طالب علم پاکستان کے مدرسوں میں داخل تھے۔ قومی اسمبلی کو یہ بھی باور کرایا گیا کہ بلوچستان میں جتنے بھی غیر ملکی طالبعلم ہیں وہ تقریباً افغانستان سے تعلق رکھتے ہیں۔

خصوصی تعلیم سکول

معلومات کے مطابق مخصوص سکول برائے خصوصی طلباء پاکستان کے دو بہت اہم علاقوں میں پائے ہی نہیں جاتے۔ 2012 کے آخر تک سندھ میں 48 خصوصی تعلیم کے ادارے، پنجاب میں 101، خیبر پختونخوا

میں 21 جبکہ بلوچستان اور گلگت بلتستان میں خصوصی تعلیم کے مراکز کا کوئی ریکارڈ نہیں ملا۔ سندھ اور پنجاب میں خصوصی تعلیم کے اداروں کی ویب سائٹس دیگر کی نسبت زیادہ مفصل تھی۔

2012 میں پنجاب یونیورسٹی پہلا تعلیمی ادارہ بنا جو اس ملک میں پی ایچ ڈی سطح تک خصوصی بچوں کی تعلیم اور خود ان کے وظیفے مہیا کرتا ہے۔

نصاب اور تدریسی کتب

ماہرین تعلیم اکثر پاکستان میں تعلیمی اداروں میں پڑھائی جانے والی کتابوں میں جدت کی کمی اور اس میں موجود جانبدارانہ تصورات اور ذہنی استطاعت کو بڑھانے کے لیے ناکافی مواد کو اکثر تنقیدی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسلامیات کی تدریسی کتب میں نظرثانی کر کے اصلاح کرنے کی کوشش کو مذہبی حلقوں سے مکمل طور پر مخالفت کا سامان کرنا پڑا۔ جس سے یہ منصوبہ ملتوی ہو گیا۔

نیشنل کمیشن برائے انصاف اور امن کی منت کے تجزیئے کی رپورٹ کے مطابق پنجاب میں تدریسی کتابوں میں نفرت آمیز مواد جو 2009 میں 45 فقروں پر مشتمل تھا 2012 میں بڑھ کر 122 فقروں تک پہنچ گیا۔ اس رپورٹ میں پنجاب اور سندھ کے جماعت اول سے لے کر دس تک تعلیمی سال 13-2012 کے سلیبس کو مدنظر گیا۔

رپورٹ کے مطابق نصابی کتب نے عدم برداشت کو فروغ دیا اور ساتویں جماعت سے دسویں جماعت

نئی کتابوں کی قیمت بڑھنے سے قارئین استعمال شدہ کتابوں کی طرف متوجہ

تک کے نصاب میں نفرت آمیز مواد کا اضافہ ہوا۔نفرت آمیز نصاب میں اضافہ اردو، اسلامیات اور معاشرتی علوم کی کتابوں میں پایا گیا۔

سفارشات

1۔ وفاقی اور صوبائی حکومتیں تعلیم کے حوالے سے ہزار سالہ ترقیاتی اہداف کے حصول اور تعلیم کے حق کی فراہمی جس کا انہوں نے عہد کیا تھا میں ناکام رہیں۔ ہر بچے کو تعلیم کی فراہمی پہلی ترجیح قرار دینی چاہئے۔

2۔ تعلیم پر مختص بجٹ تعلیم کے ساتھ سنجیدگی کا عندیہ دیتی ہے۔ جی ڈی پی کا چار فیصد تعلیم پر خرچ کرنا چاہئے۔رقم کو ماہرین کے زیرنگرانی شفافیت سے خرچ کرنا چاہئے نہ کہ سیاستدانوں اور افسر شاہی کی منشاء پر۔ پرائمری سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک وسائل کے تخصیص اور تعلیم کے تمام شعبوں میں اس طرح توجہ دینی چاہئے جس طرح ملکی تعلیمی ضروریات پوری ہوتی نظر آئیں۔

3۔ لڑکیوں کے سکولوں پر دہشت گردوں کے حملے اور لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف روایتی رویے کو لازمی طور پر آگاہی شعوری مہم اور علاقے کے رہنماؤں کو رول ماڈل بنانے کے ذریعے ختم کرنا چاہیے۔لڑکیوں کو لازمی طور پر تعلیم کے لیے بہتر اور محفوظ ماحول مہیا کرنا چاہیے۔

4۔ رواداری اور مثبت اقدار کے فروغ ے لیے تعلیمی نصاب کی اصلاح، تجدید اور طلباء میں دانشورانہ فکر کے اضافے کی اشد ضرورت ہے۔

صحت

جنس، ذات، رنگ اور نسل کے امتیاز سے بالاتر، ریاست عوام کی فلاح اور بہبود کو یقینی بنائے گی اور جنس، ذات، رنگ اور نسل سے بالاتر ایسے تمام افراد کو بنیادی ضروریات زندگی۔۔۔مثلاً طبی سہولیات۔۔۔فراہم کرے گی جو بے روزگاری، بیماری یا معذوری کی بنا پر مستقلاً یا عارضی طور پر روزی کمانے کے قابل نہیں۔

آئین پاکستان[آرٹیکل-38(اے)اور(ڈی)]

ہر شخص ایک معقول معیار زندگی پر حق رکھتا ہے جو اس کی اور اس کے خاندان کی صحت اور فلاح و بہبود کی ضمانت فراہم کر سکے۔ جس میں خوراک، لباس، رہائش، صحت برقرار رکھنے کی سہولیات، ضروری سماجی خدمات [بجلی، پانی، گیس وغیرہ] اور بے روزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپے یا ایسے حالات کے تحت جو اس کے بس سے باہر ہوں اور عدم روزگار کی کسی بھی صورت کے خلاف ضمانتیں بھی شامل ہیں۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل 25(1)]

دنیا میں 115 ایسے مما لک ہیں جو اپنے شہریوں کو 'صحت کے حق' کی بنیادی انسانی حق کے طور پر ضمانت دیتے ہیں۔ پاکستان ان میں شامل نہیں۔ صحت اور مناسب طبی سہولیات کو یقینی بنانے کے لیے ریاست کی ذمہ داری کا حوالہ پاکستان کے آئین کے پالیسی اصولوں میں دیا گیا ہے۔ اس کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ پالیسی اصول براہ راست قابل نفاذ نہیں اور کوئی شہری ریاست کی جانب سے اس اہم حق کو نافذ کروانے کے لیے عدالت میں درخواست دائر نہیں کر سکتا۔

صحت کا شعبہ 2012 میں ایک مایوس کن منظر پیش کرتا رہا۔ اس ناکامی کی تین اقسام میں درجہ بندی کی جا سکتی ہے پہلا وسائل کی تخصیص ہے، جس کا لب لباب یہ ہے کہ صحت کے لیے کتنا بجٹ مختص کیا گیا۔ وسائل کی تخصیص قلیل اور انتہائی غیر اطمینان بخش تھی۔ دوسرا وسائل کی ترجیح تھی یعنی مختص کی گئی رقم کہاں خرچ کی جاتی ہے۔ ثانوی صحت اور شفا بخش صحت توجہ کا مرکز بنی رہیں اور جی ڈی پی کی خاطر خواہ شرح کے ساتھ پرائمری طبی نگہداشت اور انسدادی طبی نگہداشت پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

بدین: سیلاب کے باعث ہسپتالوں میں طبی سہولیات بھی متاثر ہوئیں

آخر میں ان وسائل کے استعمال کے جائزے یا نگرانی اور شعبہ صحت کی کارکردگی کا اہم مسئلہ بھی درپیش ہے۔

بجٹ کی تخصیص

پاکستان میں بجٹ کی تخصیص کی سمت بتدریج زوال کی طرف گامزن رہی ہے۔ کمیشن برائے ترقی ومنصوبہ بندی کے اعداد وشمار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صحت کے لیے مختص کی گئی جی ڈی پی کی شرح فیصد 2000-2001 کے مالی سال کی شرح فیصد 0.72 سے کم ہو کے 2010-2011 کے مالی سال میں 0.27 فیصد رہ گئی ہے۔ 2012-13 کے مالی سال میں اس کمی کا رجحان جاری رہا اور صحت کے شعبے کو سات ارب چوراسی کروڑ پچاس لاکھ روپے (0.2 فیصد) کی انتہائی قلیل رقم ملی۔ بجٹ دستاویزات کے مطابق اس رقم میں سے تیرہ کروڑ بیس لاکھ روپے طبی مصنوعات اور آلات کے لیے مختص کیے گئے۔ چھ ارب ساٹھ کروڑ نوے لاکھ روپے ہسپتال کی خدمت گزاریوں کے لیے اور پچیس کروڑ نوے لاکھ روپے شعبہ صحت کی انتظامیہ کے لیے مختص کیے گئے۔ ڈینگی بخار اور خسرے جیسی وبائی امراض جن کی وجہ سے کئی لوگ ہلاک ہوئے، اس بات کا کھلا انتباہ تھا کہ مستقبل میں آنے والی آفات سے بچنے کے لیے شعبہ صحت کے لیے بجٹ کی تخصیص اور مختص کی گئی رقم کے منصفانہ استعمال کے حوالے سے بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔

ماں کی صحت اور کم عمر بچوں کی شرح اموات

ماں کی صحت اور کم عمر بچوں کی شرح اموات کے معاملے میں پاکستان دیگر ترقی پذیر ممالک سے بہت

بہت زیادہ مریض...... بہت کم گنجائش

پیچھے تھا اور 2013 تک ایک ہزار سالہ ترقیاتی اہداف کا حصول غیر متوقع معلوم ہوتا تھا۔ شیر خوار بچوں میں 1,000 میں سے 63 بچوں کی اموات اور پانچ سال سے کم بچوں میں 1000 میں سے 86.5 کی اموات کی شرح لمحہ فکریہ رہی۔ کثرت اموات کی بڑی وجہ ناقص غذا، پانی سے پیدا ہونے والی بیماریاں اور ناکافی خوراک ہیں۔ مادری اموات کی ایک لاکھ میں سے 276 اموات کی شرح ابھی بھی بہت زیادہ ہے اور 2015 تک ان اموات کو ایم ڈی جی کے مطابق کم کر کے 140 تک لانا غیر متوقع ہے۔ مانع حمل کے پھیلاؤ کی شرح 30 فیصد ہے جسے 2015 تک 55 فیصد تک بڑھانے کی ضرورت ہے، جبکہ شرح پیدائش 4.1 بچے فی خاتون ہے جسے کم کر کے 2.1 فیصد تک لانے کی ضرورت ہے۔ بلوچستان میں ایک لاکھ میں سے 785 خواتین کی اموات واقع ہوئیں۔ مانع حمل کے پھیلاؤ کی شرح 14 فیصد رہی جبکہ شرح پیدائش 4.1 بچے فی خاتون رہی۔ اس بھیانک صورت حال کا ناکافی بجٹ اور مختص کی گئی رقم کے غیر منصفانہ استعمال سے بھی اتنا ہی تعلق ہے جتنا اس کا تعلق لوگوں میں تعلیم اور شعور کی کمی سے ہے۔

پانی کی صفائی

پانی کی صفائی اور حفظان صحت پاکستان میں صحت کو درپیش چیلنجوں کا مرکزی موضوع ہے۔ یہ خاص طور پر نہایت اہم ہے کیونکہ اس کا غیر معمولی طور پر بہت سی بیماریوں کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ رپورٹس کے مطابق ان بیماریوں میں سے 10 فیصد سے زائد کے واقعات پر پانی کی صفائی اور حفظان صحت میں بہتری اور واٹر ریسورس مینجمنٹ کو بہتر کرتے ہوئے قابو پایا جا سکتا ہے۔ پانی سے متعلقہ بیماریوں کا اثر غیر نسبتی طور پر

غریبوں اور بالخصوص پانچ سال سے کم عمر بچوں پر پڑتا ہے اور ان بچوں کی اموات میں سے 30 فیصد صاف پانی تک ناکافی یا انتہائی کم رسائی اور پانی کی صفائی کی عدم موجودگی سے منسوب ہیں۔

پاکستان میں پانی اور صحت وصفائی کے فوائد ناکافی طور سے تحریر شدہ رہے ہیں اور عام لوگوں کو اس موضوع کے متعلق شعور فراہم کرنے کے لیے معنی خیز اقدامات نہیں کیے گئے۔

پانی کے معاملات کو سیاسی اور ترقیاتی سطح پر ترجیح نہیں دی جارہی اور پانی کے انفراسٹرکچر میں سرمایہ کاری کی شدید کمی ہے۔

دماغی صحت

پاکستان کو Lunacy ایکٹ 1912 ورثے میں ملا ہے جو کہ زیادہ ملک میں نفسیاتی مریضوں پر اثر کرنے میں بہترین تھا۔ جب پاکستان نے دماغی صحت کے ایکٹ 2001 کو اپنایا تو اس میدان میں تھوڑی یا بالکل بھی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ آئین کی اٹھارہویں ترمیم نے دماغی صحت کی شق کو وفاق سے صوبوں کے سپرد کر دیا۔ اٹھارویں ترمیم نے 2001 کے ایکٹ کو منسوخ کر دیا جو کہ وفاقی نفسیاتی ریگولیٹری اداروں کا احاطہ کرتا تھا۔ سندھ کا دماغی صحت کا بل جنوری 2012 میں معائنے کے لیے صوبائی وزارت قانون کو جمع کرایا گیا۔ یہ بل صوبائی (سندھ) مینٹل اتھارٹی اور دورہ کرنے والے بورڈ، اہم حکومتی ادارے جو کہ دماغی نگہداشت کے لائسنس دینے، اس کی باقاعدگی اور نگرانی کے ذمہ دار ہیں کے لے ایک فریم ورک کی تشکیل سے متعلق دفعات پر مشتمل تھا۔ بل میں جیلوں اور ہسپتالوں میں دماغی نگہداشت کی دفعات بھی شامل تھیں۔

ایک سکول میں معذور بچے

اس میں ان اداروں میں دماغی مریضوں کے ساتھ بدسلوکی کا جرمانہ اور سزا بھی تجویز کی گئی تھی۔ اس کے باوجود زیر جائزہ سال کے آخر تک اس میدان میں تا حال کوئی معنی خیز پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔

خودکشیاں

پاکستان میں گزشتہ برسوں کے دوران خودکشی کی شرح 2012 میں بھی برقرار رہی۔ ایچ آر سی پی کی میڈیا مانیٹرنگ کے مطابق زیر جائزہ سال کے دوران 1,916 افراد نے خودکشی کی۔ ان میں 1,323 مرد اور 626 خواتین شامل ہیں۔ میڈیا رپورٹوں نے خودکشی کرنے والے 37 افراد کی جنس کی وضاحت نہیں کی۔ وہ افراد جنہوں نے خود اپنی جان لی ان میں کم از کم 188 کم سن بچے شامل تھے۔ 873 کے لگ بھگ افراد جن میں 488 مرد اور 382 خواتین شامل تھیں، نے بھی اپنی جان لینے کی ناکام کوشش کی۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر سال خودکشی اور اقدام خودکشی کے بیشتر واقعات اس وجہ سے منظر عام پر نہیں آتے کیونکہ اپنی جان لینے والوں کے ساتھ معاشرتی اور مذہبی رسوائی منسلک ہوتی ہے۔ مددگار قومی ہیلپ لائن کے ریکارڈ کے مطابق پچھلے 12 سالوں میں (2001 تا 2012) پاکستان میں 32,762 خودکشیوں کی خبریں شائع ہوئیں جن میں 4031 بچے، 11,752 خواتین اور 16,975 مرد شامل تھے۔ خودکشیوں کے متعلق جانچ شدہ کوائف خراب معاشرتی و معاشی حالات اور خودکشیوں کے بیچ گہرے تعلق کو ظاہر کرتے تھے۔ لاچارگی، غربت، اپنی زندگی پر اختیار کھودینا، نفسیاتی دباؤ اور گھریلو تشدد خودکشیوں کی عام وجوہات تھیں جبکہ زہرخورانی، آتشی آلات کا استعمال یعنی بڑی مقدار میں نیند آور گولیاں اور جراثیم کش ادویات لے لینا، خودکشی کرنے کے عام طریقے تھے۔

خودکشی کے واقعات کی بڑی تعداد عام لوگوں میں پائے جانے والے عدم اطمینان اور عدم تسکین کو ظاہر کرتی ہے اور خودکشی اور اقدام خودکشی کا ارتکاب کرنے والے لوگوں کو فراہم کی گئی انسدادی ذہنی نگہداشت کے متعلق سنگین سوال اٹھاتی ہے۔

نشے کے عادی افراد

نشے کی عادت کا مقابلہ ایک مستحکم اور بڑی مہم کے ذریعے کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں تقریباً نوے لاکھ افراد نشے کے عادی ہیں اور اس تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ نشے کے عادی تقریباً 20 لاکھ افراد کی عمر 15 سے 25 سال کے درمیان ہے اور منشیات کی عادی خواتین کی تعداد 2 لاکھ کے قریب ہے۔ پاکستان یو این او ڈی سی/ڈبلیو ایچ او UNODC/WHO کا حصہ ہے جو کہ منشیات کے علاج اور بحالی کا عالمی منصوبہ ہے اور جس کا مقصد علاج کے ضابطہ اخلاق کی پیروی کرتے ہوئے منشیات کے علاج کے ماہرین

ہیروئن کے ٹیکے لگاتے ہوئے

کی تعداد میں اضافہ کرنا تھا۔ پاکستان میں اقوام متحدہ کے دفتر برائے منشیات اور جرائم کے نمائندے نے حال ہی میں یہ بیان دیا ہے کہ اقوام متحدہ کی تنظیم ان پالیسیوں کو فروغ دیتی ہے جو منشیات کی ترسیل میں کمی اور طلب کے درمیان صحیح توازن پیدا کرتی ہیں اور یہ منشیات کی روک تھام اور نشے کے علاج کے لیے سائنسی طریقہ کار اپنانے میں رکن ریاستوں کی رہنمائی بھی کرتی ہے۔ نشے کے علاج کی فراہمی اور بحالی نو کی خدمات کو معیار کے مطابق بنانے اور اس میں اضافہ کرنے کے لیے یو این او ڈی سی (UNODC) نے علاج کے اصولوں کے ایک مجموعے کی بنیاد رکھی جسے ''منشیات کا استعمال کرنے والوں کے علاج کا ضابطہ اخلاق'' کا نام دیا گیا۔

وزارت انسداد منشیات کے سیکرٹری نے کہا کہ قومی منصوبہ برائے انسداد منشیات کے تحت حکومت پاکستان کا منشیات کے علاج اور بحالی نو کی خدمات کو صحت کے نظام میں شامل کرنے کا ارادہ ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ منشیات کا استعمال کرنے والے لوگوں کو مؤثر اور انسانی علاج مہیا کیا جانا چاہیے اور یہ کہ منشیات کے استعمال کو ایک طبی مسئلہ سمجھنا چاہیے اور منشیات استعمال کرنے والوں کے ساتھ کسی دوسری بیماری سے متاثر ہونے والے لوگوں جیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔

بدانتظامی اور سقم

پی آئی سی سکینڈل

جنوری 2012 میں لاہور کے امراض قلب کے ایک ہسپتال میں ناقص ادویات کی وجہ سے 100 سے

ناقص ادویات کے باعث اموات کے خلاف احتجاج

زائد افراد ہلاک ہوئے۔ جنوری کے وسط میں لاہور کے نجی اور سرکاری ہسپتالوں میں پی آئی سی سے رجسٹرڈ مراض قلب کے مریضوں میں اچانک پلیٹ لیٹس اور سفید خونی خلیے کم ہونے اور جسم کے مختلف حصوں سے خون بہنے کے واقعات منظر عام پر آئے۔ شروع میں اسے 2011 کے بعد ایک دفعہ پھر ڈینگی مرض کا پھیلاؤ سمجھا گیا لیکن بہت جلد یہ محسوس کیا گیا کہ یہ علامات اس دوا کا ردعمل تھیں جو پی آئی سی نے مفت تقسیم کی تھی۔ تحقیقات سے یہ پتہ چلا کہ پی آئی سی کو ادویات کی ترسیل کرنے والی ایک کمپنی کے لائسنس کی معیاد بہت عرصہ پہلے ختم ہو چکی تھی اور اس کے باوجود اس نے سرکاری ہسپتالوں اور مارکیٹ میں ادویات کی ترسیل جاری رکھی ہوئی تھی۔ برطانوی ریگولیٹری اتھارٹی برائے ادویات و نگہداشت صحت مصنوعات کی جانب سے کیے جانے والے معائنوں سے اس بات کی نشاندہی ہوئی کہ پانچ مشتبہ ادویات میں سے ایک آئسوٹیب (Isotab) ناقص تھی۔ رپورٹ سے یہ بھی پتہ چلا کہ آئسوٹیب میں پائری میتھامین شامل تھی جو اصل میں ملیریا کے علاج میں استعمال ہوتی ہے۔ پائری میتھامین (Pyrimethamine) کی موجودگی زہر آلود ثابت ہوئی۔ ناقص دوا بنانے والی دواساز فیکٹری کو بند کر دیا گیا اور اس کے مالکان کے نام ای سی ایل میں شامل کر دیے گئے۔ پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن (پی ایم اے) نے محسوس کیا کہ ادویات کی تیاری کے دوران کوالٹی کنٹرول میں خامی دوا کے ردعمل کی وجہ سے ہونے والی ہلاکتوں کی اہم ترین وجہ تھی اور اس نے وفاقی اور صوبائی حکومتوں سے ادویات کے انضباطی طریقہ ہائے کار تشکیل دینے کا مطالبہ کیا۔

کھانسی کے شربت کا سکینڈل

نومبر اور دسمبر میں پنجاب کے حلقوں لاہور اور گوجرانوالہ میں کھانسی کا ناقص شربت پینے سے کم از کم 50

افراد (میڈیا کی خبروں کے مطابق ان میں زیادہ تعداد نشئیوں کی تھی) ہلاک ہوئے۔ پنجاب کے سیکرٹری برائے صحت کے شربت میں ایک فعال جز (Dextromethorphan) کی حد سے زیادہ مقدار کو ان اموات کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ پنجاب حکومت نے معاملے کی تحقیقات کے لیے ایک خاص کمیٹی تشکیل دی۔ ادویات کی جانچ کرنے والی لیبارٹری (ڈی ٹی ایل) کو اس بات کا پتہ چلا کہ شربت کے خام مال میں کوئی خرابی تھی۔ دوا کے نمونے برطانیہ میں ادویات اور نگہداشت صحت مصنوعات ریگولیٹری اتھارٹی کو بھیجنے کے دوران عالمی ادارہ صحت (ڈبلیو ایچ او) اس میں شامل تھا۔ عالمی ادارہ صحت نے خام مال میں ایک زہریلے مادے Levomethorphon کا سراغ لگایا جو کہ انڈیا کے ایک صنعتکار سے درآمد کیا گیا تھا اور پاکستان میں کھانسی کے شربت میں استعمال ہوتا تھا اور لاہور اور گوجرانوالہ میں اموات کا سبب بنا۔ اس سے دونوں ہمسایہ ممالک کے درمیان پہلے سے ہی غیر مستحکم تجارت کو ایک اور دھچکا لگا۔

ینگ ڈاکٹروں کی ہڑتال

ینگ ڈاکٹروں نے 2012 میں اپنی تنخواہوں اور عہدے کی ساخت میں بہتری کا تقاضہ کرنے کے لیے کئی دفعہ ہڑتال کی۔ ہڑتالوں کی وجہ سے ہسپتالوں کی ایمرجنسیز بھی بند رہیں یا ان میں عملے کی کمی تھی، جس کے باعث مریضوں کی پریشانیوں میں کئی گناہ اضافہ ہوا۔ صوبہ پنجاب اس کا سب سے زیادہ نشانہ بنا اور تمام بڑے شہروں کے ہسپتال بُری طرح متاثر ہوئے۔ جن ڈاکٹروں نے کام کرنے سے انکار کر دیا صوبائی حکومت نے انہیں گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ حکومت نے گرفتار کیے گئے ڈاکٹروں کو رہا کر کے اور دیگر کے خلاف جاری کیے گئے شوکاز نوٹس کو واپس لے کر اس تنازع کو عارضی طور پر حل کر لیا لیکن سال کے آخر میں ڈاکٹروں نے

حکومت۔ ڈاکٹروں کے مابین کشیدگی کے معاملے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی

ہڑتالوں کے ایک نئے سلسلے کا آغاز کیا جس کے باعث مریضوں کے کرب میں اضافہ ہوا۔ لاہور ہائی کورٹ نے ینگ ڈاکٹروں کو ہڑتال ختم کرنے اور اپنے کام پر واپس آنے کا حکم دیا اور حکومت کو حکم دیا کہ احتجاجی ڈاکٹروں کو ہراساں نہ کیا جائے۔ اس مسئلے کو حل کرنے میں پنجاب حکومت کی ناکامی جو یا تو نااہلی یا غیر آمادگی اور کبھی کبھار کچھ حد تک دونوں کی وجہ سے تھی، کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

مضر اثرات اور جراثیم کا حملہ

ڈینگی: 2011 کے مقابلے میں زیر جائزہ سال کے دوران ملک میں ڈینگی کے اطلاع شدہ واقعات میں اچانک کمی دیکھی گئی۔ 2011 میں ڈینگی بخار کے 31,665 واقعات منظر عام پر آئے تھے جن کی وجہ سے 347 ہلاک ہوئے اور ان میں سے 296 افراد صرف لاہور میں ہلاک ہوئے۔ سندھ میں 2011 میں 1053 واقعات اور 17 اموات منظر عام پر آئیں۔ کراچی میں 2012 میں 639 مریضوں میں ڈینگی بخار کی تشخیص ہوئی جن میں سے 2 افراد جاں بحق ہو گئے۔ میڈیا کے ذریعے اور تعلیمی اداروں، دفاتر اور مارکیٹوں میں وسیع پیمانے پر آگاہی مہم چلاتے ہوئے ڈینگی کا مقابلہ کرنے پر پنجاب حکومت خراج تحسین کی مستحق ہے۔ تمام ہسپتالوں میں ڈینگی کے مریضوں کے لیے علیحدہ ڈیسک قائم کیے گئے تھے۔ ایسے ہسپتال اور ادارے جو حفاظتی اقدامات پر عمل درآمد کرنے میں ناکام رہے اور جہاں ڈینگی لاروے پائے گئے ان کے خلاف شوکاز نوٹس جاری کیے گئے اور ایف آئی آر درج کرائی گئیں۔

پولیو

2012 میں پولیو کے تقریباً 58 واقعات منظر عام پر آئے۔ ڈبلیو ایچ او کے شعبہ ''عالمی پروگرام برائے انسداد پولیو'' کے سربراہ ڈاکٹر ایلیئس ڈرے کے مطابق پاکستان پولیو وائرس کی تیسری قسم کے مکمل خاتمے کے قریب ہے۔ ملک میں پولیو وائرس کا آخری کیس 14 اپریل 2012 کو منظر عام پر آیا تھا اور تب سے ملک کے کسی بھی حصے میں وائرس نہیں پایا گیا۔ ڈبلیو ایچ او نے انڈیا کو پہلے ہی پولیو سے متاثرہ ممالک کی فہرست سے نکال دیا ہے اور پاکستان بھی صحیح سمت میں جاتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ ڈبلیو ایچ او نے یہ بھی کہا کہ اگرچہ پاکستان میں 2012 میں پولیو کے واقعات میں 70 فیصد تک کمی ہوئی تاہم جب تک پولیو وائرس کا مکمل خاتمہ نہ کر دیا جائے، اس وقت تک ملک کے کسی حصے کو پولیو سے پاک نہیں سمجھا جا سکتا۔ 2012 میں پاکستان میں پولیو کے 58 واقعات پچھلے سال سے کافی کم ہیں جب 178 واقعات منظر پر آئے تھے۔ ڈبلیو ایچ او کے عہدیدار نے

35لاکھ سے زائد پاکستانی بچے پولیو ویکسی نیشن سے محروم رہ گئے

یہ غور کیا کہ پنجاب سے لیے گئے تمام حالیہ سیوئج نمونوں کے نتائج منفی تھےاور پشاور، گڈاپ ٹاؤن، کراچی اور حیدرآباد کے علاقوں سے حاصل کیے گئے زیادہ تر نمونے جن کے نتائج پہلے مثبت تھے، ان کے نتائج بھی اب منفی تھے۔ پاکستان کو پولیو کے خلاف جنگ میں جو بڑا چیلنج درپیش تھا وہ پولیو کے کارکنوں کے خلاف تشدد کا استعمال تھا۔ 2012 میں 5 پولیو کارکن مارے گئے جبکہ بہت سے کارکنوں کو ویکسی نیشن مہمات کے دوران جان سے مارنے کی دھمکی دی گئی اور ڈرایا دھمکایا گیا۔ پولیو کے خاتمے کی مہم کو کئی سالوں سے ویکسی نیشن کے بارے میں لوگوں میں پائے جانے والی غلط فہمی اور مذہبی تشریحات کی وجہ سے رکاوٹ کا سامنا ہے۔ یہ پروپیگنڈا بالخصوص خیبر پختونخوا اور فاٹا میں اس وقت بہت زیادہ بڑھ گیا جب ایک ڈاکٹر نے القاعدہ کے لیڈر اُسامہ بن لادن جو بعد میں ایک امریکی آپریشن میں مارے گئے، کا سراغ لگانے کے لیے ایبٹ آباد میں ایک جعلی پولیو ویکسی نیشن مہم چلائی۔ القاعدہ کے قائد کا سراغ لگانے کے لیے پولیو مہم کے ناجائز استعمال نے انتہا پسند عناصر کو موقع فراہم کیا کہ وہ پوری مہم کو سبوتاژ کرنے کے لیے ایک مخصوص واقعے کو استعمال کریں۔ پولیو مہم کی مخالفت اور پولیو کارکنوں/رضا کاروں پر حملوں کے باعث ایک بار پھر ایک بنیادی آگاہی مہم کی ضرورت کی اہمیت نمایاں ہوتی ہے۔

ٹی بی

ٹی بی بیکٹیریا سے پیدا ہونے والی ایک اچھوتی بیماری ہے جو کہ Mycobacterium tuberculosis کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو عموماً پھیپھڑوں کو متاثر کرتی ہے۔ ڈبلیو ایچ او کے مطابق ٹی بی

سے متاثرہ 22 ممالک میں پاکستان چھٹے نمبر پر ہے جو کہ بحیرہ روم کے (Mediterraneaus) ممالک میں پائے جانے والی اس بیماری کا 43 فیصد ہے۔ دستیاب شدہ کوائف کے مطابق پاکستان میں ٹی بی کی شرح 181 فی ایک لاکھ افراد، ایک سال میں اطلاع شدہ واقعات کی تعداد 150 فی ایک لاکھ افراد جبکہ کامیاب علاج کی شرح 85 فیصد ہے۔ حکومت نے قومی پروگرام برائے انسداد ٹی بی شروع کر رکھا ہے جس کے ذریعے 15 لاکھ مریضوں کا علاج کیا جا چکا ہے اور ملک بھر میں ٹی بی کی تشخیص کے 5800 مراکز قائم کیے گئے ہیں۔ اس کے باوجود پاکستان میں ہر سال ٹی بی کے 4 لاکھ 20 ہزار نئے واقعات منظر عام پر آتے ہیں جن میں سے تقریباً ستر ہزار کا تعلق سندھ سے ہے۔ سندھ کے 14 فیصد واقعات میں اموات واقع ہوئیں۔

ملیریا

ملیریا کے تقریباً سالانہ 16 لاکھ واقعات کے ساتھ پاکستان مشرقی بحیرہ روم کے گروپ 3 ممالک میں شامل ہے اور پاکستان میں ملیریا کے مرض کی شرح علاقائی سطح پر 95 فیصد ہے۔ موثر ردعمل کا فقدان، علم امراض کی تبدیلی اور طفیلیوں اور حاصل مرض کی جانب سے ادویات اور جراثیم کش دوا کی مزاحمت، پاکستان میں ملیریا کی بڑھتی ہوئی شرح کا سبب ہیں۔

ماحولیاتی خطرات جیسے جیسے سیلاب اور نکاسی آب کی خراب صورت حال، آبادی میں بے پناہ اضافہ اور بے ضابطہ شہرکاری کے باعث ملک کے شہری اور دیہی علاقوں میں ملیریا کے جراثیم کی افزائش میں اضافہ ہوا ہے۔

کینسر

پاکستان میں ہر 9 خواتین میں سے ایک بریسٹ کینسر کے خطرے سے دوچار ہے جس کے نتیجے میں ہر سال چالیس ہزار اموات واقع ہوئی ہیں۔ یہ تعداد جنوبی ایشیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ ہے۔ پاکستان میں کینسر کے مریض کی اوسط عمر 30 سے 40 سال کے درمیان ہے جو کہ عالمی معیار سے کم ہے۔ ماہرین کے مطابق اگر بریسٹ کینسر کی بروقت تشخیص ہو جائے اور اس کا باقاعدہ علاج کرایا جائے تو 90 فیصد کیسز قابل علاج ہیں۔

طبی معائنے سے جڑے ہوئے فرسودہ معاشرتی رواج اس بیماری کی بروقت تشخیص اور علاج کو روکتے ہیں۔ ملک کے چند ہسپتالوں کے علاوہ باقی سب میں علاج معالجے کی سہولیات کی کمی بھی ایک ایسا عنصر تھا جو اتنی بڑی تعداد میں اموات کا سبب بنا۔

ایچ آئی وی/ایڈز

ایچ آئی وی پاکستان میں وبائی مرض نہیں ہے لیکن متاثرہ افراد کی تعداد یقیناً بڑھ رہی ہے۔ قومی ایڈز

پروگرام کے اعداد وشمار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ 1986 سے 2012 تک 4000 واقعات منظر عام پر آئے ہیں۔ اگرچہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ اس بیماری سے منسلک احساس ندامت کی وجہ سے بہت سے واقعات منظر عام پر نہیں آتے۔

خسرہ

اقوام متحدہ کے مطابق اگرچہ پچھلے چند سالوں کے دوران دنیا بھر میں خسرے سے ہونے والی اموات میں نمایاں کمی واقع ہوئی ہے تاہم چند مخصوص علاقے بشمول پاکستان اور انڈیا اس پیش قدمی کو روک رہے ہیں۔ اقوام متحدہ نے مزید کہا کہ بیماری کے خاتمے کے لیے ویکسین کی بڑی تعداد میں فراہمی انتہائی ضروری ہے۔ 2000 سے 2011 کے درمیان دنیا بھر میں خسرے سے ہونے والی اموات کی تعداد پانچ لاکھ بیالیس ہزار سے کم ہو کے ایک لاکھ اٹھاون ہزار رہ گئی جو 70 فیصد کمی کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی عرصے کے دوران نئے واقعات بھی 58 فیصد تک کم ہو گئے۔ اگرچہ ادارے نے خبردار کیا کہ ڈبلیو ایچ او کے جاری کردہ کوائف کے مطابق اس عالمی پیش رفت کے باوجود کچھ آبادیاں اب بھی غیر محفوظ ہیں اور تقریباً 2 کروڑ بچے ویکسی نیشن سے محروم ہیں۔ ان میں سے آدھے سے زیادہ پانچ ممالک؛ پاکستان، عوامی جمہوریہ کانگو، ایتھوپیا، انڈیا اور نائجیریا میں آباد ہیں۔

پاکستان میں 2012 میں خسرے کے باعث ریکارڈ اموات واقع ہوئیں جب 2011 میں خسرے سے ہونے والی 64 اموات کے مقابلے میں 306 افراد جاں بحق ہوئے۔ سندھ میں 2011 میں خسرے سے ہونے والی 28 اموات کے مقابلے میں 210 بچے جاں بحق ہوئے۔ ڈبلیو ایچ او کے ایک ترجمان نے کہا کہ زیادہ تر متاثرہ بچے خسرے کے بعد کی پیچیدگیوں مثال کے طور پر نمونیا، خسرے کے بعد دماغ کی سوزش اور پیچش کے باعث جاں بحق ہوئے۔ مسلسل تین سال آنے والے سیلابوں کے باعث لاکھوں بچے ویکسین اور بیماریوں کی مزاحمت کرنے والی غذائیت بخش خوراک سے محروم رہ گئے۔ ترجمان نے کہا کہ سیلابوں، بے دخلی اور خوراک کی کمی نے ان اموات میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔

جائزہ

پاکستان میں شعبہ صحت میں مسلسل نج کاری کا رواج جاری ہے۔ نتیجتاً، نجی طبی نگہداشت پر انحصار میں اضافہ ہوا ہے اور یہ اب یہ طبی نگہداشت کی خدمات کے بہت بڑے حصے کا احاطہ کرتا ہے۔ نجی ہیلتھ کیئر کے دائرہ کار میں ڈاکٹر، پیشہ ور طبیب، میٹرنٹی ہوم، ڈسپنسریاں، تشخیصی لیبارٹریاں اور نفع حاصل کرنے والے

ہسپتال شامل ہیں۔نجی شعبے میں چند قدیم نوعیت کے بڑے ہسپتال بھی ہیں جوزیادہ تر بڑے شہروں میں واقع ہیں۔نجی ہیلتھ کیئر کے شعبے کی کارکردگی کی نگرانی کے لیے ایک مناسب طور سے بااختیار انضباطی طریقہ ہائے کار موجود نہیں۔ پاکستان میں لوگوں کو خدمات مہیا کرنے والے ہسپتالوں کی دو اقسام ہیں، سرکاری اور نجی۔نجی ہسپتال جہاں معیاری خدمات مہیا کرتے ہیں وہاں وہ خاصے مہنگے اور زیادہ تر لوگوں کی پہنچ سے دور ہیں۔نجی ہسپتالوں کی ایک کاروباری حکمت عملی بھی ہوتی ہے اوران کا بنیادی مقصد ایک کاروباری ادارے کے طور پر کام کرتے ہوئے آمدنی میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ دوسری طرف سرکاری ہسپتال لوگوں سے بھرے ہوئے اور مناسب سہولیات سے محروم ہیں۔سرکاری ہسپتالوں میں غیر حاضر عملے کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے کیونکہ کم تنخواہ پانے والے ڈاکٹر اپنی توجہ نجی کلینک پر مرکوز رکھتے ہیں۔ یہ سب چیزیں غریب شہریوں کے لیے مشکلات کا سبب بنتی ہیں کیونکہ انہیں ڈاکٹر سے ملاقات کے لیے گھنٹوں قطاروں میں انتظار کرنا پڑتا ہے۔

طبی تعلیم کی ضابطہ کاری

طبی تعلیم سے متعلق بنیادی چیلنج ڈاکٹروں کی تعلیمی اسناد کی تصدیق یا توثیق اور کبھی کبھار پاکستان اور بیرونی ممالک میں مطلوبہ تعلیم مہیا کرنے والے نجی اداروں کی اپنی قابلیت بھی ہوتی ہے۔دیہی علاقوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ طبی معاون خاطر خواہ تجربہ حاصل کرنے کے بعد اپنا کلینک کھول کر ڈاکٹر کا روپ دھار لیتے ہیں۔ بہت سے شہری علاقوں میں ایک چیلنج بیرونی ممالک اور زیادہ تر چائنہ اور وسطی ایشیائی ممالک سے حاصل شدہ طب کی ڈگریوں کی تصدیق اور قبولیت ہے۔اس حوالے سے شاید ایک زیادہ شفاف اور سخت معیار وضع کرنے کی ضرورت ہے۔اگر نظریاتی طور پر بات کی جائے تو انہیں یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنس (UHS) جائز قرار دیتی ہے۔اس کے باوجود ان کی نگرانی سے متعلق کافی شکوک وشبہات برقرار رہتے ہیں۔یو ایچ ایس بین الاقوامی طور پر مانی ہوئی یونیورسٹی ہے جس کے ساتھ 80 کالج اور تعلیمی ادارے وابستہ ہیں اور 35 ہزار انڈر گریجوایٹ اور 4 ہزار پوسٹ گریجوایٹ طالب علم رجسٹرڈ ہیں۔سرکاری میڈیکل کالجوں میں داخلے کا مقابلہ کافی سخت ہے اور صرف قابل ترین افراد کو ہی داخلہ ملنے کی امید ہوتی ہے۔زیادہ تر نجی میڈیکل کالجوں میں داخلے کے لیے درکار اہلیت یا معیار سرکاری شعبے کے مقابلے میں خاصا پست ہے۔ایک اور قابل اعتراض اقدام سیلف فنانس (Self-finance) سکیم ہے جو ان طالب علموں کو بھاری فیس کی ادائیگی کے بعد کامیاب ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے جو داخلے کے معیار پر پورا نہیں اترتے۔نجی میڈیکل کالجوں کو لائسنس کی فراہمی کے طریقہ کار پر نظر ثانی اور سخت معیار وضع کرنے کے لیے کئی مطالبات کئے گئے ہیں۔

عطائی طریقہ علاج

اس حوالے سے ایک انتہائی سنگین مسئلہ دیسی ادویات کے ڈاکٹر ہیں جس میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر اور حکیم وغیرہ شامل ہیں۔ زیادہ تر کیسز میں وہ مناسب تربیت کے بغیر ادویات تجویز کرنے کے علاوہ جراحی سے متعلق طریقہ کار بھی سرانجام دیتے ہیں۔ تجویز کردہ ادویات کسی بھی لیبارٹری سے تصدیق شدہ نہیں ہوتیں۔ پاکستان میں عطائیت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ان میں عطائی دندان ساز، ڈسپنسر، ڈاکٹروں کا دکھاوا کرنے والے طبی معاون، دم درود کرنے والے، ہومیو پیتھک ڈاکٹر، حکیم، جنسی امراض کے ماہر اور پہلوان شامل ہیں۔ یہ تمام لوگ طبی تعلیم سے عاری ہوتے ہیں اور اس کے باوجود بلا روک ٹوک مریضوں کا علاج جاری رکھتے ہیں۔ اینٹی بائیوٹک ادویات، جنسی ہارمون اور ٹیکوں کے غیر منصفانہ استعمال سے اکثر مریض کی صحت بُری طرح متاثر

سرِ راہ بیٹھے عطائی دندان سازوں کے ہاتھوں مریضوں کو نقصان کا سامنا

ہوتی ہے اور یہ اکثر اوقات موت کا سبب بھی بنتی ہیں۔ کم قیمت طبی سہولیات اور تعلیم کی کمی کے باعث عطائیت ایک نفع بخش منصوبے میں تبدیل ہوگئی ہے۔ یکے بعد دیگر اقتدار میں آنے والی حکومتیں ایسی غیر قانونی اور خطرناک سرگرمیوں پر قابو پانے یا انہیں کچلنے میں ناکام ہو چکی ہیں۔ پاکستان کی دندان ساز انجمن کے مطابق پاکستان میں تیرہ ہزار دندان ساز اور اتنے ہی عطائی پریکٹس کر رہے ہیں۔

معالج کا نسخہ ادویات

ایک اور متعلقہ موضوع ان ادویات کو بیچنے کے لیے معالج کے تحریری نسخہ ادویات کی شرط کی عدم موجودگی

ہے جن کے حصول کے لیے دنیا بھر میں ڈاکٹری نسخے کی شرط لازم ہے۔ تقریباً ہر قسم کی ادویات بشمول اینٹی بائیوٹک بغیر نسخے کے دستیاب ہیں۔ اس سے لوگوں کو یہ اجازت ملتی ہے کہ وہ کسی میڈیکل سٹور پر جائیں اور کسی بھی دوا کا تقاضہ کریں۔ ادویات کا غیر منصفانہ استعمال، نامناسب اور غیر نگران شدہ علاج معالجے کا سبب بنا ہے اور اس کے باعث اکثر مریض کی حالت غیر ہو جاتی ہے اور بعض اوقات یہ جان لیوا بھی ثابت ہوتا ہے۔

ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی

آئین کی اٹھارہویں ترمیم کے باعث 17 وزارتیں بشمول صحت صوبوں کی تحویل میں آ گئیں۔ اس کا مقصد لامرکزیت کے ذریعے سہولیات کو لوگوں کے قریب لانا تھا۔ ڈرگ ریگولیٹری کی عدم موجودگی کے باعث غیر معیاری اور جعلی ادویات متعدد واقعات کا سبب بنیں جن میں کئی اموات واقع ہوئیں۔ وفاقی حکومت نے صورت حال پر قابو پانے اور مستقبل کے حادثات سے بچنے کے لیے نومبر 2012 میں ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی آف پاکستان ایکٹ (DRAP) کی منظوری دی۔ اس قانون کا مقصد جعلی، غیر معیاری اور غیر اندراج شدہ ادویات کی فروخت اور ذخیرہ اندوزی کو روکنا تھا۔ یہ قانون ادویات کی تیاری، ذخیرہ اندوزی، فروخت اور تشہیر کو بھی باضابطہ بناتا ہے۔ یہ محکمہ امریکہ اور کینیڈا میں موجود اداروں کی طرز پر بنایا گیا ہے اور اس کا مقصد مریضوں، دوا ساز صنعت اور محکمے کے مفادات کا تحفظ ہے۔ یہ محکمہ ایک سی ای او کے علاوہ 13 ڈائریکٹروں پر مشتمل ہوگا جسے وفاقی حکومت مقرر کرے گی۔

ریسکیو 1122

ریسکیو 1122 سروس صوبہ پنجاب میں 2008 سے قبل شروع کی گئی تھی اور اس نے ملک کے سب سے بڑے صوبے میں مسلسل شاندار ہنگامی مدد اور ریسکیو سروس مہیا کی ہے۔ اس سروس کا انفراسٹرکچر صوبے کے تمام 36 اضلاع میں موجود ہے۔ اس کی سرکاری ویب سائٹ کے مطابق اس نے 2012 کے آخر تک 7 منٹ کے اوسط وقت میں جوابی اقدام کرتے ہوئے 17 لاکھ سے زائد لوگوں کی جان بچائی۔ ان میں چھ لاکھ بیس ہزار ٹریفک حادثات، 8 لاکھ ساٹھ ہزار سے زائد طبی حادثات، 40 ہزار آتش زدگی کے واقعات، 3 ہزار پانچ سو عمارت گرنے کے واقعات، 50 ہزار سے زائد جرائم کے واقعات، 3 ہزار پانچ سو ڈوبنے کے واقعات اور 716 دھماکے شامل ہیں۔

اس سروس کو شہری علاقوں سے باہر اور دوسرے صوبوں تک معقول حد تک پھیلانے میں ناکامی یا تو نااہلی

یا اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ صحت کی سہولت کی فراہمی میں سیاست کتنا اہم اور انقلابی کردار ادا کرتی ہے۔

سفارشات

1- شعبہ صحت کے لیے بجٹ کی تخصیص کو کل جی ڈی پی کے 2.5 فیصد تک بڑھانے کی ضرورت ہے۔

2- نظام کو متاثر کرنے والے مسائل کو حل کرنے کے لیے شعبہ صحت میں اختیارات کی لامرکزیت اور سیاسی عمل دخل سے آزادی نہایت ضروری ہے۔ حفاظتی ٹیکوں کے پروگراموں، پینے کے صاف پانی کی فراہمی اور نکاسی آب کے نظام پر توجہ دینے کے علاوہ بنیادی نگہداشت صحت کو بھی ترجیح دی جانی چاہیے۔

3- لیڈی ہیلتھ ورکرز کو تحفظ اور ایک محفوظ ماحول فراہم کیا جائے تاکہ وہ حفاظتی ٹیکوں کی مہمات کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں اور آبادی منصوبہ بندی کے متعلق آگاہی پیدا کر سکیں۔

4- جعلی، غیر معیاری اور غیر اندراج شدہ ادویات کے استعمال کے باعث ہونے والے حادثات سے بچنے کے لیے ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی کو محتاط طریقے سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

5- صحت سے متعلق ہزار سالہ ترقیاتی اہداف بشمول ماں، ایک ماہ کے بچوں، شیر خوار بچوں اور بچوں کی اموات کی روک تھام، کو حاصل کرنے کے لیے حکمت عملی وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ خواتین کے تولیدی حقوق کو یقینی بنایا جائے۔

6- صحت سے متعلق تعلیم اور ایک معقول ڈرگ پالیسی اور قیمتوں کے یکساں معیار کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔

7- عطائی طریقہ علاج کے انسداد اور متبادل نباتاتی ادویات کی پریکٹس کے لیے لائسنس جاری کرنے کے طریقہ کار اور پالیسی کو فوری طور پر واضح کرنے کی ضرورت ہے۔

رہائشی سہولیات[Housing]

ریاست، جنس، ذات، رنگ اور نسل سے بالاتر ہو کر معیار زندگی بہتر کر کے، عوام کی فلاح و بہبود کو یقینی بنائے گی۔۔۔

آ ئین پاکستان[آرٹیکل نمبر- (a) 38]

ہر شخص ایک معقول معیار زندگی کا حق رکھتا ہے۔ جو اس کے خاندان کی صحت اور فلاح اور بہبود کی ضمانت فراہم کر سکے۔۔۔جس میں رہائش کی سہولتیں بھی شامل ہیں۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور[آرٹیکل نمبر-(1)25]

موجودہ میثاق کی توثیق کرنے والے تمام رکن ممالک ہر شہری کے اپنے اور اپنے خاندان کے لئے معقول معیار زندگی.....بشمول مناسب خوراک، لباس اور ہاؤسنگ کے حق کو تسلیم کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی حالات زندگی میں مسلسل بہتری لانے کے اس کے حق کو بھی تسلیم کرتے ہیں......

معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق کے بارے میں بین الاقوامی[میثاق آرٹیکل(1) 11]

سال 2012 میں مناسب رہائش کے حق کے مسائل زیادہ تر جوں کے توں برقرار رہے، جبکہ ملک بھر میں تقریباً اسی لاکھ گھروں کی کمی تھی۔ عالمی بینک کے اندازوں کے مطابق اس کمی کو پورا کرنے کے لیے منظّم کوششیں ناپید تھیں۔ نجی اداروں کی طرف سے نئی رہائشی سکیموں کے قیام کا رجحان زیادہ تر بڑے شہروں کی حدود میں جاری رہا جبکہ بڑے شہری علاقوں سے باہر رہنے والوں کی رہائشی ضروریات کو بڑے پیمانے پر نظر انداز کیا گیا۔ حکام کی جانب سے کیئے جانے والے نہایت معمولی اقدامات سے اس بات کی نشاندہی ہوتی تھی کہ رہائش کی کمی پر قابو پانا حکومت کی ترجیح نہیں تھی۔ ایک قابل اعتبار ڈیٹا کی کمی کی وجہ سے بھی پاکستان میں رہائش سے متعلق مسائل میں اضافہ ہوا۔ پچھلی مردم شماری جو کہ چودہ سال پہلے کی گئی تھی، سے حاصل شدہ ڈیٹا کا حوالہ دیا جاتا رہا۔ نئی مردم شماری سے یہ بڑی حد تک پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ رہائش کی کمی پہلے سے موجود اعداد وشمار کی نسبت زیادہ شدید ہوگئی ہے۔ مردم شماری تقریباً چار سال پہلے ہونی تھی لیکن ماضی کی روش کو دیکھتے

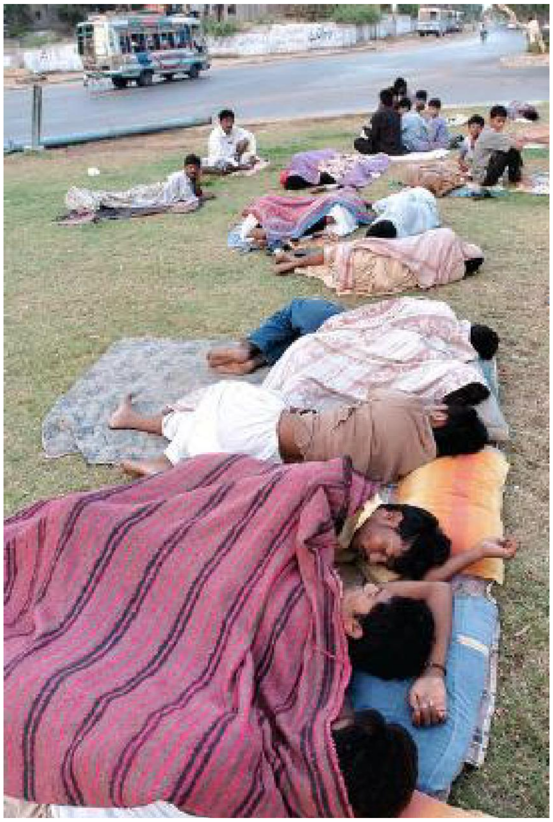

بے گھر افراد سڑک کنارے سوئے ہوئے ہیں

ہوئے اس بات کی امید کی جا رہی تھی کہ یہ عمل مزید تاخیر کا شکار ہوگا۔ ماہرین نے پچھلی مردم شماری سے حاصل کیے گئے کوائف کی ساخت کے متعلق بھی سوالات اٹھائے ہیں کیونکہ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ ان تخمینوں کے پیچھے سیاسی مقاصد تھے۔ غلط اعداد وشمار پیش کرنے کے فوائد میں مقنّنہ میں بہتر نمائندگی اور سوال کیے گئے علاقے کے بجٹ سے متعلق وسائل کی بڑے پیمانے پر تحصیص شامل ہیں۔ معقول رہائش کا حق انسانی حقوق کے بنیادی حق میں سے ایک ہے جن کا پوری دنیا کے شہریوں سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کا وعدہ نہ صرف انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے بلکہ پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 38 (ڈی) میں بھی کیا گیا ہے۔

تدریسی، سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے ایک تحقیقی اور مشاورتی ادارے "Collective for social science research کے مطابق رہائشی تحفظ کثیر پہلوؤں کا حامل تصور ہے۔ ایک دوسرا پہلوان لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے میں مشکلات ہیں جو روایتی طور پر مستقل رہائش اختیار نہیں کرتے اور وہ خود کو کسی مستقل ٹھکانے کے ساتھ منسوب نہیں کرنا چاہتے۔ پاکستان میں غیر مستقل رہائش رکھنے والے افراد تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے بہت کم کام کیا گیا ہے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ پاکستان میں خانہ بدوشوں، نیم خانہ بدوشوں یا موسمی تبدیلی کے باعث رہائش تبدیل کرنے والے افراد کی ایک بڑی تعداد موجود تھی لیکن ان کے سماجی تحفظ اور شہریت سے متعلق حقوق کو اس حقیقت کے تحت حذف کیا گیا کہ وہ مستقل رہائش نہیں رکھتے۔ چنانچہ فرد کی شناخت کا تعین اس کی مستقل رہائش سے کیا جاتا ہے۔ پاکستان نے خود ملک کی سابقہ مردم شماری

میں ہمیشہ پہلے گھروں کی تعداد کو گنا اور پھر ان کوائف کو آبادی کا تخمینہ لگانے کے لیے استعمال کیا۔ ملک میں سیلابوں اور مسلح تنازعات کی وجہ سے پیدا ہونے والے بے گھر افراد کے بحران کے بعد یہ مسئلہ اور بھی زیادہ شدت اختیار کر گیا ہے۔

رہائشی تحفظ کے متعلق گفتگو کرنے کے دوران جو نازک مسئلہ قابل توجہ ہے وہ جائیداد اور مزارعات کے تحفظ کا حق ہے۔ پاکستان جعلی سکیموں اور تجاوزات جیسے مسائل کا شکار رہا ہے۔ لوگ جبری بے دخلیوں کی وجہ سے عدم تحفظ کا شکار رہے ہیں۔ بہت سی کچی آبادیوں اور بے قاعدہ بستیوں کو پیشگی نوٹس کے بغیر مسمار کر دیا گیا اور ان کے مکینوں کو بے دخل کر دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جنہیں نوٹس جاری کئے گئے ان کے لیے متبادل رہائش کا بندوبست نہیں کیا گیا۔

آخر میں رہائشی تحفظ، کم قیمت رہائش تک رسائی کے لیے معاشرتی اور ادارتی بندوبست کا تقاضہ کرتا ہے۔

بہت سی کم قیمت رہائشی سکیموں کا اعلان کیا گیا اور گھروں کی تعمیر کے لیے قرضے فراہم کرنے کے لیے ادارے موجود تھے لیکن ان کا حصول محدود تھا۔

ایک اور مسئلہ جو سال 2012 میں جاری رہا وہ مالکان پر دباؤ ڈال کر انہیں اپنی زمین رہائشی سکیموں کو بیچنے پر مجبور کرنا تھا۔ چند واقعات میں نئی رہائشی سکیم کے لیے جگہ حاصل کرنے کے لیے پورے گاؤں کو کسی اور جگہ منتقل ہونے پر مجبور کیا گیا اور جب گاؤں والوں نے اس سے انکار کیا تو دیہاتوں اور نئی رہائشی سکیموں کے بیچ میں چار دیواریاں تعمیر کر دی گئیں جس کی وجہ سے دیہات محصور ہو کر رہ گئے اور ان کی نقل و حرکت کافی حد تک محدود ہو کر رہ گئی۔ پنجاب کچی آبادی ایکٹ کے تحت کچی آبادیوں کو قانونی حیثیت دینے سے متعلق بہت سے وعدے کئے گئے لیکن کسی پیش رفت کے بغیر مقررہ تاریخوں کی حد میں اضافہ کیا جاتا رہا۔ فضلے کے نامناسب انتظام کی ذمہ داری بے جا طور پر غیر

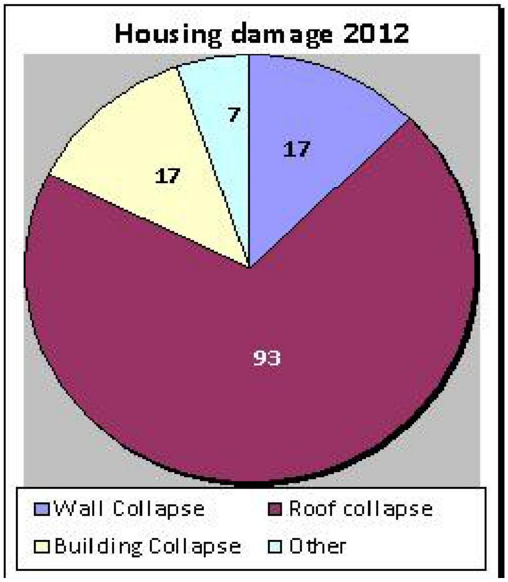

شکل نمبر 1.1

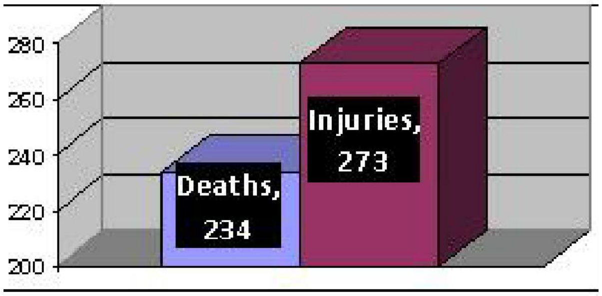

شکل نمبر 1.2

قانونی آبادیوں پر ڈال دی گئی جبکہ اس بات کا پتہ چلا تھا کہ رہائشی سکیمیں زہریلے مادوں کے قریبی دریاؤں اور نہروں میں شامل ہونے کی سب سے زیادہ ذمہ دار تھیں۔ سڑکوں اور پھر رہائشی سکیموں کو جگہ دینے یا متعدد غیر قانونی تجاوزات کو ختم کرنے کی غرض سے کچی آبادیوں کو مسمار کیا گیا۔ کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے مئی میں اسلام آباد کی کچی آبادی میں متعدد گھروں اور ڈھانچہ جات کو مسمار کیا۔ ملک میں گھروں اور عمارتوں کا معیار ناقص رہا اور 2012 میں بہت سے گھر زمین بوس ہوگئے جن میں قیمتیں جانیں ضائع ہوئیں۔ گراف نمبر 1.1 ان گھروں، فیکٹریوں اور تجارتی عمارتوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو پچھلے سال کے دوران مختلف وجوہات کی بنا پر زمین بوس ہوگئے تھے۔

گراف نمبر 1.2 میں 2012 پورے گھروں یا ان کی دیواروں اور چھتوں تلے دب کر جاں بحق ہونے والے افراد کی تعداد دکھائی گئی ہے۔

کم خرچ رہائش

کم خرچ رہائش اور قرعہ اندازی کے ذریعے پلاٹوں کی تقسیم بے گھر لوگوں معاونت فراہم کرنے اور ملک میں رہائش کی کمی کو پورا کرنے کے نمایاں طریقے ہیں، تاہم پاکستان میں رہائش کی صورتحال کو دیکھتے ہوئے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ایک مستقل اور جامع پروگرام کی ضرورت تھی۔ عام انتخابات کے نزدیک کئے گئے نیم دلانہ اقدامات جو کہ بہت سے قانونی مسائل کا شکار ہیں نے دیرینہ مسائل کو حل کرنے میں نہایت معمولی کردار ادا کیا۔

مختلف ماہرین اور سکالرز نے اس بات کی نشاندہی کی تھی کہ مطلوبہ رہائشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے زمین یا سرمائے کی کمی نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت کے پاس کوئی غربت دوست پالیسی نہیں تھی۔ ایک نامور ماہر تعمیرات اور سماجی محقق نے اپنے ایک مضمون ماحول اور شہر کاری 2005 میں لکھا ہے کہ متوسط اور اعلیٰ طبقوں کو عالی شان گھر فراہم کرنے پر زیادہ توجہ دی گئی۔ پچھلے سال متعدد پوش رہائشی سکیموں کی بنیاد رکھی گئی

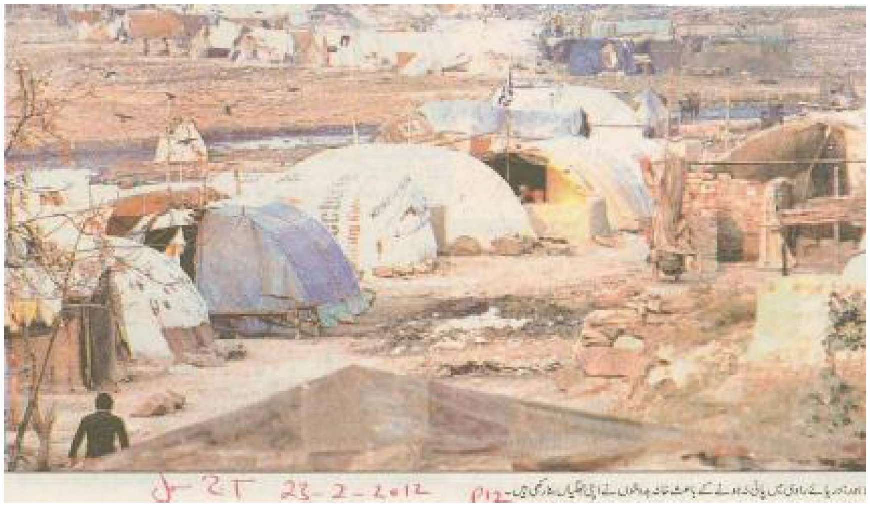

دریا کی گود میں جھونپڑیاں: راوی

جبکہ وہ لوگ جو ریاست کی مدد کے بغیر گھر خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے ان کے لیے زمین مختص کرنے کے لیے بہت کام کیا گیا۔

گزشتہ چند سالوں میں پاکستان کے چند علاقوں میں کم قیمت رہائشی سکیموں کی بنیاد رکھی گئی۔ سال 2012 میں وزیر اعلیٰ کی جناح آبادی سکیم کے تحت پنجاب کے اضلاع پاکپتن، راولپنڈی، ملتان اور حافظ آباد کے بے گھر افراد میں بذریعہ قرعہ اندازی 5,487 پلاٹ تقسیم کئے گئے۔

اگرچہ شروع کے چند سالوں میں کئے گئے زیادہ تر وعدوں کو پورا نہیں کیا گیا۔ پنجاب حکومت کی جانب سے شروع کی گئی انتہائی تشہیر یافتہ آشیانہ ہاؤسنگ سکیم میں بھی بہت سی خامیاں پائی گئیں۔ سپریم کورٹ نے سکیم کے لیے مختص کی گئی زمین کو غیر قانونی قرار دیا اور اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ پنجاب املاک کے آرڈیننس 1979 کی شرائط کے تحت زمین کی منتقلی غیر قانونی تھی، ایک حکم امتناعی جاری کیا۔ اس قانون کے سیکشن نمبر 17 کے مطابق ''ایک وقف اراضی کو صرف اس مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے جس کے لیے اسے وقف کیا گیا ہے یا جس کے لیے استعمال کیا جا تا رہا ہے، یا کسی ایسے مقصد کے لیے جسے اسلام نے مذہبی، نیک اور خیراتی قرار دیا ہو''۔ آشیانہ ہاؤسنگ سکیم پنجاب کے دوسرے شہروں مثلاً فیصل آباد، ساہیوال اور سرگودھا میں بھی شروع کی گئی۔ ایک کم قیمت سستی بستی جس کی کافی سال پہلے کراچی میں بنیاد رکھی گئی تھی، کا بھی وہی حال ہوا جو دیگر ان سکیموں کا ہوا تھا جن کا وعدہ کیا گیا تھا۔ سندھ کچی آبادی اتھارٹی پچھلے تقریباً دس سال سے یہ کہہ رہی ہے کہ سستی بستی تعمیر کرنے کے لیے حکومت کی جانب سے سرمایے کی فراہمی کی بجائے سکیم کے

لیے محض زمین کی تخصیص کی ضرورت ہے اور کام کا آغاز ہوجائے گا۔ اگر یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا تو غریب لوگوں کو تقریباً تین ہزار گھروں کے ساتھ بنیادی سہولیات بشمول تعلیمی اور صحت کی سہولیات بھی حاصل ہوتیں۔

اراضی سے متعلقہ معاملات میں بدعنوانیوں کے واقعات

پاکستان میں زمین کے مالکانہ حقوق کی تقسیم انتہائی غیر متوازی رہی ہے میڈیا رپورٹس کے مطابق ملک میں 67 فیصد خاندانوں کے پاس اپنی زمین نہیں تھی جبکہ زمین مالکان میں سے پانچ فیصد افراد ملک کی کل زرعی اراضی کے 64 فیصد حصے کے مالک تھے۔ معاشی عدم مساوات، تعمیری اور زمینی لاگت کی وجہ سے یہ مسئلہ اور سنگین ہوگیا۔ نجی رہائشی سکیموں کی جانب سے اپنی ملکیت سے زائد زمین فروخت کرنا معمولی بات تھی اور ایسے واقعات کی اطلاعات موصول ہوئی ہیں کہ ایک پلاٹ دس مختلف افراد کو فروخت کیا گیا۔ پراپرٹی ڈیلروں اور رہائشی سکیموں کے کھرے پن اور تصدیق ناموں کی جانچ کے موثر طریقے کی عدم موجودگی کے باعث بہت سے لوگ وسیع پیمانے پر ہونے والی دھوکہ دہی کا شکار ہوئے۔ فروری میں اسلام آباد میں سی ڈی اے کے اربوں روپوں کے بدعنوانیوں میں ملوث ہونے کی اطلاعات موصول ہوئیں۔ سی ڈی اے مزدور یونین اور سی ڈی اے ایمپلائز فیڈریشن نے اعلیٰ افسروں میں آئی ایٹ سیکٹر میں غیر قانونی طور پر دوسو سے زائد پلاٹ تقسیم کئے جانے کے خلاف احتجاج کیا۔ قرعہ اندازی صرف اعلیٰ افسروں کے مابین کرائی گئی جو کہ نہ صرف سپریم کورٹ بلکہ اسلام آباد ہائی کورٹ کے احکامات کی بھی خلاف ورزی ہے۔ جب سی ڈی کے چیئر مین نے

گوٹھ صاحب داد کے رہائشی لینڈ مافیا کے خلاف نعرے لگا رہے ہیں

 مظاہرین کو یقین دلایا کہ پلاٹوں کی تخصیص منسوخ کر دی جائے گی تو احتجاج ختم کر دیا گیا۔

رہائشی سکیموں کے اندر اور باہر، مثال کے طور پر پارکوں اور سڑکوں پر سرکاری زمین پر قائم تجاوزات پاکستان کے تمام شہروں کا عام مسئلہ ہے۔ ان کا شہری ڈھانچے پر منفی اثر پڑا۔ 2011 کے آخر میں ملک کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ نے پاکستان ریلوے کو قبضہ گروپوں سے اپنی زمین واپس لینے کا حکم دیا۔ پاکستان ریلوے کی تقریباً چار ہزار ایکڑ اراضی دیگر سرکاری محکموں، رہائشی سکیموں اور تجارتی علاقوں کے غیر قانونی قبضے میں تھی۔ سپریم کورٹ نے اراضی واپس لینے کے حوالے سے کاہلی کا مظاہرہ کرنے پر پاکستان ریلوے کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ پاکستان ریلوے کی مالی بدحالی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات یقینی تھی کہ اراضی واپس لینے اور اسے فروخت کرنے یا لیز پر دینے سے ادارے کے وسائل میں اضافہ ہوگا جس کی اشد ضرورت تھی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پاکستان ریلوے کی ایک ہزار انسٹھ (1,059) ایکڑ اراضی فوج کے قبضے میں تھی جبکہ 496 ایکڑ پر رینجرز کا قبضہ تھا۔ جب جنوری 2012 کے شروع میں اراضی واپس لینے کے عمل کا آغاز کیا گیا تو حکومت کو صرف جھگیوں اور کچی آبادیوں کے خلاف اقدامات کرنے اور بااثر لوگوں کو بے دخل کرنے کے لیے سنجیدہ اقدامات نہ کرنے پر کڑی تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

اقامت کاری کے لیے سرمایے کی ضرورت

جہاں پاکستان میں صرف چند لوگ ہی اپنے اپنے ذاتی سرمایے سے گھر خریدنے یا تعمیر کرنے کی استطاعت رکھتے تھے، وہاں لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے مستقل رہائش کے حصول کے لیے اپنے خاندان دوستوں یا مالیاتی اداروں سے حاصل کردہ ادھار کی رقم پر یہ انحصار کیا۔ تعمیراتی سامان کی بڑھتی ہوئی قیمت نے متوسط آمدنی رکھنے والے خاندانوں کی بیرونی امداد کی فراہمی کے بغیر اپنے گھر تعمیر کرنے کی صلاحیت کو مزید متاثر کیا سیمنٹ، لوہے، اینٹوں اور پٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں تیزی سے اضافے نے مجموعی لاگت کے بڑھنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ پاکستان میں متعدد بنک اور مخصوص ادارے، مثال کے طور پر سرکاری ادارہ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن وغیرہ موجود تھے جنہوں نے ماضی میں گھر تعمیر کرنے کے لیے قرضے فراہم کئے تھے۔ اگرچہ ماضی قریب میں بہت سے ملک اور ادارے غریبوں کے لیے قرضوں کا دائرہ وسیع کرنے میں تذبذب کا شکار ہو گئے ہیں۔ قرضے وصول کرنے کے عمل میں ان اطلاعات کے باعث مشکل پیش آئی کہ تعمیری لاگت میں اضافے نے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے قرضوں کی واپسی کو مشکل بنا دیا تھا۔ گھروں کی تعمیر کے لیے قرض کے طلب گار زیادہ تر لوگوں کے لیے ضمانت کی کمی یا عدم موجودگی بھی ایک مسئلہ تھا۔

غیر قانونی تعمیرات

کسی بھی شہر میں تعمیر کردہ نئے ڈھانچے کی متعلقہ حکومتی ادارے کے منظور کردہ منصوبے کے موافق ہونے کی توقع تھی۔ جیسے ہی منصوبہ منظور ہو جاتا اور این او سی کے اجراء کے بعد تعمیر شروع ہو جاتی تو تعمیرات سے متعلق قوانین سے مطابقت کو یقینی بنانے کے لیے متعلقہ محکمے کے اس جگہ کا دورہ کرنے کی توقع تھی۔ جب کہ عملی طور پر بہت سی رہائشی اور تجارتی عمارتوں کے لیے یا تو این او سی کا انتظار نہیں کیا گیا یا منصوبے کی منظوری حاصل نہیں کی اور پھر اسے بالکل نظرانداز کر دیا۔ غیر قانونی تعمیرات کے خلاف کارروائی شروع کرنے کے لیے بار بار احکامات جاری کئے گئے لیکن صرف غریب لوگوں کی بے ضابطہ آبادیوں اور کچی آبادیوں کو ہی نشانہ بنایا گیا۔ ایل ڈی اے نے لاہور کے علاقے گڑھی شاہو میں مسیحی برادری کے زیر ملکیت دو ایکڑ اراضی جس کی مالیت اربوں روپے تھی اپنے قبضے میں لے لی۔ ایل ڈی اے نے علاقے میں موجود عمارتوں بشمول ایک خانقاہ، ایک لڑکیوں کے سکول اور نجی رہائش گاہوں کو مسمار کر دیا۔ یہ علاقہ جو کہ گوشہ امن کے نام سے جانا جاتا تھا اور اس کے کا نظام کیتھولک چرچ کے ایک بورڈ کے ذریعے چلایا جاتا تھا، اس بورڈ کا یہ دعویٰ تھا کہ چونکہ حکومتی اداروں کے پاس اپنے اس دعوے کہ یہ اراضی حکومت پنجاب کی ملکیت ہے کوئی توثیق کے لیے قانونی دستاویزات موجود نہیں، اس لیے مسماری غیر قانونی ہے۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ حکومت علاقہ مکینوں کو پیشگی اطلاع دینے میں بھی ناکام رہی۔ 2012 کے آخر تک بے دخل کئے گئے مکینوں کو کسی قسم کا معاوضہ ادا نہیں کیا گیا تھا۔

راولپنڈی: علاقہ مریڑ حسین میں پاکستان ریلوے کی اراضی پر تجاوزات کے خلاف آپریشن کا منظر

تاریخی مقامات کی حفاظت کو پس پشت ڈال دیا گیا کیونکہ غیر قانونی تجاوزات بلا روک ٹوک قائم رہیں۔ایک مثال ملک ایاز کے مقبرے کی ہے جو ایک غلام تھا اور محمود غزنوی کی فوج میں جنرل بنا۔لاہور میں قائم یہ مقبرہ تقریباً چاروں طرف سے غیر قانونی تعمیرات سے گھرا ہوا تھا۔راولپنڈی کے علاقے پرانا قلعہ میں متعدد قدیم عمارتیں بشمول سات تاریخی بازار ایسی خستہ حالت میں پائے گئے کہ حکام نے 2012 میں انہیں خطرناک قرار دیا۔مقامی تاجروں، سول سوسائٹی اور تاریخ میں دلچسپی رکھنے والوں کی جانب سے تاریخی عمارتوں کی حفاظت کے لیے بار بار کئے گئے مطالبات کو رد کر دیا گیا۔دوسرے علاقوں میں سینکڑوں مساجد قانون کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے غیر قانونی طور پر قبضہ کی گئی اراضی پر تعمیر کی گئی تھیں۔مساجد کے تعمیر کئے جانے کے بعد ان کے خلاف کارروائی کرنا انتہائی مشکل تھا کیونکہ قابضین لوگوں کے مذہبی جذبات کا سہارا لے رہے تھے۔کیپیٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (سی ڈی اے) کے مطابق 2012 میں صرف اسلام آباد میں چالیس غیر قانونی مساجد تعمیر کئے جانے کی اطلاعات موصول ہوئیں جبکہ پنجاب کے جنوبی حصے ملتان میں ایک میڈیا رپورٹ میں غیر قانونی مساجد کی تعداد پینتالیس بتائی گئی تھی۔

اگرچہ اعلیٰ عدلیہ نے چند برس پہلے غیر قانونی بلند و بالا عمارتوں کے خلاف مقدمات کی سماعت کی تھی پھر بھی عمارتوں میں حفاظتی تدابیر کے فقدان اور عمارتوں سے متعلق قوانین کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے یہ سب پاکستان میں پریشانی کا باعث بنے رہے۔بلند عمارتوں اور فیکٹریوں خاص طور پر وہ جو رہائشی علاقوں کے بیچ میں واقع ہیں، نے علاقہ مکینوں کو شدید خوف سے دوچار کئے رکھا۔مارچ میں سپریم کورٹ کے دو رکنی بینچ نے غیر قانونی کثیر منزلہ عمارتوں کے خلاف ریمارکس دیئے اور ان عمارتوں کے مالکان کو اراضی کی قیمت اور احاطہ کئے گئے علاقے کی تفصیلات جمع کرانے کو کہا۔اگرچہ بلند و بالا عمارتیں بڑے شہروں میں زمین کی کمی کے مسئلے کا خاتمہ کرتی ہیں لیکن ہنگامی امداد اور باقاعدہ انخلاء کی عدم موجودگی میں آگ لگنے کی صورت میں یہ عمارتیں موت کے پھندوں میں تبدیل ہو سکتی ہیں جیسا کہ زیر تبصرہ سال میں کراچی میں ایک تین منزلہ فیکٹری میں ہوا۔یہ دیکھتے ہوئے کہ پاکستان کے سب سے بڑے شہر میں آگ بجھانے والوں کو آگ بجھانے میں تین دن لگے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ بلدیاتی ادارے دوسرے گنجان شہروں میں موجود لاتعداد کثیر منزلہ عمارتوں میں آگ پر قابو پانے میں کتنی بُری طرح لیس ہیں۔(باب ''مزدوری'' بھی دیکھیے)

رہائشی علاقوں کے کاروباری استعمال نے بنیادی ڈھانچے پر غیر متوقع دباؤ ڈالتے ہوئے تمام شہروں کو متاثر کیا۔غیر قانونی تجارتی سرگرمی بشمول پلازوں، سکولوں اور ہسپتالوں نے بھی ٹریفک میں اضافے، شور کی آلودگی اور عدم تحفظ کا سبب بنتے ہوئے رہائشیوں پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔

 شہروں میں زمین ہتھیانے کی سرگرمی پارکوں، شہری سہولیات کے لیے مختص زمین اور قبرستانوں تک بھی پھیل گئی۔ جب شہروں نے رہائشیوں کے لیے گنجائش پیدا کرنے اور بنیادی ڈھانچے بشمول سڑکوں کی وسعت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی تو درخت جو کہ شہروں کو سرسبز وشاداب بناتے ہیں اور وہ آنکھوں کے لیے نہایت فرحت بخش ہیں اور جن کے ماحول پر نہایت خوشگوار اثرات مرتب ہو سکتے تھے انہیں غیر ضروری سمجھا گیا۔

جھگیاں / کچی آبادیاں

بڑے شہروں میں رہنے والے پاکستانیوں کی اکثریت آبادی کچی آبادیوں میں قیام پذیر تھی۔ دیہی علاقوں سے شہروں میں نقل مکانی میں اضافے اور رہائشی علاقوں کی گنجائش میں اضافہ نہ کرنے کی وجہ سے اپنی گنجائش سے زیادہ آبادی والے شہر لوگوں کے اتنے بڑے بہاؤ کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ ان مہاجروں اور غیر مراعات یافتہ افراد کو غیر معیاری علاقوں جن میں بنیادی سہولیات تقریباً ناپید تھیں، میں رہائش پذیر ہونے پر مجبور کیا گیا۔ ان میں سے بہت سے لوگ صرف شہر کے کناروں پر آباد جھگیوں میں رہنے کی استطاعت رکھتے تھے اور جہاں انہیں حکام کی طرف سے ہراساں بھی کیا جاتا تھا۔ کچھ جھگیاں کئی دہائیوں سے موجود تھیں لیکن رہائشیوں کو زمین، جسے وہ اپنے گھر کہتے تھے، کا حق نہیں دیا گیا۔ انتخابات کے انعقاد نے جھگیوں میں رہنے والوں کو بہت امید دلائی تھی کیونکہ ماضی میں انتخابات کے بعد منتخب ہونے والی حکومتیں ووٹ حاصل کرنے کے لیے کچی آبادیوں کو باضابطہ کرنے میں مشہور تھیں۔ باضابطہ بنانے سے عام طور پر بے دخلی سے تحفظ، بنیادی سہولیات کی فراہمی اور پینے کے صاف پانی اور نکاسی آب کے نظام جیسی سہولیات حاصل ہوتی ہیں۔ اگرچہ جھگیوں میں رہنے والوں کو زمین جس پر وہ رہتے تھے کے مالکانہ حقوق دیے جانے کے بعد بھی وہاں دوسرے شہری علاقوں جیسے انفراسٹرکچر کی تعمیر نو کے لیے بہت کم کوششیں کی گئیں۔ کم از کم پینسٹھ جھگی نما آبادیاں جو کہ لاہور میں پچھلی دو دہائیوں یا اس سے زائد عرصے سے موجود تھیں وہ 2012 کے آخر تک باضابطہ بنائے جانے کی منتظر تھیں۔ پنجاب کی کچی آبادی کے ڈائریکٹوریٹ نے ان آبادیوں کی باضابطگی کے لیے تقریباً پانچ سال پہلے لاہور کی شہری ضلعی حکومت سے وصولیات کے متعلق ریکارڈ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن دس یاد دہانیوں کے باوجود کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

زمین ہتھیانے والی مافیا کی جانب سے بے گھر لوگوں کو اس زمین جس پر وہ نظر رکھے ہوئے تھے، پر جھگیاں تعمیر کرنے کے لیے معاوضہ دینے کے واقعات بھی اکثر اوقات منظر عام پر آئے۔ اس کے بعد قبضہ گیر جھگیوں کے رہائشیوں کو باضابطگی کے لیے تحریک شروع کرنے پر اکساتے تھے۔ جیسے ہی جھگیوں والے علاقے

آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کو بنیادی انفراسٹرکچر کی عدم دستیابی کا سامنا ہے

کو باضابطہ بنادیا جاتا تو رہائشیوں کو زمین خالی کرنے کے لیے پیسے دے دیے جاتے۔

کچی آبادیوں کا تعلق اکثر جرائم، حفظان صحت کی کمی اور نکاسی آب کے نظام کی کمی کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ان الزامات کے پیچھے بہرحال کسی قسم کی تحقیق نہیں ہے۔ایک میڈیا رپورٹ نے اس بات کی نشاندہی کی کہ کیسے لاہور کی نام نہاد منصوبہ بند رہائشی سکیمیں اپنے گندے نالوں کا پانی شہر کی نہر میں ڈال رہی تھیں۔ پاکستان کونسل برائے سائنسی و صنعتی تحقیق کے مطابق لاہور کی بارہ سکیموں سے اخراج شدہ گندے پانی کی Biological oxygen demand کی سطح منظور کردہ سطح سے چار ہزار گنا زیادہ تھی۔دوسری پوش سکیموں مثال کے طور پر ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کے ای ایم ای فیز سے گندے پانی کا اخراج سال بھر جاری رہا۔

ایسی گرمیوں سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ متعلقہ انضباطی اداروں نے منظور شدہ رہائشی سکیموں کے نکاسی آب کے منصوبوں پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔

فروری میں سی ڈی اے نے اسلام آباد کی بے ضابطہ بستیوں میں کوڑے کرکٹ اوراس کے اثرات کے بارے میں شعور اجاگر کرنے کے لیے ایک مہم کا آغاز کیا۔صفائی کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے بروشرز، پمفلٹ اور کتابچے تقسیم کیے گئے۔

اسلام آباد کی کچی آبادیوں میں رہنے والے آٹھ ہزار افراد کو ترقی کے نام پر بغیر کوئی معاوضہ ادا کیے اپنے گھر چھوڑنے کا حکم دیا گیا۔دسمبر میں قومی اسمبلی نے اسلام آباد کے I-11 سیکٹر میں تمام کچی آبادیوں کے خاتمے کے لیے سی ڈی اے کو جنوری 2013 تک کی مہلت دی۔سی ڈی اے کے ایک رکن نے یہ تجویز پیش کی کہ

علاقے کی کچی آبادیوں کے آٹھ سو چونسٹھ خاندانوں کو جگہ خالی کرنے کے لیے دس دن کی مہلت دینی چاہیے۔ بے دخل کیے گئے افراد کے لیے کسی قسم کے معاوضے یا متبادل رہائش کا اعلان نہیں کیا گیا تھا۔

پاکستان ریلوے کی تجاوزات کے خاتمے کی مہم جو کہ جنوری میں شروع ہوئی، کی وجہ سے بہت سے خاندانوں کو کسی معاوضے یا پیشگی اطلاع کے بغیر ان کے گھروں سے بے دخل کر دیا گیا۔ فروری میں لاہور میں مظاہرین نے خود کو بے دخل کیے جانے پر مزاحمت کی جس سے تجاوزات کے خاتمے کی مہم میں خلل پیدا ہوا۔ دو مظاہرین بُری طرح زخمی ہوئے۔ بہت سے خاندانوں نے اصرار کیا کہ یہ زمین ان کی ملکیت ہے کیونکہ انہوں نے اس کے لیے پاکستان ریلوے کو ایک معقول رقم ادا کی تھی، لہٰذا انہیں اپنی زمین سے بے دخل نہ کیا جائے۔ اگست میں اسلام آباد کے قریبی گاؤں مہر آبادی کے مسیحی رہائشی اس وقت اپنا گھر بار چھوڑ کر چلے گئے جب ایک عیسائی لڑکی رمشا مسیح پر قرآن کی بے حرمتی کا الزام عائد کیا گیا۔ انہوں نے اپنی زندگیوں کو خطرے میں محسوس کیا اور وہ وفاقی دارالحکومت میں کھلے علاقے میں اس وقت تک مقیم رہے جب تک انہیں اس بات کا یقین نہیں ہو گیا کہ ان کے اپنے گھروں کو لوٹنے میں کوئی خطرہ نہیں۔

اگرچہ جب علاقہ مکینوں نے ان کے خلاف شکایت درج کرائی تو سی ڈی نے انہیں وہاں تین ماہ سے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ کچی آبادیاں قدرتی آفات مثال کے طور پر آگ اور بارش اور سیلاب کی وجہ سے تباہی کی زد میں ہیں۔ یہ بستیاں ایک تنگ جگہ میں ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے رہائشی جھونپڑیوں جنہیں اکثر واٹر پروف بنانے کی غرض سے پلاسٹک سے ڈھانپا جاتا ہے کے قریب آگ جلا کے کھانا پکانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ دسمبر میں کراچی کے علاقے کورنگی کی ایک کچی آبادی میں آگ بھڑک اٹھی جس کے نتیجے میں ایک حاملہ عورت جل کے ہلاک ہو گئی اور دو عورتیں بُری طرح جھلس گئیں۔ مئی میں کراچی کی آبادی میں لگنے والی آگ کے ایک اور واقعے میں ایک سو پندرہ جھونپڑیوں کو شدید نقصان پہنچا اور دو افراد زخمی ہوئے۔

قبرستان

تدفین کے لیے جگہ کی شدید کمی پورے ملک جہاں مرنے والے کو دفنانے کے علاقہ اور کوئی چارہ نہیں ہوتا، کے شہروں میں ایک مسئلہ رہا۔ زمین کی کمی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا جتنا کہ ٹاؤن منصوبہ بندی کا فقدان۔ ایک سال سے دوسرے سال کے درمیان مرنے والے افراد کی تعداد میں زیادہ فرق نہیں اس لیے اس بات کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں ہونا چاہیے کہ اگلے پچیس سالوں یا اس سے زیادہ میں تدفین کے لیے کتنی جگہ درکار ہو گی۔

موجودہ قبرستانوں میں اکثر جگہ نہیں ہوتی تھی اور ناجائز تجاوزات نے معاملات کو اور سنگین بنا دیا تھا۔

سرکاری حکام سے اپنے منصوبے منظور کراتے وقت نجی رہائشی سکیموں پر یہ لازم تھا کہ وہ زمین کا ایک مخصوص حصہ قبرستان کے لیے مختص کریں۔ اگرچہ منصوبوں کی منظوری کے بعد نجی رہائشی سکیمیں قبرستان کے لیے مختص جگہ کو اکثر رہائشی پلاٹوں میں تبدیل کر لیتی تھیں۔

زمین کی دستیابی کے باوجود میت کی تدفین ایک مہنگا اقدام بن چکا تھا۔ ایک ایسا ملک جہاں تقریباً تیس فیصد آبادی غربت کی لکیر کے نیچے زندگی بسر کرتی ہے وہاں پکی قبر کی قیمت چار ہزار پانچ سو روپے جبکہ کچی قبر کی قیمت پندرہ سو روپے ہے۔ لاہور کے مشہور قبرستان میانی صاحب میں قبرستان میں میت کی تدفین کے لیے مزید جگہ باقی نہیں رہی تھی اور منتظمین نے اس وجہ سے قبروں کی تخصیص پر پابندی لگا دی تھی۔ اس بات کا فیصلہ تقریباً تین سال پہلے کیا گیا تھا کہ جگہ کی کمی پر قابو پانے کے لیے ایک اور قطعہ زمین مختص کیا جائے گا، اگرچہ جو واحد پیش رفت ہوئی وہ جگہ کی نشاندہی تھی۔ لاہور کی شہری ضلعی حکومت سال کے آخر تک زمین خریدنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

سیلاب اور مسلح تنازعات

پاکستان کے جنوبی علاقے یکے بعد دیگرے تیسرے سال سیلاب سے متاثر ہوئے۔ متاثر ہونے والے لوگوں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ سیلابوں کے باعث بھی صرف 2012 میں کم از کم دو لاکھ پچھتر ہزار سات سو بیس گھر بھی تباہ ہوئے یا انہیں نقصان پہنچا۔ ایک ایسی ریاست جہاں تقریباً اسّی لاکھ گھروں کی کمی میں ہر سال مزید تین لاکھ کا اضافہ ہوتا ہے وہاں قدرتی آفات سے تباہ ہونے والے لاکھوں گھروں کا متبادل فراہم کرنا انتہائی بڑا ہدف تھا۔

قدرتی آفات کے مسلسل واقعات کے علاوہ پاکستان مسلح افواج اور انتہا پسند جنگجوؤں کے بیچ ہونے والے مسلح تنازعات سے بھی متاثر ہوا۔ اگرچہ خیبر پختونخوا کے جنگ سے متاثرہ علاقوں میں فوجی آپریشن کی بدولت جنگجوؤں کے اثر و رسوخ والے علاقوں کو آزاد کرانے میں کامیابی حاصل ہوئی لیکن فاٹا میں مسائل جوں کے توں برقرار رہے۔ 2012 کے شروع سے لے کے آخر تک دہشت گردوں نے فاٹا کے زیادہ تر علاقوں میں بلا روک ٹوک اپنی کارروائیاں جاری رکھیں۔ انہوں نے نہ صرف مقامی آبادی کو دہشت زدہ کیے رکھا بلکہ اہم عمارتوں مثال کے طور پر صحت کے مراکز اور لڑکیوں کے سکولوں کو بھی تباہ کیا۔ دہشت گردوں کے خاتمے کے لیے مسلح افواج کی جانب سے کی گئی کارروائیوں کی وجہ سے بھی مقامی انفراسٹرکچر کو نقصان پہنچا۔ فاٹا

سیلاب 2012 کے باعث بے دخل ہونے والے افراد

سیکرٹریٹ کے ڈیپارٹمنٹ برائے ترقی ومنصوبہ بندی کے اس تنازعے سے ہونے والے نقصان کے متعلق مکالے کے مطابق فاٹا کے اندرونی تصادم کے نتیجے میں صرف انفراسٹرکچر کی قیمت کی مد میں تقریباً ایک سوتین ملین ڈالر کا نقصان ہوا۔

سفارشات

1- موجودہ مسئلے کے حل کے لیے مؤثر پالیسیاں بناتے وقت یہ لازمی ہے کہ زیرغور آبادی کی جلد از جلد مردم شماری کرائی جائے۔

2- تعمیرات کے سامان کی قیمتوں پر قابو پانے کے لیے اقدامات کیے جائیں تاکہ لوگ لاگت کم کرنے کے لیے معیار پر سمجھوتا نہ کریں۔ عام لوگوں کے لیے معیاری مٹیریل کی دستیابی کو ممکن بنایا جائے جس سے پیداوار میں اضافہ کرنا ممکن ہوگا اور قیمتیں کم کرنے میں مدد ملے گی۔

3- ایسے قواعد وضوابط موجود ہونے چاہئیں جو اس بات کو یقینی بنائیں کہ نئی رہائشی سکیمیں اس وقت تک تعمیر نہ کی جائیں جب تک پہلے سے موجود سکیمیں ایک خاص حد تک بھر نہ جائیں۔

4- کچی آبادیوں کو باضابطہ بنانے اور کم قیمت رہائش اور زمین کے متعلق مراعات کے متعلق کیے گئے وعدے پورے کیے جائیں۔ شہر بھر میں کچی آبادیوں کے لیے معلوماتی مرکز قائم کیے جاسکتے ہیں۔ کچی آبادی کے قائدین کو فیصلہ سازی کے عمل میں شامل کیا جائے۔

ماحولیات

تمام انسان، ایسے ماحول کا بنیادی حق رکھتے ہیں، جوان کی صحت اور فلاح و بہبود کے تمام تقاضوں کو پورا کرے۔

تمام ممالک، ماحول کا تحفظ کریں گے اور قدرتی وسائل کو، موجودہ اور آنے والی نسلوں کی بہتری کے لیے استعمال کریں گے۔

تمام ممالک، ماحول کے تحفظ کے سلسلے میں مناسب اور موزوں معیار قائم کریں گے اور ماحولیاتی معیار اور قدرتی وسائل کے استعمال میں آنے والی تبدیلی کو مانیٹر اور متعلقہ اعداد وشمار کو منظر عام پر لائیں گے

ماحولیاتی تحفظ اور قابل توثیق ترقی کے لیے مجوزہ قانونی اصول [آرٹیکل 1-2 اور 4]

مارچ 2012 کو پاکستان میں ماحولیاتی انصاف پر منعقدہ ساؤتھ ایشیائی کانفرنس میں بھوربن اعلامیہ کی منظوری کو ماحولیاتی مسائل کے حل کے لیے عدلیہ کے کردار کو نمایاں کرنے میں ایک بنیادی اقدام کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اگرچہ اعلامیہ پورے پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں میں سبز بنچوں کی تشکیل کا باعث بنا، پھر بھی ان بنچوں کے پاس درج شدہ مقدمات میں صرف پندرہ فیصد کا فیصلہ ہوا اور بیس فیصد پر نافذ شدہ جرمانہ وصول کیا گیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اپنی تشکیل کے وقت ان بنچوں نے پاکستان کے عوام کے ساتھ جو ماحولیاتی انصاف کے وعدے کئے تھے ان کے پورا ہونے کو ابھی کافی وقت درکار ہے۔ اس پورے سال میں پاکستان ماحولیاتی تحفظ کے ایکٹ 1997(PEPA) کی خلاف ورزیاں مشاہدہ میں آئیں کیونکہ صوبائی حکومت نے ماحول پر پڑنے والے اثرات سے قطع نظر ایک کے بعد ایک پروجیکٹ شروع کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ پاکستان ماحولیاتی تحفظ (PEPA) کی خلاف ورزی کرنے والوں پر سزا لاگو نہ ہونے کے عمل نے حکومت کو قانون کا تمسخر اڑانے کا مزید موقع فراہم کیا ہے۔ وفاقی کابینہ نے آب وہوا کی تبدیلی پر قومی پالیسی (NPCC) کو آب وہوا سے متعلقہ آفتوں کے اثرات کو کم کرنے اور استحکام پزیر ترقی کے تقاضوں پر پورا

کوڑا کرکٹ کا سمندر

اترنے کے لیے منظور کیا۔اس پالیسی کو آب وہوا کی تبدیلی کے اثرات کو کم کرنے میں ایک مثبت قدم کی حیثیت سے دیکھا گیا تاہم جنوری 2011 میں توانائی کی کارکردگی اور بچاؤ کے بل 2011 کی پارلیمان سے واپسی کو توانائی کے بچاؤ میں عزم کی کمی قرار دیا گیا۔ملک کے تمام بڑے شہروں میں چھ سال پہلے فضائی آلودگی کے انتباہ اور اس کی روک تھام کے لیے حکمت عملی کی تشکیل کے لیے قائم کئے جانے والے ماحولیاتی نگرانی کے نظام کا بند ہوجانا سال 2012 میں ایک مایوس کن اقدام ہے۔فضائی آلودگی کے خلاف جنگ میں یہ ایک بہت بڑی رکاوٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور اگست میں اس کے بند ہوجانے سے اب تک اس نظام کا متبادل کوئی نظام اختیار نہیں کیا گیا۔کینجھر جھیل میں آلودگی کی وجہ دریافت کرنے میں سندھ ماحولیاتی تحفظاتی ایجنسی کی ناکامی نے صوبے میں ایجنسی کے ماحولیاتی مسائل کے حل پیش کرنے کی صلاحیت کو بری طرح متاثر کیا۔کینجھر جھیل میں نجاست/آلودگی کو جھیل میں سمندری مخلوق کے ساتھ ساتھ جھیل کے پانی پر منحصر جانوروں کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔تاہم دریائے راوی کی نجاست دور کرنے میں کچھ کوششیں نظر آئیں جب دریائے راوی کی نجاست کی وجہ دریافت کرنے اور اس کو دور کرنے کے لیے تجاویز دینے کے لیے لاہور ہائی کورٹ کے سبز بینچ نے دریائے راوی کمیشن تشکیل دیا۔

ترقی کا عمل

اگرچہ استحکام پزیر ترقی یا آنے والی نسلوں کو متاثر کیے بغیر موجودہ نسل کی ضروریات کو پورا کرنے والی ترقی کے بارے میں سیمینارز اور کانفرنسوں میں کافی بحث ومباحثہ کیا گیا مگر زیرنظر سال کے دوران اس پر عملی

لحاظ سے کوئی کام نہ ہوسکا۔

سرکاری ملازم/اہلکار استحکام پزیری کے متعلق بہت جوش اور ولولہ سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے لیکن نقصان دہ ترقی پر قابو پانے کے لیے مناسب اقدامات کرنے میں برتی گئی تاخیر واضح ہے۔ اس کا نتیجہ عجلت میں منصوبہ بند ترقیاتی پروجیکٹس کی بے ہنگم تعمیل کی صورت میں نکلا جس کے ماحول پر گھمبیر اثرات ہوئے۔

ان میں منصوبوں میں سے ایک بس ریپڈ ٹرانزٹ سسٹم تھا جو کہ 27 کلومیٹر لمبی سڑک ہے جس کا 8.5 کلومیٹر حصہ بلند ڈھانچے پر پھیلائی گئی سڑک پر مشتمل ہے۔ پنجاب گورنمنٹ نے لاہور میں اس منصوبے کا آغاز کیا۔ پنجاب کے دارالخلافہ کے انفراسٹرکچر کو جدید بنانے اور عوام کو آمدورفت کی سہولت میسر کرنے کے مقصد کے ساتھ یہ منصوبہ ترکی حکومت کے تعاون سے شروع ہوا۔ یہ منصوبہ ماحولیاتی اثراتی جائزے (EIA) کے بغیر تیز رفتاری سے آغاز پر ماحولیاتی ماہرین کی تنقید کا نشانہ بنا۔ پاکستان ماحولیاتی تحفظ ایکٹ (PEPA) کی دفعہ 12 میں ماحولیاتی اثراتی جائزہ (EIA) کو قانونی شرط قرار دیا گیا ہے اور منصوبوں پر عمل درآمد سے قبل ماحولیاتی اثرات کا جائزہ لینے کے لیے ماحولیاتی تحفظاتی ایجنسی (ای پی اے) اس کا انعقاد کرتی ہے۔ ایکٹ کی ایک دفعہ کے تحت اس قانونی تقاضے کی سزا ایک کروڑ روپے تک ہے لیکن اس کے باوجود بس ریپڈ ٹرانزٹ سسٹم (بی آر ٹی ایس) کے ڈویلپرز کو سزا نہیں ملی اور نہ ہی اس منصوبے کے ڈویلپرز نے ماحول کے اثرات کو مدنظر رکھا ہے۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق، بس ریپڈ ٹرانزٹ بی آر ٹی ایس کے لیے سینکڑوں درختوں کو کاٹ دیا گیا۔ اس منصوبے کے ماحولیاتی اثراتی جائزے (ای آئی اے) کے لیے منصوبے کے آغاز کے بعد عوام کی کھلے عام لی گئی تجاویز کو پنجاب حکومت نے نظرانداز کر دیا۔ لاہور کے رہائشی ماحولیاتی وکیل کی طرف سے ماحولیاتی تحفظاتی شعبہ (ای پی ڈی اے) میں درج شدہ شکایت میں عوامی تفریح گاہوں میں اس منصوبے کے لیے تعمیراتی مواد کے ذخیرہ کے باعث عوام کو ان کے استعمال سے منع کئے جانے پر تنقید کی گئی۔ کھلے گڑھوں کی وجہ سے عوام کو درپیش خطرات کو بھی نمایاں طور پر بیان کیا گیا۔ پنجاب میں ایمرجنسی ریسکیو سروس 1122 نے بس ریپڈ ٹرانزٹ سسٹم کے باعث ہونے والے حادثات کی صرف اگست میں تین دن کے دورانیہ میں 48 کالز وصول کیں۔ اس تعمیراتی کام کے نتیجہ میں اٹھنے والے گردوغبار پر قابو پانے کے لیے اس منصوبے کے ڈویلپرز نے کوئی اقدامات نہیں کئے۔ ماحولیاتی تحفظاتی شعبہ (ای پی ڈی) کی طرف سے بھیجے جانے والے نوٹس کو نظرانداز کر دیا گیا۔

تاہم ریپڈ ٹرانزٹ سسٹم صرف اکلوتا پروجیکٹ نہیں جس نے ابتدا سے ہی پاکستان ماحولیاتی تحفظاتی

ایکٹ (پی ای پی اے) کی دفعات کا مذاق اڑایا۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق جولائی میں ماحولیاتی تاثراتی تجزیے کی منظوری کے بغیر راولپنڈی میں پشاور روڈ کی توسیع کے لیے کیپٹیل ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے سینکڑوں درخت کاٹ دیئے۔ پشاور ڈویلپمنٹ اتھارٹی جو کہ پشاور سے ملحقہ خیبر پختونخوا میں سب سے بڑے ہاؤسنگ پروجیکٹ اسفندیار سٹی میں مصروف عمل ہے' ذرا سا بھی فکر مند نہیں ہے۔ ماحولیاتی ماہرین کو ڈر ہے کہ اس پروجیکٹ کی وجہ سے کثیر دیہاتی آبادی شہر کو ہجرت کرے گی جس سے پہلے سے پر ہجوم پشاور کی آبادی میں مزید اضافہ ہوگا۔ ایک اور فکر ان اندیشوں میں اضافہ کرتی ہے کہ 14,000 ایکڑ پر پھیلی ہوئی زرخیز اراضی پر تعمیر وادی کے قدرتی ذرائع کو بری طرح متاثر کرے گی۔ شہر میں سول سوسائٹی کی تنظیموں نے بھی اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ شہر میں 12 عبوری پلوں کی جاری تعمیر میں ماحول پر اثرات کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ اسی طرح کراچی میں عبوری پل ماحولیاتی تاثراتی تجزیے کے بغیر ہی تعمیر کئے گئے۔

ماحولیاتی ماہرین نے سندھ میں ذوالفقار آباد سٹی کے پروجیکٹ کی شدید مذمت کی۔ اس شہر کو ٹھٹھہ کے ساحلی علاقے میں واقع انڈس ڈیلٹا ریجن میں تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ انڈس ڈیلٹا ویسٹ لینڈ آف انٹرنیشنل ایمپارٹنس کی فہرست میں شامل ہے اور دلدلی زمینوں کی یہ فہرست اپنے ماحولیاتی، معاشی، سائنسی ثقافتی اور تفریحی سرگرمیوں کے لیے مشہور ہے۔ ورلڈ وائڈ فنڈ پاکستان کے مطابق اس منصوبے سے ملک کے پچاس فیصد چمرنگ کے جنگلات کے تباہ ہونیکا اندیشہ ہے۔ پاکستان فشر فوک فورم (پی ایف ایف) نے بھی چمرنگ کے جنگلات کی زمین پر اس بڑے منصوبے کی مخالفت کی ہے۔ پی ایف ایف کا کہنا تھا کہ مزکورہ جگہ پر یہ منصوبہ اس منصوبے سے چمرنگ کے جنگلات کو درپیش خطرات کے لیے حکومت کے کیے گئے اپنے جائزے سے حاصل کردہ حقائق کے منافی ہے۔ نومبر 2010 میں صوبائی حکومت کے جاری کردہ نوٹیفکیشن میں ٹھٹھہ اور کراچی کے چمرنگ کے جنگلات کو ''محفوظ جنگلات'' قرار دیا گیا۔ لاتعداد جانوروں اور پرندوں کے لیے جائے امن کے علاوہ یہ جنگلات اردگرد کی رہائشی بستیوں کے لیے خوراک اور آمدنی کا ذریعہ بھی ہیں۔ ماہی گیری، کشتی رانی، مال مویشی چرانا اور فصلوں کی کاشت ان ساحلی بستیوں کے لیے آمدنی کے بنیادی ذرائع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ساحلی جنگلات کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان ساحلی بستیوں کا زلزلوں، سیلابوں اور سونامی جیسی قدرتی آفات کا مزید زد پذیر ہونے کا امکان ہے۔ سال 2012 میں بہت زیادہ تنقید کا شکار ایک اور منصوبہ سندھ کے ضلع سانگھڑ میں آئل اینڈ گیس ڈویلپمنٹ کا مجوزہ پروجیکٹ تھا۔ ماحولیاتی تحفظاتی ایجنسی نے زور دیا کہ اگرچہ ملک میں توانائی کے بحران کو دور کرنے کے لیے تیل اور گیس کی تلاش انتہائی اہمیت کی حامل ہے تاہم ماحول پر اس پروجیکٹ کے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ 18 دیہاتوں، کھیتوں آبی گزرگاہوں،

دلدلی علاقوں، جھیلوں جنگلوں کے قرب میں 102 ایکڑ کی اراضی پر آئل کی تحقیق کا یہ منصوبہ پھیلا ہوا ہے۔
ماحولیاتی تحفظاتی ایجنسی نے آئل اینڈ گیس ڈویلپمنٹ کمپنی لمیٹڈ کی طرف سے پیش کی گئی ایک اثراتی جائزہ جاتی رپورٹ کو مسترد کر دیا۔ سنجوڑو تلاش منصوبے کے بارے مارچ میں عوام کی آراء لینے کے موقع پر ماحولیاتی تحفظاتی ایجنسی کے افسران نے بتایا کہ آبادی، جامع سماجی و معاشی اثرات اور دیہاتوں کی نقل مکانی کرنے کی صورت میں ان کی بحالی کے لیے مجوزہ اقدامات کے متعلق آئل اینڈ گیس ڈویلپمنٹ کمپنی لمیٹڈ نے کوئی معلومات فراہم نہیں کیں۔ ماحولیاتی تحفظاتی ایجنسی نے مزید بتایا کہ رپورٹ میں صحت، تعلیم، زراعت اور پانی کے مسائل کا بیان بھی ناکافی تھا۔ یہ دعوی بھی کیا گیا کہ ماحولیاتی ماہرین کے ساتھ مشورہ کیا گیا تھا جو کہ درحقیقت نہیں کیا گیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ زراعت، ماہی گیری، جنگلی حیات، جنگلوں اور آثار قدیمہ کے شعبہ جات کے ساتھ مشاورت نہیں کی گئی تھی۔ سال 2012 کراچی میں ابھی تک نامکمل لیاری ایکسپریس وے پروجیکٹ کے سنگ بنیاد کی دسویں سالانہ تقریب کی نشاندہی کرتا ہے۔ سنگ بنیاد کے موقع پر پروجیکٹ کے منصوبہ دانوں نے اعلان کیا تھا کہ اس کے بنیادی مقاصد شہر میں ٹریفک کی بھیڑ کم کرنا اور نزدیکی کچی آبادیوں میں رہائشیوں کے لیے ماحول کے اثرات کو بہتر بنانا ہے۔ طے شدہ مقاصد کے برعکس پروجیکٹ ہزاروں کی تعداد میں کچی آبادی کے رہائشیوں کی نقل مکانی کی وجہ بنا اور شہر کے ماحولیاتی حالات میں کوئی مثبت تبدیلی نہیں لا سکا۔ درحقیقت میڈیا کی اطلاعات کے مطابق پروجیکٹ ناقص تعمیراتی مواد کے استعمال کے باعث شہر میں ہوائی آلودگی کا باعث بنا۔ پروجیکٹ پر عملدرآمد سے قبل اس عمل کے ماحولیاتی اثرات کا جائزہ لینے کے لیے فیصلہ سازوں نے ماحولیاتی اثراتی جائزے کی ضرورت کو نظرانداز کیا۔ کراچی میں اسی طرح کے مقاصد کے ساتھ ملیر ایکسپریس وے کی تعمیر کی تجاویز اور لیاری ایکسپریس وے کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے کی کوششوں پر تنقید کی گئی اور قلیل المدتی اہداف کی بجائے انفراسٹرکچر کے منصوبوں کی موثر منصوبہ بندی پر زور دیا گیا۔ ملک میں ترقی کی افزائش کی تگ و دو اور صنعتیں قائم کرنے میں تعاون ملک کے بڑے شہروں میں اور ان کے ارد گرد صنعتی شعبوں کی تشکیل کا باعث ہے۔ تاہم، ناگزیر منصوبہ بندی کی عدم موجودگی کا مطلب ہے کہ متعدد کارخانے ماحولیاتی تحفظاتی ایجنسی سے ناقابل اعتراض سرٹیفکیٹ کی منظوری کے بغیر تعمیر کئے گئے ہیں۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق لاہور شہر میں قائم صرف تقریباً 30 فیصد صنعتی یونٹس نے تعمیر سے قبل ناقابل اعتراض سرٹیفکیٹ حاصل کئے تھے۔ میڈیا رپورٹس نے جون میں ماحولیاتی تحفظاتی ایجنسی کے ایک سروے کا حوالہ دیا جس کے مطابق رنگ روڈ کے گردنواح میں 332 کارخانے ماحولیاتی تحفظاتی ایجنسی سے ناقابل اعتراض سرٹیفکیٹ حاصل کئے بغیر قائم کئے گئے۔ خیبر پختونخوا کے علاقے گندھاوا میں شہریوں نے جپسم پاؤڈر

کے کارخانوں کی پیدا ہونے والی فضائی آلودگی کی شکایت درج کروائی۔

ہوا کا معیار

گاڑیوں اور صنعتی اخراج کے باعث فضائی آلودگی کے علاوہ زیر بحث سال میں ڈینگی بخار کے پھیلاؤ پر قابو پانے کے لیے کئے گئے اقدامات کے صحت پر اثرات کا مشاہدہ بھی کیا گیا۔ خیبر پختونخوا کی حکومت نے جنوری میں خود مختار ٹریفک انجینئرنگ اتھارٹی کی بنیاد رکھی۔ اتھارٹی کی ذمہ داری بڑے شہروں میں ٹریفک کے موثر بہاؤ کی یقین دہانی کرتے ہوئے سڑکوں پر بڑھتی ہوئی بھیڑ کے مسئلے کو حل کرنا تھا۔ اضافہ شدہ ٹریفک بڑھتی ہوئی فضائی اور شور کی آلودگی کے ساتھ سانس لینے اور سننے سے متعلقہ بیماریوں کا سبب ہے۔ اپریل میں خیبر ٹیچنگ ہسپتال کی ایک تحقیق نے پشاور میں ٹریفک پولیس اہلکاروں میں گردوں کیمرظ کے پھیلاؤ کی نشاندہی کی ہے۔ شہر کے آٹھ مرکزی مقامات پر تعینات 65 ٹریفک پولیس کانسٹیبلز میں سے 19 گاڑیوں کے دھوئیں کا شکار ہو کر گردوں کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ صنعتوں میں توانائی کے ذریعہ کی حیثیت سے ٹائر جلانے کی تیزی سے بڑھتی ہوئی غیر صحت افزا روش کا نتیجہ زہر آلود دھواں کی صورت میں نکلتا ہے جو دمہ، ٹی بی اور کھانسی جیسی

گاڑیوں کا دھواں شہری آلودگی میں اضافے کا سبب ہے

بیماریوں کا باعث بنتا ہے۔ کارخانوں میں یہ طریقہ کار بہت مقبول ہے کیونکہ یہ توانائی پیدا کرنے کا سستا طریقہ ہے۔ دسمبر میں ماحولیاتی تحفظاتی ایجنسی (ای پی اے) نے لاہور میں ٹائر جلانے والے چار کارخانوں کو بند کردیا۔ مئی میں پنجاب ماحولیاتی تحفظاتی شعبے نے کارخانوں کے سروے کرنے اوران کی بدولت پیدا ہونے والے آلودگی کی مقدار کی پیمائش کرنے کے لیے چھ دستے تشکیل دیئے۔ سروے کے نتیجے میں ماحولیاتی تحفظاتی شعبے نے 110 کارخانوں کونوٹس جاری کئے۔

اپریل میں راولپنڈی میں ڈینگی مخالف سپرے کی مہم کے دوران فضائي آلودگی کی ایک اوروجہ کی نشاندہی کی گئی۔ پنجاب شعبہ صحت کے بیان کے مطابق ڈینگی انسدادسپرے ایسی گیسوں کامنبع ہے جوانسانی صحت کے لیے مضر ہیں۔ صوبائی حکومت کے صحت اور ماحول کے شعبہ جات نے اسپرے کے استعمال کوروکنے کافیصلہ کیا۔ پاکستان میں بیشتر کارخانے بہت زیادہ آلودگی پھیلانے کا باعث ہیں کیونکہ انہوں نے مہلک فضلے کے اخراج کی روک تھام کے لیے ماحول دوستانہ ٹیکنالوجی نصب نہیں کی۔ کارخانوں کا رہائشی علاقوں میں قائم ہونا بہت عام ہے جوکہ رہائشیوں کے لیے صحت کے سنگین مسائل کا باعث بنتے ہیں۔ میڈیا کی اطلاعات کے مطابق جنوری میں وفاقی دارالحکومت میں ہوا کے معیار کوبہتر بنانے کی ماحولیاتی تحفظاتی ایجنسی کی کاوشوں کی اہم پیش رفت اسلام آباد کی آٹھ سٹیل ملز میں سے ایک میں اخراج روکنے کے لیے آلات نصب کرنا ہے۔ خیبر پختونخو کے اینٹوں کے بھٹوں پربھی ایسے اقدامات کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا کیونکہ انہوں نے فضائی آلودگی کے تیزی سے بڑھنے میں اہم کرداراداکیا۔

2006ء میں ملک میں فضائی آلودگی کو مانیٹر کرنے کے لیے شروع ہونے والے ماحولیاتی مانیٹرنگ سسٹم کی بندش کا مشاہدہ بھی 2012 میں کیا گیا۔ اس نظام کے تحت سات غیر تغیر پزیر اور تین موبائل مانیٹرنگ اسٹیشنوں کولاہور کراچی، کوئٹہ، کراچی اوراسلام آباد میں قائم کیا گیا۔ تاہم سرمایہ کی کمی کی وجہ سے ان مانیٹرنگ اسٹیشنز نے کام کرنا ترک کردیا اوراگست میں یہ منصوبہ ختم کردیا گیا۔

آبی آلودگی کی صورتحال

پنجاب میں دریائے راوی اور سندھ میں کینجھر جھیل میں آبی آلودگی توضیح کرتی ہے کہ کیسے پانی کے قدرتی راستوں اور ذرائع کوفضلہ نکاسی اورکوڑا کرکٹ کے ذخیرہ کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ یہ مسئلہ زیر بحث سال میں میڈیا کی سرخیوں کی زینت بنا رہا۔ پنجاب حکومت نے دریائے راوی کی آبی آلودگی کی تفتیش کے لیے کچھ اقدامات اٹھائے۔ کینجھر جھیل میں آبی آلودگی کے حوالے سے سندھ حکومت کی کاہلی جاری ہے۔

دریااور نہریں فضلے کے ذخائر کا کام دے رہے ہیں

پاکستان کی سب سے بڑی تازہ پانی کی اور ایشیا کی سب سے بڑی انسانی تیار کردہ تازہ پانی کی کینجھر جھیل تمام کراچی اور ٹھٹھہ کے بعض حصوں میں پانی کی دستیابی کا اہم منبع ہے اور سندھ میں نمایاں اہمیت کی حامل ہے۔ جھیل میں آبی آلودگی کی سطح اتنی بلند ہے کہ جھیل کے گردنواح کے علاقوں کے رہائشیوں میں پانی کی پیدا کردہ بیماریاں مثلاً ڈائیریا وسیع پیمانے پر پھیل رہی ہیں۔ اپریل میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی طرف سے منعقدہ ابتدائی معائنوں میں کینجھر جھیل کا پانی پینے کے لیے مضر قرار دیا گیا۔ پھر بھی سندھ حکومت نے دلدلی علاقوں پر رامسر کنونشن کے تحت کینجھر جھیل کو ایک محفوظ دلدلی خطہ قرار دیا اور نقصان کیا زالے کے لیے عملی اقدامات نہیں کئے گئے۔ ورلڈ وائلڈ لائف پاکستان نے کھینجر جھیل سے متعلقہ طویل مدت سے قائم مسائل کا تعلق سرکاری افسران کی باہمی رابطہ سازی کے فقدان سے جوڑا ہے۔ سندھ ماحولیاتی تحفظاتی ایجنسی (ای پی اے) نے فوجی فرٹیلائزر کمپنی (ایف ایف سی) کے جھیل کے قریب پن چکی کو منصوبہ آبی آلودگی کے ابتدائی اسباب میں شمار کیا۔ ای پی اے نے کمپنی کو ماحول دشمن منصوبے شروع کرنے کی اجازت دینے کا ذمہ دار متبادل توانائی ترقیاتی بورڈ (اے ای ڈی بی) کو ٹھرایا۔ تاہم بعدازاں جاری ہونیوالی ایک رپورٹ میں ای پی اے نے جھیل کو آلودہ کرنے میں ایف ایف سی کے کردار کی نفی کی۔ اس نے دوسرے امکان نوری آباد صنعتی علاقہ سے فضلے کے اخراج کو رد کر دیا۔ یہ کہا گیا کہ شدید بارشیں پانی کی آلودگی کا سبب ہیں کیونکہ بارش کے دوران یوریا کے تھیلے کنجھیر جھیل کی ہریلو نالی میں دھلتے تھے۔ سندھ ای پی اے آلودگی کے ذمہ دار عناصر کی نشاندہی کرنے میں

ناکام رہی اوراس کی بجائے انسدادی اقدامات اورسفارشات مرتب کرنے کی طرف رجوع کیا۔ پنجاب میں زیر بحث سال کے دوران دریائے راوی کے مسئلے کو بارہا زیر بحث لایا گیا۔ پاکستانی ماحولیاتی وکلاء ایسوسی ایشن نے دریائے راوی میں صنعتی فضلہ اور گندنکاسی کے بہاؤ کے خاتمے کی اپیل کی۔ یہ کہا گیا کہ دریا کے آلودہ پانی نے خوراک کے معیار کے ساتھ ساتھ عوام کی صحت کو بھی بری طرح متاثر کیا ہے۔ پاکستانی ماحولیاتی وکلاء ایسوسی ایشن کے مطابق دریائے سندھ میں 48 فیصد آلودگی کا باعث دریائے راوی ہے۔ واٹر اینڈ سینیٹیشن اتھارٹی اور ماحولیاتی تحفظاتی شعبہ کے سرکاری اہلکاروں کو لاہور ہائیکورٹ نے عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ ماحولیاتی تحفظاتی ایجنسی کے ایک سروے نے دریائے راوی میں آلودگی پھیلانے والے 217 کارخانوں اور نکاس کے نو خارجی راستوں کی نشاندہی کی۔ میڈیا کی اطلاعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مچھلیوں کی تقریبا 40 انواع آبی آلودگی کے باعث ختم ہو چکی ہیں۔ میڈیا میں یہ اطلاعات بھی منظر عام پر آئیں 378 صنعتی یونٹوں میں سے صرف 5 میں پانی کی فلٹریشن کا بندوبست ہے دیگر یونٹ غیر فلٹر شدہ پانی دریا میں ڈالتے ہیں جو بھاری دھاتوں پر مشتمل ہوتا ہے اور دریائے راوی کی آلودگی کا سبب ہے۔ دریا میں آلودگی کی سطح کا معائنہ لینے کے لیے لاہور ہائی کورٹ نے دریائیراوی کمیشن تشکیل دیا۔ ایک سائنسدان، ماحولیاتی تحفظاتی شعبہ کے سیکرٹری، پنجاب ایڈووکیٹ جنرل، ورلڈ وائلڈ لائف فنڈ پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل، واٹر اینڈ سینیٹیشن ایجنسی کے مینجنگ ڈائریکٹر ماحولیاتی وکلاء اور دیگر کارکنان پر مشتمل کمیشن نے پاکستان کے سب سے زیادہ آلودہ دریا کی حفاظت کے لیے اقدامات اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ کمیشن میں شامل واحد غیر سرکاری تنظیم ورلڈ وائلڈ لائف کو پاکستان کو گندے پانی کو فلٹر کرنے والے پلانٹس کے نصب ہونے اور صنعتوں کے خارج شدہ مواد کے طریقہ کار جیسی تفصیلات معلوم کرنے میں مدد کے لیے ایک تحقیقی مطالعہ کرنے کا کہا گیا۔ جولائی میں کمیشن نے دریائے راوی میں آلودگی کے انتہائی سنگین مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک مصنوعی دلدلی خطے کے قیام کے امکان کی کھوج لگائی۔ ماحولیاتی تحفظاتی شعبہ نے دعویٰ کیا کہ گندے پانی کو فلٹر کرنیکی نسبت اس مسئلے کا بہتر حل مصنوعی دلدلی خطہ تعمیر کرنا ہے کیونکہ کارخانوں کی خارج کردہ بھاری دھاتوں کے لیے گندے پانی کے فلٹر کی سہولیات ناکافی ہیں اور دلدلی خطہ بنانا ہی واحد حل ہے۔ خیبر پختونخوا کنزرویشن ایکٹ 1975 کے تحت نیشنل پارک قرار دی جانیوالی جھیل سیف الملوک تجارتی سرگرمیوں کے باعث شدید خطرے کی زد میں ہے جو اس کی جنگلی حیات اور ماحولیات کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں۔ جھیل سیف الملوک جھیل کے بڑھتے ہوئے ماحولیاتی مسائل کے حل کے لیے ورلڈ وائلڈ لائف پاکستان نے ایک منصوبے کا آغاز کیا۔ یہ منصوبہ جون میں اپنے اختتام سے قبل کامیاب رہا اس کے بعد عوام نے تجارتی

سرگرمیوں کے لیے جھیل پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ میڈیا اطلاعات کے مطابق منصوبے کی تکمیل کے بعد جھیل میں دو کی بجائے 35 کشتیاں تھیں اور جھیل پر ناجائز تجارتی سرگرمیوں کے الزام میں منصوبے کے عملے کے چودہ اراکین کو فارغ کر دیا گیا۔ لوگوں نے جھیل کے قریب جھونپڑیاں تعمیر کر رکھی ہیں جو کہ آلودگی کا سبب بننے کے ساتھ ساتھ اس جگہ کی قابل دید خوبصورتی کو بھی بری طرح متاثر کرتی ہیں۔

جنگلات

زیر بحث سال میں سڑکوں کی توسیع جیسے ترقیاتی منصوبوں کی منصوبہ بندی اور عملدرآمد کثیر تعداد میں درختوں کے کاٹے جانے کی بنیادی وجہ ہے۔ مئی 2012 کی میڈیا اطلاعات واضح کرتی ہیں کہ قراقرم ہائی وے کی توسیع کے لیے خیبر پختونخوا میں 1900 درخت کاٹے گئے اور اس شاہراہ کے 2013 میں مکمل ہونے کی توقع ہے۔ عوامی شاہراہ اتھارٹی نے یہ توسیعی کام بغیر کسی ماحولیاتی اثراتی جائزے کے کیا اور اس حوالے سے صوبائی حکومت محکمہ جنگلات کے مشورے کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ سوات اور چترال کے رہائشیوں نے حکومت اور انسانی حقوق کی تنظیموں سے درختوں کی کٹائی کی روک تھام کا مطالبہ کیا کیونکہ یہی جنگلات ان علاقوں کے بیشتر رہائشیوں کی روزی کا ذریعہ ہیں۔ انہوں نے درختوں کی کٹائی کے جاری سلسلے کے نتیجے میں ماحولیاتی پناہ گزین بننے کے متعلق اپنی فکر کا اظہار کیا۔ اگست میں انٹرنیشنل یونین فار کنزرویشن آف

درختوں کو محض کٹے شہتیر کی اہمیت دی گئی

نیچر جیسے ماحولیاتی گروہوں نے زراعت و جنگلات پٹہ پالیسی کے انسداد کے لیے آواز بلند کی جو کہ ان کے دعوے کے مطابق یہ پالیسی بااثر و رسوخ لوگوں کو جنگلات کی زمین پر فصلوں کی کاشت کی اجازت دیتی ہے۔ ملک میں جنگلات کی غیر جنگلی زمین میں سب سے زیادہ تبدیلی دریائے سندھ کے ڈیلٹا میں دیکھی گئی جہاں ذوالفقار آباد سٹی جیسے ترقیاتی منصوبے سندھ کے قدرتی ذرائع کو مسلسل تباہ کر رہے ہیں۔ باغات کے شہر لاہور کو بس ریپڈ ٹرانزٹ سسٹم کی تعمیر کے دوران بہت سے درختوں سے محروم ہونا پڑا۔ ترقیاتی منصوبے کے لیے 500 سے زائد درختوں کو کاٹے جانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ حکومت نے ترقیاتی منصوبوں کے نام پر قدرتی ذرائع کی حفاظت کو نظر انداز کرنا جاری رکھا جیسا کہ راولپنڈی میں بھی پشاور روڈ کی توسیع کے لیے 100 سے زائد درختوں کو کاٹ دیا گیا۔ بلوچستان کے علاقے زیارت میں واقع جونسیر کے جنگلات جو کیلی فورنیا کے بعد اس قسم کے سب سے بڑے جنگلات ہیں' 2012 میں کٹائی کے خطرے میں رہے۔ علاقے میں جنگل کی کٹائی کی وجوہات میں تجارتی اور غیر قانونی درختوں کی کٹائی، ضرورت سے چرائی کران اور گھریلو استعمال کے لیے درختوں کا کٹاؤ شامل ہیں۔ معشیت کو محرک فراہم کرنے اور ماحول کے تحفظ کے لیے سیاحت میں ترقی کے ساتھ حیاتیاتی نظام تنوع کے تحفظ کی تکمیل کی بہت اہم ضرورت محسوس کی گئی۔

وفاقی دارالخلافہ کے مارگلہ کی پہاڑیوں کے عوامی پارک کی حفاظت اور پارک میں ایندھن کے طور پر استمال کے لیے درختوں کی کٹائی کی روک تھام میں کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی کی نااہلی بھی قابل غور ہے۔ سال کے اوائل میں کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (سی ڈی اے) بھی تنقید کی زد میں آئی اس پر الزام عائد کیا گیا کہ اس نے اخراجات میں کمی لانے کے لیے گھسیارے کے استعمال کی بجائے گھاس کو آگ لگا دی اے۔ بعد ازاں ماحولیاتی ماہرین نے اسلام آباد- ہری پور کو ملانے والی زمین دوز سڑک کے منصوبے کو ملتوی کرنے کے سی ڈی اے کے فیصلے کو سراہا۔ یہ کہا گیا کہ اس منصوبے سے مارگلہ کی پہاڑیوں کی قدرتی خوبصورتی کو دائمی نقصان پہنچے گا جو پہلے ہی تجاوزات کے خطرے کی زد میں ہیں۔ گرد و نواح کی دیہاتی کمیٹیوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ سی ڈی اے پہاڑیوں میں جنگلاتی آگ پر قابو پائے حیاتی تنوع اور جنگلی حیات محفوظ رہ سکے۔

جنگلی حیات

زیر بحث سال میں بسٹرڈز اور سائبرین سارس جیسے نایاب خانہ بدوش پرندوں کا وسیع پیمانے پر غیر قانونی شکار مشاہدہ میں آیا۔ انٹرنیشنل ٹریڈ ان انڈ میجرڈ سٹیٹز آف وائلڈ فاٹا اینڈ فلورا میں ناپید اقسام کی حیثیت رکھنے کی حقیقت کے قطع نظر پرندوں کی ان دونوں اقسام کا شکار کیا گیا۔ مزید برآں سندھ کی نراری اور

جنگلی حیات صرف پنجروں میں محفوظ دکھائی دی

جھو دلولوں (جن کو رامسار مقامات اور خانہ بدوش پرندوں کی سب سے اہم ٹھہراؤ کی جگہ کہا جاتا ہے) میں بڑھتی ہوئی آلودگی علاقے میں پرندوں کی آبادی میں بہت زیادہ کمی کا باعث ہے جو کہ 2009 کی 100,000 سے 2012 میں 20,000 تک ہوگئی ہے۔ سکھر میں ماہی گیروں کے جھیل میں کیمیکلز خارج کرنے کی وجہ سے جنوری میں ایک اندھی ڈولفن کی موت واقع ہوئی۔ سندھ جنگلی حیات شعبہ (SDA) کی اطلاعات کے مطابق پچھلے موسم سرما میں صوبہ کے پانی کی مخلوقات میں فلیمنگو اور پیلی کن کو دیکھا گیا لیکن 2012 میں یہ غائب رہے۔ نومبر میں آب وہوا کی تبدیلی پر سینٹ سٹینڈنگ کمیٹی نے غیر ملکیوں بالخصوص سعودی شاہی میں مشہور مال غنیمت کے شکار پر پابندی کی سفارشات پیش کیں۔ ان شاہی خاندانوں کو پاکستان مدعو کیا جاتا اور سندھ، بلوچستان، گلگت بلتستان اور چترال کے علاقوں میں مارخور، یوریل، آئی بیکس اور نیلی بھیڑ کا شکار کرنے کا لائسنس دیا جاتا۔ ان جانوروں کے گوشت کو کھایا جاتا ہے اور شکاری ان کے دیگر اجزاء اپنے پاس یادگار تحفہ کے طور پر رکھتے ہیں۔ زیر بحث سال میں کمیٹی کی سفارشات پر عملدرآمد نہیں کیا گیا۔

فضلہ جات

پنجاب کے بیشتر ہسپتال ویسٹ مینجمنٹ رولز 2005 کا احترام نہیں کرتے ہیں جن میں ہسپتال کے فضلے کا محفوظ اخراج شامل ہے۔ فروری میں شالیمار ویسٹ مینجمنٹ کمپنی کے سات اہلکار اور شالیمار ہسپتال کے دو کارکنان کو استعمال شدہ سرنج، پیشاب کی تھیلیاں، گلوکوز کی خالی بوتلیں اور ہسپتال کے دیگر فضلات کو بیچنے کے

جرم میں گرفتار کیا گیا۔ اس مہینے کے بعد میڈیا نے اطلاع دی کہ ماحولیاتی تحفظاتی شعبے کے اہلکاروں نے شالیمار ویسٹ مینجمنٹ کمپنی کے تین میں سے ایک فعال فضلہ سوز کو بند کر دیا جو کہ 160 ہسپتالوں لیبارٹریوں میں سے نو ہزار ٹن فضلہ اکٹھا کرتا تھا۔ فضلہ سوز کے بند ہو جانے کی وجہ سے ہسپتال کا فضلہ ہسپتالوں اور لیبارٹریوں کے پچھواڑے میں خارج کیا گیا جو اس کا سامنا کرنے والے افراد کے لیے ماحولیاتی اور صحت کے مسائل کا باعث بنا۔ فضلہ کے انتظام کی خاطر پنجاب حکومت نے نومبر میں لاہور ویسٹ مینجمنٹ کمپنی کے ذریعے شہر میں سالڈ ویسٹ مینجمنٹ سروسز کا افتتاح کیا۔ اس منصوبے کی ٹیکنالوجی میں ترکی نے پنجاب حکومت کی معاونت کی۔

موسمیاتی تبدیلی

ستمبر میں نیشنل ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی کی اطلاعات کے مطابق مون سون کی بارشوں کی بدولت 422 لوگ ہلاک اور 3000 زخمی ہوئے۔ جنوبی پنجاب، جنوبی خیبر پختونخوا، مشرقی بلوچستان اور سندھ میں حد سے زیادہ بارشیں ہوئیں۔ میڈیا کی اطلاعات کے مطابق سندھ 239 اموات کے ساتھ شدید متاثرہ صوبہ تھا۔ اس مہینے کے بعد ملک میں مستحکم نشوونما کے لیے حکمت عملی اپنانے اور آب و ہوا سے متعلق آفات کے اثرات کو روکنے کے لیے کابینہ نے موسمیاتی تبدیلی پر پاکستان کی پہلی عوامی پالیسی منظور کی۔

موسمیاتی تبدیلی پر عوامی پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ معیشت کے سماجی اور معاشی طور زد پذیر شعبے بھی موسمیاتی تبدیلی کے دھارے میں لایا جائیں اور پاکستان میں موسمیاتی تبدیلی کے تناظر میں ترقی کو یقینی بنایا جاسکے۔ تاہم زیر نظر سال میں اس پالیسی کا نفاذ مشاہدے میں نہیں آیا۔

توانائی

جنوری میں حکومت کی جانب سے توانائی بچاؤ بل سے دستبرداری کو ملک میں خوفناک حد تک بڑھتے ہوئے توانائی کے بحران پر ایک کاری ضرب قرار دیا گیا۔ یونائیٹڈ سٹیٹس ایجنسی فار انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ، یونائیٹڈ نیشنز ڈویلپمنٹ پروگرام اور ڈیپارٹمنٹ آف انٹرنیشنل کارپوریشن کے ماہرین نے دیگر فریقین کے اشتراک سے بل کا مسودہ تیار کیا تھا۔ سرکاری اہلکاروں نے بیان دیا کہ بل سے دستبرداری اٹھارہویں ترمیم کے نتیجے میں ہوئی جس کے باعث توانائی کے مسئلہ کو حل کرنا اب صوبائی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ حتیٰ کہ ملک مسلسل تین سال سے سیلاب کے اثرات کی زد میں ہے سندھ حکومت تحصیل تھرپارکر میں قحط سالی کا شکار رہائشیوں کو خوراک کی فراہمی میں وفاقی حکومت سے معاونت کی خواہشمند ہے۔ کامپیکٹ فلوروسینٹ لائٹ بلب کے

صاف توانائی پر بہت کم انحصار کیا گیا

استعمال پر سوال اٹھایا گیا کیونکہ منسٹری آف نیشنل ڈیساسٹر مینجمنٹ نے بیان دیا کہ ان کی ماحولیاتی لاگت ان کے معاشی مفادات سے تجاوز کرتی ہے۔ بلبوں کے ٹوٹنے پر مرکری کے اخراج نے ان بلبوں کے صارفین پر صحت کے لیے خطرات جیسے جلد کے سرخ بار، دماغ کا نقصان اور یادداشت کے کھوجانے کا انکشاف کیا۔ گاڑیوں کے دھویں کے اخراج پر قابو پانے کی ایک کوشش کی صورت میں ماحولیاتی تحفظاتی ایجنسی نے وزیراعظم کی سرپرستی میں پاکستان ماحولیاتی کونسل کو ایک منصوبہ پیش کیا جس میں مارکیٹ میں یوروٹو (Euro II) گاڑی کے ایندھن کی فوری دستیابی کی تجاویز شامل تھیں۔ یوروٹو میں استعمال شدہ اجزاء میں ڈیزل دیگر ایندھن کی نسبت کم ماحولیاتی نقصان کا سبب بنتا ہے اور اس منصوبے کا مقصد ماحولیاتی نقصان کے اسباب کو کم کرنا تھا۔ تاہم پٹرولیم کی وزارت نے 2014 تک اس ایندھن کی مارکیٹ میں دستیابی میں تاخیر کر دی ہے۔ ایندھن کے بہتر معیارات کی قبولیت پر تاخیر کی وجہ سے ماحولیاتی تحفظاتی ایجنسی اور موسمیاتی تبدیلی کی وزارت نے اس پر کافی تنقید کی۔ میڈیا کی اطلاعات کے مطابق تیل صاف کرنے والی ایجنسیوں نے یوروٹو ڈیزل جیسی سبز توانائی کو قبول کرنے میں مزاحمت ظاہر کی کیونکہ انہیں یہ کافی معلوم ہوا تھا۔

سفارشات

1۔ ماحولیاتی تحفظ کے ذمہ داروں کو عملی طور پر بااختیار بنانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ قانونی اختیارات کے استعمال کو یقینی بنا سکیں۔

2۔ جامع حکمت عملی کے بغیر ماحول کو بہتر بنانے کی تمام تر کاوشیں ناکام ثابت ہوں گی۔ ملک کے حیوانات ونباتات کے ساتھ پیش آنے والے واقعات اس کی عوام کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ پاکستان کو فوری طور پر جنگلات کے نقصانات کو روکنا چاہیئے اور معدومیت کی انتہا پر پہنچے ہوئے جانوروں اور پرندوں کا تحفظ کرنا چاہیئے۔

3۔ فوری ماحولیاتی انصاف کی فراہمی کے لیے اعلیٰ عدالتوں کے سبز بنچوں کو اپنی کارکردگی کو بہتر بنانا چاہیئے۔ بچوں کو ان بینچوں کی کارگردگی سے اور ماحولیاتی تحفظ کے حکام کے بارے میں بھی آگاہی دینی چاہیئے۔ بچوں کو ماحول کو صاف رکھنے کی اہمیت کے بارے تعلیم کا آغاز شروع سے ہی کرنا چاہیئے۔

4۔ ہسپتالوں کے فضلات ماحول دوست طریقے سے ٹھکانے لگانے کے لیے موجودہ فضلہ سازوں کی صلاحیت میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ نئے فضلہ ساز بھی نصب کئے جانے چاہئیں۔

5۔ دھوئیں کا اخراج کرنے والے تمام تر کارخانوں یا آلودہ فضلے کے نکاس والے کارخانوں پر کم از کم زہریلے اخراج اور آلودہ پانی کے اخراج سے قبل اس کو فلٹر کرنے کی پابندی لازمی ہونی چاہیئے۔

مہاجرین

تمام بنی نوع انسان عظمت اور حقوق کے حوالے سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں عقل اور ضمیر ودیعت ہوا ہے اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کے جذبے کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔

[اقوام متحدہ کا عالمی منشور۔ آرٹیکل نمبر1]

2012 میں پاکستان جبری نقل مکانی کے شکار لاکھوں لوگوں کی آماجگاہ بنا رہا ہے۔ ان میں سے کچھ پرانے تھے اور کچھ لوگ اس دوران سال بے گھر ہوئے۔ کچھ ملک کے اندر سے تھے اور دیگر باہر سے۔ سال 2012 میں نقل مکانی کرنے والے افراد کا سب سے بڑا گروہ افغان مہاجرین کا تھا۔

زیر جائزہ سال کے دوران 83,000 سے زائد رجسٹرڈ افغانیوں کو واپس ان کے وطن بھیج دیا گیا۔ افغانستان میں اتنی بہتری نہیں آئی کہ وہ پناہ گزینوں کے واپس جانے سے ہچکچاہٹ کو ختم کر سکے ان کے ملک میں سب سے بڑا خدشہ غیر محفوظ کرنا اور ناپائیداری رہی۔

سال کے آخر تک پاکستان کی طرف سے دباؤ کے باوجود یو این ایچ سی آر کی طرف سے واپس جانے کے لیے گئے۔ تقریباً 1.6 ملین رجسٹرڈ پاکستان میں موجود افغان باشندوں نے یہاں رہنے کا فیصلہ کیا۔ دیگر دس لاکھ غیر اندراج شدہ افغانی پاکستانی میں تھے۔ 2012 کے آخر میں پاکستان نے ایک مرتبہ پھر رجسٹرڈ افغانیوں کے لیے واپس اپنے گھر جانے کی حتمی تاریخ میں چھ ماہ کے لیے توسیع کی۔

پاکستان نہ ہی 1951 کے پناہ گزین کنونشن کا فریق ہے اور نہ ہی 1967 کے پناہ گزین کی حالت بارے پروٹوکول کا حصہ ہے۔ افغان حکومت پاکستان اور یو این پناہ گزین ایجنسی کے مابین سہہ جزہ معاہدے

بے دخل افراد کے لیے خوراک کا سامان

کے تحت تمام رجسٹرڈ افغانیوں کو 2012 کے آخر تک اپنے ملک واپس جانا تھا۔ دوران سال پاکستان نے بار بار افغان اور یو این اہلکاروں کو اس خواہش بارے مطلع کیا کہ مہاجرین وطن واپسی کے سلسلے کو تیز اور بہتر بنایا جائے لیکن اس نے رضا کارانہ طریقے کے اپنے عہد کو بار بار دہرایا۔ حکومت کی طرف سے رجسٹرڈ افغانیوں کو واپس بھیجنے کے لیے کسی طاقت کے استعمال کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ یو این ایچ سی آر نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ پاکستان میں رجسٹرڈ مہاجرین کو زبردستی واپس بھیجنے کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔ اگرچہ پوری دنیا میں مہاجرین کے لیے رضا کارانہ وطن واپسی ایک ترجیحی پائیدار حل رہا ہے۔ تقریباً تمام افغانیوں کے لیے بھی پاکستان میں یہی واحد پائیدار حل ہے۔ مجموعی طور پر افغانیوں کے لیے پاکستان میں صورتحال ان کے ابتدائی سالوں کی نسبت کم خوش آئند رہی جو کہ ان کے یہاں بھیجنے کے اوپر 1980 کے عشرے میں دکھائی دی اور اس کے بعد کے سالوں میں جب وہ اپنا ملک مسلح جنگ اور لاقانونیت کی وجہ سے چھوڑ کر بھاگ آئے تھے۔

پاکستانی حکام کے افغان مہاجرین سے جلد از جلد ملک چھوڑنے کے مطالبے سے علاوہ افغانیوں کو مسلسل موردالزام ٹھہرایا گیا کہ وہ جرائم میں اضافے کا موجب ہیں اور ان کو قومی سلامتی کے لیے خطرے کے بطور پیش کیا جاتا رہا۔ مقامی رہائشیوں کے علاوہ، عدلیہ نے بھی پاکستان میں رہنے والے تمام افغان باشندوں کو جلد ان کے ملک واپس بھیجنے پر زور دیا۔

اس سال دوبارہ اندرونی طور پر نقل مکانی کرنے والے افراد کی تعداد دس لاکھ سے زائد رہی۔ ان میں

اکثریت فیڈرل ایڈمنسٹریڈٹرائبل ایریا(فاٹا) کے نقل مکین تھے۔سندھ میں شدید خشک سالی نے بھی تقریباً پانچ لاکھ لوگوں کو مجبور کیا۔تیسرے مسلسل سال میں آنے والے سیلاب سے بھی صوبہ میں کچھ نقل مکانی دیکھنے کو ملی۔ 1971 سے بنگلہ دیش میں پھنسے پاکستانیوں کو واپس لانے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کئے گئے۔اس سے زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ قومی سطح کی کسی گفتگو میں ان کی حالت زار کا کوئی اندازہ نہیں لگایا گیا۔ذرائع ابلاغ،سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی نے واضح طور پر اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

پاکستان میں افغانی باشندے

پاکستان میں موجود تمام افغانی باشندے مہاجر نہیں تھے مگر سب کے سب عدم استحکام کی وجہ سے اور عدم تحفظ کی وجہ سے اپنے مادر وطن جانے سے ہچکچا رہے تھے۔سال 2012 میں پاکستان میں افغان مہاجرین کی آبادی پوری دنیا میں سب سے بڑی اور طویل المدت مہاجرین کی آبادی تھی۔ تقریباً 26لاکھ افغان باشندے 2012 کے آخر تک پاکستان میں مقیم تھے۔سولہ لاکھ سے تھوڑے زائد حکومت سے رجسٹرڈ تھے اور جبری واپسی سے محفوظ تھے۔ایک اندازے کے مطابق دس لاکھ افغان باشندوں کی رجسٹریشن نہیں ہوئی اور پاکستانی قوانین کے مطابق ان کے ساتھ غیر قانونی مہاجرین کا سلوک روا رکھا گیا۔یواین ایچ آر سی نے سارا سال 2012 میں رجسٹرڈ افغان باشندوں کے رضا کارانہ وطن واپسی کے منصوبے کے لیے مراعات دیں۔ تاہم وطن واپس جانے کی رفتار سے یہ بات تو بہت واضح تھی کہ پاکستان میں موجود رجسٹرڈ افغان کی بہت بڑی تعداد 31 دسمبر کی حتمی تاریخ تک واپس نہیں جائے گی۔اکتوبر کے آخر میں یواین ایچ سی آر نے رجسٹرڈ افغانیوں کے لیے مراعات بڑھا دیں جو نومبر اور دسمبر میں واپس گئے۔مجموعی طور پر پاکستان میں موجود 83,423 رجسٹرڈ افغان(15,348 خاندان) سال 2012 میں یواین ایچ سی آر کی سہولیات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے وطن واپس گئے۔

رجسٹرڈ افغانیوں کی بڑی تعداد جو سال 2012 کے آخر تک پاکستان میں موجود تھی وہ وہی ہے جو پاکستان میں پیدا ہوئی اور بڑی ہوئی۔حکومت کی طرف سے مراعات اور تقاضے کے باوجود افغانستان میں غربت مسلسل عدم تحفظ اور ناپائیداری اور رہائش اور روزگاری کی کمی ان کے یہاں واپس نہ جانے کی وجہ بنی۔ دسمبر کے وسط میں،حکومت پاکستان نے 31 دسمبر کی حتمی تاریخ جس کے تحت رجسٹرڈ افغانیوں کو اپنے وطن واپس جانا تھا میں چھ ماہ کی توسیع دی تاہم دوران سال وطن واپسی کے دیکھے گئے رجحان سے یہ نہیں لگتا کہ 30 جون 2013 کی حتمی تاریخ تک یہ سب ممکن ہو۔

2012 میں پاکستان سے افغانیوں کی وطن واپسی

صوبہ/علاقہ	خاندان	افراد
خیبر پختونخواہ	9845	55391
بلوچستان	3122	16113
پنجاب	1396	7402
سندھ	813	3714
اسلام آباد	172	803
کل	**15348**	**83423**

سال کے اختتام پر 1,637,740 رجسٹرڈ افغانی پاکستان میں موجود تھے۔ 2012 میں کوئی نئی رجسٹریشن واقع نہیں ہوئی ماسوائے نئی پیدائش کے رجسٹریشن کے جو کہ ایک مسلسل عمل ہے۔ پاکستان میں 76 افغان مہاجرین کے کیمپ جو کہ یو این ایچ سی آر کی مدد سے سنبھالے جا رہے تھے۔ 2012 میں ان میں سے ایک بھی بند نہیں ہوا۔ ان کیمپوں پر مبنی گھر میں 544,484 رجسٹرڈ افغان پاکستان میں موجود تھے جس میں سے 260,556 خواتین ہیں کیمپ کی آدھی سے زیادہ آبادی جس میں 296,708 افراد 18 سال سے کم عمر کے تھے۔ افغانیوں کے علاوہ 750 غیر افغانیوں جس میں زیادہ تر سومالیہ، ایران اور عراق سے تعلق رکھنے والے یو این ایچ سی آر سے رجسٹرڈ افراد کی پاکستان نے میزبانی کی۔ یو این ایچ سی آر نے دوسری قومیتوں کے مہاجرین اور پناہ گزین کے ساتھ بھی نسبتاً تھوڑا کام کیا ہے۔ جس میں سومالی، عراقی اور ایرانی شامل ہیں۔ 2012 میں یو این ایچ سی آر نے 13 غیر افغانیوں کو پاکستان سے واپس ان کے وطن بھیجنے میں مدد کی جس میں سات الجیرین اور چھ روانڈن تھے۔

استحقاق میں توسیع

گورنمنٹ آف افغانستان، پاکستان اور یو این رفیوجی ایجنسی کے سہ جزی معاہدے کے تحت پاکستان میں موجود تمام افغانیوں کو سال 2012 کے اختتام تک ملک چھوڑ نا تھا۔ تاہم مجموعی تعداد کا ایک مختصر حصے نے حقیقتاً مقررہ وقت پر ملک چھوڑا۔

ستمبر میں ترکی میں ہونے والی ایک ملاقات میں پاکستانی نمائندے سے افغان گورنمنٹ اور یو این ایچ سی آر نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ سہ جزی معاہدے کو جس کے تحت افغان مہاجرین کو پاکستان سے

رضا کارانہ طور پر واپس جانا تھا میں تین سال کی توسیع کی ضرورت ہے۔

دسمبر کے وسط میں، وفاقی حکومت نے رجسٹرڈ افغانیوں کو وطن واپسی کی حتمی تاریخ 31 دسمبر میں ایک بار مزید چھ ماہ کے لیے توسیع کر دی۔

اس سے پہلے پاکستان میں موجود یو این ایچ سی آر کے ملکی نمائندے نے یہ بیان دیا تھا کہ یہ بات غیر واضح ہے کہ یکم جنوری 2013 کو پاکستان میں افغانیوں کے ساتھ کیا واقع ہوگا۔ تاہم اس نے یہ بات محسوس کی کہ پاکستان نے کبھی جانتے ہوئے کسی رجسٹرڈ افغان مہاجر کو زبردستی ملک سے واپس نہیں بھیجا۔ یو این ایچ سی آر کے پاکستان میں نمائندے نے توسیع پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا چھ ماہ کی توسیع بہت اہم ہے، افغان مہاجرین اس بات کی پریشانی چھوڑ دیں گے کہ مستقبل میں جولائی 2013 میں اور اس کے بعد ان کے لیے کیا رکھا ہے۔ یو این ایچ سی آر تاہم حکومت پاکستان کی اس ضمن میں ہمت افزائی کرتی رہے گی کہ پاکستان آنے والی مشکل گھڑی میں پناہ کی گنجائش کو برقرار رکھے گا۔

یو این ایچ سی آر کے اہلکار نے مزید بیان دیا کہ افغانستان سے غیر ملکی افواج کا اخراج رضا کارانہ وطن واپسی کی رفتار پر ضرور اثر انداز ہو سکتا ہے۔

مہاجرین کی واپسی کب ہوگی، اگر نہ ہوئی تو متبادل لائحہ عمل کیا ہے

جیسے ہی افغانیوں کے لیے رضا کارانہ وطن واپسی کا منصوبہ شروع ہوا تو یہ بہت واضح ہو گیا کہ پاکستان میں موجود نقل مکانی کا شکار افغانیوں کے لیے وطن واپسی ہی واحد حل تھا۔ ان میں وہ مہاجرین بھی شامل تھے جو یہاں پیدا ہوئے اور بڑھے۔ یہاں تک کہ پاکستان، افغانستان اور (یو این سی ایچ آر) افغانیوں کی پاکستان سے رضا کارانہ واپسی پر زور دیا۔ وہ جنہوں نے رضا کارانہ وطن واپسی کا انکار کر دیا ان کے متعلق کوئی بھی جامعہ حکمت عملی سامنے آنے میں ناکام رہی۔ رضا کارانہ وطن واپسی پوری دنیا میں مہاجرین کے لیے سب سے بہتر حل تو ہے لیکن صرف یہ ایک ہی حل نہیں ہے۔ بہت سے دوسرے تسلیم شدہ حل جن میں میزبان ملک میں یکجا کرنے کا عمل اور رہائش کے لیے میزبان ملک میں گنجائش شامل ہے۔

مراعات

یو این ایچ سی آر کے وطن واپسی پروگرام کے تحت اندراج شدہ مہاجرین کو جو افغانستان واپس جا رہے تھے کو سفری سہولت کے لیے اور واپس گھر منتقلی کے لیے 150 ڈالر فی مہاجر دیئے گئے۔ اکتوبر کے آخر میں یو این ایچ سی آر نومبر اور دسمبر میں پاکستان سے واپس جانے والے اندراج شدہ مہاجرین کے لیے مراعات کو

بڑھا دیا۔ بڑھائی جانے والی واپسی کی مراعات میں کھانے پینے والی اشیاء کے علاوہ بھاری بالٹیاں، صابن، مچھروں سے بچاؤ کے لیے جال، سونے کے لیے گدے، کمبل، باورچی خانہ کا سامان اور حفظان صحت کے لیے جراثیم سے پاک کپڑے شامل تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان سے افغانستان تک مفت سفری سہولت بھی دستیاب کی گئی لیکن دباؤ اور مراعات کے باوجود مہاجرین کی اکثریت واپسی کے لیے غربت اور جنگی کی وجہ سے رضامند نہ ہوئی۔ وطن واپسی سے افغانیوں کو پاکستان میں اپنا محفوظ مقام چھوڑنا پڑا۔ بہت سے افغانیوں کے نزدیک پاکستان کو بغیر ویزے کے چھوڑنے سے انہیں وہاں افغانستان میں ایسے ہی غیر قانونی مہاجرین سمجھا جائے گا جیسا کہ انہیں یہاں پاکستان سمجھا جاتا ہے۔ بہت سے مہاجرین نے میڈیا کو بتایا کہ وہ افغانستان میں غیر یقینی مستقبل کے لیے پاکستان میں جوان کے پاس تھوڑا بہت ہے کو داؤ پر نہیں لگا سکتے باقیوں نے کہا کہ وہ اس وقت تک پاکستان رہیں گے جب تک حکومت انہیں نکال نہیں دیتی۔

غیر ضروری پیش رفتیں

پاکستان میں رائے عامہ کے جذبات افغانیوں کے خلاف ہوتے چلے گئے۔ افغانیوں کی پاکستان میں لمبی رہائش گزیری اور اس سے پیدا ہونے والی ملک میں لاقانونیت اور دہشت گردی کے واقعات سے افغانیوں کی واپسی کی ڈیمانڈ بڑھ گئی خاص طور پر ان علاقوں میں جہاں افغانی بڑی تعداد میں مقیم تھے۔ افغانیوں کی وطن واپسی کا تقاضا بڑھ گیا ہے صرف ان کے دہشت گردی کے واقعات میں شامل ہونے کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ بیچ بیچ میں افغانستان میں موجود پاکستانیوں کے ساتھ غیر انسانی رویے بھی اس مطالبے کی وجہ ہے۔ جہاں انہیں افغانیوں کے ہاتھ سے مشقت اور زیادتیوں کا سامنا تھا۔

افغان پناہ گزین خواتین اپنے گھر واپسی کا انتظار کر رہی ہیں

دسمبر میں خیبر پختونخوا کے ضلع مانسہرہ میں بہت سے رہائشیوں نے افغانیوں کی فوراً واپسی کی ڈیمانڈ کی۔ ان رہائشیوں کا کہنا تھا کہ جب کہ پاکستان نے تو لاکھوں مہاجرین کو پناہ دی جبکہ افغانستان میں پاکستانیوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے افغانیوں کو ٹیکس نہ دینے پر بھی مورد الزام ٹھہرایا۔ انہوں نے ڈیمانڈ کی کہ جب تک افغانیوں کو واپس بھیجنے کا شیڈول نہیں آتا گورنمنٹ کو افغانیوں کو کیمپ تک محدود کیا جائے۔ انہوں نے افغانیوں کو دہشت گردی میں اتار چڑھاؤ کا ذمہ دار ٹھہرایا اور مطالبہ کیا کہ گورنمنٹ پشاور ہائی کورٹ کی تعمیل کرتے ہوئے افغانیوں کو فوراً واپس بھیجے۔ یو این ایچ سی آر کی ویب سائٹ کے مطابق سال کے دوران افغانیوں کی پاکستان سے واپسی سے یہاں بہتر زندگی کے مواقع بڑھے، نوکریوں کے لیے مقابلے بازی میں اضافہ ہوا جبکہ خیبر پختونخوا میں سکیورٹی کے خدشات میں تیزی آئی۔

کمیشن برائے انسانی حقوق کی زیرنگرانی میڈیا کی رپورٹ کے مطابق 2012 میں غیر ملکی باشندوں کے بارے قانون کے تحت 803 افغانی شہریوں کو حراست میں لیا گیا جو کہ پاکستان میں بغیر کسی سفری اجازت نامے کے موجود تھے۔ ان میں سے جو لوگ قانونی کاغذات پیش نہ کر سکے انہیں تھوڑا سا وقت جیل میں رکھ کر واپس بھیج دیا گیا۔ میڈیا نے نہ صرف 2012 میں 803 افغانیوں کو حراست میں لے کر واپس بھیجنے کی رپورٹ دی بلکہ میڈیا کی یہ بھی رپورٹ تھی کہ ستاون افغانیوں کو علیحدہ سے واپس اپنے ملک بھیجا گیا۔

بنگلہ دیش میں پھنسے پاکستانیوں کی حالت زار

بنگلہ دیش میں چالیس سال سے زیادہ پھنسے ہوئے سینکڑوں، ہزاروں پاکستانی جو کہ 2012 تک کوئی توجہ حاصل نہیں کر سکے انسانی زندگی کا ایک نا ختم ہونے والا المیہ ہے۔ بنگلہ دیش میں یہ اردو بولنے والی کمیونٹی کو بہاری کہا جاتا ہے۔ یہ بہاری کمیونٹی پاکستان میں موجود اعلیٰ افسران اور سرکار کی کوئی توجہ حاصل نہیں کر سکے۔ نہ ان کے بارے میں از خود نوٹس لیا گیا اور نہ ہی سیمینار منعقد کرائے گئے۔ بہاریوں پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ بنگلہ دیش بننے تک پاکستان کے شہری تھے۔ اس لیے انہیں واپس اپنے ملک جانا چاہئے۔ پاکستان ان کی واپسی کے لیے رضامند نہیں ہوا۔ حال ہی میں بنگلہ دیش نے ان بہاریوں کو ووٹ کا حق دیا جو 1971 کی جنگ میں چھوٹے بچے تھے یا وہ جو بعد میں پیدا ہوئے۔ البتہ جو 1971 میں نوجوان اور بڑے تھے انہیں ابھی تک قانونی شناخت نہیں ملی۔ لاکھوں بہاری مہاجرین کی طرح بنگلہ دیش میں کوئی ساٹھ کیمپوں میں رہتے ہیں۔ انہیں سرکاری نوکریوں تک رسائی نہیں ملتی اور یہ بنیادی ضروریات سے محروم ہیں۔ یہ بہاری نہ تو بنکوں میں قرضے کے لیے درخواست دے سکتے ہیں اور نہ ہی بنکوں میں کھاتے کھلوا سکتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ بہاری وسیع

پیمانے پر زیادتیوں کا شکار ہیں۔ 2012 تک ایسی کوئی امید ظاہر نہیں ہوئی کہ پاکستانی گورنمنٹ اپنے بنگلہ دیش میں پھنسے ہوئے مہاجرین کو واپس لانے کے لیے کوئی قدم اٹھائے۔

اندرون نقل مکانی

پاکستان میں زیرِ جائزہ سال کے دوران اندرون نقل مکانی کی سب سے بڑی وجہ مسلح جنگ رہی۔ 2012 میں پاکستان میں اندرونی نقل مکانی کا مسئلہ مکمل طور پر فاٹا سے تعلق رکھتا ہے۔ فاٹا میں لوگوں کو گھروں سے بے دخل کرنے کی لڑائی جاری رہی یہاں تک کہ بے دخل واپس دیگر اضلاع کی طرف گئے۔ تازہ ترین سرگرمی کا مرکز خیبر ایجنسی رہی۔ فاٹا کی زیادہ تر ایجنسیز میں نقل مکانی کے ایک مرحلے میں تھی یا دوسرے مرحلے میں تھی۔

یو این ایچ سی آر کے اندازے کے مطابق، 31 دسمبر 2013 تک جنگ کے باعث پاکستان میں 757,996 افراد (163,102) خاندان اندرونی طور پر نقل مکانی کا شکار ہوئے۔ پروشل ڈیزاسٹر مینجمٹ خیبر پختونخوا کے اعداد و شمار کے مطاق، اکتوبر کے آغاز میں آئی ڈی پی کیمپس میں اور آف کیمپس میں لگ بھگ 623,382 بے دخل افراد مقیم تھے۔ سب سے بڑا گروہ (370,382) کا تعلق خیبر پختونخوا سے تھا۔ اس کے علاوہ 1,340 آئی ڈی پیز افراد باجوڑ سے تھے۔ 106,9690 کا تعلق اورکزئی سے تھا اور 145,150 افراد فاٹا کے علاقے کرم کے رہائشی تھے۔ ایک بہت بڑی تعداد میزبان کمیونیٹز کے پاس یا کیمپس کے علاوہ رہائش آئی ڈی پیز ہی کیمپس میں رہائش رکھے ہوئے تھے۔ بے دخل افراد کے لیے میزبان علاقے/کیمپس ہنگو، کوہاٹ، کرم، پشاور اور نوشہرہ میں موجود تھے۔

غیر نقل مکین کیمپس میں رہنے والے خاندان مدد اور پناہ ان شہروں میں موجود اپنے رشتے داروں سے مانگتے تھے۔ جبکہ امیر وہاں گھر کرائے پر لیتے تھے۔

سال کے آخر میں خیبر ایجنسی کے علاقے باڑہ سے تعلق رکھنے والے آئی ڈی پیز جو جلوزئی کیمپس نوشہرہ میں رہ رہے تھے، نے حکومت کو ان کے علاقے میں آپریشن بند کرنے کا کہا تا کہ وہ اپنے گھروں کو واپس جا سکیں۔ انہوں نے آٹے کے راشن میں کمی کی شکایت کی اور پھٹے ہوئے ٹینٹوں کی تبدیلی کا مطالبہ کیا تا کہ سخت سردی سے بچا جا سکے۔ نقل مکینوں کے لیے مناسب خوراک کی فراہمی کے لیے فنڈز کی قلت اور خوراک کی کمی بھی دیکھنے کو ملی۔ جولائی کے آخر میں خیبر پختونخوا حکومت نے وفاقی حکومت کو مطلوبہ 200,000 میٹرک ٹن گندم ورلڈ فوڈ پروگرام کے تحت دینے کا کہا۔ یو این ایجنسیاں فاٹا کے نقل مکینوں کو خوراک مہیا کر رہی ہیں تا کہ

امدادی کارروائیوں کو جاری رکھ سکیں۔ یو این ایجنسی نے پہلے ہی فاٹا آئی ڈی پیز کے خوراک کے راشن کو امداد کی کمی کی وجہ سے کم کیا ہے اور بتایا کہ خوراک کے راشن اور بھی کم کئے جا سکتے ہیں۔

ہزاروں نقل مکانی رہائشی جنوبی وزیرستان میں واپس آئے۔ کرم ایجنسی سے اہم شاہراہ کے رابطے کا دوبارہ بحال ہونے کے بعد ہزاروں خاندانوں کو بسانے کی کوشش کی گئی جو علاقے کو فرقہ وارانہ تصادم اور طالبان کے خلاف فوجی کارروائی کے باعث علاقہ چھوڑ چکے تھے۔ فوجی آپریشن تقریباً 2000 بے دخل خاندان جون میں کرم ایجنسی واپس آئے۔

زیادہ تر مکانات زیر اثر علاقے میں تباہ کر دیئے گئے۔ حکومت کی طرف سے ہر تباہ شدہ گھر کے لیے معاوضے کی رقم کی پیشکش نے کافی متزلزل لوگوں کو اپنی طرف راغب کیا۔ حالانکہ اس سے پیش تر کرم ایجنسی کے حالات بارے بہتری کے متعلق وہ لوگ واقف تھے۔ اکتوبر میں باجوڑ ایجنسی کی سالارزئی تحصیل کے بے دخل رہائشی جو واپس آ گئے تھے شکایت کی کہ ان کے گھروں کو جنگجوؤں کے خلاف فوجی آپریشن سے نقصان پہنچا۔ جبکہ وہ دور تھے اور مطالبہ کیا کہ گورنمنٹ ان کو آباد کرے اور خاص طور پر ان کے گھروں کو دوبارہ بنانے میں مدد کرے۔

آئی ڈی پیز میں شامل عورتوں اور بچوں نے بے دخلی کے تمام مراحل میں سخت مصیبتیں برداشت کیں۔ بے دخلی نے بچوں کی تعلیم پر منفی اثر ڈالا۔ خیم گاہ کے بارہ خاص طور پر بچوں کی پڑھائی میں خلل پڑتا رہا۔

ستمبر میں امدادی تنظیمیں خیبر ایجنسی میں لمبے فوجی آپریشن کے اثرات اور فاٹا کے دوسرے علاقوں میں ناقص غذا اور خطرناک بیماریوں کے خطرے میں پڑے ہوئے تقریباً 400,000 بچوں کے بارے میں فکرمند تھیں۔

اپریل میں پشاور ہائی کورٹ نے جلوزئی کیمپ کے مکینوں کو ان کے گھر واپس جانے تک سہولیات کا بہم پہنچانے بارے سوموٹو نوٹس لیا۔

دسمبر میں اس مقدمہ کی سماعت کے دوران خیبر پختونخوا کے پی ڈی ایم اے نے پشاور ہائی کورٹ کو بتایا کہ خطرناک سکیوٹی کی صورتحال کے باعث اور بے دخلی بہت سے علاقوں میں جاری ہی اور 2013 میں بھی یو این ایجنسیوں کو امدادی کارروائیاں جاری رکھنے کے لیے امدادی مسائل کا سامنا رہا۔

عمومی طور پر ملک میں نقل مکینوں کے ووٹ کا حق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اگلے جنرل الیکشن جو کہ 2013 کے شروع میں متوقع ہیں دسمبر میں پشاور ہائی کورٹ نے صوبائی الیکشن کمشنر کو سوموٹو مقدمے میں بلایا اور اسے ہدایات جاری کیں کہ نقل مکینوں کو خیبر پختونخوا میں ان کے اپنے کیمپس میں ووٹ دینے کی سہولت

یقینی بنائی جائے۔

نومبر میں نقل مکینوں کے مسئلے پر ایچ آر سی پی نے مینگورہ اور سوات میں ایک اجلاس منعقد کیا۔ جہاں 2009 میں پاکستان کی تاریخ کی سب سے بڑی اندرونی نقل مکانی ہوئی۔ اس میں ایسے افراد شامل تھے جنہوں نے خود نقل مکانی کا سامنا کیا اس کے علاوہ این جی اوز کے نمائندے لوکل کمیونٹی آرگنائزیشن صحافیوں، وکلا، انسانی حقوق کے محافظ اور سرکاری ملازمین نے شرکت کی۔ شرکاء نے اعتماد میں اضافے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ مشاورت کی تکنیکی پہلو کو متاثرہ آبادی کے ساتھ ترتیب دیا جائے تاکہ مجموعی فیصلہ سازی کو بڑھاوا دیا جا سکے۔ انہوں نے وسیع پیمانے پر نقصان اور نقل مکانی کو روکنے اور بغاوت کو ختم کرنے کے لائحہ عمل پر بھی زور دیا۔ شرکاء نے قدرتی آفات اور مسلح کشیدگی کے باعث ہونے والی بے دخلی، خیموں کے اندر کمیونٹیوں کے ہاں سکونت، اضافی مسائل کا شکار آئی ڈی پیز، میزبان کیمونٹی پر اثرات، واپسی اور بحالی نو، فیصلہ سازی کے عمل میں متاثرہ کمیونٹی کی شمولیت، میڈیا، سول سوسائٹی اور منتخب شدہ نمائندوں کے کردار، انسدادی لائحہ عمل اور مستقبل کی حکمت عملیوں سمیت ملک میں بے دخلی کے تحت مختلف پہلوؤں پر بحث کی۔

دیگر نقل مکانی

ستمبر میں مون سون کے سیلاب نے 400 لوگوں کی زندگیاں چھین لیں جبکہ 45 لاکھ لوگوں کو بری

سیلاب اس سال بھی ہزاروں افراد کی بے دخلی کا سبب بنا

طرح متاثر کیا۔ بلوچستان اور سندھ کے صوبوں میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ بے گھر ہوئے جبکہ پنجاب میں یہ تعداد لاکھوں میں ہے۔ ان میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو کہ مسلسل تین بڑے سیلابوں کی زد میں آئے جس سے ان کے گھر تباہ ہو گئے اور غذائی اشیاء کی قلت اور بھوک کا سامنا کرنا پڑا۔

جب سیلاب سے پاکستان کے بہت سے حصے تباہ حالی کا شکار تھے تو ادھر ضلع تھرپارکر کے جنوبی صحرا کے لوگ خشک سالی کا شکار تھے۔ خشک سالی کے ایک سال بعد ہی اسی ضلع کے لوگوں نے طوفانی بارشوں سے بہت نقصان اٹھایا۔ اگست میں سندھ حکومت نے ضلع تھرپارکر کو آفت زدہ قرار دے دیا۔ تقریباً پانچ لاکھ لوگوں نے قحط سے بچنے کے لیے تھرپارکر سے نقل مکانی کی۔

سفارشات

1۔ افغانیوں کی پاکستان سے وطن واپسی لازمی طور پر رضا کارانہ طور پر ہونی چاہئے۔ رضا کارانہ طور پر وطن واپسی کے ساتھ ساتھ دوسرے پائیدار حل بھی افغانیوں کی طویل نقل مکانی کو ختم کرنے کے لیے استعمال کرنے چاہئیں۔

2۔ مہاجرین کے ساتھ تعصب آمیز رویہ بالکل ناقابل قبول ہونا چاہئے۔ جہاں کہیں بھی ضرورت ہو تو بین الاقوامی برادری کے ساتھ مل کر مہاجرین کو امتیازی رویے اور مشکلات سے بچانے کے لیے کوششیں کرنی چاہئیں۔

3۔ بڑے پیمانے پر اندرون نقل مکانی کا شکار افراد کی بحالی اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے فوری لائحہ عمل بنانا چاہئے۔ انسانی اور قدرتی آفات اور ان کے خاص طور پر بچوں، خواتین اور مظلوم طبقے کے افراد پر ہونے والے اثرات پر خاص توجہ دینی چاہئے۔

4۔ بنگلہ دیش میں چالیس سال سے زیادہ عرصے تک اڑھائی لاکھ بے یار و مددگار پاکستانیوں کی واپسی کے لیے اقدامات سے گریز کرنے کا کوئی عذر پیش نہیں کرنا چاہئے۔ ان کی وطن واپسی کے لیے فی الفور اقدامات کرنے چاہئیں اور بنگلہ دیش میں پاکستانی ہائی کمیشن کو وہاں ان کی بہتری کے لیے کوششیں کرنی چاہئیں۔

ضمیمے

ضمیمہ - 1

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی سرگرمیاں

ایچ آر سی پی کی سرگرمیاں

شہریوں کو بنیادی انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے بارے میں آگہی فراہم کرنے کے لیے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے زیرِنظر سال کے دوران انسانی حقوق کے تمام امور سے متعلقہ سرگرمیوں کا اہتمام کیا۔ ایچ آر سی پی کے چیپٹر دفاتر اور ٹاسک فورس دفاتر نے ملک بھر میں انسانی حقوق کے معاملات پر ورکشاپس، فیکٹ فائنڈنگ مشنوں، سیمینارز، تحقیق اور ریلیوں کا انعقاد کیا۔ اپنے عقیدے کے باعث غیرمحفوظ طبقات پر ایچ آر سی پی کے ورکنگ گروپ نے ماہرین کے گروپ کی شکل اختیار کر لی اور مذہبی اقلیتوں کے مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے اجلاسوں کے انعقاد کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایچ آر سی پی اکانومی واچ نے وفاقی وصوبائی بجٹوں میں انسانی حقوق کے لیے مختص شدہ سرمائے کی نگرانی کی ذمہ داری سرانجام دی۔ نوجوانوں کو انسانی حقوق کے بارے میں حساس بنانے کے لیے، سکولوں اور یونیورسٹیوں میں میٹنگیں منعقد کی گئیں۔ عوام کو امن اور رواداری پر قائل کرنے کے لیے ملک بھر کے اضلاع میں عوامی میٹنگوں کا اہتمام کیا گیا۔ سزائے موت کے خلاف عالمی دن پر ایچ آر سی پی کے دفاتر اور ملک بھر میں ایچ آر سی پی کے کور گروپس نے ملک میں سزائے موت کے خاتمے کا مطالبہ کرنے کے لیے ریلیوں اور سیمینارز کا اہتمام کیا۔

ایچ آر سی پی نے چاروں صوبوں میں مصنفین، شعرا اور فنکاروں کا کنونشن منعقد کیا تاکہ معاشرے میں انسانی حقوق اور امن کے فروغ میں اُن کے کردار پر گفت وشنید کی جائے۔ ملک میں کسانوں کی جدوجہد کو اجاگر کرنے کے لیے ایک کسان کنونشن کا انعقاد بھی کیا گیا۔ ایچ آر سی پی نے گروی مزدوروں کے خلاف اپنے مؤقف پر کاربند رہتے ہوئے گروی مزدوروں اور اُن کے اہل خانہ کو درپیش مشکلات اجاگر کرنے کے لیے قومی

سطح کی مشاورت کا اہتمام کیا۔ عام انتخابات 2013 سے قبل، ایچ آر سی پی نے امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد کے موضوع پر ملک بھر میں اجلاسوں کا انعقاد کیا گیا۔ سول، ملٹری تعلقات اور انسانی حقوق پر اُن کے اثرات پر ایک مشاورت کا اہتمام کیا گیا اور 2013 کے اوائل میں منعقد ہونے والے عام انتخابات کے حوالے سے عوام کے جمہوری حقوق کے استعمال کو توجہ کا مرکز بناتے ہوئے ایک الیکشن ڈیسک تشکیل دیا گیا۔ ایچ آر سی پی نے اقوام متحدہ میں پاکستان کی یونیورسل سلسلہ وار نظر ثانی (یو پی آر) کی براہ راست کارروائی آن لائن دکھائی تاکہ میڈیا اور انسانی حقوق کی تنظیمیں اقوام متحدہ میں پاکستان کے انسانی حقوق کا ریکارڈ اور مؤقف سے آگاہ ہو سکیں۔ ایچ آر سی پی نے 2012 میں بلوچستان میں ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن بھیجا اور اُس کی رپورٹ شائع کی۔ تمام دفاتر میں منعقد ہونے والے ماہانہ اجلاسوں میں ایچ آر سی پی کے اراکین نے علاقائی اور ملکی سطح پر انسانی حقوق کے معاملات پر گفت وشنید کی۔ ایچ آر سی پی کے مرکز شکایات نے متعدد شکایات، معلومات اور اطلاعات موصول کیں۔ ان میں سے ایک اطلاع ایک کمسن پاکستانی لڑکے کاشف علی کے متعلق تھی جسے ہندوستان کی حکومت نے غلطی سے پاک۔ انڈیا بارڈر عبور کرنے پر حراست میں لے لیا۔ ہندوستانی عدالت نے اُسے بے قصور قرار دے دیا مگر اسے واپس پاکستان نہ بھیجا گیا۔ ایچ آر سی پی نے نئی دہلی میں پاکستانی ہائی کمیشن سے معاملے میں مداخلت کرنے کا مطالبہ کیا جس کے نتیجے میں لڑکے کی پاکستان واپسی کے انتظامات کیے گئے۔

ایچ آر سی پی کی ویب سائٹ اور بلاگ کو انسانی حقوق کے معاملات پر کمیشن کے مؤقف اور اقدامات پر بہت زیادہ تبصرے موصول ہوئے۔ انسانی حقوق کے مختلف پہلوؤں بارے معلومات لینے کے لیے سینکڑوں طلبا، ریسرچرز، صحافیوں اور دیگر متعلقہ افراد نے ایچ آر سی پی کی آن لائن دستاویزات کا استعمال کیا۔ کاغذات پر مبنی حوالہ جاتی مواد کے علاوہ، اگست 2012 سے پاکستان بارے 2005 سے 2012 تک کی ایچ آر سی پی کی دستاویزات آن لائن دستیاب ہیں۔ اگست کے بعد سے پاکستان سے تقریباً 717 افراد جبکہ دیگر ممالک سے 26 افراد نے آن لائن دستاویزات تک رسائی حاصل کی ہے۔ پاکستان اور باہر سے تقریباً 277 افراد نے کاغذات پر مبنی دستاویزات بارے معلومات لینے کے لیے ایچ آر سی پی کے ریفرنس سیکشن کا دورہ کیا۔

زیر نظر سال کے دوران ادارے کی بنیادی سرگرمیوں کا ایک مختصر جائزہ بیان کیا جاتا ہے۔

ورکشاپس/ سیمینارز/ میٹنگیں

10 جنوری پشاور: خیبر پختونخوا میں ایچ آر سی پی کے ضلعی کوآرڈی نیٹرز کے لیے بچوں کے حقوق کی

خلاف ورزیوں کے کوائف جمع کرنے بارے تربیتی ورکشاپ۔

13 جنوری، ملتان: ضلع میں امن اور رواداری کے موضوع پر پبلک میٹنگ۔

15 جنوری، مکران: ایچ آر سی پی اراکین کی ماہانہ میٹنگ

17-16 جنوری، صوابی: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانی اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

17 جنوری، کراچی: بزنس یونیورسٹی میں ایچ آر سی پی سندھ چیپٹر کو آرڈی نیٹر کا عالمی منشور برائے انسانی حقوق پر لیکچر

21 جنوری، ملتان: لیبر قوانین اور مزدوروں کے مسائل پر ٹریڈ یونین رہنماؤں اور وکلا کے ساتھ ایچ آر سی پی کی میٹنگ۔

22-21 جنوری، سکھر: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانی اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

22 جنوری، حیدر آباد: بنیادی آزادیوں، اذیت رسانی اور لسانی بدسلوکی پر اقوام متحدہ کے معاہدات کی سندھی زبان میں چار کتابوں کی اشاعت

23 جنوری، گلگت: شعبہ نسواں ترقی، جی بی کے ساتھ شعبہ کے ملازمین کے مسائل پر گفتگو کے لیے میٹنگ۔

عوام کے جمہوری حقوق کے متعلق ایک ضلعی سطح کی میٹنگ

24 جنوری، گلگت: ورکرز یونین شمالی علاقہ جات ٹرانسپورٹ کارپوریشن (نیٹکو) کے مسائل اور مطالبات جاننے کے لیے اُن کے ساتھ میٹنگ

25 جنوری، کراچی: جبری گمشدہ افراد کے رشتہ داروں کے ساتھ میٹنگ

25 جنوری، تربت: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر سیمینار

26 جنوری، تربت: انسانی حقوق اور نوجوانوں کی ذمہ داریوں پر سیمینار

26 جنوری، کراچی: لیبر عدالتوں اور قومی صنعتی تعلقات کمیشن (این آئی آر سی) کی ذمہ داریوں اور خامیوں پر گفتگوشنید کے لیے مزدور رہنماؤں کے ساتھ میٹنگ

26 جنوری، گوادر: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر سیمینار

27 جنوری، لسبیلہ: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر سیمینار

30 جنوری، سکھر: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانی اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

31 جنوری، گلگت: جی بی میں انسانی حقوق سے متعلقہ قانون سازی کے عمل پر گفت وشنید کے لیے گلگت بلتستان (جی بی) قانون ساز اسمبلی کے سپیکر کے ساتھ میٹنگ

یکم فروری، کراچی: سندھ یونیورسٹی، جام شورو میں امن عامہ کی صورت حال پر گفت وشنید کرنے اور گورنر سندھ کو اساتذہ کے مطالبات تسلیم کرنے پر فائل کرنے کے لیے گورنر سندھ کے ساتھ ملاقات۔

10 فروری، اسلام آباد: پاکستان ورکرز کنفیڈریشن کے تعاون سے مزدوروں کے حقوق پر سیمینار

10 فروری، اسلام آباد: صنعتی تعلقات آرڈیننس 2011 پر پاکستان ورکرز کنفیڈریشن اور ایچ آر سی پی کی جانب سے سیمینار

11 فروری، پشاور: فرنٹیر کرائمز ریگولیشن (ایف سی آر) میں اصلاحات پر سیمینار۔

11-12 فروری ٹھٹھہ: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

12 فروری، کراچی: خواتین کے قومی دن پر جوائنٹ ایکشن کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت۔

12-15 فروری، کراچی: انسانی حقوق کے مدافعین کے لیے ترین روزہ تربیتی ورکشاپ

15 فروری، حیدرآباد: دیہی سندھ میں مزدور رہنماؤں کے ساتھ لیبر عدالتوں اور مزدوروں کے مسائل بارے گفت وشنید۔

اپنے عقیدے کے باعث غیر محفوظ طبقات پر ورکنگ گروپ کا اجلاس

21 فروری، اسلام آباد: ماں بولی کے عالمی دن کے موقع پر 'سدا کوز دعا' کا پشتو اور تور والی زبانوں میں ترجمہ کی اشاعت۔

25-24 فروری، جھنگ: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ۔

29 فروری، ملتان: 20 فروری کو سماجی انصاف کے عالمی دن کے حوالے سے نیو سنٹرل جیل فیکٹری کے نزدیک ایک خیمہ لگایا گیا جس کا مقصد مزدوروں کے حقوق کی آ گاہی پھیلانا تھا جہاں متعدد خواتین مزدور تقرر نامے حاصل کیے بغیر کام کر رہی ہیں۔

8 مارچ، تربت، حیدر آباد، پاک پتن، ملتان: خواتین کے عالمی دن پر اجلاس۔

16 مارچ، گلگت: علاقے میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور مختلف فرقوں کے مابین امن کے قیام کے لیے حکومتی کردار پر گفت وشنید کے لیے میٹنگ۔

17-16 مارچ لاہور: ایچ آر سی پی کے ضلعی کوآرڈی نیٹرز اور کارکنوں کی تربیتی ورکشاپ

18 مارچ، لاہور: ایچ آر سی پی کا سالانہ عمومی اجلاس

22 مارچ اسلام آباد: ایچ آر سی پی کی سالانہ رپورٹ ''پاکستان میں انسانی حقوق کی صورت حال 2011'' کی اشاعتی تقریب۔

25-24 مارچ، خانیوال: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا

فروغ پر تربیتی ورکشاپ

30-29 مارچ، تربت: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

30 مارچ، ملتان: صنعتی مزدوروں کے مسائل پر بحث کرنے کے لیے اجلاس کا انعقاد، خواتین مزدوروں کے لیے تربیتی پروگراموں اور آگہی مہموں کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

4 اپریل، ٹوبہ ٹیک سنگھ: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر سیمینار

15-14 اپریل، بٹ گرام: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

16 اپریل، کراچی: مذہبی ہم آہنگی اور رواداری کے فروغ کے لیے متفقہ لائحہ عمل اپنانے کے لیے این جی اوز کے ساتھ میٹنگ

17-16 اپریل تورغر: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

12 اپریل، کراچی: غیر مسلموں کے تحفظ میں سول سوسائٹی کا کردار پر میٹنگ

28 اپریل، کراچی: اپنے عقیدے کے باعث غیر محفوظ طبقات پر ورکنگ گروپ کی میٹنگ

29-28 اپریل، اوکاڑہ، انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی میٹنگ

یکم مئی، کراچی: ایچ آر سی پی عملے کے اراکین کی جانب سے جماعت اسلامی کے کارکنوں کو یو ڈی ایچ آر پر لیکچر

5 مئی، رحیم یار خان: وکلا کے ساتھ انسانی حقوق کی آگہی بارے میٹنگ

5 مئی، لاہور: پنجاب کے مصنفین، شعرا اور فنکاروں کا کنونشن تاکہ معاشرے میں انسانی حقوق اور امن کے فروغ میں اُن کے کردار کا جائزہ لیا جاسکے۔

5 مئی، سرگودھا: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر سیمینار

5 مئی، رحیم یار خان: رحیم یار خان میں انسانی حقوق کی صورت حال جاننے کے لیے میٹنگ

7 مئی، کراچی: کراچی، بالخصوص لیاری میں امن و امان کی ابتر صورت حال پر گفت وشنید کے لیے شہریوں کے ساتھ میٹنگ۔

انتہا پسندوں کی مزاحمت کے لیے کارکنوں کی تربیت

8 مئی، تربت: کراچی، لیاری میں بدامنی پر بحث ومباحثہ کے لیے میٹنگ

10 مئی، گلگت: گلگت بلتستان میں انسانی حقوق سے متعلقہ معاملات جاننے کے لیے ایچ آر سی پی کور گروپ کے ساتھ میٹنگ

11 مئی، لاہور: کرپشن مخالف قوانین پر مشاورت

19 مئی، کراچی: کراچی میں امن وامان کی صورت حال جاننے کے لیے ایچ آر سی پی کے وفد نے متحدہ قومی موومنٹ کے مرکزی دفتر کا دورہ کیا۔

17-18 مئی، خوشاب: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

22 مئی، کوہاٹ: جمہوری حقوق کے فروغ میں شہریوں کی ذمہ داریوں پر پبلک میٹنگ جس میں توجہ کا مرکز انتخاباتی ذمہ داریاں تھا۔

23 مئی، بنوں: جمہوری حقوق کے فروغ میں شہریوں کی ذمہ داریاں پر پبلک میٹنگز جس میں توجہ کا مرکز انتخاباتی ذمہ داریاں تھا۔

23-24 مئی، سبی: رواداری پر دوروزہ ورکشاپ

24 مئی کرک: جمہوری حقوق کے فروغ میں شہریوں کی ذمہ داریاں پر پبلک میٹنگ جس میں توجہ کا مرکز انتخاباتی ذمہ داریاں تھا۔

25-24 مئی، سبی: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

25 مئی، کراچی: انسانی حقوق کے فروغ میں میڈیا کا کردار پر لیکچر

25 مئی، اسلام آباد: عقائد کے مابین ہم آہنگی اور رواداری پر ایچ آر سی پی کی جانب سے بنائی گئی فلم کے جائزے کی میٹنگ

26-25 مئی، سکھر: سندھ میں قبائلی تنازعات اور جرگہ سسٹم پر ورکشاپ

26-25 مئی بولان: رواداری پر دوروزہ ورکشاپ

27-26 مئی بولان: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

28 مئی کراچی: لیبر عدالتوں پر گفت وشنید کے لیے مزدور رہنماؤں کے ساتھ مشاورت

29 مئی، کراچی: کراچی پولیس افسران کو یوڈی ایچ آر اور آئی سی ای ایس آر پر لیکچر

5 جون، لاہور: جبری مشقت پر مشاورت

10-9 جون، بونیر، انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

17-16 جون، عمر کوٹ: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

18 جون، گلگت: قائمہ کمیٹی برائے امن کے چیئر مین کے ساتھ میٹنگ جس کا مقصد مسلکی ہم آہنگی اور امن کے فروغ میں کمیٹی کے کردار کا جائزہ لینا تھا۔

21 جون، لکی مروت: جمہوری حقوق کے فروغ میں شہریوں کا کردار پر پبلک میٹنگ جس میں توجہ کا مرکز انتخاباتی ذمہ داریاں تھیں۔

22 جون، ڈیرہ اسماعیل خان: جمہوری حقوق کے فروغ میں شہریوں کا کردار پر پبلک میٹنگ جس میں توجہ کا مرکز انتخاباتی ذمہ داریاں تھیں۔

22 جون، کراچی: ایچ آر سی پی اور قلم برائے امن، نے نوجوان شاعر اور انسانی حقوق کے کارکن ڈاکٹر ثروت زہرہ کے ساتھ ایک ادبی شام بسر کرنے کا اہتمام کیا۔

24-23 جون، گلگت: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا

فروغ پر تربیتی ورکشاپ

24-23 جون، لاہور: جبری مشقت پر مشاورت

29 جون، کراچی: ایس اے ایچ ای کے تعاون سے معاشرے میں اخلاقیات اور مثبت اقدار کے فروغ کے طریقوں پر مشاورت کا اہتمام۔

30 جون، کراچی: سندھ کے مصنفین، شعرا اور فنکاروں کا کنونشن تاکہ معاشرے میں انسانی حقوق اور امن کے فروغ میں اُن کے کردار کا جائزہ لیا جا سکے۔

30 جون گلگت: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر سیمینار

7 جولائی، پشاور: عدالتوں میں خواتین کے مقدمات کی نگرانی کے لیے وکلا کے ساتھ میٹنگ

12-11 جولائی، سوات: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

12 جولائی، اسلام آباد: سول۔ ملٹری تعلقات اور انسانی حقوق پر اُن کے اثرات پر سیمینار

14 جولائی، سکھر: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر پبلک میٹنگ

15-14 جولائی میلسی: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

15 جولائی، شکار پور: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر پبلک میٹنگ

16 جولائی، جیکب آباد: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر پبلک میٹنگ

17 جولائی، خیر پور: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر پبلک میٹنگ

19 جولائی، اسلام آباد: صحت بطور انسانی حق پر مشاورت

20 جولائی، کراچی: ماضی کے انتخابات کا جائزہ اور مستقبل کے انتخابات سے اُمیدیں پر لیکچر

22-21 جولائی، شکار پور، انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

25-24 جولائی، جام شورو: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

28-27 جولائی، بدین: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

مینگورہ میں آئی ڈی پیز کے مسائل پر مشاورت

27 جولائی، ملتان: انسانی حقوق کے مختلف پہلو اور ایٹمی ہتھیاروں کے اثرات پر مذاکرہ

6 اگست، ملتان: موجودہ صورت حال میں پاکستان کے سماجی و معاشی حالات پر ایٹمی ہتھیاروں کے اثرات پر میٹنگ

7 اگست، کراچی: کراچی، لیاری میں امن وامان کی صورت حال پر ایچ آر سی پی کی فیکٹ فائنڈنگ مشن کی میٹنگ

8 اگست، حیدر آباد: سیاسی کارکن نذیر عباسی کی بیسویں برسی منانے کے لیے میٹنگ

9 اگست، پشاور: کونسل رکن ملک جرار حسین نے ایچ آر سی پی کی ٹیم کو جیل کے دورے کرنے کے لیے تربیت دی۔

18 اگست، سکھر: مذہبی اقلیتوں بالخصوص ہندوؤں کے مسائل پر سیمینار

25 اگست، گوجرانوالہ: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر سیمینار

25 اگست، قلات: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

25 اگست، اسلام آباد: انسانی حقوق پر ایچ آر سی پی کی آن لائن دستاویزات کی افتتاحی تقریب

27-28 اگست، خضدار: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا

فروغ پر تربیتی ورکشاپ

29-30 اگست، مستونگ: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

30 اگست، اسلام آباد: جبری گمشدہ افراد پر ورکشاپ اور ایچ آر سی پی کی بلوچستان فیکٹ فائنڈنگ مشن کی رپورٹ کی اشاعت

01-02 ستمبر نوشکی: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

یکم ستمبر، تھر پارکر: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر پبلک میٹنگ

2 ستمبر، ٹنڈو الہیار: امن اور انسانی حقوق کے لیے جدوجہد پر پبلک میٹنگ

5-6 ستمبر، ملتان: کاشتکاروں کے حقوق پر دوروزہ قومی کنونشن

12 ستمبر، کراچی: بلدیہ فیکٹری میں آگ لگنے اور نتیجتاً بہت زیادہ انسانی جانوں کے ضیاع پر گفت وشنید کے لیے جوائنٹ ایکشن کمیٹی اور ایچ آر سی پی میں اراکین کی ہنگامی میٹنگ

12 ستمبر، کراچی: کراچی میں فیکٹری میں آگ لگنے کے واقعے پر کراچی میں پریس کانفرنس۔

12 ستمبر، لاہور: کراچی میں فیکٹری میں آگ لگنے کے واقعے پر لاہور میں پریس کانفرنس

27 ستمبر، کوہاٹ: شہریوں کے انسانی حقوق اور اُن کی ذمہ داریاں پر کالج میں میٹنگ

28 ستمبر، کراچی: ایچ آر سی پی فیکٹ فائنڈنگ ٹیم نے کراچی بلدیہ فیکٹری میں آگ لگنے، اُس کی وجوہات اور حکومتی ذمہ داری پر اپنی فیکٹ فائنڈنگ رپورٹ پیش کی۔

28 ستمبر، کراچی: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر ملیر، کراچی میں پبلک میٹنگ

30 ستمبر، کراچی: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر ویسٹ کراچی میں پبلک میٹنگ

2 اکتوبر، مالاکنڈ: جمہوری حقوق کے فروغ میں شہریوں کا کردار پر پبلک میٹنگ جس میں توجہ کا مرکز انتخاباتی ذمہ داریاں تھیں۔

2 اکتوبر، ملتان: رواداری کے عالمی دن پر ملک میں بڑھتی ہوئی عدم رواداری پر گفت وشنید کے لیے ایچ آر سی پی کے اراکین، کارکنوں، سول سوسائٹی اور وکلا کے ساتھ ایچ آر سی پی کی میٹنگ

3 اکتوبر شانگلہ: جمہوری حقوق کے فروغ میں شہریوں کا کردار پر پبلک میٹنگ جس میں توجہ کا مرکز انتخاباتی ذمہ داریاں تھیں۔

4 اکتوبر، کوہستان: جمہوری حقوق کے فروغ میں شہریوں کا کردار پر پبلک میٹنگ جس میں توجہ کا مرکز انتخاباتی ذمہ داریاں تھیں۔

5 اکتوبر، کراچی: سزائے موت کے خلاف لائحہ عمل پر گفت وشنید کے لیے جوائنٹ ایکشن کمیٹی نے ایچ آر سی پی کے دفتر میں میٹنگ کا انعقاد کیا۔

6-7 اکتوبر، لاہور: عام انتخابات میں ترجیحات پر ورکشاپ

10 اکتوبر، پشاور/ کراچی/ حیدرآباد/ ملتان/ چنیوٹ/ پاک پتن/ چمن/ گلگت/ ٹانک/ تربت/ خیر پور/ بونیر/ گوادر/ صوابی/ قلات/ جام پور/ منڈی بہاؤالدین اور خوشاب: سزائے موت کے خلاف عالمی دن پر سیمینارز کا انعقاد

18 اکتوبر، ساہیوال: نوجوان اور انسانی حقوق پر سیمینار

19-21 اکتوبر، لاہور: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

20 اکتوبر، حیدرآباد: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر پبلک میٹنگ

20 اکتوبر پشاور: خیبر پختونخوا کے مصنفین، شعرا اور فنکاروں کا کنونشن جس میں معاشرے میں انسانی حقوق اور امن کے فروغ میں اُن کے کردار کا جائزہ لیا گیا۔

22 اکتوبر سرگودھا: نوجوان اور انسانی حقوق پر سیمینار

23 اکتوبر، ملتان: ایچ آر سی پی کور گروپ کو عوام تک قابل رسائی بنانے کے طریقوں پر گفت وشنید کے لیے عوام کے ساتھ مشاورت

24 اکتوبر، ملتان: اقوام متحدہ کے دن کے موقع پر بوسن روڈ، ملتان پر آگہی کیمپ لگایا گیا جہاں اقوام متحدہ کے کردار پر بنیادی معلومات پر مبنی 500 پمفلٹ تقسیم کیے گئے۔

24 اکتوبر، کوئٹہ: بلوچستان کے مصنفین، شعراء اور فنکاروں کا کنونشن جس میں معاشرے میں انسانی حقوق اور امن کے فروغ میں اُن کے کردار کا جائزہ لیا گیا۔

30 اکتوبر، لاہور: پاکستان پر یو این یونیورسل سلسلہ وار نظر ثانی کی براہ راست سکریننگ

31 اکتوبر، جہلم: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر سیمینار

2 نومبر، چارسدہ: جمہوری حقوق کے فروغ میں شہریوں کا کردار پر پبلک میٹنگ جس میں توجہ کا مرکز انتخاباتی ذمہ داریاں تھیں۔

لاہور: ایچ آر سی پی کے عملے کی استعداد سازی کی ورکشاپ

3 نومبر، نوشہرہ: جمہوری حقوق کے فروغ میں شہریوں کا کردار پر پبلک میٹنگ جس میں انتخاباتی ذمہ داریاں توجہ کا مرکز تھیں۔

3-4 نومبر، دیر زیریں: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

4 نومبر، صوابی: جمہوری حقوق کے فروغ میں شہریوں کا کردار پر پبلک میٹنگ جس میں توجہ کا مرکز انتخاباتی ذمہ داریاں تھیں۔

5 نومبر، مردان: جمہوری حقوق کے فروغ میں شہریوں کا کردار پر پبلک میٹنگ جس میں توجہ کا مرکز انتخاباتی ذمہ داریاں تھیں۔

6-7 نومبر، دیر بالا: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

9 نومبر، سکھر: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

10 نومبر، حیدرآباد: پاکستان میں فورنیسک نفسیاتی علاج پر سیمینار

10-11 نومبر، مینگورہ: پاکستان میں اندرونی نقل مکانی کے باعث پیدا کردہ مشکلات پر مشاورت

15 نومبر، حیدرآباد: ایچ آر سی پی کے سابق چیئرپرسن مرحوم اقبال حیدر کے لیے تعزیتی میٹنگ

17 نومبر، ڈیرہ غازی خان: انسانی حقوق اور جمہوری ثقافت کے فروغ میں طالب علموں کا کردار پر مذاکرہ

19 نومبر، حیدر آباد: یو این عالمی ٹوائلٹ ڈے کے موقع پر انڈس فیوچر فاؤنڈیشن کے تعاون سے ایچ آر سی پی نے ایک اجلاس منعقد کیا۔ سندھ ہاری پراجیکٹ، انڈس رورل ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن، ادارہ برائے سماجی تبدیلی اور سندھ کمیونٹی فاؤنڈیشن کے اراکین نے اجلاس میں شرکت کی۔

22 نومبر، ہری پور: جمہوری حقوق کے فروغ میں شہریوں کا کردار پر پبلک میٹنگ کا انعقاد کیا گیا جس میں توجہ کا مرکز انتخابی ذمہ داریاں تھیں۔

23 نومبر، مانسہرہ: جمہوری حقوق کے فروغ میں شہریوں کا کردار پر پبلک میٹنگ جس میں توجہ کا مرکز انتخابی ذمہ داریاں تھیں۔

یکم دسمبر، ملتان: سٹی ماڈل سکول میں انسانی حقوق کی آگہی پر پروگرام

یکم دسمبر، بہاولنگر: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر سیمینار

7-9 دسمبر، لاہور: ایچ آر سی پی سٹاف کے لیے استعدادسازی کی ورکشاپ

10 دسمبر، جھنگ/ چنیوٹ/ ٹنڈو محمد خان/ دادو/ پشین/ حیدر آباد/ نواب شاہ/ ٹھٹھہ/ اوکاڑہ/ قلات/ کوئٹہ/ نوشہرو فیروز/ چمن/ شہدادکوٹ/ پاکپتن اور کراچی: انسانی حقوق کے عالمی دن پر اجلاسوں کا انعقاد

12 دسمبر، چارسدہ: گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج چارسدہ میں شہریوں کے انسانی حقوق اور اُن کی ذمہ داریاں پر میٹنگ

10 دسمبر، کراچی: خواتین کے خلاف تشدد کے انسداد کے لیے متحد ہونے کی ضرورت پر سیمینار

10 دسمبر، کراچی: 'اب صنفی مساوات' کے موضوع پر پوسٹرز کی نمائش کی تین روزہ ورکشاپ

13 دسمبر، مینگورہ: جمہوری حقوق کے فروغ میں شہریوں کا کردار پر پبلک میٹنگ جس میں توجہ کا مرکز، انتخابی ذمہ داریاں تھا۔

14 دسمبر، سیدو شریف: گورنمنٹ جہانزیب کالج، سیدو شریف میں شہریوں کے انسانی حقوق اور اُن کی ذمہ داریاں پر میٹنگ

15 دسمبر، نارووال: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر سیمینار

15-16 دسمبر، بہاولپور: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

15 دسمبر، سیالکوٹ: امن اور جمہوری حقوق کے لیے جدوجہد پر سیمینار

لاہور: اکانومی واچ نے انسانی حقوق کے تناظر میں ریاستی مصارف کا جائزہ لیا

20-19 دسمبر، دادو: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

20 دسمبر، صوابی: کرنل شیر خان گرلز کالج، صوابی میں شہریوں کے انسانی حقوق اور اُن کی ذمہ داریاں پر میٹنگ

21 دسمبر، منڈی بہاؤالدین: امن اور انسانی حقوق کے لیے جدوجہد پر سیمینار

22 دسمبر، چارسدہ: نیو مسلم کالج، چارسدہ میں شہریوں کے انسانی حقوق اور اُن کی ذمہ داریاں پر میٹنگ

22 دسمبر، اوکاڑہ: پاکستان میں جمہوری حقوق کے لیے لوگوں کی تنظیم سازی پر میٹنگ

22 دسمبر، اسلام آباد: عام انتخابات 2013 پر مشاورت

23-22 دسمبر، نوشہرو فیروز: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

24 دسمبر، مظفر گڑھ: 'جمہوریت و جمہوری اقدار کا فروغ اور شہریوں کا کردار' پر مذاکرہ

26 دسمبر، لاہور: پاکستان میں خوراک کا تحفظ، مسائل اور بہتر صورت حال کی توقعات' پر مشاورت

27 دسمبر، اسلام آباد: عام انتخابات 2013 کی تیاری پر مشاورت

28 دسمبر، کراچی: 'ہندوستان چھوڑ و تحریک اور تقسیم ہندوستان' پر ایچ آر سی پی کے ایک سابق کونسل رکن اور موجودہ رکن ایچ آر سی پی کا لیکچر۔ ملک بھر سے انسانی حقوق کے کارکنوں اور سول سوسائٹی کے اراکین نے تقریب میں شرکت کی۔

29-28 دسمبر، لکی مروت: انتہا پسندی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ پر تربیتی ورکشاپ

29 دسمبر، کراچی: اپنے عقیدے کے باعث غیر محفوظ طبقات پر ایچ آر سی پی کے ماہرین گروپ کی میٹنگ

30 دسمبر، لاہور: معیشت کی نگرانی، ریاستی اخراجات اور انسانی حقوق پر مشاورت

فیکٹ فائنڈنگ

12 جنوری، کراچی: سندھ یونیورسٹی جام شورو، سندھ میں پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد چنار کے قتل کے وقوعے کی فیکٹ فائنڈگ

29-26 مارچ، پشاور: اندرون نقل مکین افراد (آئی ڈی پیز) کیمپ جلوزئی کا دورہ جس کا مقصد وہاں مقیم افراد کے مسائل اور اُن کو حاصل ریلیف کا جائزہ لینا تھا۔

21 مارچ، پشاور: 6 سالہ لڑکی کا جنسی تشدد

23 مارچ، ملتان: جلال پور پیروالا، ملتان میں زیب مائی خاتون کا اغوا اور اُس کی فروخت

20 اپریل، جام شورو: بلیو بن سکول، کوٹری کے کمرے کی چھت کا گرنا

24 اپریل، دیر بالا: چوتھی اور پانچویں جماعت کے دو طلبا کی خودکشی

24 اپریل، چنیوٹ: فیکٹ فائنڈنگ ٹیم نے 30 مارچ 2012 کو پولیس کے تشدد سے ایک استاد کی ہلاکت کے وقوعے کی تحقیقات کیں۔

20-15 مئی، بلوچستان: چاروں صوبوں سے ایچ آر سی پی کونسل اراکین پر مشتمل فیکٹ فائنڈنگ ٹیم نے کوئٹہ، مستونگ اور پشین کا دورہ کیا اور صوبے میں انسانی حقوق کی صورت حال بارے مستند معلومات کے حصول کے لیے متعدد مختلف فریقین سے ملاقاتیں کیں۔

18-15 جون، ڈیرہ غازی خان: پانچ خواتین کے جنسی تشدد کے وقوعے کی تحقیقات

19 جون، جام شورو: کوٹری کے شورو قبیلے کے چار مزدوروں کی ماورائے عدالت ہلاکت

25 جون، کراچی: ایک کمسن ہندو بچی ریکھا کا اغوا

کوئٹہ: بلوچستان کے لیے ایچ آر سی پی فیکٹ فائنڈنگ مشن

28 جون، وہاڑی: نرگس بی بی کو اُس کے خاوند نے اِس شبہ پر تشدد کا نشانہ بنایا کہ خاتون نے اسقاط حمل کیا ہے۔

7 جولائی، بہاولپور: تضحیک رسالت کے ایک ملزم کو مشتعل ہجوم نے تھانے سے گھسیٹ کر باہر لا کر زندہ جلا دیا۔

7 جولائی، رحیم یار خان: ہندو کمیونٹی کی بے دخلی اور ہراسیمگی

19 جولائی، مظفر گڑھ: چار افراد نے دشمنی کے بدلے میں تین خواتین کو زندہ جلا دیا۔

19 جولائی، مرید کے: ڈیرہ سہگل کے مظاہرین مزارعوں پر پولیس تشدد کے واقعے کی تحقیقات تشدد کے باعث ایک راہگیر ہلاک ہو گیا تھا۔

9 اگست پشاور: ٹاؤن 1 کے مسیحی عملے کو اُن کی تنخواہیں نہیں ملی تھیں۔

11 اگست، مظفر گڑھ: ایک لڑکی کے خاندان نے دو خواتین کو ایک بس اسٹاپ پر برہنہ کر کے پیدل چلوایا۔ خواتین کے خاندان نے لڑکی کا رشتہ مانگا تھا جو ملزمان نے اپنے اونچے معاشرتی رُتبے کے باعث اپنی ہتک سمجھا اور اِس رنجش پر مذکورہ جرم کا ارتکاب کیا۔

12 اگست ڈیرہ غازی خان: ایک نوجوان کو اُس کے مذہبی استاد نے تشدد کا نشانہ بنایا۔

18 اگست، ملتان: ایک مدرسہ میں اساتذہ نے طالب علم کو تشدد کا نشانہ بنایا۔

22 اگست، مظفر گڑھ: 13 سالہ لڑکی کو اُس کے مذہبی استاد نے تشدد کا نشانہ بنایا۔

30 اگست، کراچی: عیسیٰ نگری، کراچی میں دوکانداروں سے بھتہ کا مطالبہ۔

4 ستمبر، کراچی: گوادر پریس کلب کے نائب صدر دلشاد ڈھانی کا قتل

15 ستمبر، کراچی: بلدیہ ٹاؤن کراچی میں واقع فیکٹری میں آگ لگنے کے باعث 259 ورکروں کی ہلاکت

21 ستمبر، حیدرآباد: ایک تاجر پر تضحیک مذہب کے الزامات

12 اکتوبر، کراچی: 16 سالہ مسیحی لڑکے پر تضحیک مذہب کے الزامات

2 نومبر، حیدرآباد: اپنی پسند کی شادی کرنے والے نوجوان لڑکے اور لڑکی کا قتل

23 دسمبر، ملتان: ایک گھریلو تنازعے کے باعث محمد حنیف نامی محنت کش کو قتل کر دیا گیا۔ طبی رپورٹس سے ثابت ہوا کہ موت تشدد کے باعث واقع ہوئی تھی۔

30 دسمبر، کراچی: دو لیڈی ہیلتھ ورکرز کا قتل

30 دسمبر، لودھراں: دو بہنوں 15 سالہ شازیہ اور 14 سالہ سعدیہ کا اغوا۔ مذکورہ لڑکیوں کے بھائی نے اغوا کار کی بیٹی سے پسند کی شادی کی تھی جس کا اُسے رنج تھا۔

31 دسمبر، ملتان: ایک نوجوان محمد بلال کی آنکھیں ایک لڑکی کے خاندان نے نکال دیں جنہیں شبہ تھا کہ محمد بلال نے اُن کی لڑکی کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کر رکھے ہیں۔

احتجاجی مظاہرے / ریلیاں / دورے

28 فروری، کوئٹہ: امن وامان کی ابتر صورت حال، اغوا برائے تاوان اور تشدد کے خلاف احتجاجی مظاہرہ

12 مارچ، ٹنڈو محمد خان: ضمنی انتخابات میں دھاندلی کے خلاف احتجاجی مظاہرہ

8 مارچ، ملتان: بلوچستان میں خواتین کی حالت زار کے خلاف مظاہرہ۔ ایک تھیٹر ڈرامے کے ذریعے بلوچ خواتین کے حالات زندگی کی عکاسی کی گئی اور لوگوں میں تحریری مواد تقسیم کیا گیا۔

13 مارچ، کوئٹہ: ڈاکٹر راجیش کمار کے اغوا، بدامنی، اغوا برائے تاوان اور تشدد کے خلاف احتجاج

22 مارچ، تربت: آل پاکستان کلرکس ایسوسی ایشن (اے پی سی اے) کے بھوک ہڑتالی کیمپ کا دورہ

22 مارچ، کوئٹہ: بلوچستان رُورل سپورٹ پروگرام (بی آر ایس پی) کے چھ اہلکاروں کے اغوا برائے تاوان کے بعد ایک مغوی کو قتل کر دیا گیا جس کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا گیا۔ دیگر 5 افراد بحفاظت بازیاب ہو گئے تھے۔

ملتان: جبری گمشدگیوں کے خلاف احتجاج

26 مارچ، پشاور: اندرون نقل مکین افراد (آئی ڈی پیز) کے لیے قائم جلوزئی کیمپ کا دورہ جس کا مقصد آئی ڈی پیز کے اندراج کا طریقہ کار اور خیبر ایجنسی سے نئے آئی ڈی پیز کی آبادکاری بارے میں معلومات لینا تھا۔

6 اپریل، سکھر: دارالامان (خواتین کی جائے پناہ) کا دورہ

17 اپریل، حیدرآباد: سندھ میں فرقہ وارانہ تشدد اور ہندو لڑکیوں کی جبری تبدیلی مذہب کے خلاف احتجاج

22 مئی، گلگت: سنٹرل جیل گلگت کا دورہ

23 مئی، گلگت: گلگت شہر میں یتیم خانے کا دورہ

6 جون حیدرآباد: عاصمہ جہانگیر کو قتل کی دھمکیوں کے خلاف احتجاج

8 جون، ملتان: سابق وزیراعظم کی رہائش گاہ کے باہر عاصمہ جہانگیر کو قتل کی دھمکیوں کی مذمت کے لیے اجتماع

6 جون، کراچی: عاصمہ جہانگیر کو قتل کی دھمکیوں کے خلاف پریس کانفرنس

12-11 جون، اسلام آباد: عاصمہ جہانگیر کو قتل کی دھمکیوں کے خلاف احتجاجی مظاہرہ اور پریس کانفرنس

22 جون، گلگت: ایک مقامی یونیورسٹی کے عملے اور طلبا کے ساتھ گلگت بلتستان میں جاری انسانی حقوق کی

صورت حال بارے تبادلہ کرنے کے لیے یونیورسٹی کا دورہ

29 جون، گلگت: ہنزہ میں واقع طلبا بہبود کے ادارے کے ساتھ میٹنگ جس کا مقصد انسانی حقوق کی تعلیم کے فروغ میں نوجوانوں کی تنظیموں کے کردار پر گفت وشنید کرنا تھا۔

21 جون، لکی مروت: لکی مروت جیل کا دورہ

26 جون، کراچی: عاصمہ جہانگیر کو قتل کی دھمکیوں کے خلاف جوائنٹ ایکشن کمیٹی کے ساتھ احتجاجی مظاہرہ

6 اگست حیدرآباد: کھپرو، سانگھڑ میں ایک زمیندار کی جانب سے ہاریوں کو غیر قانونی حراست میں رکھنے اور اُن کو مظالم کا نشانہ بنانے کے خلاف احتجاجی مظاہرہ

13 اگست، پشاور: پشاور سنٹرل جیل کا دورہ

15 اگست، پشاور: آئی ڈی پیز کی حالت زار کے بارے میں جاننے کے لیے جلوزئی کیمپ کا دورہ

13 اگست، حیدرآباد: لیاقت یونیورسٹی آف میڈیسن اینڈ ہیلتھ سائنسز کا دورہ جس کا مقصد ایک مذہبی تہوار میں زہریلا مشروب پینے کے بعد وہاں داخل ہندو مریضوں سے ملاقات کرنا تھا۔

30 اگست، کراچی / حیدرآباد / پشاور / کوئٹہ: جبری گمشدگی کے عالمی دن کے موقع پر پریس کلب کے باہر احتجاجی مظاہرے اور ریلیاں۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ جبری گمشدگی کے واقعات کا فوری نوٹس لے۔

21 ستمبر، پشاور: وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات (فاٹا) میں رجسٹرڈ ووٹرز کے بارے میں معلومات لینے کے لیے صوبائی الیکشن دفتر کا دورہ۔

24 ستمبر، بلوچستان: صوبے کے سیلاب زدہ علاقوں کا دورہ

10 اکتوبر، حیدرآباد: سزائے موت کے خلاف عالمی دن کے موقع پر ریلی کا انعقاد

11 اکتوبر، کراچی: طالبان کے ہاتھوں گولی لگنے سے زخمی ہونے والی لڑکیوں کی تعلیم کی حامی کم عمر ملالہ یوسف زئی کی حمایت میں شمعیں جلائی گئیں۔

11 اکتوبر، حیدرآباد: ملالہ یوسف زئی پر حملے کے خلاف احتجاجی مظاہرہ اور پریس کانفرنس

12 نومبر، حیدرآباد: حیدرآباد کے نزدیک گاؤں پچاری میں قبضہ مافیا کی جانب سے ہندومزدووں کو دھمکیوں کے خلاف احتجاج

21 دسمبر، ملتان: کراچی اور پشاور میں خواتین ہیلتھ ورکروں کے قتل کے خلاف احتجاج

مرکز شکایات

زیرنظر سال کے دوران ایچ آرسی پی کو 1,150 شکایات موصول ہوئیں۔ شکایات کی نوعیت درج ذیل تھی۔

☆ پولیس/انتظامیہ کے مظالم	232
☆ غیرریاستی عناصر/اثرورسوخ والے افراد کے مظالم	168
☆ خواتین کے حقوق کی خلاف ورزی/ گھریلوتشدد	144
☆ مخلوط	587
☆ بیرون ممالک سے شکایات	19
☆ کل	11,50
☆ حکام کو لکھے گئے خطوط	371
☆ موصول شدہ جواب	158

ویب سائٹ

ایچ آرسی پی کی ویب سائٹ www.hrcp-web.org پر ماہانہ اُردو جہدحق، پریس ریلیزوں، اور ایچ آر سی پی کے مشنوں اور سرگرمیوں کے بارے میں معلومات سمیت ایچ آر سی پی کی مطبوعات کا الیکٹرانک ورژن دستیاب ہے۔ ویب سائٹ کا آن لائن دستاویزات والا حصہ اگست 2012 میں متعارف کروایا گیا جس کا استعمال طلبا، ریسرچرز، صحافی اور دیگر حلقے کرتے ہیں۔

مطبوعات

☆ ایچ آرسی پی کی سالانہ رپورٹ: 2011 میں انسانی حقوق کی صورت حال (انگریزی/اردو)

☆ جہدحق 12 ماہانہ رسالے (اردو)

☆ پاکستان میں جبری گمشدگیاں: اقوام متحدہ کے ورکنگ گروپ کی ابتدائی رپورٹ اور سفارشات (انگریزی/اردو)

☆ بلوچستان میں اُمیدیں، خوف اور احساس بیگانگی (انگریزی/اردو)

☆ رمشا کیس: کوئی سن رہا ہے؟ (انگریزی)

☆ کیلنڈر 2013 (انگریزی)

☆ انتہاپسندوں سے نجات ممکن ہے؟ (اردو)

☆ انتہاپسندی کے خاتمے کے لیے انسانی حقوق اور انسانیت دوست اقدار کا فروغ (اردو)

ضمیمہ - 2

اہم مسائل پر کمیشن کا مؤقف

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے ایسے واقعات اور معاملات پر تبصروں اور آراء کا سلسلہ جاری رکھا جو عوام کے حقوق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ 2012 کے دوران کمیشن نے اہم مسائل پر جو مؤقف اختیار کیے ان کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

9 جنوری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے حالیہ ہفتوں کے دوران صحافیوں کو دھمکیاں ملنے کی اطلاعات پر تشویش کا اظہار کیا ہے اور حکام سے مطالبہ کیا ہے کہ صحافیوں کو لاحق خطرات اور صحافت کے پیشے سے منسلک خدشات کے خاتمے کو یقینی بنایا جائے۔

ایچ آر سی پی کی جانب سے جاری ہونے والے ایک بیان میں کہا گیا: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کو حالیہ دنوں میں صحافیوں کو دھمکیاں ملنے کی اطلاعات پر تشویش ہے۔ اگرچہ پاکستان میں مستقل طور پر خوف و ہراس اور تشدد کی فضا میں رہنا صحافیوں کے لیے کوئی خلاف معمول بات نہیں، مگر 2011 میں ایک درجن سے زائد صحافیوں کے قتل سے ان کو لاحق خطرات میں واضح اضافے کی نشاندہی ہوتی ہے اور متعدد دیگر صحافی اپنے ہی ملک میں روپوش ہونے پر مجبور ہیں۔ بیشتر نے اپنی سلامتی کے پیش نظر خاموشی اختیار کر لی ہے اور دیگر ایسے خیالات کے اظہار پر مشکلات اور خطرات کا سامنا کر رہے ہیں، جو بعض حلقوں میں غیر مقبول سمجھے جاتے ہیں۔

متعدد صحافیوں نے ''گمنام فون کالوں'' کے ذریعے ملنے والی دھمکیوں سے متعلق شکایت کی ہے۔ انہوں نے کال کرنے والے لوگوں کے فون نمبرز بھی بتائے ہیں مگر ان لوگوں کی شناخت کرنے یا ان کے خلاف قانونی

 کارروائی کرنے کے حوالے سے کچھ بھی نہیں کیا گیا۔میڈیا کی آزادی پر یقین رکھنے والی حکومت کو نہ تو ان حالات میں خاموش تماشائی بننا چاہیے اور نہ ہی اقدام اٹھانے کی استدعا آنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ایچ آر سی پی حکام کو یاد دہانی کرانا چاہتا ہے کہ گزشتہ دو برسوں سے پاکستان کا شمار صحافیوں کے لیے انتہائی خطرناک ممالک میں ہے۔ایچ آر سی پی اس بات کا اعادہ کرتا ہے کہ صحافیوں کو دھمکانے اور تشدد کا نشانہ بنانے والوں کی اس امر سے حوصلہ افزائی ہوئی ہے کہ گزشتہ عشرے میں پاکستان میں 70 سے زائد صحافی قتل ہوئے، مگر صرف ایک واقعہ میں ملوث ملزمان کو انصاف کے کٹہرے میں لایا گیا۔ایچ آر سی پی ایک بار پھر تمام ریاستی اداروں کو صحافیوں کو درپیش خطرات کا نوٹس لینے، انہیں ان کے کام کی بدولت دھمکانے والوں کی نشاندہی کرنے اور ان کے خلاف قانونی کارروائی کرنے، مزید برآں صحافت کو ایک محفوظ شعبہ بنانے کے امر کو یقینی بنانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ایچ آر سی پی ان صحافیوں کی پرزور حمایت کرتا ہے جو دھمکیوں اور خطرات کا سامنا کر رہے ہیں اور ان دھمکیوں سے آگاہ کرنے کے ان کے جرات مندانہ فیصلے کو قابل تحسین سمجھتا ہے۔

13 مارچ: انٹرنیٹ سنسر شپ کے اقدام کے خلاف عالمی دن کے موقع پر بین الاقوامی فیڈریشن برائے انسانی حقوق (FIDH) اور اس کی رکن تنظیم، پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (HRCP) نے پاکستانی وزارت اطلاعات وٹیکنالوجی کی جانب سے ایک وسیع فلٹرنگ سسٹم کو بروئے کار لاتے ہوئے انٹرنیٹ پر اظہار رائے، تخلیقی اور پرامن سوچ کی آزادی پر مزید پابندیاں عائد کرنے پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔اگر اس مجوزہ فلٹرنگ سسٹم پر عمل درآمد کیا گیا تو حکام کو ملکی سطح پر 50 ملین ''غیر ضروری'' ویب سائٹس کو بند کرنے کا اختیار مل جائے گا۔وزارت اطلاعات وٹیکنالوجی کے ادارے قومی آئی سی ٹی آر اینڈ فنڈ نے علمی/تحقیقاتی اداروں، کمپنیوں اور تنظیموں کو فروری میں درخواست کی تھی کہ وہ 16 مارچ، 2012 تک فلٹرنگ سسٹم کے قیام کے لیے تجاویز دیں۔درخواست میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ پاکستان میں انٹرنیٹ کا استعمال زیادہ تر لامحدود اور ناتفتیش کردہ ہے، چنانچہ پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی کے مطابق ''غیر ضروری'' مواد پر مبنی لاکھوں ویب سائٹس کو بند کرنے کے لیے انٹرنیٹ سروس فراہم کنندگان (ISPs) کے پاس انتہائی معیاری نظام ہونا چاہیے۔ایچ آر سی پی کی چیئرپرسن زہرا یوسف نے کہا ''سنسر شپ پہلے ہی پاکستان میں بہت سخت ہے؛ پہلے ہی 13,000 ایسی ویب سائٹس کو بند کیا جاچکا ہے جنہیں غیر اخلاقی مواد پر مبنی سمجھا جاتا تھا۔ 14 نومبر 2011 کو حکام نے موبائل آپریٹرز سے ایس ایم ایس کے مواد کو سنسر کرنے اور 1,600 الفاظ پر پابندی عائد کرنے کی درخواست کی تھی۔گزشتہ موسم گرما کے دوران، آپریٹرز کو ایسے انٹرنیٹ استعمال کنندگان کی فہرست دینے کا حکم جاری ہوا جو سنسر شپ سے بچنے کی کوشش کر رہے ہوں، جو کڑی نگرانی کے زمرے میں

آتا ہے''

2011 میں اقوام کی جنرل اسمبلی کو اپنی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے، یو این خصوصی رپورٹیئر برائے حقوق آزادی اظہار رائے، فرانک لارُو نے زور دیتے ہوئے کہا ''عمومی اصول کے مطابق'' دیگر انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے بین الاقوامی قانون کے متعین شدہ غیر معمولی اور محدود حالات کے علاوہ، انٹرنیٹ سے حاصل ہونے والی معلومات پر ممکنہ حد تک کم پابندی عائد ہونی چاہیے۔

خصوصی رپورٹیئر نے یہ بھی کہا کہ اگر پابندیاں عائد کی جائیں تو ریاست کو کسی بھی مخصوص ویب سائٹ کو بند کرنے کی ضرورت اور جواز سے آگاہ کرنا چاہیے اور مجاز عدالتی اتھارٹی یا کسی بھی قسم کے سیاسی، تجارتی یا دیگر غیر ضروری دباؤ سے آزاد ادارے کے ذریعے اس بات کا تعین کیا جائے کہ کونسے مواد پر پابندی عائد ہونی چاہیے تاکہ پابندی کو سنسر شپ کے ذریعے کے طور پر استعمال نہ کیا جاسکے۔ FIDH کے صدر بساؤ ہائیر بلسن نے کہا کہ ''بین الاقوامی قانون نے اظہار کی ان اقسام کو واضح کیا ہے جن پر قانونی طور پر پابندی عائد کی جاسکتی ہے، مثلاً نسلی منافرت کی تبلیغ یا بچوں سے متعلقہ فحش مواد کا فروغ، مگر محض اس جواز پر اظہار اور آراء پر پابندیاں عائد کردینا کہ وہ حکومت کے لیے خطرے کا باعث ہیں یا موجودہ سماجی اقدار کے لیے معترض ہیں، بین الاقوامی قانون کے تحت آزادی اظہار رائے کے تحفظ کے پاکستانی فریضے سے ہم آہنگ نہیں''۔ FIDH اور HRCP نے حکومت پاکستان سے درخواست کی ہے کہ فلٹرنگ نظام کے قیام میں عجلت کا مظاہرہ نہ کیا جائے اور اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ انٹرنیٹ سنسر شپ اور نگرانی کی باضابطگی کا خاتمہ نہ ہو اور مجوزہ نظام آزادی اظہار رائے کے تحفظ کے پاکستانی فریضے کی مطابقت میں ہو۔

اس ضمن میں سول سوسائٹی اور انسانی حقوق کی تنظیموں سے بامعنی مشاورت ہونی چاہیے اور منصوبے کو عملی جامہ پہناتے وقت ان کی سفارشات کو مدنظر رکھا جائے۔

19 نومبر: پنجگور میں صحافی کے قتل کی مذمت کرتے ہوئے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے مطالبہ کیا ہے کہ نہ صرف قاتلوں کی گرفتاری کے لیے سنجیدہ اور ٹھوس اقدامات اٹھائے جائیں بلکہ اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ صحافی پرامن اور محفوظ ماحول میں اپنے فرائض ادا کرسکیں۔

پیر کو جاری ہونے والے بیان میں ایچ آر سی پی نے کہا: ایچ آر سی پی کو پنجگور میں صحافی رحمت اللہ عابد کے بہیمانہ قتل پر شدید دُکھ ہے۔ یہ اِس سال بلوچستان میں چھٹے صحافی کی ہلاکت کا واقعہ ہے اور ایک مرتبہ پھر پاکستان میں صحافیوں کو درپیش بڑھتے ہوئے عدم تحفظ اور بلوچستان میں امن عامہ کی مکمل طور پر بگڑتی ہوئی صورت حال کی نشاندہی کرتا ہے۔ وزیر اعلیٰ بلوچستان اور وفاقی وزیر داخلہ کی جانب سے قاتلوں کی جلد از جلد

گرفتاری کے مطالبات اعتماد حاصل کرنے میں بڑی حد تک ناکام ہیں۔ اُن کی جرأت مندی کو بار بار جانچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس معاملے کو بلوچستان میں جاری قتل و غارت کی لہر سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور اس پر سنجیدگی کے ساتھ قابو پانے کی ضرورت ہے۔

صحافیوں کو قاتلوں کے گروہ واضح طور پر اس وجہ سے ہدف بناتے ہیں کہ وہ نہیں چاہتے کہ صحافی اُن کے جرائم کو رپورٹ کریں۔ میڈیا سے وابستہ افراد ریاست سے مکمل تحفظ کی ضمانت اور معاشرے سے ممکنہ حمایت حاصل کرنے کے مستحق ہیں۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ میڈیا مالکان کی تنظیمیں، ایڈیٹرز اور فیلڈ میں کام کرنے والے صحافی ریاستی حکام کے تعاون سے کام کرنے والے تمام صحافیوں خصوصاً کشیدگی زدہ علاقوں میں کام کرنے والے صحافیوں کے تحفظ کے لیے ایک منظم مہم چلائیں۔ مسٹر عابد کے قاتلوں کو گرفتار کرنے کا کام پوری ذمہ داری اور عزم کے ساتھ سرانجام دینا چاہیے نہ کہ اس طرح کرنا چاہیے جس کا مشاہدہ عموماً ایسے واقعات میں کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں حکومت اور مسٹر عابد کے مالکان، دونوں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مقتول کے اہل خانہ کی مالیاتی اور جذباتی بحران پر قابو پانے میں مدد کریں جس بحران کو قاتلوں کی گولیوں نے جنم دیا ہے۔

28 نومبر: سینئر صحافی حامد میر کو قتل کرنے کی کوشش پر تشویش کا اظہار کرتے اور اس کی مذمت کرتے ہوئے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے صحافیوں کے مکمل تحفظ کے لیے ہر ممکن اقدامات اٹھانے کا مطالبہ کیا ہے۔ کمیشن کی جانب سے جاری ہونے والے ایک بیان میں کہا گیا: صحافی حامد میر کو قتل کرنے کی کوشش سے کسی مخصوص صحافی کو درپیش خطرے سے قطع نظر زیادہ اہم نوعیت کے خدشات نے جنم لیا ہے۔ اطلاعات کے مطابق طالبان کے ایک ترجمان نے اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے ہر اس صحافی کو قتل کرنے کی منصوبہ سازی کر رکھی ہے جو شدت پسند تنظیموں کے اقدامات بارے تنقیدی رپورٹنگ کرے گا۔ چنانچہ کئی صحافی قتل ہونے کے خطرے کی زد میں ہیں۔ حکام کا فرض ہے کہ وہ معلوم کریں کہ میڈیا سے وابستہ کن افراد کو خطرات لاحق ہیں اور ان کے تحفظ کے لیے تمام ممکنہ اقدامات اٹھائیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی واضح ہے کہ تمام میڈیا حملے کی زد میں ہے جس کے باعث کشیدگی زدہ علاقوں میں صورتحال کی میڈیا کوریج پر شدید منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ مذکورہ علاقوں سے پہلے ہی معلومات بہت کم ملتی ہیں اور لوگوں کو ملک کے حالات پر مناسب ردعمل ظاہر کرنے میں مشکلات درپیش ہیں۔ صورتحال میں اس وقت تک بہتری نہیں آ سکتی جب تک ریاست شورش زدہ علاقوں کے حالات کو کوریج دینے کے حوالے سے صحافیوں کو جرات کا مظاہرہ کرنے کے عمل میں ان کی مدد نہیں کرتی۔ چنانچہ، صحافیوں پر تشدد میں ملوث مجرموں کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے حکومت کو

صحافیوں کے تحفظ کو یقینی بنانے کو ترجیح دینی چاہیے۔

عقیدے اور مذہب کی آزادی/فرقہ واریت

16 جنوری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے خان پور میں چہلم جلوس پر حملے کی شدید مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ فرقہ وارانہ دہشت گردی کے ناسُور سے نبٹنے میں ناکامی کی بنیادی وجہ مذہبی انتہا پسندی کی جانب تمام ریاستی اداروں کا نرم رویہ ہے۔

ایک بیان میں ایچ آر سی پی نے کہا: ''ایچ آر سی پی خان پور میں چہلم جلوس پر ہونے والے بم دھماکے کی مذمت اور متاثرہ خاندانوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ فرقہ وارانہ تشدد کے مرتکب افراد عوام کو نقصان پہنچانے کے نت نئے طریقے ڈھونڈنے میں مصروف رہتے ہیں۔ مذہبی تقریبات کے موقع پر فرقہ وارانہ ہلاکتوں کی لہر کو روکنے میں پولیس کے اقدامات ناکام ثابت ہو رہے ہیں۔ اگرچہ مرض کی علامات پر توجہ صرف کرنا اہم ہے، مگر پاکستان میں فرقہ وارانہ تشدد کا سلسلہ جاری رہے کیونکہ اس کے سبب پر توجہ مبذول نہیں کی گئی۔ یہ بات واضح ہے کہ یہ سلسلہ نہ رکنے کی وجہ یہ ہے کہ تمام ریاستی ادارے مذہبی انتہا پسندی کی جانب نرم رویہ رکھتے ہیں اور وہ اس کے ساتھ قانون کے مطابق نبٹنے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ اس صورتحال میں قتل و غارت کا سلسلہ نہیں رُکے گا۔

''یہ خوش آئند امر ہے کہ کم از کم ایک مذہبی سیاسی جماعت کے رہنما نے خان پور میں ہونے والی ہلاکتوں کی مذمت کی ہے۔ ایچ آر سی پی کے خیال کے مطابق تمام جماعتوں اور گروہوں، بالخصوص مذہبی جماعتوں کے پاس دہشت گردی کے اس واقعہ کی مذمت کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ رواداری پر یقین رکھنے والے سول سوسائٹی کے تمام حلقے ایسے بھیانک مظالم پر قابل مذمت خاموشی اور اس کے سبب کو بے نقاب کرنے میں اپنا متفقہ کردار ادا کریں۔ تاہم ریاست کو چاہیے کہ وہ شہریوں کو اپنے تحفظات اور خواہشات کا اظہار کرنے کے لیے ساز گار ماحول فراہم کرے۔ اور فیصلہ کن اقدام اٹھانے میں کسی قسم کی تاخیر کے باعث نہ صرف غفلت بلکہ جرم میں ملی بھگت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ریاست کو چاہیے کہ وہ اس انداز سے متاثرہ کمیونٹی کے ساتھ رابطہ کرے کہ جس سے ظاہر ہو کہ اسے اس معاملے کی سنگینی کا احساس اور شہریوں کی زندگیوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکامی پر ندامت ہے۔ مزید برآں طویل عرصہ تک عدم رواداری کو فروغ دینے کے بعد اب ریاست کو رواداری کے فروغ کی جدوجہد کرنی چاہیے۔

یکم مارچ: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ملک میں فرقہ وارانہ تشدد کے خاتمے کے لیے، جہاں ضروری ہو فوج سے مدد لی جائے اور بروز منگل ایک بس پر حملے کے باعث اہل تشیع سے تعلق رکھنے والے 18 افراد کے قتل میں ملوث ملزمان کا سراغ لگایا جائے۔

جاری ہونے والے ایک بیان میں ایچ آر سی پی نے کہا؛ کمیشن کو گلگت جانے والی بس پر گھناؤنے فرقہ وارانہ حملے کا شدید دکھ ہے جس کے نتیجے میں 18 شیعہ افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ کمیشن نے آرمی چیف کی اس پیشکش کو خوش آئند قرار دیا ہے جس میں انہوں نے بعض اطلاعات کے مطابق فوجی وردی میں ملبوس حملہ آوروں کے ہاتھوں ہونے والی سنگین ہلاکتوں کے واقعہ کی تحقیقات میں تعاون کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اس معاملے کے دو پہلو ہیں، سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ جس جگہ حملہ ہوا ہے، اس علاقے میں فوج کی کثیر تعداد موجود ہے اور وہاں فرقہ وارانہ تشدد کے متعدد واقعات کا وقوع پذیر ہونا اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ سول حکام اور فوجی حکام مل کر حفاظتی اور انسدادی لائحہ عمل اختیار کرنے کی سعی کریں۔ اس کے ساتھ ہی ملک بھر کی مارکیٹوں میں فوجی وردیوں کی بلا روک فروخت پر قابو پانے کی اشد ضرورت ہے۔

ایچ آر سی پی کا مطالبہ ہے کہ گزشتہ دس برسوں میں فرقہ وارانہ فسادات کے واقعات کے علاوہ بس مسافرین پر حالیہ افسوس ناک حملے کی غیر جانبدارانہ اور آزاد اتھارٹی کے ذریعے تحقیقات ہونی چاہئیں تاکہ مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جاسکے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور برداشت کے فروغ کے لئے اپنی کوششوں کو تیز کردے تاکہ مزید قتل و غارت سے بچا جاسکے۔ اسے فرقہ وارانہ جنگجو گروہوں کے خلاف فیصلہ کن اقدام اٹھانے اور فرقہ وارانہ تشدد کے جرم میں پکڑے جانے والوں کے خلاف موثر قانونی چارہ جوئی کرنے کے حوالے سے قوت ارادی اور عزم کا مظاہر بھی کرنا ہوگا۔

5 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے گلگت بلتستان میں فرقہ وارانہ فساد کے نتیجے میں ہونے والے زندگیوں کے ضیاع پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ علاقے میں امن کے فوری قیام کے لیے حکومت، سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی کی تنظیموں کو ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہئے۔ جمعرات کو جاری ہونے والے ایک بیان میں، کمیشن نے کہا: ''ایچ آر سی پی گلگت بلتستان میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کے بھیانک اور طویل سلسلے پر نہایت فکرمند ہے اور اس کی پرزور مذمت کرتا ہے۔ گلگت میں کرفیو کے نفاذ اور عسکری دستوں کی تعیناتی کے بعد پیدا ہونے والے وقتی خاموشی تناؤ کی صورتحال کی عکاسی کرتی ہے۔ اور انتقامی حملے اور اغواء کاری کے واقعات کی اطلاعات موصول ہو رہی ہیں، ان تحفظات کے دوران کہ حکومت محض نسبتاً زیادہ متشدد واقعات پر جوابی اقدام اٹھاتی ہے اور اس نے معذرت خواہانہ رویہ اختیار

کر رکھا ہے۔

ایچ آر سی پی انتہائی فکر مند ہے کہ لوگ شدید مشکلات کا شکار ہیں کیونکہ انہیں اشیائے خورد ونوش، یہاں تک کہ بچوں کے دودھ کی قلت کا سامنا ہے۔ ہسپتالوں میں ادویات کا فقدان ہے اور خوراک کی راشن بندی کی جاری ہے جبکہ کرفیو کا نفاذ بغیر کسی وقفے کے جاری ہے۔ جن لوگوں نے فرقے یا عقیدے سے بالاتر ہو کر محض انسانی زندگی کو قابل قدر جان کر دیگر لوگوں کو پناہ فراہم کی، اس عمل کے نتیجے میں اب خود ان کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ تمام افراد کی زندگیوں اور املاک کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے تمام ممکنہ اقدامات اٹھائے جائیں۔ یہ سوچنا دانشمندی نہیں ہے کہ گلگت بلتستان میں گزشتہ چند دنوں کے واقعات کے زخم کرفیو کے نفاذ، یا موبائل فون کی سروس کی بندش یا امن کی تبلیغ سے مندمل ہو جائیں گے۔ زخموں پر مرہم لگانے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ کا انتہائی مشکل کام متاثرہ برادریوں کی مشاورت سے جلد از جلد شروع ہونا چاہئے اور جاری رہنا چاہئے۔ سیاسی جماعتوں کو ایک دوسرے کی ملامت کرنے کا سلسلہ ترک کر دینا چاہئے اور تشدد کی کھلے عام واضح مذمت کرنے کے علاوہ انہیں اس صورتحال کو کنٹرول کرنے اور مستقبل میں اس بے معنی تشدد کو دوبارہ پیدا ہونے سے روکنے کے حوالے سے عوام کو اپنے لائحہ عمل سے آگاہ کرنا چاہئے۔ انہیں اس مقصد کے حصول کے لیے حکومت کا ساتھ دینا چاہئے۔

گلگت میں فساد کو ہوا دینے والوں کی نشاندہی ہونی چاہئے اور ان کے خلاف قانونی کارروائی ہونی چاہئے جیسا کہ ٹارگٹ کلنگ کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف ہونی چاہئے۔ درحقیقت، کوئٹہ، کراچی اور ملک کے دیگر حصوں میں فرقہ وارانہ تشخص کی بنیاد پر ہونے والی قتل وغارت کے انسداد کے لیے بھی اتنی ہی توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے اور نفرت کا پرچار کرنے والوں کو یہ واضح پیغام دیا جائے کہ انہیں لوگوں اور امن عامہ کو یرغمال بنانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

11 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے بدھ کو کہا ہے کہ کوئٹہ اور گلگت بلتستان میں جاری فرقہ وارانہ قتل وغارت گری معاشرے میں پھیلی ہوئی عدم برداشت پر قابو پانے میں ریاست کی مکمل ناکامی کا مظہر ہے جو ملک کو درپیش بڑے خطرات میں سے ایک ہے۔

کمیشن نے ایک بیان میں کہا ''ایچ آر سی پی کو ملک، خصوصاً کوئٹہ اور بلتستان میں فرقہ وارانہ قتل وغارت کے بڑھتے ہوئے سلسلے پر شدید تشویش ہے ان ہلاکتوں سے ایک پریشان کن رجحان کی عکاسی ہوتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ یہ واقعات طے شدہ تسلسل کا حصہ ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ان واقعات میں افغانستان سے دراندازی کرنے والے شرپسند ملوث ہیں۔ یہ مسئلے کا ایک پہلو ہوسکتا ہے مگر بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ جس بے حس قتل

وغارت کا ہم ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں،اس کا بنیادی سبب معاشرے میں وہ مذہبی عدم برداشت ہے جس کے ظہور پذیر ہونے میں ریاست نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ مذہب کے نام پر سیاست نے پہلے سے خراب صورتحال کو مزید ابتر کر دیا ہے۔ یہ امر باعث تشویش ہے کہ کئی برسوں سے ہونے والی ان ہلاکتوں کے ذمہ داران میں سے کسی کا بھی سراغ نہیں لگایا گیا۔اس بے حسی کی قیمت لوگوں کو اپنی زندگیوں کی صورت میں چکانا پڑ رہی ہے۔کمیشن مطالبہ کرتا ہے کہ محض علامات سے نبٹنے پر وقت ضائع کرنے کی بجائے، مسئلے کے بنیادی سبب کا سراغ لگا کر اس کا ازالہ کیا جائے۔حقائق سے چشم پوشی ترک کر کے ہمیں اب ان پالیسیوں کی نشاندہی کرنی چاہئے جو کہ معاشرے میں انتہا پسندی اور عقیدے کی بنیاد پر منافرت کے فروغ کا سبب ہیں۔ یہ پاکستان کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں۔

ان پر خطر حالات میں،عوام کے حقوق، انسانی وقار اور پاکستان کے بہتر مستقبل پر یقین رکھنے والوں کو خاموش نہیں رہنا چاہئے۔بصورت دیگر ملک کے لیے اس کے نتائج ناقابل تصور حد تک تباہ کن ہوں گے۔

اقلیتیں

5 جون: ہائی کمشنر اقوام متحدہ برائے انسانی حقوق محترمہ نیوی پلے نے مذہبی اقلیتوں کے رہنماؤں سے ملاقات کی اور سول سوسائٹی کی تنظیموں کے نمائندوں، وکلاء اور صحافیوں کے ساتھ خیالات کا تبادلہ کیا۔بعد میں سول سوسائٹی کے نمائندوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے ان کے ساتھ چائے پی۔ یہ تمام اجلاس ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے دفتر میں منعقد ہوئے۔ہائی کمشنر نے مختصر طور پر سول سوسائٹی کے ارکان کو اپنے مشن کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اقلیتی برادریوں کے نمائندوں نے امتیازی سلوک کے مسئلے کو اجاگر کیا اور ان مسائل کی وضاحت کی جو توہین رسالت قانون کی پیداوار ہیں اور یہ بھی بتایا کہ ملازمتوں اور تعلیم کے میدان میں ان سے کس طرح امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔سول سوسائٹی کی تنظیموں نے عسکریت پسندی کی وجوہات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ حکومت کی رٹ یا اتھارٹی کس طرح معدوم ہوتی جا رہی ہے،صحافیوں کو کن خطرات کا سامنا ہے اور انسانی حقوق کے کارکن کن خطرات سے دوچار ہیں۔مزید برآں یہ بتایا کہ عسکریت پسند کس طرح کھلے بندوں پھرتے ہیں،تعلیم کی صورت حال کیسی ہے، انتہا پسندی کیوں پھل پھول رہی ہے،نوجوان مایوسی کا کیوں شکار ہیں، بچوں اور نوجوانوں میں عدم رواداری کیوں بڑھ رہی ہے، جھگڑے نمٹانے کے متبادل راستے کیوں معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور معاشرے کو اس حوالے سے کن مسائل سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔

29 جون: حال ہی میں بلوچستان میں شیعہ زائرین کا بہیمانہ قتل ایک بار پھر اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ دہشت گرد مذہب کی بنیاد پر شہریوں کو نشانہ بنانے پر تلے ہوئے ہیں اور ریاست یا تو کوئی کارروائی کرنا ہی نہیں چاہتی یا ان ہلاکتوں کو روکنے میں ناکام ہوگئی ہے۔

ایچ آر سی پی نے کہا: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق ان خاندانوں کے دُکھ میں برابر کا شریک ہے جو جمعرات کے روز کوئٹہ میں دہشت گردوں کے حملے کے نتیجے میں ہلاک ہوئے یا زخمی ہوئے۔ حملہ آوروں نے شیعہ زائرین کی ایک بس کو نشانہ بنایا تھا۔

گزشتہ سال بلوچستان میں ایران جانے والے زائرین کی بس پر حملے کے بعد یقین تھا کہ جب تک مجرموں کو پکڑا نہیں جاتا وہ ایک بار پھر ظلم ڈھائیں گے۔ انہوں نے جمعرات کے روز ایسا ہی کیا۔ اس بار پولیس کی ایک ٹیم گاڑی کے ساتھ تھی، اور جیسا کہ مستونگ کے حملے میں ہوا نہ تو اس حملے کو روکا جاسکا اور نہ ہی مجرموں کو پکڑا گیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ لوگ جو مارے گئے یا زخمی ہوئے اُنہیں نسبتاً جلدی ہسپتال پہنچایا گیا۔ صرف 2012 کے دوران بلوچستان میں ہلاک کیے جانے والے شیعہ حضرات کی تعداد 60 (ساٹھ) سے زائد ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ قاتل کون ہیں۔ ہر حملے کے ساتھ حملہ آوروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں سکیورٹی فورسز کی ہمدردی اور اعانت حاصل ہے......کم از کم اس کمیونٹی کے مطابق جسے نشانہ بنایا جارہا ہے۔

ان حالات میں بلوچستان کی شیعہ آبادی......اور خاص طور پر ایران جانے والے زائرین......خود کو انتہائی غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔ یہ حیرانگی کی بات نہیں ہے کہ ہزارہ فرقے سے تعلق رکھنے والے متعدد نوجوان ملک چھوڑ کر چلے جانا چاہتے ہیں......حفاظت اور حفظ وامان کی تلاش میں اور اس مقصد کے لیے وہ بعض اوقات ٹوٹی پھوٹی کشتیوں میں سفر کرنے کا خطرہ بھی مول لینے کے لیے تیار ہیں اور بعض اوقات انہیں ایسے پانیوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے جہاں شارک مچھلیاں اور مگرمچھ ہوتے ہیں۔ 2011 کے دوران ایسی ہی ایک کوشش میں 70 نوجوان انڈونیشیا میں اپنی قیمتی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق شیعہ زائرین پر حملے کی شدید مذمت کرتا ہے اور کمیشن کو اس بات پر سخت صدمہ ہے کہ حکام اس سلسلے میں کچھ نہ کرسکے یا وہ دہشت گردوں کے خلاف کارروائی کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے......خاص طور پر لشکر جھنگوی کے خلاف......جس نے متعدد بار ان حملوں کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ اس حملے کی تفتیش کے دوران اس بات کی تفتیش بھی کی جانی چاہیے کہ دہشت گردوں کی مدد اور پشت پناہی کون کررہا ہے......بشمول سکیورٹی ایجنسیز...... یہ الزام بھی عائد کیا گیا ہے کہ ایران جانے والے جن زائرین کو جمعرات کے روز ہدف بنایا گیا درحقیقت کئی بسوں میں بیٹھے ہوئے تھے لیکن حکام نے انہیں ایک ہی بس میں جانے کے لیے کہا جسے بعد میں نشانہ بنایا گیا۔ کمیونٹی کے

کچھ افراد نے اسے ایک ثبوت کا نام دیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قانون نافذ کرنے والے کچھ اداروں میں بعض لوگ یا بعض عناصر دہشت گردوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔کمیشن اس الزام یا دعوے کی صداقت یا سچائی کو ثابت نہیں کرسکتا لیکن اس الزام کی بھی تحقیقات ہونی چاہیے۔حکومت کمیونٹی کی حالت زار کے بارے میں سوچ بچار کرے کہ وہ کس ابتلا میں پھنسی ہوئی ہے۔اس فرقے کا منظّم اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل عام کھلم کھلی بربریت اور جارحیت ہے۔کمیشن کو یقین ہے کہ جب تک قاتلوں کو پکڑا نہیں جاتا اور انہیں قرار واقعی سزا نہیں دی جاتی پاکستان ایک ایسی جگہ میں تبدیل ہوجائے گا جہاں زندگی گزارنا مشکل ہوجائے گا۔

10 اگست: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے سندھ اور بلوچستان سے مذہبی اقلیتی برادریوں کی بڑھتی ہوئی نقل مکانی پرتشویش کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ سول سوسائٹی کی جانب سے متعدد یاددہانیوں کے باوجود ریاست اقلیتوں کے تحفظات کا ازالہ کرنے میں مکمل طور پرناکام ثابت ہوئی ہے۔

کمیشن نے کہا: ''ایسی اطلاعات شدید تشویش اور غصے کا سبب بنیں کہ سندھ اور بلوچستان سے سینکڑوں ہندوشہری انڈیا نقل مکانی کررہے ہیں مگر اس انکشاف نے لوگوں کی تشویش اور غصے میں کمی پیدا کردی ہے کہ وہ وہاں مذہبی مقامات کی زیارت پر جارہے ہیں۔اُن میں سے زیادہ تر نے کہا ہے کہ وہ پاکستان واپس آجائیں گے جبکہ کچھ نے کہا ہے کہ وہ واپس نہیں آئیں گے۔

بہرحال سندھ اور بلوچستان سے ہندوشہریوں کی انڈیا منتقلی کی اطلاعات تواتر کے ساتھ منظرِ عام پرآ رہی ہیں۔اقلیتی طبقوں کے کچھ نمائندوں کا کہنا ہے کہ بعض عناصر کے مفادات غیرمسلموں کے لیے خوف و خطرے کا باعث ہیں اور اُنہیں نقل مکانی کرنے پر مجبور کررہے ہیں۔ان میں سے بعض عناصر مذہبی انتہاپسند ہیں جبکہ دیگر اقلیتوں کی املاک پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔صورت خواہ کوئی بھی ہو، یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اقلیتوں کو مایوس کن حالات میں دھکیلا جارہا ہے۔

سندھ اور بلوچستان سے مذہبی اقلیتوں کی جاری نقل مکانی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ریاست ان شہریوں کو تشدد، امتیازی سلوک اور نوجوان خواتین کی جبری تبدیلی مذہب جیسے قابل مذمت مظالم سے تحفظ فراہم کرنے میں ناکام ہے۔بالخصوص حال ہی میں ٹیلی ویژن پرایک نوجوان ہندوآدمی کی تبدیلی مذہب کی براہ راست نشریات سے غیرمسلموں کی جانب مذمت انگیز اور ناقابل دفاع رویے کی عکاسی ہوئی ہے۔

ایچ آرسی پی شدید امید کرتا ہے کہ حکومت اس حوالے سے ذمہ داری کا احساس کرے گی اور کمیشن ریاست سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مذہبی اقلیتوں کی مشاورت کے ساتھ اُن کی ملک سے نقل مکانی کے اسباب کا ازالہ کرے۔ایچ آرسی پی، سول سوسائٹی اور میڈیا سے بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ انتہائی منظّم ومحتاط طریقے سے

مذکورہ طبقوں کو درپیش مظالم کو اجاگر کرتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے پاس بھی موقع ہے کہ وہ انتخابات سے قبل اپنے منشور اور اس سے بھی زیادہ اپنے اقدامات سے پاکستان کی مذہبی اقلیتوں کے بارے میں اپنا نقطہ نظر واضح کریں۔

22 نومبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے 25 بے گناہ پاکستانی شہریوں کے قتل کی شدید مذمت کی ہے جنہیں ان کے عقیدے کی بناء پر قتل کیا گیا ہے۔ اور فرقہ پرستی کی عفریت کے خاتمے کے لیے سنجیدہ کوششیں کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

ایچ آر سی پی نے کہا: الفاظ بدھ کو پیش آنے والے قتل وغارت کے واقعے کی مذمت کرنے سے قاصر ہیں جس میں 25 بے گناہ پاکستانیوں کو اس وقت ہلاک کیا گیا جب وہ اپنی مذہبی رسوم ادا کر رہے تھے اور نہ ہی اس شرمندگی کو بیان کیا جا سکتا ہے جس کا سامنا پوری قوم کو ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی جنونیوں کی نئی نسل ڈی۔8 کے مندوبین کو بتانا چاہتی ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کو کس قسم کی دلدل کی طرف دھکیل دیا گیا ہے۔ یہ بات عیاں ہے کہ شیعہ افراد کی ہلاکتوں میں اس سال نمایاں اضافہ ہوا ہے اور کئی حلقے عاشورہ کے موقع پر مزید قتل وغارت کا خدشہ ظاہر کر رہے ہیں۔ حکومت اور سیاسی جماعتوں میں شامل تمام معروف شخصیات نے مذمتی بیانات جاری کئے ہیں اور وفاقی وصوبائی حکومتی کے ترجمان امن کے قیام کے بلند وبانگ دعوے کر رہے ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں سرایت پذیر فرقہ پرستی کے وائرس کو نہ سیاستدانوں کی فرسودہ لفاظی اور نہ ہی قانون نافذ کرنے والے غیر موثر اداروں کے نامعقول رویے سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ شیعوں کے قاتلوں بارے ہر کوئی جانتا ہے اور جہادیوں کی نئی پود کی جانب سے مذہبی یا فرقہ وارانہ اختلافات کی بنیاد پر قتل کو قابل جواز قرار دینے کے تصورات کے متعلق بھی سب کو علم ہے۔ چنانچہ، انتظامیہ کو فرقہ وارانہ جنگجوؤں کے ایجنڈے سے نبٹنے کے لیے تمام ممکنہ اقدامات اٹھانے چاہئیں اور یہ ثابت کرنا چاہئے کہ ان کا عمل ان کے دعوؤں کی عکاسی کر رہا ہے اور مختلف مذہبی نقطہ نظر کے رہنماؤں کو اس غلطی کا اعتراف کرنا چاہئے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو نظم وضبط میں رکھنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ انہیں رواداری کی مقامی روایات کی بحالی کے لیے سنجیدہ کوشش کرنی چاہئے کیونکہ وہ پاکستان کو ناقابل برداشت ملک بنانے میں دیگر افراد کی طرح برابر کے ذمہ دار ہیں۔

31 دسمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے اتوار کو مستونگ میں ایران جانے والی بسوں پر حملے کے دوران شیعہ زائرین کے بیہمانہ قتل کی شدید مذمت کی ہے اور حکومت سے فرقہ وارانہ قتل وغارت کے خاتمے کا مطالبہ کیا ہے۔ کمیشن نے کہا: یہ افسوس ناک امر ہے کہ 2012 کے آخری دن ایچ آر سی پی مقتولین کے اہل خانہ کے ساتھ تعزیت کرنے کی حالت میں ہے جنہیں محض ان کے شیعہ مسلک کے باعث نشانہ بنایا گیا۔ 2012 میں ایسا پہلی دفعہ نہیں ہوا کہ مستونگ میں ایران جانے والی شیعہ زائرین کی بسوں کو

نشانہ بنایا گیا ہو اور نہ ہی اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے اس سال پہلی دفعہ پاکستان میں شیعوں کے قتل کی مذمت کی ہے۔ 2012 میں شیعوں کے قتل عام کے واقعات میں خطرناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔ حالات بہت کشیدہ ہیں مگر تیزی کے ساتھ کشیدہ ترین ہو رہے ہیں جس کا احساس بلوچستان میں ہزارہ شیعوں سمیت بیشتر شیعوں کو ہے جس کا اندازہ ان کی طرف سے ہر حال میں ملک چھوڑنے کے لیے خطرناک ذرائع پر بھروسے کرنے سے لگایا جا سکتا ہے۔ اتوار کو سکیورٹی دستے بسوں کی حفاظت پر مامور تھے تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ان سے حملے کو روکا نہیں جا سکا۔ ایچ آر سی پی سکیورٹی کے معاملات پر مہارت رکھنے کا دعویٰ نہیں کرتا مگر اس امر پر واضح زور دیتا ہے کہ قتل و غارت کے حالیہ وقوعہ کو روکنے کے لیے متعدد اقدامات اٹھائے جانے چاہئیں تھے؛ مستونگ میں حملے کو صرف اس لیے روکا نہ جا سکا کیونکہ ضروری اقدامات میں سے کوئی ایک قدم بھی نہیں اٹھایا گیا تھا۔ ہر چیز سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان میں فرقہ وارانہ تشدد کا خاتمہ ترجیح اور ارادے کا مسئلہ ہے۔ اس امر کی بیش بہا شہادتیں موجود ہیں کہ پاکستان میں فرقہ ورانہ تشدد بڑھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کے انسداد کے لیے محض لفاظی کے علاوہ کچھ نہیں کیا جا رہا جو مظلوم خاندانوں، پورے فرقے جسے یہ یقین ہوتا جا رہا ہے کہ ریاست نے انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے اور انسانیت، انسانی زندگی اور انسانی حقوق کو اہمیت دینے والوں کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ آج کے دور میں یکے بعد دیگرے حملوں کی ذمہ داری قبول کرنے والے پوشیدہ کیسے رہ سکتے ہیں؟ نفرت کی فضا کے انسداد، حملہ آوروں کو سزا سے حاصل استثنیٰ کے خاتمے اور انہیں کارروائی کا موقع دینے سے انکار کیے بغیر زائرین کے لیے ان سکیورٹی دستوں کی اہمیت حملے کے بعد مردہ خانے میں نعشیں لے جانے والی گاڑیوں سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ خام خیال ہے کہ ہلاکتوں کی لہر کے ذمہ دار افراد اور کارروائی کرنے سے انکار کر کے قاتلوں کے آگے جھک جانے والے رضا کارانہ طور پر تشدد کا راستہ ترک کر دیں گے۔ یہ وقت اس بات کا تقاضا بھی کرتا ہے کہ تحقیقات کر کے سکیورٹی ایجنسیوں کے اندر موجود قاتلوں کے حمایتیوں کو منظر عام پر لایا جائے۔

صحت

2 جولائی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق پنجاب میں ڈاکٹر صاحبان کی طویل ہڑتال کے نتیجے میں مریضوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے انہیں انتہائی تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اب تک اس معاملے کو صلح صفائی سے نمٹانے میں صوبائی حکومت جس طرح ناکام رہی ہے کمیشن کو اس پر بھی تشویش لاحق ہے۔ اس نے دونوں فریقین سے اپیل کی ہے کہ وہ عوام کی خاطر اپنی لڑائی کو ختم کر دیں۔

پیر کے روز یہاں جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ''پاکستان میں احتجاج اور ہڑتالیں اور ڈاکٹرز ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کے متعلق عوام نے سن نہ رکھا ہو لیکن انہوں نے کبھی ایمرجنسی سہولیات فراہم کرنا بند نہیں کیا۔ گزشتہ سال سے ڈاکٹرز کے رویہ میں تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ ایچ آر سی پی کو یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحبان کا اپنے زندگی بچانے والے حلف اور عہد و پیمان کو ترک کر کے اپنے مطالبات کو ترجیح دینا بالکل ناقابل دفاع ہے اور عوام میں ڈاکٹروں کے لیے ہمدردی میں کمی کا سبب بنا ہے۔

''ممکن ہے احتجاج کرنے والے ڈاکٹرز کے بعض مطالبات حق بجانب ہوں لیکن جاری تو تکار، افراتفری اور بدنظمی اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ کوئی بھی فریق صلح صفائی کے ساتھ معاملہ طے کرنے کے لیے اپنا مؤقف ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ دونوں اطراف نے اپنا مؤقف چھوڑنے کا کوئی اشارہ نہیں دیا...... دونوں اپنے اپنے مؤقف پر ڈٹے ہوئے ہیں...... اور سودابازی کے لیے مضبوط پوزیشن حاصل کرنے کے متمنی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ دھونس اور دھاندلی سے بھی کام لے رہے ہیں۔

ایچ آر سی پی پنجاب کی حکومت کی طرف سے بھی مسئلے کے حل کے سلسلے میں دھونس، دھاندلی کے ہتھکنڈے بھی پسند نہیں کرتا...... سروس کے دوران ڈسپلن کی ضرورت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن احتجاجوں سے نمٹنے میں حکومت کے نیم طور طریقوں نے اس کی ساکھ کو نقصان پہنچایا ہے۔ ڈاکٹرز کی شکایات عرصہ دراز سے اکٹھا ہو رہی ہیں۔ لہٰذا حکومت اس بات کو یقینی بنائے کہ ڈاکٹرز کے جائز مطالبات حل کیے جائیں۔ یہ جتنا جلدی ہوگا۔ اتنا ہی ملک وقوم کے لیے بہتر ہوگا۔

19 دسمبر: بدھ کے روز جاری کئے گئے ایک بیان میں ایچ آر سی پی نے کہا'' کراچی اور پشاور میں پولیو ٹیموں کے ارکان کے وحشیانہ قتل کے واقعات سفاکی کی بدترین مثال ہیں اور پاکستان کے بچوں کو ایک صحت مند مستقبل سے محروم کرنے کی گھناؤنی سازش ہیں۔ کسی ایک بچے کا پولیو کا شکار ہونا بھی پوری کمیونٹی میں پولیو کے خاتمے کی کوششوں کی ناکامی کا باعث بن سکتا ہے۔ پاکستان میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے کیونکہ پاکستان دنیا کے ان تین ممالک میں سے ایک ہے جہاں یہ مرض آج بھی بچوں کی ہلاکت اور معذوری کا باعث ہے۔ یہ بات ناقابل یقین لگتی ہے کہ کراچی اور پشاور میں ایک ہی دن ہونے والے حملوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا۔ منگل کے روز کراچی میں پولیو ٹیموں پر ہونے والے تینوں واقعات ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں پیش آئے جس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ یہ ایک ہی سازش کا حصہ تھے۔ ملک میں پولیو ٹیموں پر حملے کے واقعات سارا سال ہی سامنے آتے رہے ہیں۔ تاہم ان کے سدباب کے لیے حکومت کی طرف سے مناسب اقدامات دیکھنے میں نہیں آئے۔

مستقبل میں ایسے سانحات کو روکنے کے لیے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ گزشتہ چند دنوں میں ہونے والے حملوں کے ذمہ دار افراد کو گرفتار کیا جائے اور قانون کے مطابق قرار واقعی سزا دی جائے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ شدت پسندانہ عناصر کے عزائم سے متعلق بروقت معلومات حاصل کر کے ایسے واقعات کے خلاف پیش بندی کی جائے۔ ان حملوں کے بعد پولیو قطرے پلانے کی مہم کو جاری رکھنا، پولیو ٹیموں کے ارکان کی حفاظت اور ان کا حوصلہ بڑھانا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی ذمہ داری بے شک حکومت پر عائد ہوتی ہے تاہم اس کے ساتھ ساتھ کمیونٹی رہنماؤں کا کردار بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔

ایچ آر سی پی تمام سیاسی جماعتوں، میڈیا، سول سوسائٹی اور مقامی کمیونٹی کے رہنماؤں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ان وحشیانہ واقعات کی پرزور مذمت کریں اور والدین کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اس موذی مرض سے حفاظت کے لیے اپنے بچوں کو پولیو کے قطرے پلوائیں۔ ایچ آر سی پی حکومت سے یہ اپیل بھی کرتا ہے کہ وہ جاں بحق ہونے والے پولیو ٹیموں کے ارکان کے خاندانوں کی مناسب مالی امداد کرے تاکہ ان کے لیے اس کٹھن وقت میں آسانی کا کچھ سامان ہو سکے۔

محنت کش اور کسان

8 فروری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے شدید ابتر ملکی حالات پر تشویش اور حیرت کا اظہار کیا ہے، جن کے باعث لاہور میں تقریباً دو درجن افراد کی افسوسناک ہلاکت کا واقعہ پیش آیا جب ایک بوائلر پھٹنے کے نتیجے میں ایک ادویات ساز لیبارٹری کی تین منزلہ عمارت زمین بوس ہوئی۔

بدھ کو جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ''بروز پیر لاہور میں واقع ایک ادویات ساز لیبارٹری کے گرنے کے نتیجے میں مرنے والے غریب مزدوروں کے اہل خانہ کے دکھ میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ اس سانحے نے کسی بھی قسم کے انضباطی نظام کی مکمل عدم موجودگی کی حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے جو کہ ناقابل یقین حد تک تشویشناک ہے۔ ہمیں اب معلوم ہوا ہے کہ فیکٹری ایک رہائشی علاقے میں بغیر لائسنس کے چل رہی تھی، اس میں زیادہ تر ملازمین خواتین تھیں، بچوں کو انتہائی استحصالی حالات کے تحت بھرتی کیا گیا تھا، انتظامیہ نے ماحولیاتی اثرات کا جائزہ نہیں لیا تھا اور فیکٹری کے احاطے کی انسپکشن نہیں کی جا رہی تھی کیونکہ صوبائی حکومت نے 2002 سے فیکٹریوں میں انسپکٹرز کے داخلے کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔ لیبر انسپکشن پر پابندی عائد کرنا مضحکہ خیز اقدام ہے جو کہ سب سے بڑھ کر سرمایہ داروں کے لالچی اقدامات کو حکومتی سرپرستی حاصل ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایسی ناقابل دفاع پالیسی کا سلسلہ جاری رہنے سے بڑے تجارتی حلقوں کی

بااختیار طاقت کی حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے۔

اگر ملک کے دوسرے بڑے شہر میں ایسے قابل مذمت استحصال اور بے ضابطگیوں کا نوٹس نہ لیا گیا اور ان پر کنٹرول نہ کیا گیا تو حکمرانوں سمیت کسی شخص کے لیے بھی اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ملک کو کتنے برے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا جن کا ادراک نہ حکومت کو ہے اور نہ ہی میڈیا ان کی تشہیر کر رہا ہے۔ طاقت کے ایوانوں پر براجمان لوگوں کو ادراک کرنا چاہیے کہ لوگ مکمل طور پر باشعور ہیں اور حکومت پر ان کی توقعات تیزی سے ختم ہو رہی ہیں کہ وہ ان کے مفادات کو تحفظ فراہم کرے گی۔ حکومت کو سانحہ پیش آنے کے بعد معاوضہ جاتی پیکجوں کا اعلان کرنے کی بجائے ایسے سانحات کو وقوع پذیر ہونے سے روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

31 مئی: اگر لیبر مقدمات کا فوری اور منصفانہ تصفیہ مقصود ہے تو لیبر کورٹس اور ٹربیونلز کے تمام تر نظام پر نظرثانی کی ضرورت ہے۔ یہ ماہرین کے اس گروپ کی طرف سے پیش کردہ ایک بڑی سفارش ہے جو ٹریڈ یونینوں کے نمائندوں، وکلاء اور سول سوسائٹی کی تنظیموں پر مشتمل ہے اور ایچ آر سی پی نے اسے اپنے مرکزی دفتر سے جاری کیا ہے۔

اجلاس نے اس رائے کا اظہار کیا کہ لیبر کورٹس اور ٹربیونلز کی کارکردگی کو ریاست کے روّیے سے علیحدہ نہیں دیکھا جا سکتا جو اس نے محنت کشوں کے حقوق اور مسائل کے تناظر میں اختیار کر رکھا ہے۔ حکومت کے پاس لیبر پالیسی تیار کرنے یا محنت کشوں کی فلاح و بہبود کا کوئی پروگرام تیار کرنے کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔

ماہرین کے گروپ نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ محنت کشوں کی ایک بہت بڑی تعداد لیبر کورٹس تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر ہے۔ آجر کے پاس اپنی ملازمت کا ثبوت پیش کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی دستاویزی ثبوت نہیں اور وہ مزدور کی تعریف میں بھی نہیں آتے۔ اس مسئلے کو ترجیحی بنیادوں پر حل کرنے کی ضرورت ہے۔

نئے صوبائی قوانین محنت، ماسوائے ان کے جو بلوچستان نے منظور کیے ہیں، اعلیٰ عدالتوں تک رسائی کی بات نہیں کرتے۔ نیز نئے صوبائی قوانین اعلیٰ عدالتوں کو یہ حق فراہم نہیں کرتے کہ وہ لیبر کورٹس یا ٹربیونلز کی کارکردگی کا جائزہ لیں...... خاص طور پر ان کے پریزائیڈنگ آفیسرز کی تعیناتی کے معاملے میں، اعلیٰ عدالتوں کے سپروائزری کردار کی وضاحت کی ضرورت ہے۔

زیادہ تر لیبر فورموں پر کام کا بوجھ بہت زیادہ ہے جو تاخیر کا باعث بن رہا ہے۔ موجودہ لیبر کورٹس کی تعداد یا ان عدالتوں میں جج صاحبان کی تعداد میں اضافہ کیا جانا چاہیے۔ گروپ نے جوڈیشل سروس کے قیام کی حمایت کی...... جو یکسر طور پر صرف قوانین محنت میں مہارت رکھتی ہو یا اسے صرف قوانین محنت کی تربیت دی گئی

ہو لیکن اگر ایسا کرنا ممکن نہیں ہے تو لیبر کورٹس کے جج صاحبان کو قوانین محنت کی تربیت فراہم کی جائے اور مزدوروں کے مقدمات نمٹانے میں کوئی تاخیر نہیں کی جانی چاہیے۔

ایک اور سفارش جو پیش کی گئی وہ یہ تھی کہ قانون کی تعلیم فراہم کرنے والے اداروں میں قوانین محنت کو شامل کیا جانا چاہیے۔

گروپ نے قوانین محنت پر نظر ثانی کرنے میں تاخیر پر تشویش کا اظہار کیا۔ گروپ نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ان قوانین کو مزید منصفانہ اور مساویانہ بنانا چاہیے۔

آخر میں گروپ نے ٹریڈ یونینوں سے اپیل کی کہ وہ کلی طور پر صرف سرکاری افسران اور اہلکار اور ان کی تیار کردہ پالیسیوں پر انحصار نہ کریں اور محنت کشوں کی مؤثر مدد کے لیے اپنے اراکین کو تیار کریں جن کے ساتھ ان کے آجروں کا روّیہ درست اور قانونی نہیں ہوتا۔

25 جون: پاکستان میں جبری مشقت استحصال کی انتہائی قابل مذمت شکل ہے باوجود اس حقیقت کے کہ ملک میں اس کے خاتمے کے قانون کو نافذ ہوئے 20 برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ چنانچہ اس برائی کے خاتمے کے لیے ریاست اور سول سوسائٹی، دونوں کو اپنی جدوجہد میں بہتری لانی چاہئے۔ ان خیالات کا اظہار اتوار کے روز پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کی جانب سے لاہور میں جبری مشقت کے خاتمے کے لیے کام کرنے والی تنظیموں کی دوروزہ مشاورت میں متفقہ طور پر کیا گیا:

شرکاء نے اس امر پر اتفاق رائے کا اظہار کیا کہ چونکہ جبری مشقت کو دنیا بھر میں غلامی کی طرح تصور کیا جاتا ہے، اس لیے ریاست پر فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کے خاتمے کو ترجیح دے۔ اگر انسداد جبری مشقت ایکٹ مجریہ 1992 کو عملاً نافذ کیا جاتا تو ہزاروں لوگوں کے حقوق کو متاثر کرنے والے مسئلہ کا سدباب ہوتا۔

مشاورت کے دوران اس چیز کا نوٹس لیا گیا کہ شعبہ محنت صوبوں کو منتقل ہونے کے بعد صرف پنجاب نے قانون 1992 میں معمولی تبدیلیاں کرکے صوبے کے لیے نیا قانون بنایا ہے۔ دیگر صوبوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس حوالے سے اپنے قوانین بنانے کا عمل تیز کریں۔ تاہم اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ جبری مشقت کے خاتمے کے لیے صوبائی قانون سازی کے نتیجے میں جبری مزدوروں کے لیے قانون 1992 کی نسبت زیادہ ریلیف کا اہتمام کیا گیا ہو۔ پنجاب حکومت کی جانب سے دوسری مرتبہ ترقیاتی بجٹ سے جبری مشقت کے خاتمے کے پروگرام کے لیے فنڈز کی تخصیص اور اس پروگرام میں چار نئے اضلاع کو شامل کرنے کے فیصلے کو شرکاء نے سراہا۔ میٹنگ میں اس امید کا اظہار کیا گیا کہ پورے صوبے پر اس منصوبے کو لاگو کیا جائے گا۔ دیگر صوبائی حکومتوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ جبری مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لیے اس جیسے یا اس سے بہتر

منصوبے متعارف کروائیں۔ میٹنگ میں جبری مشقت سے متعلق قانون کا جائزہ لیا گیا اور درج ذیل سمیت متعدد سفارشات کی گئیں۔

☆ قانون کے نفاذ کا زیادہ تر انحصار ضلعی افسران پر ہے اوران کی کارکردگی کو جانچنے کا کوئی موثر طریقہ کار نہیں ہے۔ یہ تجویز پیش کی گئی کہ قانون کے نفاذ کی مستقل نگرانی اور اپنے فرائض ادا نہ کرنے والے عہدیداروں کے خلاف کارروائی کے لیے اعلیٰ محکمانہ سربراہان (داخلہ، محنت، پولیس وغیرہ) سمیت ایک بااختیار یونٹ ہونا چاہئے۔

☆ قانون کے نفاذ کے فوری بعد اس کے نفاذ کے لیے مطلوبہ ضوابط کا اجراء ہونا چاہئے۔

☆ نوٹیفکیشن کی عدم موجودگی کے باعث چند اہلکار اپنے فرائض ادا کرنے سے انکار کردیتے ہیں۔

☆ نفاذ کرنے والے حکام کا نوٹیفکیشن جاری کرنے والا نظام ترک کیا جائے متعلقہ حکام کا قوانین/ضوابط میں واضح ذکر کیا جائے۔

☆ تمام ضلعی حکام کو ایک مخصوص تاریخ تک نگران کمیٹیاں قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ کمیٹیوں کا اجلاس ہر ماہ ہونا چاہئے اور کورم بہت کم رکھا جائے۔ اپنی ذمہ داریوں کو سنجیدہ نہ لینے والے کمیٹی رکن کو نکال کر ان کی جگہ دیگر افراد کا تقرر ہونا چاہئے۔

☆ مزدوروں سے جبری مشقت کروانے کی سزا میں اضافہ ہونا چاہیے اور اس کا نفاذ ہونا چاہئے۔

☆ قانون شکنی کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے بالعموم قانون کو بروئے کار نہیں لایا گیا جس کا سبب یہ ہے کہ مجرم کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کے لیے، متاثرہ جبری مزدور کے پاس طاقت اور وسائل نہیں ہوتے۔ قانون شکنی کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کی ذمہ داری ریاست کو اٹھانی چاہئے اور ان کے جرائم کو ناقابل ضمانت قرار دیا جائے۔

شرکاء کو جبری مشقت سے متعلقہ بین الاقوامی ادارہ صحت (آئی ایل او) کے منصوبوں سے آگاہ کیا گیا اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ حکومت کو آئی ایل او کے پاکستان کی جانب سے توثیق شدہ معاہدات پر عمل درآمد کرنا چاہئے۔ مزید یہ کہ جبری مشقت کے معاملات کو نئی پالیسیوں اور محنت کی سہ فریقی کانفرنسوں کے ایجنڈے میں شامل کیا جائے۔

میٹنگ میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ عوام کے سماجی و معاشی مفادات کے معیار پر پورا اترنے کے لیے بہتر طرز حکومت پر یورپی یونین کی طے شدہ شرائط پر پورا اترنے کے لیے اقدامات اٹھائے۔

شرکاء نے اس رائے کا اظہار کیا کہ جبری مشقت کے معاملے کو مجموعی طور پر مزدوروں کے حقوق اور

مسائل کے تناظر میں دیکھا جائے۔ بالخصوص ٹریڈ یونینوں اور بالعموم سول سوسائٹی تنظیموں کو جبری مزدوروں کے مسائل کو ذاتی مسائل تصور کرنا چاہئے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ سیاسی جماعتیں جبری مشقت کے خاتمے کے لیے اصلاحات اور مزدوروں و کسانوں کی خوشحالی کو اپنے ایجنڈے میں شامل کریں۔

مشاورت میں جبری مشقت کے خلاف نافذ قانون سے عدالتی حلقوں تک کی لاعلمی، اپنے شناختی کارڈز کے حصول میں جبری مزدوروں کو درپیش مشکلات، کم از کم تنخواہ کے حصول میں مشکلات اور کم از کم تنخواہ یا تنخواہوں کی ادائیگی کے لیے قانون کے تحت مقدمات کی پیروی میں مشکلات سے پیدا ہونے والے مسائل کو بھی زیر بحث لایا گیا۔

شرکاء نے دوران مشاورت ہونے والے فیصلوں کے نفاذ کے لیے انفرادی اور مجموعی جدوجہد کرنے اور ملک بھر میں غلامی کے خاتمے کا عالمی دن منانے کا فیصلہ کیا۔ شرکاء مشاورت میں پائلر، سپارک، بھنڈار ہاری سنگت، گرین رورل ورکرز ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن، جبری مشقت آزادی محاذ، مہر گڑھ، آئی ایل او، ایچ آر سی پی، اور وکلاء سمیت دیگر شامل تھے۔

6 ستمبر: ملتان میں پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی جانب سے منعقد کردہ دوروزہ (ستمبر 6,5) کسان کنونشن، نے زرعی اصلاحات، زمین سے مساوی استفادہ اٹھانے کی پالیسی کے فروغ، بے زمین کاشتکاروں کی مشکلات کا ازالہ کرنے، فوج کو ٹھیکے پر دی جانے والی اراضی پر طویل عرصے سے آباد کاشتکاروں کے حقوق تسلیم کرنے، کھیت مزدوروں کو مناسب معاوضہ ادا کرنے، جبری مشقت کے خاتمے کے لیے موثر اقدام اٹھانے، زرعی شعبہ میں کام کرنے والی خواتین کے حقوق کو تحفظ دینے اور امداد کی تقسیم زرعی پیداوار کی مارکیٹنگ کے سلسلے میں ایک کسان دوست پالیسی اختیار کرنے کا پرزور مطالبہ کیا ہے۔ کنونشن میں ملک کے مختلف حصوں سے کسان/ ہاری کمیٹیوں کے نمائندوں، جبری/ آزاد مزدوروں کے کسان رہنماؤں اور انسانی حقوق کے کارکنوں نے شرکت کی۔ کنونشن کے شرکاء نے کہا کہ ملک کے معاشی مفاد، وسیع دیہاتی آبادی کو سماجی انصاف کے حصول اور جمہوری نظم ونسق کی بنیادی شرائط پر پورا اترنے کے لیے زرعی اصلاحات کا ہونا ضروری ہے۔ ماہرین معاشیات کی تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ ملک میں زرعی ملکیت کا بے ڈھنگ ڈھانچہ عوام الناس کی غربت میں اضافے کے علاوہ معاشی ترقی اور تعلیم کے فروغ میں بھی رکاوٹ ہے۔ معاشی اور سماجی لحاظ سے پسماندہ کسان جمہوری نظام کی حمایت کرنے سے بھی قاصر ہے۔ کنونشن میں اس امر کو یقینی بنانے کا مطالبہ کیا گیا کہ مجوزہ زرعی اصلاحات کو نیک نیتی اور موثر طریقے سے نافذ کیا جائے، چھوٹے مالکان اور بے زمین کاشتکار کو کم از کم گزارہ کے لائق زمین دی جائے اور خواتین کا شتکاروں، بالخصوص خاندانوں کی کفالت کی

ذمہ دار خواتین کا خاص خیال رکھا جائے۔ کنونشن نے صوبائی حکومتوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ زمین سے استفادہ کاری سمیت قلیل اور طویل المدتی دونوں طرح کی پالیسیاں تشکیل دیں۔ اسٹیبلشمنٹ کو مشتبہ اور متنازعہ خدمات کی بنا پر بطور انعام اراضی دینے کی روایت بھی ختم ہونی چاہیے۔ تجارتی مقاصد کے لیے اراضی مختص کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ زمین صرف کاشتکاروں کی دی جانی چاہیے اور غیر حاضر جاگیرداروں کا نظام مکمل طور پر ختم ہونا چاہیے۔ زرخیز زمینوں پر صنعتی منصوبوں کی اجازت دینے کی روش پر نظر ثانی کرنے اور زرعی علاقے کے غیر ضروری اور بے ترتیب سکڑاؤ کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ جب کبھی زمین غیر زرعی مقاصد کے لیے حاصل کی جائے تو بے دخل ہونیوالے مزارعین کو حصہ ملنا چاہیے جو کہ زمیندار کے لیے متعین معاوضے کا 25 فیصد ہوسکتا ہے۔ اراضی کی استفادہ کاری پالیسی سازی میں جنگلات کی بے جواز تباہی کے باعث پیش آنے والی ماحولیاتی آفات پر بھی توجہ دی جائے۔

کنونشن کی رائے تھی کہ مزارعین کے حقوق کو یقینی اور واضح ضمانتیں دینے کی خاطر تمام صوبوں کے قوانین مزارعت پر نظر ثانی کرنے، مزارعوں کے استحصال کا موقع فراہم کرنے والے تمام رخنوں کو ختم کرنے اور جاگیردار مزارعات تنازعات کے تصفیے کے لیے خصوصی ہاری عدالتوں کے قیام کی ضرورت ہے۔ بے زمین مزارعین کے حوالے سے کنونشن نے مطالبہ کیا کہ ممکنہ حد تک زیادہ سے زیادہ افراد کو اراضی الاٹ کی جائے، اور مزارعین کی بے دخلی کے خلاف موثر اقدامات اٹھائے جائیں۔ جنہیں کھیتوں پر نہیں رکھا جاسکتا انہوں نے قصبوں میں اپنے گھروں کے نزدیک متبادل صلاحیتوں کو فروغ دینے کے قابل بنایا جائے اور انہیں بامعنی روزگار فراہم کیا جائے۔ فوجی کھیتوں پر کئی نسلوں سے کام کرنے والے کاشتکاروں کے حقوق کو تسلیم کرنے اور تحفظ دینے میں حکومتی ناکامی کو کنونشن کے شرکاء نے شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ انہوں نے کسان تنظیموں کو اپنے حقوق کے خلاف ہونے والے حملوں کی مزاحمت کرنے پر خراج تحسین پیش کی اور اوکاڑہ، خانیوال، سرگودھا اور ملک کے دیگر علاقوں میں فوجی زرعی فارموں پر کام کرنے والے کاشتکاروں کو ان اراضیوں کی فوری ملکیت دینے کا مطالبہ کیا ہے۔

کنونشن نے زرعی مزدور کے مناسب معاوضے کی ضمانت دینے کے حوالے سے باضابطہ نظام کی عدم موجودگی پر تشویش کا اظہار کیا اور اس مسئلے کے فوری حل پر زور دیا۔ مزید برآں کہا کہ جبری مشقت کے خاتمے کے لیے مناسب اقدامات اٹھانا اور آزاد مزدوروں کی بحالی بھی اتنی ہی اہمیت کی حامل ہے۔

شرکاء نے اتفاق رائے سے مطالبہ کیا کہ مناسب قیمت پر ضروری زرعی ضروریات، خصوصاً پانی اور بیجوں کی دستیابی کو یقینی بنایا جائے۔ زرعی پیداوار کی مارکیٹنگ کے غیر دوستانہ نظام سے کاشتکار بہت زیادہ

نقصان اٹھارہے ہیں۔ کاشتکاروں کے نمائندوں کی مشاورت سے ایک منصفانہ اور مساوی مارکیٹنگ نظام وضع ہونا چاہیے۔

کنونشن نے متعدد کسان اور ہاری کمیٹیوں، کسان اور مزارعین انجمنوں، انسانی حقوق کے کارکنوں اور تنظیموں کی جانب سے کسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہونیوالے کام کو سراہا اور ملک کی سب سے بڑی زرعی کمیونٹی کو انصاف کی فراہمی کی ایک مضبوط تحریک کے جنم کے لیے مذکورہ حلقوں کے مابین قریبی اتحاد کی ضرورت پر زور دیا۔ کنونشن نے ریاست، سیاسی جماعتوں، صنعتی مزدوروں کی ٹریڈ یونینوں اور سول سوسائٹی کے دیگر تمام عناصر پر زور دیا کہ وہ آئی ایل او معاہدات اور پاکستانی آئین اور بین الاقوامی دستاویزات میں موجود ضمانتوں کی مطابقت میں زرعی مزدوروں کی انجمن سازی کے لیے بھرپور کوشش کریں۔

کنونشن کے موقع پر کئے گئے دیگر تمام مطالبات میں کام کرنے کا حق، مساوی معاوضہ جات کا حق اور تمام شہریوں کے سماجی تحفظ کے حق کو بنیادی حق تسلیم کرنا شامل تھے۔ کنونشن نے تمام سیاسی جماعتوں پر زور دیا کہ وہ اپنے منشوروں اور پروگراموں میں کسانوں کے مفادات اور مسائل کو نمایاں مقام دیں۔

12 ستمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے کراچی اور لاہور کی دو فیکٹریوں میں تباہ کن آگ کے باعث ہونے والی کم وبیش 250 اموات پر شدید دلی رنج وغم کا اظہار کیا ہے اور پورے ملک میں کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے لیے موثر تحفظ کی طرف فوری توجہ دینے کا مطالبہ کیا ہے۔

کمیشن نے کہا: ''پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق منگل کو لاہور اور کراچی کی دونوں فیکٹریوں میں آگ لگنے کی وجہ سے ہونے والی جانی نقصانات کے ساتھ ساتھ ان المناک واقعات کی وجہ بننے والے عوامل پر گہری تشویش کا اظہار کرتا ہے''۔

ذرائع ابلاغ کی رپورٹوں کے مطابق کراچی میں گارمنٹس فیکٹری میں تقریباً 230 اموات ہوئیں اور بے شمار زخمی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عملہ میں سے کچھ ہی حفاظت کے ساتھ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ لاہور میں جوتے کی فیکٹری میں 35 مزدور تھے جب وہاں آگ لگ گئی۔ ان میں سے تقریباً 25 کی موت کی تصدیق کر دی گئی ہے اور باقی تمام شدید زخمی ہیں۔

حکومت نے ان واقعات کے اسباب کی کھوج لگانے کا اعلان کیا ہے لیکن ایسے اداروں میں حالات کار کے حوالے سے واقف افراد جانتے ہیں کہ ان واقعات میں ہونے والی اموات کی وجہ بننے والے کیا عوامل ہوتے ہیں۔ یہ تو حقیقت ہے کہ داخلے اور اخراج کے کئی دروازوں/ راستوں کی موجودگی اس طرح کے جہنم سے مزدوروں کو بھاگنے میں مدد کرتی ہے۔ لاہور میں فیکٹری میں داخل ہونے اور باہر نکلنے کا صرف ایک راستہ

تھا۔ کراچی میں کئی مزدوروں نے چار منزلہ عمارت کی کھڑکیوں میں سے اپنی زندگیاں بچانے کے لیے چھلانگ لگائی جس کی وجہ سے انہیں ہڈیوں میں شدید زخم آئے۔ اعلیٰ قسم کا آتشگیر مواد بغیر کسی احتیاطی تدبیر کے ذخیرہ کیا گیا تھا، آگ لگنے کی اطلاع کے لیے الارم اور آگ سے بچاؤ کے لیے سامان کی کمی نے صورتحال کو مزید سنگین بنادیا۔

حکومت کو ان المناک واقعات کی وجوہات کی تلاش کے ساتھ ان فیکٹریوں میں حفاظتی تدابیر کے بغیر کام کرنے کی اجازت کے بارے میں بھی تفتیش کرنی چاہیے اور عوام کو آگاہ کرنا چاہیے کہ ایسی فیکٹریوں کو بغیر حفاظتی تدابیر کے کام کرنے کی اجازت کیسے حاصل ہوئی؟ داخلے اور باہر نکلنے کے لیے متفرق راستوں اور دروازوں کی کمی اور ہنگامی صورتحال میں موثر اور محفوظ انخلا کے منصوبوں کی طرف دھیان کیوں نہیں دیا گیا؟

دونوں واقعات میں یہ واضح ہے کہ ان فیکٹریوں کے مالکان ہر چیز سے زیادہ منافع کو ترجیح دیتے تھے اور مزدوروں کی حفاظت کے بارے میں ان کا رویہ بے دردی پر مبنی تھا۔ لیکن کیا مزدوروں کے مفادات کے لیے محفوظ حالات کار کو مدنظر رکھنا حکومت کا فرض نہیں ہے؟ کراچی میں آگ سے حفاظت کرنے والے ادارے کے سربراہ نے بیان دیا کہ فیکٹری خطرناک اور ناپائیدار تھی اور ہنگامی صورت میں باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ آگ سے بچاؤ کے اداروں کے افسران نے اس پہلو پر توجہ کیوں نہیں دی؟

کراچی میں آگ سے بچاؤ کا تمام اداروں بمعہ نیوی، ایئر فورس اور کراچی پورٹ ٹرسٹ کے عملہ نے ان شعلوں کو بجھانے کی کئی گھنٹوں تک کوشش کی۔ ان کی کوشش قابل تعریف ہے لیکن ملک کے سب سے بڑے شہر میں آگ پر قابو پانے کی مکمل صلاحیت پر ایک سوالیہ نشان ہے۔ پاکستان میں دیگر مقامات پر حالات بدتر ہیں۔ اس لیے امید کی جاتی ہے کہ سرکاری تفتیش میں اس پہلو پر بھی توجہ دی جائے گی۔

ہم دل کی اتھاہ گہرائیوں سے متاثرہ افراد اور ان کے خاندانوں کے ساتھ ان کے دکھ میں شریک ہیں۔ ہم امید اور مطالبہ کرتے ہیں کہ حکومت ہلاک ہونے والوں کے خاندانوں کے لیے مناسب و معقول تلافی کا اعلان کرے گی اور زخمیوں کو بہترین طبی امداد فراہم کی جائے گی۔

کمیشن حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ متعلقہ فیکٹری مالکان کے خلاف کارروائی کرے اور مزدور نمائندوں کے مشورہ سے فیکٹریوں میں محفوظ حالات کار کے لیے ضروری اقدامات کرے نیز اس طرح کے واقعات سے بچاؤ کے لیے انسپکٹروں کے ذریعہ فیکٹریوں کی نگرانی کا آغاز کرے تاکہ مستقبل میں ایسے المناک واقعات رونما نہ ہوں۔

14 ستمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے جمعہ کو اپنی ایک حقائق جو ٹیم کے

مشاہدات کو شائع کیا جس نے گزشتہ ماہ مرید کے کا دورہ کیا تھا۔ دورے کا مقصد 16 مئی کو ڈیرہ سہگل فارمز سے اپنے چار ساتھیوں کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے والے مزارعین کو منتشر کرنے کے لیے پولیس کی کارروائی بارے حقائق اکٹھا کرنا تھا۔ ایک آدمی وقوعہ کے دوران گولی لگنے سے ہلاک جبکہ ایک پولیس اہلکار زخمی ہوا تھا جو 13 دن بعد ہلاک ہو گیا تھا۔

حقائق جو ٹیم کے مشاہدات

☆ تقریباً 50 مزارعین اپنے چار ساتھی دیہاتیوں کی گرفتاری کے خلاف مظاہرہ کرنے کے لیے جی ٹی روڈ، مرید کے جمع ہوئے تھے. مظاہرین کے پاس آتشیں اسلحہ نہیں تھا۔

☆ اطلاعات کے مطابق مذاکرات کے دوران پولیس نے کہا تھا کہ چار زیرحراست افراد کو رہا کر دیا جائے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیرحراست افراد کو دوران حراست باضابطہ قانونی کارروائی سے مستفید ہونے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔

☆ بعدازاں پولیس نے مظاہرین کو منتشر کرنے کے لیے آنسو گیس، لاٹھی چارج اور آتشیں اسلحہ کا استعمال کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پولیس نے انہیں منتشر کرنے کے لیے غیر ضروری اور غیر متناسب طاقت کا استعمال کیا تھا۔ آتشیں اسلحہ کا استعمال غیر ضروری تھا۔ مظاہرین نے جواب میں پولیس پر پتھراؤ کیا۔

اس تصادم کے دوران، مویشیوں کی خرید فروخت کا کاروبار کرنے والا ایک شخص محمد عارف گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ موقع پر موجود اس کے بھائیوں کے بقول، اسے پولیس نے گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ ضابطہ فوجداری کی دفعہ 64 کے تحت بیان قلمبند کرواتے وقت چشم دید گواہوں، محمد عارف کے بھائیوں نے کہا، ان کے بھائی کو پہلے پولیس اہلکاروں نے تشدد کا نشانہ بنایا اور اس کے بعد ایک پولیس اہلکار نے اسے گولی ماردی۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ اس بیان کے نتیجے میں عائد ہونے والے سنگین الزام کی کوئی تحقیقات نہیں کی گئیں اور نہ ہی عارف کی موت کا سبب بننے والی گولی کی استعمال ہونے والے ہتھیار سے پڑتال کی گئی تا کہ گولی چلانے والے شخص کی شناخت ہو سکے۔

☆ اطلاعات کے مطابق ایک پولیس سب انسپکٹر، جان محمد کو پتھر لگا تھا، جسے ہسپتال داخل کروایا گیا اور وہ 13 دن بعد ہلاک ہو گا۔

☆ یہاں تک کہ موقع پر موجود نہ ہونے والے بیشتر افراد کو بعدازاں گرفتار کر کے ان پر قتل کا الزام عائد کر دیا گیا۔ پولیس نے ڈیرہ سہگل فارمز پر چھاپے کے دوران 7 خواتین اور ان کے بچوں کو بھی اپنی تحویل

میں لے لیا تھا۔

☆ پولیس کی بہت بڑی نفری تعینات کرنے کے باوجود جس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے طاقت کا استعمال کیا، ہنگامی طبی امداد یا ایمبولینسوں کی فراہمی کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا تھا۔

☆ زیادہ تر افراد کے مطابق، جی ٹی روڈ پر اکٹھا ہونے والے افراد کی تعداد 50 سے زیادہ نہیں تھی مگر پولیس نے محمد عارف اور اے ایس آئی جان محمد کے قتل کے مقدمے میں 32 نامزد اور 200 نامعلوم افراد کو ملوث کیا۔ بعدازاں پولیس نے کسی گواہی یا تحقیقات کے بغیر 120 مزید افراد کے نام ایف آئی آر میں شامل کر لیے۔

☆ ایچ آر سی پی کی حقائق جو ٹیم کے مطابق اعلیٰ پولیس افسران نے ان سے بات کرنے سے انکار کر کے حقائق کو منظر عام پر لانے کی ان کی کوششوں میں رکاوٹ ڈالی ہے۔ چنانچہ واقعے کے متعلق پولیس کا بیان بڑی حد تک رپورٹ میں موجود نہیں ہے۔ صرف تحقیقاتی افسر نے حقائق جو ٹیم کے سوالات کا جواب دیا تھا۔

تعلیم

9 فروری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے سندھ یونیورسٹی میں حالیہ صورتحال پر نہایت تشویش کا اظہار کیا ہے جہاں 2 جنوری کو پروفیسر بشیر چنار کے ہونے والے قتل کے خلاف مظاہرہ کرنے والے اساتذہ کے خلاف بلا جواز کارروائی کی گئی ہے۔

جمعرات کو جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ''ایچ آر سی پی کو اس امر پر انتہائی تشویش ہے کہ 'سندھ یونیورسٹی اساتذہ انجمن' کے دو نمائندوں ڈاکٹر عرفانہ ملاح اور ڈاکٹر اظہر علی شاہ کو معطل کر دیا گیا ہے اور دیگر اساتذہ کو اظہار وجوہ کا نوٹس (Show-cause notice) بھیجا گیا ہے۔ یونیورسٹی کو چند ہی دن قبل گورنر سندھ کی اس یقین دہانی پر کھولا گیا تھا کہ اپنی ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچنے والے وائس چانسلر، سندھ یونیورسٹی کی جگہ نئے چانسلر کا تقرر اساتذہ کی مشاورت کے ساتھ کیا جائے گا۔ ایچ آر سی پی کو اساتذہ کے تحفظات کا ادراک کرنے اور ان کا ازالہ کرنے کے حوالے سے حکام کے سرد مہر رویے پر بھی شدید افسوس ہے۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ اساتذہ کو اپنے مطالبات حکام بالا تک پہنچانے کے لیے کئی ہفتوں تک احتجاج کرنے پر مجبور کیوں ہونا پڑا۔ اساتذہ اپنے درج ذیل جائز مطالبات کے لیے طویل عرصہ سے پرامن احتجاج کر رہے ہیں۔

پروفیسر بشیر کے قتل کی انکوائری کی جائے، یونیورسٹی کے احاطے سے پولیس اور رینجرز کی نفری ہٹائی جائے، طلباء یونینوں کو بحال کیا جائے اور وائس چانسلر کو ہٹایا جائے۔ یہ افسوس ناک امر ہے کہ سندھ یونیورسٹی سمیت صوبے کی زیادہ تر یونیورسٹیوں میں وائس چانسلر کے عہدہ پر وہ لوگ براجمان ہیں جو اپنی ریٹائرمنٹ کی عمر کی حد عبور کر چکے ہیں۔ ایچ آر سی پی سندھ چیپٹر کے وائس چیئر پرسن اور ایچ آر سی پی کونسل اراکین کے ساتھ ایک حالیہ میٹنگ میں، گورنر سندھ نے سندھ یونیورسٹی کے معاملات کا نوٹس لینے پر اتفاق کا اظہار کیا تھا۔ ایچ آر سی پی کا گورنر سے مطالبہ ہے کہ وہ بطور چانسلر سندھ یونیورسٹی، اساتذہ کی معطلی اور ان کو اظہار وجوہ نوٹس بھیجنے کے فیصلوں کو کالعدم قرار دیں اور یونیورسٹی میں خوف وہراس سے پاک اور تعلیمی ترقی کے لیے سازگار ماحول کے قیام کو یقینی بنانے کے حکومتی فریضے کو پورا کرنے کے لیے موثر اقدامات اٹھائیں۔

10 اکتوبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے بچوں کے حقوق کی کارکن ملالہ یوسف زئی پر طالبان کے حملے کو انتہائی بزدلانہ اقدام قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی، اس کی جلد صحت یابی کی دعا کی ہے اور اس کے طبی علاج پر حکومت کی جانب سے دی جانے والی فوری توجہ کو سراہا ہے۔

ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ''ایچ آر سی پی ملالہ یوسف اور اس کے اہل خانہ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار اور امید کرتا ہے کہ وہ اس مصیبت کی گھڑی سے جلد ہی باہر نکل آئے گی۔ ملالہ یوسف زئی کے علاج کے حوالے سے حکومت اور طبی ٹیم نے جس عجلت اور توجہ کا مظاہرہ کیا ہے، ایچ آر سی پی اسے خراج تحسین پیش کرتا ہے۔

یہ سمجھ سے بالاتر ہے کہ کوئی اتنا ظالم بھی ہوسکتا ہے اور معصومیت کی علامت، ایک غیر محفوظ بچی پر انتہائی بزدلانہ حملہ کرسکتا ہے، حملے کا اعتراف کرسکتا ہے اور یہ بیان دے سکتا ہے کہ اگر وہ صحت یاب ہوگئی تو اسے دوبارہ نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ الفاظ اس واقعے کی مذمت کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ طالبان کے لیے بھی شرم کی علامت ہے۔ سیاستدانوں کا لبادہ اوڑھنے والے مذہبی دانشوروں اور علماء کو غور کرنا چاہیے کہ انہیں اس واقعے بارے کیا کچھ کہنا ہے اور انہوں نے اس پاگل پن کے انسداد کے لیے کیا تیاری کر رکھی ہے جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ طالبان کو مطمئن کرنے اور ان کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی دلالت کرنے والوں کے لیے بھی یہ وقوعہ ایک تنبیہ ہے۔ اگر انہیں کسی تنبیہ کی ضرورت تھی۔ اس حملے کے نتیجے میں ملالہ، سول سوسائٹی، باشعور شہریوں اور سکیورٹی کے عزم میں مضبوطی آنی چاہیے کیونکہ اس نے ایک بار پھر سنگدل جنونیوں کی بربریت اور ان میں انسانیت کے فقدان کو آشکار کردیا ہے۔ انہیں اپنے قول وفعل سے طالبان کی جانب سے ہونے والی بے رحمانہ ہلاکتوں کے لیے شدید نفرت اور مذمت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

9 نومبر: اقوام متحدہ کی جانب سے 10 نومبر کو 'یوم ملالہ' قرار دینے کے فیصلے کو خوش آئند قرار دیتے ہوئے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) حکومت اور پاکستانی عوام سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ

سوات سے تعلق رکھنے والی کمسن بچی کو دنیا بھر میں خراج تحسین پیش ہونے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ انہیں یہ پختہ عہد کرنا چاہیے کہ وہ اپنے بچوں، خصوصاً لڑکیوں کی تعلیم کے حق کی ضمانت کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں بروئے کار لائیں گے۔

کمیشن نے آج اپنے ایک بیان میں کہا: پاکستانی عوام اس امر پر فخر کرنے میں حق بجانب ہیں کہ آج (ہفتہ، 10 نومبر) پوری دنیا ملالہ کو خراج تحسین پیش کرنے میں ان کے شانہ بشانہ کھڑی ہے...... ملالہ، جو تعلیم کے حصول کی لڑکیوں کی تمنا اور اپنے حق کے لیے لڑنے کی جرات کی علامت بن چکی ہے۔ تاہم سوات کی بہادر لڑکی نے اپنے ملک کے لیے جو اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے اس کے باعث پاکستانی ریاست اور معاشرے، دونوں کے لیے شدید چیلنجز بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ مختصراً، انہیں اس امر کو یقینی بنانا پڑے گا کہ ان کے بچوں، خصوصاً لڑکیوں کو معیاری تعلیم کے حصول کے مساوی مواقع حاصل ہیں، انہیں آئین میں بیان شدہ مطلوبہ درجے تک مفت تعلیم دی جائے گی اور اس کے بعد قابل برداشت اخراجات پر۔ عملی لحاظ سے یہ مطالبات اس امر کے متقاضی ہیں کہ نہ صرف تعلیم اور لڑکیوں کے دیگر حقوق سے متعلقہ ہزار سالہ ترقیاتی اہداف (ایم ڈی جی) کے حصول کے لیے کوششوں میں تیزی لائی جائے بلکہ آرٹیکل 25۔(الف) کے نفاذ کے لیے غور و خوض پر مبنی اور قابل عمل منصوبے متعارف کروائے جائیں۔ آرٹیکل 25۔(الف) کے تحت بچوں کے عالمگیر اور مفت تعلیم کے حق کو بالآخر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یہ سوال بھی ذہن میں ابھرتا ہے کہ اگر ریاست عشروں تک بچوں کی تعلیم کو نظر انداز کرنے کا جرم سرزد نہ کرتی تو کیا ملالہ پر حملے یا اس بزدلانہ اقدام کا باعث بننے والی طاقتوں کے مکمل کھیل سے بچنا ممکن تھا؟ آج پاکستان کو یہ عزم کرنا پڑے گا کہ وہ اس امر کو یقینی بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گا اور کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا کہ پاکستان کی ہر لڑکی ملالہ کے خواب اور عزائم میں شریک کار ہوگی اور وہ اس تکلیف اور اذیت کا سامنا نہیں کرے گی جس کا سامنا ملالہ کو کرنا پڑا ہے۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر 'یوم ملالہ' کو پاکستانی اپنے مستقبل کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہجوم کے طور پر خود پر ملامت کو دعوت دینے کا موقع ثابت کریں گے۔

اجتماع کی آزادی

6 فروری: گزشتہ ہفتہ کراچی میں نواب اکبر بگٹی کے رشتہ داروں کے قتل کے خلاف ہفتہ کو سبی میں احتجاج کرنے والے مظاہرین پر ایف سی اہلکاروں کی فائرنگ کے نتیجے میں دو افراد کی ہلاکت کو ایچ آر سی پی نے نہایت تشویش ناک قرار دیا ہے۔

کمیشن نے ایک بیان میں کہا: ''ایچ آر سی پی کو سبی میں ایف سی کی فائرنگ کے باعث ہونے والی ہلاکتوں اور لوگوں کے زخمی ہونے پر شدید دکھ اور تشویش ہے۔ میڈیا کی اطلاعات کے مطابق تقریباً 300 افراد نے کراچی میں ہلاکتوں کے خلاف احتجاج کے دوران قومی شاہراہ بلاک کر دی تھی اور ایف سی کے ایک قافلے کو گزرنے نہ دیا۔

''طاقت کے اس استعمال سے ان عناصر کو فائدہ پہنچے گا جو صوبے میں صورتحال کو مزید خراب کرنا چاہتے ہیں۔ ایچ آر سی پی عوام کے پرامن احتجاج کے حق کی پرزور تائید کرتا اور یہ مطالبہ کرتا ہے کہ حکام کو طاقت کے استعمال سے قبل دیگر تمام ذرائع بروئے کار لانے چاہئیں اور طاقت کا استعمال صرف تشدد اور قتل وغارت کے انسداد کے لیے کرنا چاہیے۔ مزید برآں صوبے کے انتشار زدہ حالات میں ایسی چیزیں محض امن عامہ کا مسئلہ نہیں ہے۔ ایچ آر سی پی وقوعے کی عدالتی انکوائری کے حکومتی فیصلے کا خیر مقدم کرتا ہے اور امید کرتا ہے کہ قبل ازیں مختلف واقعات میں ہونے والی تحقیقات کے برعکس اس انکوائری کے نتائج سے عوام کو آگاہ کیا جائے گا۔

سیاسی شراکت

27 فروری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے دس (10) حلقہ ہائے انتخاب میں منعقد ہونے والے ضمنی انتخابات کے دوران بعض حلقوں کی جانب سے غیر معقول رویہ اختیار کیے جانے پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔

پیر کو جاری ہونے والے ایک بیان میں ایچ آر سی پی نے کہا: ''انتخابات کے دوران رونما ہونے والے واقعات، ان خطرات کا اشارہ دے رہے ہیں جن کا سامنا ہمیں عام انتخابات میں کرنا پڑ سکتا ہے۔ ان میں معاہدے یا کسی دیگر ہتھکنڈے کے ذریعے خواتین کو انتخابات میں حصہ لینے سے روکنا، پولنگ عملے پر تشدد، پولنگ سٹیشنوں گردونواح میں اسلحہ کی کھلے عام نمائش اور استعمال اور باضابطہ انتخاباتی عمل میں مداخلت کے لیے پولیس کے عملے کی تعیناتی شامل ہے۔ ضمنی انتخابات کے دوران پیش آنے والے ان تمام واقعات کی مکمل تحقیقات ہونی چاہئیں اور ملزمان کو کسی قسم کی رعایت نہیں ملنی چاہیے، بصورت دیگر آزاد اور شفاف انتخابات کا انعقاد ایک ادھورا خواب رہ جائے گا۔ صرف الیکشن کمیشن ہی اس مسئلے کو حل کرنے کا ذمہ دار نہیں ہے...... اگرچہ بے ضابطگیوں کے ٹھوس شواہد کی موجودگی میں بنیادی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے...... تاہم حکومت، سیاسی جماعتوں اور سب سے بڑھ کر عوام پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے جنہیں معمولی مفادات یا گروہی وفاداری کی بجائے جمہوری اصولوں کی پاسداری کے عزم کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

جمہوری حقوق اور سیاسی حالات

26 اپریل: وزیراعظم کے خلاف توہین عدالت کے مقدمے میں ہونے والے فیصلے پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے ریاستی اداروں کے مابین پائی جانے والی کشیدگی کے خاتمے کا مطالبہ کیا ہے۔

کمیشن نے کہا: ''اگرچہ یہ بات اطمینان بخش ہے کہ وزیراعظم گیلانی کو سزا سناتے وقت سپریم کورٹ نے اپنا ہاتھ نرم رکھا ہے، تاہم یہ جان کر کسی فرد کو بھی خوشی نہیں ہوسکتی کہ ایک منتخب حکومت کے وزیراعظم کو سزا سنائی گئی ہے اور عدلیہ اپنے فیصلے کو متنازعہ بننے سے روکنے میں ناکام ہوگئی ہے۔ مزید یہ کہ ریاست کے دو ستونوں......عدلیہ اور انتظامیہ کی جانب سے اپنائے گئے سخت اور غیر لچکدار موقف کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال پریشان کن ہے۔ اعلیٰ عدلیہ کے فیصلوں پر عملدرآمد نہ کرنے سے انتظامیہ کی ساکھ بہتر نہیں ہوئی، ان فیصلوں کو قبول کرنا چاہئے بظاہر وہ درست معلوم نہ ہوتے ہوں اور صرف وقت ہی بتائے گا کہ عدلیہ نے انتظامیہ کو قابل سزا سمجھنے والے بیشتر واقعات میں سے صرف اپنی توہین کے مقدمے میں ہی سزا سنا کر کس چیز کو فروغ دیا ہے۔ قانونی لحاظ سے جائز چیزوں کو انتہائی لازمی سمجھنے کی پالیسی کا ازسرنو جائزہ لینے اور اس اصول پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ تمام اداروں کو نہ صرف اپنی آئینی حدود میں رہ کر کام کرنے بلکہ ایک دوسرے کو استحکام بخشنے والی پالیسیاں اختیار کرنی چاہئیں۔ بدقسمتی سے ریاستی اداروں کے مابین پیدا ہونے والا مسئلہ مستقبل قریب میں حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انصاف اور جمہوریت دونوں کو استحکام ملنا چاہئے اور یہ کہ انصاف جمہوریت کے بغیر اتنا ہی لاحاصل ہے جتنا کہ جمہوریت انصاف کے بغیر بے معنی ہے۔ اس صورتحال کے باعث کئی ہفتوں سے شدید پریشانی میں مبتلا افراد کی خواہش ہے کہ اس لاحاصل کشیدگی کا خاتمہ ہونا چاہئے۔

20 جون: ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان نے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کی برخواستگی کو پاکستان جیسے ملک کے لیے افسوس ناک اور دکھ کی بات قرار دیا ہے جہاں جمہوری روایات کو ہمیشہ ہی کچلا جاتا رہا ہے اور انہیں کبھی پروان چڑھنے کی مہلت ہی نہیں دی گئی۔

HRCP نے کہا: '' شاید سپریم کورٹ کا فیصلہ غیر متوقع نہیں ہے۔ ایک منتخب وزیراعظم کی اس کے عہدے سے علیحدگی......خاص طور پر پاکستان جیسے ملک میں...... جہاں جمہوری روایات پہلے ہی بہت کمزور ہیں، ایک انتہائی افسوس ناک بات ہے اور یقیناً ایسی بات نہیں ہے کہ اس پر کسی طرح بھی خوشی یا اطمینان کا

اظہار کیا جائے۔کوئی بھی قانونی نظام کے لوازمات سے انکار نہیں کر سکتا لیکن فیصلے کا مفہوم اور معنی ایک پائیدار معاشرے سے کوئی رغبت نہیں رکھتے اور جو بحران پیدا ہوتا نظر آ رہا ہے شاید اس کے بارے میں سوچ بچار ہی نہیں کی گئی۔ یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ آمریت کے کئی ادوار کے بعد جمہوری نظام کو توانائی بخشنے اور مزید صدمات برداشت کرنے کی ریاستی استطاعت بہت مضبوط نہیں ہے۔ایسی صورت حال میں جمہوری اداروں کو مناسب مشوروں اور رہنمائی سے مضبوط کرنے اور پروان چڑھانے کی ضرورت ہے نہ کہ تادیبی اقدامات کے ذریعے۔

''یہ اصول کہ جج صاحبان کو غیر معمولی طور پر محتاط ہونا چاہئے...... جب وہ ایسے مقدمات کا فیصلہ کر رہے ہوں جو ان کی اپنی عزت یا توہین کے متعلق ہیں، اس سے کہیں زیادہ عزت و احترام کا متقاضی ہے جتنا کہ بادی النظر میں اسے ملا۔ یہ فیصلہ توہین عدالت کے تصور اور سزا کی حد اور وسعت کے بارے میں بھی سوالات کو جنم دے گا۔ جو دی جا سکتی ہے۔خاص طور پر قید کی سزا۔

اس نازک وقت میں جمہوریت کو درپیش خطرات زیادہ سے زیادہ افہام و تفہیم کا تقاضہ کرتے ہیں اور ملک کے جمہوری مستقبل کے لیے خطرات بہت زیادہ بڑھ جائیں گے۔اگر سیاسی جماعتیں یونہی معمولی مفادات کے لئے آپس میں لڑتی رہیں۔ بالآخر اس بات کا فیصلہ عوام نے ہی کرنا ہے کہ ان پر کس نے حکومت کرنی ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ ماحول کو اس حد تک خراب نہیں کیا جائے گا کہ عوام کی انتخابی ترجیحات کا تعین کرنا ہی ناممکن ہو جائے۔

17 جولائی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے ملک میں جمہوری نظم و نسق پر منڈلاتے ہوئے خطرات پر تشویش کا اظہار کیا ہے اور سیاسی جماعتوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ جمہوریت کو درپیش خطرات کے ازالے کے لیے ذمہ داری کا مظاہرہ کریں۔

ایچ آر سی پی کے سب سے اعلیٰ منصوبہ ساز ادارے، پالیسی ساز کمیٹی نے یہاں اپنے اجلاس کے دوران سیاسی جماعتوں پر زور دیا کہ وہ باضابطہ انتقال اقتدار کو یقینی بنائیں اور ان عناصر سے باخبر رہیں جو منتخب نمائندوں اور انتخابی طریقہ کار کے بغیر محض دکھاوے کا جمہوری ڈھانچہ نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

ایچ آر سی پی نے کہا،''سیاسی جماعتوں کو حالات کی سنگینی اور جمہوری نظم و نسق کو درپیش مشکلات کا ادراک کرنا چاہیے۔انہیں علم ہونا چاہیے کہ ان کا حالیہ رویہ سودمند نہیں ہے۔شدید بدعنوانی اور ناقص نظم و نسق کے باعث سیاسی جماعتوں کی حمایت میں شدید کمی واقع ہوئی ہے اور عارضی مفادات کے لیے وضع کردہ غیر معقول اور غلط پالیسیاں بھی سیاسی عمل کے لیے خطرہ ہیں۔ سیاسی جماعتوں کو ادراک کرنا چاہیے کہ خاموش

تماشائی بنے رہنے یا آپس میں بے معنی لڑائی لڑتے رہنے کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ حالیہ متنازعہ مسائل طاقت یا محض عدالتی اقدامات سے حل نہیں ہوں گے۔ اگر چیزیں اسی سمت کی طرف رواں رہیں تو سب کو اس کے نتائج بھگتنا پڑیں گے اور اس صورت حال کی غیر واضح نوعیت لاقانونیت، لسانی اور فرقہ وارانہ ہلاکتوں اور ان ہلاکتوں میں ملوث افراد کو سزا سے استثناء کی کیفیت کو شدید تر کر رہی ہے۔ یہ ملک کے لیے ایک اہم گھڑی ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم فیصلہ ساز موڑ پر کھڑے ہیں۔ جمہوریت کو لاحق خطرات کا حل انتخابی طریقہ کار پر اعتماد اور نگران بندوبست پر اتفاق رائے کا اظہار کرنے میں ہے۔ ایچ آر سی پی امید اور توقع کرتا ہے کہ سیاسی جماعتیں اپنی ذمہ داری کا احساس کریں گی اور اپنے نمائندوں کو منتخب کرنے کے عوام کے حق سے انہیں محروم کرنے کے کسی بھی منصوبے میں شریک نہیں ہوں گی۔

12 اگست: پاکستان کی بقاء کا انحصار جمہوری ڈھانچے کی مضبوطی پر ہے چنانچہ سول اور فوجی حکام کے مابین پائی جانے والی کشیدگی اور ان کے تعلقات کے عدم توازن کو دور کیا جائے اور اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ تمام ریاستی ادارے اپنی حدود کے اندر رہتے ہوئے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ تمام سیاسی حلقوں سے تعلق رکھنے والے سیاستدانوں، سابق فوجی افسران، سول سوسائٹی کے نمائندوں، معروف ماہرین تعلیم اور صحافیوں نے ''سول، ملٹری تعلقات اور انسانی حقوق پر اس کے اثرات'' نامی مشاورتی تقریب میں شرکت کی۔ مشاورت کے اختتام پر شرکاء نے درج ذیل قرارداد منظور کی۔

1۔ پاکستان کی بقا جمہوری ڈھانچے کے استحکام پر منحصر ہے اور یہ مضبوط پارلیمان یا خودمختار عدلیہ کے بغیر فروغ نہیں پا سکتا۔ ملک کو دونوں کی ضرورت ہے۔ البتہ حالیہ واقعات پریشان کن ہیں کیونکہ پارلیمان کی اتھارٹی کو نقصان پہنچا ہے اور اس کے قانون سازی کے اختیار کو چیلنج کیا گیا ہے۔ بنیادی حقوق سے متصادم تمام قوانین عدالتوں کی جانب سے کالعدم قرار دیے جانے چاہئیں مگر وہ پارلیمان کے قوانین سازی کے حق پر پابندیاں عائد نہیں کر سکتیں۔

2۔ ایک خودمختار عدلیہ اور انصاف کے قیام کا موثر نظام جمہوری نظم و نسق کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ عدلیہ کے خودمختار کردار کے استحکام کے لیے سیاسی جماعتوں کو ایک آئینی عدالت کے قیام پر غور و فکر کرنا چاہیے جس کے قیام کا وعدہ ملک کی دو مرکزی سیاسی جماعتوں کے دستخط شدہ میثاق برائے جمہوریت (Charter of Democracy) میں کیا گیا تھا۔ اٹھارہویں ترمیم کی منظوری اور وفاق و صوبوں کے مابین پیدا ہونے والے نئے تعلقات کے بعد ایسی عدالت کا قیام فوری ضرورت بن چکا ہے۔

3۔ ریاستی آمدنی جمع کرنے اور وسائل کے استعمال میں شفافیت کو یقینی بنانے کی اشد ضرورت ہے۔ اس حوالے سے انتظامیہ کے مختلف شعبوں، فوج، خفیہ معلومات کی ایجنسیوں اور عدلیہ سمیت تمام ریاستی اداروں کو جوابدہ ہونا چاہیے۔

4۔ ملک کے لیے فوج کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے گزشتہ چند برسوں میں دہشت گردی کے خلاف لڑتے ہوئے بہت زیادہ نقصان اٹھایا ہے مگر اسے دوسری چیزوں کے علاوہ اپنی پیشہ وارانہ مہارت کو برقرار رکھنا چاہیے اور سیاسی نوعیت کی خفیہ سرگرمیوں اور معاشی سرگرمیوں کو بند کرنا چاہیے جو کہ نہ صرف ملک پر غیر ضروری معاشی بوجھ ہیں بلکہ فوج کو اس کے پیشہ وارانہ فرائض سے بھی دور کرتی ہیں۔

5۔ ملک کو کس سمت جانا چاہیے، اس معاملے پر ایک طرف فوجی کمانڈروں اور دوسری طرف سویلین حکام و سول سوسائٹی کے خیالات میں پائے جانے والے تضاد سے ملک کو بہت زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے ضروری ہے کہ دونوں فریق باہمی گفت وشنید کریں اور مستقبل کی طرف پیش رفت کرنے کے لیے بہتر راستہ تلاش کریں۔

6۔ بلوچستان کی صورتحال انتہائی تشویش ناک ہے اور سول۔ ملٹری تعلقات میں پائے جانے والے عدم تواں اور انسانی حقوق پر اس کے اثرات کی واضح مثال پیش کرتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ تمام حلقوں کی سیاسی قیادت اس نازک صورتحال کو سنجیدہ اور گہری توجہ دے۔

7۔ سویلین اور فوجی حکام کے مابین ہم آہنگ تعلقات اور انسانی حقوق کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ تمام سیاسی جماعتیں اپنی جماعتوں کے اندر جمہوری رویے کا مظاہرہ کر کے جمہوری کلچر کے فروغ میں کردار ادا کریں۔

8۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ سیاسی جماعتیں انسانی حقوق کے مسائل خصوصاً جبری گمشدگیوں کے واقعات، فاٹا اور پاٹا میں استحصالی قوانین کا سنجیدگی کے ساتھ نوٹس لیں۔ سیاسی جماعتوں کو چاہیے کہ وہ عوام کی ضروریات وخواہشات کو ترجیح دے کر، خارجہ پالیسی کے امور کو نبٹا کر اور تمام پالیسیوں اور فیصلوں کی ذمہ داری قبول کر کے پارلیمان کے خودمختارانہ حقوق کا جامع نقطہ نظر اپنائیں۔

9۔ سیاسی جماعتوں کے اندر قانونی یونٹ تشکیل دیے جا سکتے ہیں تا کہ وہ اپنی قانون ساز ذمہ داریاں بہتر ادا کر سکیں اور جماعتیں زیادہ سنجیدگی کے ساتھ اپنے اہداف پر توجہ دے سکیں۔

10۔ تمام سیاسی جماعتوں کو اس امر کو یقینی بنانا چاہیے کہ اگلے انتخابات آزاد ماحول میں منعقد ہوں اور سکیورٹی

وخفیہ ایجنسیوں سمیت تمام ایجنسیوں کی انتخابی عمل میں مداخلت نہ ہو۔ یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ سیاسی جماعتیں عدلیہ کو انتخابی عمل میں غیر ضروری مداخلت کرنے کی دعوت نہ دیں۔ تمام سیاسی جماعتوں کو عہد کرنا چاہیے کہ خواتین کو ووٹ ڈالنے کا حق استعمال کرنے سے نہیں روکا جائے گا اور سیاسی جماعتیں خواتین کو ان کے حق رائے دہی کے حق سے محروم کرنے کے کسی منصوبے میں شریک نہیں ہوں گی۔

11۔ ریاست، سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی کو چاہیے کہ وہ شدت پسندی کو کسی صورت میں برداشت نہ کریں۔ اگر یہ ظاہر ہو جائے کہ کوئی ریاستی اہلکار یا سیاسی عناصر شدت پسند عناصر کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں، انہیں تحفظ دے رہے ہیں یا ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں تو کسی کو بھی خاموش نہیں رہنا چاہیے۔

12۔ اراکین پارلیمان کو صوابدیدی فنڈز دینے کی روش ختم ہونی چاہیے۔ یہ سیاست کو کرپٹ کرنے اور اقربا پروری کو جنم دینے کا سبب بنی ہے۔ بیوروکریٹوں اور ججوں کو پلاٹ دینے کی سیاست کا بھی خاتمہ ہونا چاہیے۔

13۔ یہ افسوس ناک امر ہے کہ خفیہ اداروں کے کام کو باضابطہ کرنے کی غرض سے سینٹ میں پیش کیا جانے والا فرمت اللہ بابر کا بل واپس لے لیا گیا ہے۔ بل میں تجویز کردہ اقدامات پر سیاسی جماعتوں کی بحث ہونی چاہیے اور باضابطہ طریقہ ہائے کار پر اتفاق رائے بننا چاہیے۔ جس کی ریاست کو جتنی آج ضرورت ہے اتنی پہلے کبھی نہیں دی۔ اتنا ہی ضروری جوابدہی کے موثر نظام کی ضرورت ہے جو ریاست کے تمام اداروں کے کام کی نگرانی کرے۔

14۔ صحت مند سیاسی روایات کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ ماضی میں آمرانہ ادوار حکومت کی حمایت کرنے والی سیاسی جماعتیں اپنی غلطی کا اعتراف کریں اور عوام سے معافی مانگیں۔

15۔ اٹھارہویں اور انیسویں ترامیم کی منظوری کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آئینی ترامیم کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ آئین 1973 کی اپنی اصلی شکل میں بحالی تک آئینی اصلاحات کا عمل جاری رہنا چاہیے۔ جنرل ضیاء الحق کی شامل کردہ دفعات 62 اور 63 کو حذف کرنے کی ضرورت ہے جو ذاتی سوچ کی بنیاد پر فیصلے کرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ سپریم جوڈیشل کونسل کے نظم ونسق میں بھی اصلاحات متعارف کروانی چاہئیں اور لوگوں کے مزید حقوق کو بنیادی حقوق تسلیم کرنے کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

16۔ تجارت کے متعلق ایک پارلیمانی کمیٹی بنی چاہیے تاکہ اراکین پارلیمان پاکستان کے معاشی مسائل سے

مزید آگاہ ہوں اوران کے حل کے عمل میں اپنی شراکت کو بڑھائیں۔

سامعین کی تجاویز پر کانفرنس اس امر پر متفق ہوئی کہ تمام ہائی کورٹس کے ججوں کی تعیناتی شفاف طریقے سے ہونی چاہیے۔ اگرچہ تمام شرکاء نے مکمل اتفاق رائے سے قرارداد کی حمایت کی تاہم جماعت اسلامی کے نمائندے نے عدلیہ سے متعلق نکات اور آئین کی دفعات 62اور63 کو حذف کرنے کی سفارش سے اختلاف رائے کا اظہار کیا۔

سزائے موت

14 مئی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کواس امر پر تشویش ہے کہ ملک میں پھانسی پر غیر رسمی پابندی کے باوجود سزائے موت کے ایک ملزم کو کراچی جیل میں 23 مئی کو پھانسی دیے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایچ آر سی پی کا مطالبہ ہے کہ مذکورہ پھانسی پر عملدرآمد روکا جائے اور سزائے موت پر عملدرآمد پر باضابطہ پابندی عائد کی جائے۔

کمیشن نے کہا: ''ایچ آر سی پی کو ان اطلاعات پر انتہائی تشویش لاحق ہے کہ کراچی میں سزائے موت کے قیدی، بہرام خان کو 23 مئی کو پھانسی دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ ملک میں کسی سزائے موت کے قیدی کو دی جانے والی آخری پھانسی 2008 کے آخر میں دی گئی تھی۔ جس کے بعد سے ملک میں پھانسی پر غیر رسمی پابندی عائد ہے۔ ایچ آر سی پی ملک میں پھانسی کے تعطل کو خوش آئند قرار دیتا ہے اور متعدد بار حکومت سے مطالبہ کر چکا ہے کہ وہ 2008 میں اپنے کیے گئے وعدے کی پاسداری کرتے ہوئے تمام موت کی سزاؤں کو عمر قید میں تبدیل کردے۔ ایچ آر سی پی حکومت کو یاددہانی کروانا چاہتا ہے کہ جن وجوہات کی بنا پر 2008 میں پھانسیوں پر پابندی عائد کی گئی تھی ان میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ ان وجوہات میں قانون میں موجود خامیاں، انصاف کے انتظام وانصرام اور تحقیقاتی ضوابط میں پائے جانے والے نقائص اور شدید بدعنوانی شامل ہیں اور ان عوامل کے نتیجے میں انصاف کی فراہمی میں ناکامی کے بہت واضح امکانات ہیں۔ اس تناظر میں، بہرام خان کے لیے 23 مئی کو پھانسی کا حکم ایک رجعتی اقدام ہے اور کئی سطحوں پر تشویش کا باعث ہے۔ ایچ آر سی پی حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ مذکورہ پھانسی سمیت دیگر تمام زیرغور پھانسیوں پر عملدرآمد کو فوری روکا جائے اور جلدازجلد پھانسی پر عائد غیر رسمی پابندی کو رسمی پابندی میں تبدیل کیا جائے۔ اس اقدام کے باعث صدر مملکت کو ہر چھ ماہ بعد پھانسی پر پابندی عائد کرنے کے احکامات صادر کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ہمارا صدر مملکت سے بھی مطالبہ ہے کہ وہ رحم کی اپیلوں پر غور کریں اور سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کریں۔ ایچ آر سی پی

حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ قانون کی کتابوں سے سزائے موت کے خاتمے جیسے اقدام سمیت انتہائی سنگین جرائم کے علاوہ، تمام جرائم کے لیے سزائے موت کے خاتمے کے لیے اقدامات اٹھائے۔

ایچ آر سی پی حکومت سے یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ بین الاقوامی میثاق برائے شہری وسیاسی حقوق کے اختیاری پروٹوکول پر دستخط کرے جس کا مقصد سزائے موت کا خاتمہ ہے۔ کمیشن اراکین پارلیمان، سیاسی جماعتوں اور سول سوسائٹی سے اپیل کرتا ہے کہ وہ پاکستان میں سزائے موت کے خاتمے کی تحریک میں شامل ہوں اور ملک میں زندگی کے حق کے تقدس کو فروغ دیں۔

15 نومبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے جنوری 2009 سے ملک میں پھانسی پر غیر رسمی پابندی کے تسلسل کے باوجود جمعرات کو میانوالی جیل میں سزائے موت کے قیدی کو پھانسی دیے جانے کے واقعے پر شدید دکھ اور تشویش کا اظہار کیا ہے۔

ایک بیان میں کہا گیا: ''ایچ آر سی پی کو میانوالی سنٹرل جیل میں ایک قیدی کی پھانسی پر شدید افسوس ہے۔ یہ امر بھی باعث تشویش ہے کہ مذکورہ پھانسی کے نتیجے میں چار سالہ تحریک شدید متاثر ہوئی ہے جو حکومت کی جانب سے زندگی کے حق کے احترام اور کسی کو بھی پھانسی نہ دینے کے عزم کے بعد مستحکم ہوئی تھی۔ اب تک گزشتہ چار برسوں میں سزائے موت کے متعدد قیدیوں کو پھانسی دینے کی تاریخوں کا اجراء کیا جاتا رہا ہے، تاہم اس غیر انسانی سزا پر عمل درآمد کو ہمیشہ ملتوی کر دیا گیا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس دفعہ ایسا غفلت کا نتیجہ ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ سزا فوجی عدالت کی طرف سنائی گئی تھی۔ اس سے قبل دسمبر 2008ء میں پاکستان میں سزائے موت کے قیدی کو پھانسی دیے جانے کی وجہ بھی یہ تھی کہ اسے فوجی عدالت نے سزا سنائی تھی جو انتہائی پریشان کن امر ہے۔ اس مایوس کن واقعے کے باوجود ایچ آر سی پی کو امید ہے کہ حکومت پاکستان میں سزائے موت کے خاتمے کے اپنے وعدے سے دستبردار نہیں ہوگی۔ ہم فوج کے سربراہان سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ وہ عالمی سطح پر سزائے موت کے خاتمے کے بڑھتے ہوئے مطالبات کا نوٹس لیں اور اس امر کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کریں کہ فوجی عدالتیں بھی اس انسانیت دوست مطالبے کو احترام کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔

مخلوط

18 مارچ: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے ملک میں انسانی حقوق کی مسلسل بگڑتی ہوئی صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا ہے اور متعلقہ حلقوں سے اپیل کی ہے کہ ملک کو درپیش مسائل کا فوری حل تلاش کیا جائے اور یہ کہ وہ سب مل کر سیاسی عمل کا احترام کریں اور اسے مستحکم بنائیں۔

اتوار کے روز HRCP کی سالانہ جنرل باڈی اجلاس کے بعد جاری ہونے والے بیان میں کمیشن نے کہا:

''ملک ایک نازک مرحلے میں سے گزر رہا ہے جہاں جمہوری تجربے کو ایک آزمائش کا سامنا ہے اور یہ بات ناگزیر ہے کہ سیاسی عمل کا احترام کیا جائے اور اسے مستحکم بنایا جائے۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق اس بات کو اہم تصور کرتا ہے کہ آئین میں بہتری لانے کے عمل کو جاری رکھا جائے......اتنی دیر تک جب تک کہ آمریت کے تمام نشان مٹا نہیں دیے جاتے اور بنیادی حقوق کی منزل کو مزید مستحکم نہیں بنایا جاتا۔ HRCP کی رائے میں پارلیمنٹ کے لیے چار سال کی معیاد پر بھی غور کیا جانا چاہیے تا کہ عوام کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنے جمہوری حقوق استعمال کرتے رہیں اور حکومت سے باز پرس کر سکیں۔ یوں نئی لیڈر شپ کو بھی اُبھرنے کا موقع ملتا رہے گا۔ اب وقت آن پہنچا ہے کہ آئندہ انتخابات کے موقع پر فوج کی طرف سے......انتہا پسند عناصر کی طرف سے...... یا کسی بھی مخصوص عدالتی عمل کے ذریعے ملک میں ماورائے جمہوریت مداخلت کے امکان کو روکا جائے۔ اس لحاظ سے عوام کی تشویش کو اہمیت دی جانی چاہیے اور اسے ممکنہ حد تک کم کیا جائے۔

HRCP کو اس بات پر شدید تشویش لاحق ہے کہ ملک میں مذہبی اور فرقہ وارانہ تشدد میں اضافہ ہو رہا ہے اور مطالبہ کرتا ہے کہ حکومت سویلین اور فوجی انتظامیہ کی مدد سے سخت اقدامات اٹھائے، تاکہ اس خطرناک رجحان پر قابو پانے میں مدد مل سکے......خاص طور پر احمدی برادری کے خلاف روا رکھے جانے والے مظالم...... شیعہ حضرات کی ہلاکتیں اور ہندو برادری کے ارکان کی اغواء برائے تاوان کے لیے کی جانے والی وارداتیں، خاص طور پر انہیں تبدیلی مذہب پر مجبور کرنا، کم از کم اس حوالے سے کوششیں ضرور کی جائیں کہ معاشرے میں عدم برداشت کے رجحان پر قابو پایا جا سکے۔

بلوچستان میں اُمید کی کرن تلاش کرنا مشکل نظر آتا ہے جہاں جبری گمشدگیوں سے متاثرہ افراد لاپتہ ہی رہتے ہیں یا یہ کہ گم شدہ افراد کی لاشوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ 2011 کے دوران کم از کم 173 لاشیں ملیں۔ جب تک اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے سیاسی ذرائع بروئے کار نہیں لائے جاتے، معاملہ خطرناک صورت حال اختیار کرتا جائے گا۔ سکیورٹی ایجنسیوں کو جو استثنیٰ حاصل ہے اسے ختم کیا جانا چاہیے۔ امن عامہ کی صورت حال میں بہتری لائی جائے اور اغوا برائے تاوان کے واقعات میں جو اچانک اضافہ دیکھنے میں آیا ہے اسے کنٹرول کیا جائے۔ آخری تجزیے کے طور پر، بلوچستان کے عوام کو اپنے معاملات حل کرنے کے لیے فیصلہ کن کردار ادا کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ حکومت گلگت بلتستان کو درپیش مسائل

حل کرنے کی طرف فوری توجہ مبذول کرے اور گلگت بلتستان کے عوام کو جن سیاسی اور سماجی واقتصادی مسائل کا سامنا ہے ان کے حل کی طرف فوری توجہ دے اور فرقہ وارانہ تشدد کے رجحان پر قابو پانے کے لیے تمام ممکنہ اقدامات بروئے کار لائے۔

کراچی کی صورت حال میں ابھی تک بہتری کے آثار پیدا نہیں ہوئے اور پاکستان کے اس سب سے بڑے شہر میں تشدد کی لہر (جواب روزمرہ کا معمول بن گیا ہے) کو روکنے کے لیے کوئی عملی اقدام نہیں اٹھایا گیا۔ سندھ میں سیاسی کارکنوں کو نشانہ بنانے اور اغوا کے بعد قتل کرنے کی نئی لہر نے عوام کے خوف میں مزید اضافہ کیا ہے۔

یہ بات انتہائی افسوسناک ہے کہ شہریوں کی جبری گمشدگیوں کا مسئلہ جواب تقریباً دس سالہ پرانا ہو چکا ہے اس کے حوالے سے کسی ایک واحد شخص کو بھی حراست میں نہیں لیا گیا، حکومت فوری طور پر ایسی نظر بندیوں کا اعتراف کرے۔ لوگوں کو رہا کرے اور ایسے اقدامات بروئے کار لائے کہ گمشدگیاں ماضی کے واقعات بن کر رہ جائیں۔ اب وقت آن پہنچا ہے کہ اس جرم کا شکار ہونے والے افراد کے لیے مناسب معاوضے کا ایک نظام متعارف کروایا جائے کیونکہ یہ جرم سرکاری ایجنسیاں ہی سرزد کرتی ہیں۔ عسکریت پسندوں کے خلاف سکیورٹی فورسز کی کارروائی کے نتیجے میں بہت سے افراد فوج کی حراست میں ہیں۔ ان افراد کے لیے بھی مناسب کارروائی عمل میں لائی جانی چاہیے۔ انٹیلی جنس ایجنسیوں کی کارکردگی میں باقاعدگی لانے کے لیے قانون سازی کی جائے۔

انسانی حقوق کے محافظین کو جن خطرات اور دھمکیوں کا سامنا ہے وہ کسی رکاوٹ کے بغیر جاری وساری ہیں اور 2011 کے دوران HRCP کے تین کارکنوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا، ریاست ان تمام افراد کی حفاظت کا اہتمام کرے جو دوسروں کے حقوق کی نگہبانی میں مصروف ہیں اور ایسا ماحول فراہم کرے جو ان کی کارروائیوں کے لیے مفید اور کارآمد ہے اور انہیں یہ خوف لاحق نہیں ہونا چاہیے کہ ایسی خدمات سرانجام دینے کے لیے انہیں اپنی جانوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ HRCP کی جنرل باڈی، بعض گروہوں کو دی جانے والی آزادی، جس کے تحت وہ بعض افراد......بشمول عاصمہ جہانگیر......کے خلاف بغض اور حسد پر مبنی مواد تقسیم کرتے ہیں کی شدید مذمت کرتی ہے۔ ایسی کارروائیوں کی سنجیدگی کے ساتھ تفتیش ہونی چاہیے اور ذمہ دار افراد کو قرار واقعی سزا دی جانی چاہیے۔

اندرون ملک بے گھر ہونے والے افراد کے مصائب شاید اب حکومت کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے جو ایک انتہائی بدقسمتی کی بات ہے کیونکہ بے گھر ہونے والے افراد کو جن چیلنجوں کا سامنا ہے۔ ان مسائل کے

بارے میں HRCP کو بہت تشویش لاحق ہے ان چیلنجوں اور تشویش میں حالیہ مہینوں کے دوران اضافہ ہوا ہے۔ جو لوگ اپنے گھروں کو واپس آئے ہیں اور ان کو جن مسائل اور تکالیف کا سامنا ہے، انہیں حل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، متاثرہ افراد کے ساتھ مشاورت کی روشنی میں اس حوالے سے بہتری کی اُمید ہے۔ بے گھر ہونے والے بچوں کی صحت اور تعلیمی ضروریات کو اوّلین ترجیح دی جانی چاہیے...... جو انہیں اب تک نہیں دی گئی۔

ان پاکستانیوں کی تعداد، جن میں زیادہ تر بے قاعدہ تارکین وطن شامل ہیں......جنہیں بیرون ملک جیلوں میں نظر بند رکھا گیا ہے، ہزاروں کے قریب ہے۔ ان کی حالت زار کی طرف طویل عرصے تک کوئی سنجیدہ توجہ نہیں دی گئی......اب ان کی حالتِ زار توجہ کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کوششیں کی جانی چاہئیں کہ گھروں کو واپسی کے ان کے حق کا احترام کیا جاتا ہے......اور اس حوالے سے جو درست طریقہ کار ہے اس پر بھی عمل درآمد کیا جانا چاہیے۔ شہریوں کو اس پر شدید تشویش لاحق ہے کہ اغوا برائے تاوان کی وارداتوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور یہ کہ ملک بھر میں امن وامان کی صورت حال میں ابتری پیدا ہوئی ہے۔ شہری اور دیہی دونوں علاقوں میں جرائم کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے اور سماجی واقتصادی وجوہات، بشمول مالی محرومیوں نے بھی کردار ادا کیا ہے۔ گزشتہ چند ماہ کے دوران عسکریت پسندوں کی بڑھتی ہوئی کارروائیوں نے بھی ان مسائل میں اضافہ کیا ہے۔ شہری خود کو عدم تحفظ میں مبتلا محسوس کرتے ہیں اور انہیں یوں لگتا ہے کہ وہ مجرموں اور عسکریت پسندوں کے نرغے میں ہیں۔ عوام کے ہاتھ میں اسلحہ دیا جا رہا ہے یا یہ کہ عوام کو مسلح کیا جا رہا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں تشدد کی وارداتوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور خواتین کو عزت و ناموس کے نام پر قتل کیا جا رہا ہے، HRCP کی جنرل باڈی حکومت کو اس کی اس ذمہ داری سے آگاہ کرنا چاہتی ہے کہ عوام کے حقوق کی حفاظت، اس کا پہلا فرض ہے...... یہ حقوق ''زندہ رہنے کے حق'' سے شروع ہوتے ہیں۔ HRCP بڑی مایوسی کے ساتھ اس بات کو نوٹ کرتا ہے کہ فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن میں حالیہ ترمیموں نے نظام میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے قوانین میں ضروری تبدیلیاں لائی جائیں تاکہ اصلاحات کے عمل کو یقینی بنایا جا سکے۔ اجتماعی سزا، سزا کے طور پر گھروں کی مسماری اور یکطرفہ نظر بندی کی تمام اشکال کو غیر قانونی قرار دیا جائے۔ فاٹا میں انسانی حقوق کے نفاذ میں جو خلا پایا جاتا ہے وہ ناقابل دفاع ہے انسانی حقوق کے نفاذ میں مزید تاخیر کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

اظہار رائے کی آزادی کو جن چیلنجوں کا سامنا ہے HRCP کو اس حوالے سے شدید تشویش لاحق ہے۔ اس کے علاوہ میڈیا اور انٹرنیٹ کو سنسر کرنے کے سلسلے میں حکومت کے جو منصوبے ہیں، کمیشن کو ان کے

حوالے سے بھی شدید تشویش لاحق ہے۔ قانون میں کوئی تبدیلی کرنے سے قبل میڈیا، سول سوسائٹی اور عوام سے مشورہ کیا جانا چاہیے، معاشرے میں عدم رواداری کا مقابلہ کرنے کے لیے میڈیا کو مزید کوششیں بروئے کار لانا ہوں گی۔

توہین رسالت کے قوانین کو غلط طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ انتہا پسندوں کی حوصلہ افزائی کا سلسلہ جاری ہے جو انتہائی بدقسمتی کی بات ہے۔ جو عناصر خود کو مذہب کا محافظ ظاہر کرتے ہیں، عوام کو ان کی زیادتیوں سے بچانا انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

HRCP حال ہی میں خواتین کے حق اور حمایت میں اختیار کیے گئے قوانین کو خوش آمدید کہتا ہے اور وہ اس حوالے سے مانیٹرنگ بھی کرے گا کہ ان قوانین پر کس حد تک عمل درآمد ہو رہا ہے۔ وہ الیکشن کمیشن کی طرف سے فراہم کی جانے والی SMS سروس کو بھی خوش آمدید کہتا ہے۔ یہ سروس ووٹرز کی تفصیلات کی تصدیق کرے گی اور کمیشن اس بات کی اُمید کرتا ہے کہ غلطیوں سے مبرا الیکٹورل فہرستوں کی تیاری میں مدد ملے گی۔

10 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے سیاچن میں برف کا تودہ پھسلنے کے نتیجے میں 120 سے زائد فوجیوں اور درجن بھر دیگر شہریوں کی ہلاکت پر گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے اور مستقبل میں ایسے سانحوں سے بچنے کے لیے ضروری اقدامات اٹھانے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

کمیشن نے کہا ''ایچ آر سی پی کو اس سانحے پر شدید دکھ ہے جس میں سیاچن میں برف کے تودے تلے 136 افراد دب گئے اور کمیشن متاثرین خاندانوں کے دکھ میں برابر کا شریک ہے۔ یہ صورتحال اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ اس بات کا فوری جائزہ لیا جائے کہ سیاچن گلیشئر پر تعینات فوجیوں کو کن حالات کا سامنا ہے اور موسم کی شدت اور اس علاقے کی غیر یقینی نوعیت کے باعث پیش آنے والے قدرتی خطرات سے تحفظ کے لیے کیا اقدامات کئے گئے ہیں۔

''یہ انتہائی افسوس ناک بات ہے کہ سیاچن پر پاکستان اور بھارت کو آپس کی لڑائی کے باعث اور ناسازگار موسمی حالات اور سانحات کے باعث انسانی جانوں کے ضیاع کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کمیشن اراکین پارلیمان کے پیر کو کئے جانے والے اس مطالبے کو خوش آئند قرار دیتا ہے کہ بھارت اور پاکستان کے مابین سیاچن کا تنازعہ مذاکرات کے ذریعے حل ہونا اور چاہیے یہ بھی کہنا ہے کہ اس کے علاوہ بھی تمام تنازعات پرامن طریقے سے حل ہونے چاہئیں۔ دونوں ممالک کو چاہئے کہ وہ مذاکرات کے ذریعے اپنے تنازعات کا تصفیہ کریں تاکہ وہ اپنی عسکری تیاریوں اور 'دنیا کے بلند ترین جنگی محاذ' پر ریسکیو کارروائیاں کرنے کی بجائے اپنے لوگوں کی فلاح و بہبود اور ترقی پر اپنے وسائل صرف کر سکیں۔

04 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کراچی میں تشدد کی حالیہ لہر اور امن وعامہ کی ابتر صورتحال پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے جس کے نتیجے میں پہلے ہی بیشتر انسانی زندگیاں ضائع ہوچکی ہیں۔ ایچ آر سی پی نے حکومت اور مرکزی سیاسی جماعتوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ مسئلے کے فوری حل کے لیے مل کر کوئی حکمت عملی تشکیل دیں۔

کمیشن نے کہا: ''ایچ آر سی پی کو قتل وغارت کے حالیہ سلسلے پر نہایت تشویش اور دکھ ہے جس نے کراچی کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ آئے دن ہڑتالوں کے اعلانات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والا تشدد متعدد زندگیوں کے ضیاع اور معاشی نقصان کا باعث بنا ہے۔ پہلے ہی 2012 کے دوران 300 افراد شہر میں ہونے والے تشدد کے باعث ہلاک ہوچکے ہیں۔ دیگر بے شمار لوگ اپنے تحفظ کو لاحق خطرات کے باعث کام پر نہیں جاسکتے یا اپنے گھروں سے باہر نہیں نکل سکتے۔ 2011 کے دوران تشدد کے نتیجے میں تقریباً 1800 افراد ہلاک ہوئے تھے۔

اس امر پر عمومی اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ تشدد کا بنیادی سبب ایک دوسرے کو شہر سے باہر دھکیلنے کے لیے شروع ہونے والی خطرناک جنگ ہے جس میں کراچی کی مرکزی سیاسی جماعتیں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔ ماضی کی طرح، کراچی میں تشدد کی حالیہ لہر بھی اس وقت ختم ہوگی جب کم ازکم وقتی طور پر قاتل قتل کرنے کی اپنی حوس پوری کرلیں گے۔ یہ صورتحال مکمل طور پر ناقابل قبول ہے۔ اس حقیقت کے منکشف ہونے پر کوئی فائدہ نہیں پہنچا کہ ہر دفعہ شہر میں تشدد کا سلسلہ شروع ہونے پر ہلاکتوں کے ذمہ داران کو حکومت گرفتار کرنے میں ناکام ہوئی ہے۔ خصوصاً لیاری میں، ہلاکتوں اور تشدد کے موردالزام ٹھہرائے جانے والے، سیاسی جماعتوں سے وابستہ مسلح گروہوں کے علاوہ، عام جرائم پیشہ عناصر نے بھی امن وامان کی ابتر صورتحال سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ریاستی رٹ کی بحالی اور فسادی عناصر کو گرفتار کرنے اور ان کے خلاف مقدمہ سازی کرنے کی بجائے حکومت نے سیاسی اتحادیوں کو مطمئن کرنے کی پالیسی اختیار کئے رکھی ہے۔ اس پالیسی کا مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ یہ وقت کا تقاضہ ہے کہ کراچی میں تمام سیاسی جماعتیں مل بیٹھ کر شہر میں ہلاکتوں کے وقفہ سے سلسلوں کے خاتمے کا کوئی حل نکالیں۔ انہیں آئندہ شہر میں ہڑتال کی کال نہ دینے کے فیصلے پر بھی اتفاق رائے کا اظہار کرنا چاہئے کیونکہ اس کا دیہاڑی دار مزدوروں پر برا اثر پڑتا ہے جو پہلے ہی زندہ رہنے کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اگر حکومت کراچی میں بلاامتیاز قانونی کارروائی کے اپنے عہد میں سنجیدہ ہے، تو وہ پورے شہر کو اسلحہ سے پاک کرنے کی مہم شروع کرے۔ یہ موجودہ تباہ کن صورتحال کی روک تھام کی جانب پہلا قدم ہوگا۔ تاہم تباہ شدہ کراچی کے زخموں پر مرہم رکھنا پولیس یا نیم فوجی قوتوں کے بس کی بات نہیں۔ یہ کام صرف سیاسی جماعتیں

ہی کر سکتی ہیں۔ گروہ بندی کے خاتمے اور اجنبیوں سے شدید نفرت کے انسداد اور لسانی ہم آہنگی کے فروغ میں ناکامی نے شہر کو ہمیشہ تباہی کے دہانے تک پہنچایا ہے۔ ان معاملات پر فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ تشدد میں ہلاک ہونے والے افراد کو مناسب معاوضے کی ادائیگی بھی کرے۔

04 مئی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے جمعہ کو جاری ہونے والے ایک بیان میں کہا ہے کہ گلگت جیل میں کم ازکم پانچ سیاسی کارکنوں پر مبینہ تشدد کی اطلاعات پریشان کن ہیں اور حکام کی جانب سے ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھنے سے انکار کی عکاسی کرتی ہیں۔

ایچ آر سی پی نے اس امر کا سنجیدگی کے ساتھ نوٹس لیا ہے کہ کئی مہینوں سے جیل میں بند پانچ کارکنوں کو جیل میں غیر معیاری خوراک کی فراہمی اور قیدیوں کے مقدمات کی سماعت میں تاخیر کے حلاف احتجاج کرنے پر ناروا سلوک کا نشانہ بنایا جارہا ہے انہیں جنوری 2010 میں عطا آباد میں زمین سرکنے کے باعث جبری بے دخل ہونے والے متاثرین کے ایماء پر احتجاج کرنے پر قید کیا گیا تھا۔ اطلاعات کے مطابق، 28 اپریل کو جیل میں پولیس اور سکیورٹی ایجنسیوں کے اہلکاروں نے پانچ کارکنوں کو جیل میں احتجاج کی قیادت کرنے کے مشتبہ الزام پر تشدد کا نشانہ بنایا۔ بتایا جاتا ہے کہ تشدد کا نشانہ بننے والوں میں سے ایک کارکن، بابا جان کی دو انگلیاں ٹوٹ گئی ہیں اوان کے سر اور جسم کے دیگر حصوں پر زخم آئے ہیں۔ یہ انتہائی تشویشناک امر ہے کہ ایک مقامی عدالت کے حکم کے باوجود بھی ان اور دیگر کارکنوں کا ڈاکٹر کے ذریعے طبی معائنہ نہیں کروایا گیا اور عدالتی حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہسپتال میں داخل نہیں کروایا گیا۔ تشدد کرنے والے سکیورٹی اہلکاروں کے خلاف مقدمہ درج کرنے والے سکیورٹی اہلکاروں کے خلاف مقدمہ درج کروانے کی کوشش بھی بار آور ثابت نہیں ہوسکیں۔ ایچ آر سی پی سرکاری تحویل میں کارکنوں کے ساتھ ناروا سلوک کی شدید مذمت کرتا ہے۔ ایچ آر سی پی توقع کرتا ہے کہ حکام کو ایسے ہتھکنڈوں اور ریاستی اہلکاروں کی زیادتیوں پر عدم گرفت کے باعث پیدا ہونے والے تباہ کن نتائج کا علم ہونا چاہئیے۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں حکام اس چیز سے لاعلم ہیں۔ ایچ آر سی پی کا مطالبہ ہے کہ مذکورہ پانچ کارکنوں کو بنیادی حق اور منصفانہ قانونی چارہ جوئی کے حق سے محروم نہ کیا جائے۔ ان پر تشدد میں ملوث افراد کو تحقیقات کے دوران معطل کیا جائے اور قصوروار ٹھہرنے والوں کو قانون کے مطابق سزا دی جائے۔ آخری مگر انتہائی اہم نقط یہ ہے کہ حکومت کو شدید طاقت کے ہتھکنڈوں کے استعمال سے گلگت کی پہلے سے خراب صورت حال کو مزید بدتر نہیں کرنا چاہئے۔

25 مئی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے ڈاکٹر شکیل آفریدی کو، جسے اسامہ بن لادن کی تلاش کے عمل میں امریکی معاونت کرنے کے الزام میں تینتیس برس (33) قید کی سزا سنائی گئی ہے،

منصفانہ قانونی کارروائی کے حق سے محروم کرنے پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔کمیشن نے مطالبہ کیا ہے کہ ڈاکٹر آفریدی پر لگائے گئے الزامات سے قطع نظر اُنہیں مقدمے کے دوران ملزم کو حاصل تمام حقوق ملنے چاہیے تھے۔

کمیشن نے کہا''ہر کوئی ملک کی سلامتی کے بارے میں فکرمند ہوسکتا ہے مگر اس امر کو کسی شخص کو قانون کی حکمرانی سے محروم کرنے کا جواز نہیں بنایا جاسکتا۔ایچ آر سی پی نے سنجیدگی سے اس امر کا نوٹس لیا ہے کہ ڈاکٹر آفریدی کا مقدمہ کئی وجوہات کی بنا پر منصفانہ قانونی کارروائی کے تقاضوں پر پورا نہیں اُترتا،جن میں سے یہ وجہ بھی کم اہم نہیں کہ فطری انصاف کے بنیادی اصول کو نظرانداز کیا گیا ہے اور ڈاکٹر آفریدی کو مناسب قانونی معاونت سے محروم رکھا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اُس کے اقدامات کی وجہ ہر قسم کی دہشت گردی کے خلاف ریاست کی اعلان کردہ پُرخلوص پالیسی ہو۔ڈاکٹر آفریدی پر لگائے گئے الزامات سے قطع نظر،ایک قبائلی عدالت میں آفریدی کے خلاف مقدمہ چلانے،اسے پبلک ٹرائل یا اس کی منشاء کی قانونی معاونت کے حق سے محروم کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا جب کہ مبینہ جرم ایبٹ آباد میں سرزد ہوا تھا۔اس طرح کے سلوک سے ایسے شکوک وشبہات جنم لیتے ہیں کہ قبائلی عدالت میں اس کے خلاف مقدمہ چلانے کا واحد مقصد اسے پاکستان کے آئین میں درج شدہ حقوق سے محروم کرنا تھا۔ایچ آر سی پی حکومت سے اس امر کو یقینی بنانے کا مطالبہ کرتا ہے ڈاکٹر آفریدی کا منصفانہ ٹرائل کیا جائے اور انہیں اپنے اوپر لگائے جانے والے الزامات کا دفاع کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔یہ ہر شہری کا حق ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ڈاکٹر آفریدی کو اس سے محروم رکھا جائے۔

31 مئی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کے لاہور سے تعلق رکھنے والے اراکین نے 30 مئی، 2012 کو اپنے ماہانہ اجلاس میں پروفیسر ڈاکٹر شبیہہ الحسن ہاشمی کے بھیانک قتل کی شدید مذمت کی اور پنجاب حکومت سے وقوعہ کی مکمل تحقیقات کرانے کا مطالبہ کیا ہے۔لاہور کے اراکین نے اجلاس کے دوران مرحوم کے سوگ میں ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی۔شرکاء اجلاس نے ادب اور تعلیم کے شعبوں میں پروفیسر ڈاکٹر شبیہہ الحسن کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ ان کی موت سے پاکستان ایک عظیم دانشور اور استاد سے محروم ہوگیا ہے۔انہوں نے مجرموں کی گرفتاری میں پولیس کی ناکامی پر دکھ کا اظہار کیا اور ڈاکٹر شبیہہ الحسن ہاشمی کے اہل خانہ کے تحفظ کا مطالبہ کیا۔

جبری گمشدگی

24 جنوری: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے ان اطلاعات پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ فوجی ہیڈکوارٹرز پر حملے کے الزام میں ملوث ایک اور زیرحراست فرد کی نعش برآمد ہوئی ہے۔منگل کو جاری

ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا: ''ایچ آر سی پی کو شدید تشویش ہے کہ گزشتہ ہفتے پشاور میں عبدالصبور کی نعش کی بازیابی کے بعد، جی ایچ کیو حملے کے الزام میں حراست میں لیے جانے والے ملوث گیارہ میں سے چار افراد ہلاک کئے جا چکے ہیں۔ ان افراد کے اہل خانہ نے قبل ازیں الزام لگایا تھا کہ حراست میں انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ انہیں ہلاک کر دیا جائے گا۔ چاروں ہلاک شدگان اور کم از کم فی الحال زندہ باقی ساتوں افراد کے اہل خانہ کا دکھ وہی ہے جس کا سامنا ملک بھر میں ریاستی اہلکاروں کے ہاتھوں جبری گمشدگی سے متاثرہ دیگر سینکڑوں خاندانوں کو ہے۔

ایچ آر سی پی اپنے موقف کا اعادہ کرتا ہے کہ دہشت گردی کے واقعات میں ملوث ہونے کے الزامات خواہ وہ کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں، ملزمان کو اس حق سے محروم نہیں کرتے کہ ان کے خلاف کارروائی کرتے وقت تمام قانونی ضوابط پر عمل درآمد کیا جائے۔ ایچ آر سی پی کی یہ بھی رائے ہے کہ ایسے واقعات ریاست کے لیے یہ مواقع پیدا کرتے ہیں کہ وہ قانون کی حکمرانی کا احترام کر کے خود کو نمایاں کرے۔ تاہم یہ انتہائی افسوسناک امر ہے کہ ریاستی اہلکاروں اس رائے سے اکثر متفق نہیں ہوتے۔

ایچ آر سی پی کا مطالبہ ہے کہ حکومت ان ہلاکتوں کی تحقیقات کے لیے متاثرہ خاندانوں کے واویلے اور عدالتوں سے رجوع کا انتظار کئے بغیر فوری اقدامات کرے۔ چاروں افراد پر ہونے والے مبینہ تشدد اور ان کی ہلاکت کی وجوہات معلوم کرنے کے لیے فوری تحقیقات ہونی چاہیے تاکہ متاثرہ خاندانوں کی تشفی ہو، مجرموں کی نشاندہی ہو سکے اور ان کو سزا مل سکے۔ حکومت اس امر کو بھی یقینی بنائے کہ باقی زندہ بچ جانے والوں کے ساتھ ایسا ماورائے قانون سلوک نہ کیا جائے۔ یہ امید بھی کی جاتی ہے کہ حکومت پاکستان میں جبری گمشدگی کا شکار ہونے والے تمام افراد کی بازیابی کو اپنی اولین ترجیح بنائے گی اور جبری گمشدگیوں کا انسداد کرے گی جو نہ صرف انصاف کے اصولوں اور انسانی حقوق سے رُوگردانی کرتی ہیں بلکہ ان کے تمسخر کا بھی باعث بن رہی ہیں''۔

02 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے بلوچستان میں جبری گمشدگی کے واقعات کی تصدیق کے سلسلے میں پائی جانے والی مشکلات کو اجاگر کیا ہے اور تمام فریقین پر زور دیا ہے کہ وہ ان واقعات کا ریکارڈ رکھنے کے لیے اپنا کردار ادا کریں تاکہ غیر قانونی زیرِ حراست افراد رہا ہو سکیں، اس غیر قانونی طرزِ عمل کا خاتمہ ہو سکے اور جبری گمشدگی کا کوئی واقعہ نظرانداز نہ ہو۔

ایچ آر سی پی نے کہا: یہ لمحہ فکریہ ہے کہ پاکستان میں جبری گمشدگیوں کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ایچ آر سی پی گزشتہ کئی برسوں سے جبری گمشدگی کے واقعات کا ریکارڈ رکھنے کا کام کر رہا ہے اور کمیشن اس امر کا

اعتراف کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا کہ خصوصاً بلوچستان میں درست اعداد وشمار کی ریکارڈ سازی کا کام انتہائی مشکل اور بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔قوم پرستوں کا دعویٰ ہے کہ بلوچستان میں جبری گمشدگی کا شکار ہونے والوں کی تعداد ہزاروں میں ہے اور لوگوں کو ان کی رائے کا احترام کرنا چاہئے۔ جبکہ حکام نے یہ تعداد درجنوں سے سینکڑوں کے درمیان بتائی ہے جو کہ واضح طور پر حقائق کے برعکس ہے۔ تاہم، مسئلہ یہ ہے کہ جبری گمشدگی کے واقعات کو قلمبند کرنے کا کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ جب 2007 میں ایچ آر سی پی نے سپریم کورٹ میں لاپتہ افراد کی بازیابی کی عرضداشت دائر کی تھی تو ریکارڈ شدہ واقعات کی تعداد 400 سے کچھ زیادہ تھی۔

ایچ آر سی پی حکومت سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ وہ سرکاری ایجنسیوں کی غیر قانونی حراست میں قید تمام افراد کی رہائی کو یقینی بنائے اور اس غیر قانونی عمل کے فوری خاتمے کے لیے اپنی کوششوں میں تیزی لائے۔

23 مئی: پیر کے روز مظفر بھٹو کا قتل جو سندھ میں غائب کئے جانے والے متعدد افراد میں شامل تھے اور منگل کے روز کراچی میں پرامن جلوس پر حملہ جس میں کم ازکم سولہ افراد ہلاک ہوگئے، سیاسی مطالبات کے پرتشدد اشتعال کے تازہ ترین مظاہر ہیں اور موثر اقدامات کی عدم موجودگی میں یہ سب کچھ بلوچستان طرز کی بھیانک کارروائی لگتا ہے۔ ایچ آر سی پی نے ان خیالات کا اظہار منگل کے روز یہاں جاری ہونے والی پریس ریلیز میں کیا۔

ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان نے کہا: ''مظفر بھٹو سیکرٹری جنرل جیئے سندھ متحدہ محاذ کی نعش جو فروری 2011 میں گم ہو گئے تھے، حیدرآباد کے نزدیک پڑی ملی۔ انہیں سر اور کمر کے اوپر والے حصے میں گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ ان کے جسم پر تشدد کے نشانات بھی تھے۔ انہیں 2005 میں اٹھا لیا گیا تھا۔ لیکن انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ فیملی ارکان مصر ہیں کہ ان کی موت میں ریاستی ایجنسیاں ملوث ہیں اور کہا کہ وہ نہ تو دہشت گرد تھے اور نہ ہی کوئی مجرم تھے، وہ صرف ایک سیاسی کارکن تھے اور سندھ میں جبری غائب کئے جانے والے افراد میں سے ایک تھے جنہیں سرکاری ایجنسیوں نے اغواء کیا تھا۔ جیئے سندھ متحدہ کے متعدد کارکن جنہیں غائب کیا گیا تھا، کے بارے میں ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کہاں ہیں۔ نومبر 2010 سے ایچ آر سی پی اندرون سندھ میں کم ازکم 41 افراد کی گمشدگی کی تصدیق کر سکا ہے۔ ان میں 20 افراد کا پتہ لگ چکا ہے یا انہیں رہا کر دیا گیا ہے اور 14 افراد کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں لگ سکا۔ گم شدہ افراد میں سے پندرہ کا تعلق سیاسی جماعتوں سے ہے جو بدین کے ہیں جن میں سے نو کو رہا کر دیا گیا ہے اور چھ ابھی تک لاپتہ ہیں۔ ایچ آر سی پی بلوچستان طرز کی گمشدگیوں پر انتہائی پریشان ہے اور افسوس کی بات ہے کہ

لاشوں کو شاہراہوں پر پھینکنے کا سلسلہ اب سندھ تک پھیل چکا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ حکام نے ماضی سے سبق سیکھ لیا ہوگا اور سندھ میں شہریوں کو اٹھانے کی غیر قانونی روایت پر عملدر آمد نہیں کریں گے۔ عدالتوں کو بھی جبری گمشدگیوں کا جائزہ لینا چاہئے اور ان اشخاص کے بیان قلمبند کرنے چاہئیں جو قید سے زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور مجرموں کو انصاف کے تقاضوں کے مطابق وہ سزا دی جانی چاہئے جس کے وہ مستحق ہیں۔ کسی سیاسی جلسے پر حملہ اور نتیجے میں ہونے والا جانی نقصان اس بات کا اشارہ ہے کہ کراچی میں امن وامان کی صورت کیسی ہے۔ یہاں بے مقصد تشدد اور انسانی زندگیوں کا ضیاع روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔ منگل کے روز پولیس نے جس ردعمل کا مظاہرہ کیا اس کی پولیس سے توقع کی جارہی تھی یا لوگ پولیس سے یہی توقع کرتے ہیں۔ ہلاکتوں کے خلاف مظاہرہ کرنے والے سیاسی کارکنوں پر گولی چلادو۔ حکام کو اس واقعہ کی تحقیقات کرنی چاہئے...... ایسی تحقیقات جو صاف اور شفاف ہوں اور قاتلوں کو وہ سزا دی جانی چاہئے جس کے وہ حق دار ہیں۔ حکومت کو اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کی ریلی کے شرکاء کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکامی نہ صرف یہ کہ ان کے خلاف نااہلی کے الزامات کی تصدیق کرتی ہے بلکہ اس بات کی بھی تصدیق کرتی ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے بذات خود ان ہلاکتوں میں ملوث ہیں۔

اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں میں عوام کے اعتماد کو بحال کیا جائے اور یہ سب کچھ صرف باتیں کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ حکام اس بات کو یقینی بنائیں کہ سرکاری ایجنسیوں کو کنٹرول میں رکھا جائے اور انہیں لوگوں کو ہلاک کرنے کی کھلی چھٹی نہیں دی جانی چاہئے اور سیاسی حقوق کے لیے جدوجہد کو تشدد سے نہیں دبایا جاتا۔ سول سوسائٹی اور سیاسی جماعتوں کو صورتحال میں بہتری لانے کے لیے اپنا اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔ صورتحال جس میں کافی بگاڑ پیدا ہو چکا ہے۔

11 جون: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کہا ہے کہ اس نے جبری گمشدگیوں کی تحقیقات کرنے والے مختلف سرکاری اداروں کو ہمیشہ مکمل اور تصدیق شدہ معلومات فراہم کی ہیں۔ ایچ آر سی پی نے یہ بیان 'انکوائری کمیشن برائے گمشدہ افراد' کے سربراہ جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال کی جانب سے اختتام ہفتہ کو جاری ہونے والی آراء کے بعد دیا ہے۔ سابق جج نے کہا کہ ملک میں گمشدہ افراد کی تعداد کے حوالے سے بے بنیاد پراپیگنڈہ پایا جاتا ہے اور حکام فہرست میں شامل گمشدہ افراد کی مکمل تفصیلات مرتب کرنے میں ناکام ہیں۔ انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ گمشدہ افراد کے معاملے میں بیرونی ایجنسیاں ملوث ہیں۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے کہا: ''ایچ آر سی پی نے کبھی انکوائری کمیشن کو سنے سنائے یا غیر تصدیق شدہ واقعات ارسال نہیں کئے اور ہمیشہ 'یو این فارم برائے جبری گمشدہ افراد' کی مطابقت میں معلومات

جمع کروائی ہیں۔ مزید یہ کہ ایچ آر سی پی کی جانب سے جمع کروائے گئے واقعات میں شامل متعدد گمشدہ افراد کی سراغ رسانی میں انکوائری کمیشن کی کامیابی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ایچ آر سی پی کی جانب سے فراہم کردہ تمام تفصیلات حقائق پر مبنی تھیں۔ بلوچستان حکومت کی گمشدہ افراد کی مکمل تفصیلات فراہم کرنے میں بیان شدہ ناکامی کی وضاحت حکومت ہی کر سکتی ہے۔

20 جون: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے ایک مراسلہ کے ذریعے وزارت خارجہ سے مطالبہ کیا ہے کہ ملیشیا میں 'داخلی تحفظ قانون' کے تحت زیر حراست تین پاکستانیوں کی مدد کے لیے فوری اقدامات اٹھائے جائیں۔

11 جولائی: ملک میں خون ریزی اور بیہمانہ تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات، بشمول دشت میں حال ہی میں کم ازکم 18 افراد کا قتل، گجرات میں آرمی کیمپ پر حملہ اور کراچی میں روزانہ ہونے والی اموات، نہ صرف یہ کہ ملک میں معمولی سی شہہ پر تشدد کے رجحان کی نشاندہی کرتی ہیں بلکہ یہ ریاست کی اس مسلسل ناکامی کی بھی نشان دہی کرتی ہیں کہ وہ تشدد کی کارروائیوں پر قابو پانے اور مجرموں کو قرار واقعی سزا دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

13 جولائی: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے لاہور میں خیبر پختونخوا سے تعلق رکھنے والے نو (9) زیر تربیت سٹاف ارکان کی ہلاکتوں کی شدید مذمت کی ہے۔ کمیشن نے ہلاک ہونے والے سٹاف ممبرز کے لیے سکیورٹی کی عدم موجودگی پر بھی تنقید کی ہے اور قاتلوں کو پکڑنے کے لیے تفتیش کا مطالبہ کیا ہے۔ اس حملے کی مکمل طور پر تفتیش بھی ہونی چاہیے کہ مجرم اپنے مقصد میں کیسے کامیاب ہوئے۔

''HRCP کو لاہور میں ہونے والے وحشیانہ حملے پر انتہائی مایوسی ہوئی ہے جس کے نتیجے میں نو (9) زیر تربیت جیل وارڈن جن کا تعلق خیبر پختونخوا سے تھا اپنی قیمتی جانوں سے ہاتھ بیٹھے۔ کمیشن کو اس بات پر بھی شدید تشویش لاحق ہے کہ حملہ آوروں نے وارڈنز کے ہوسٹل کو انتہائی آسانی کے ساتھ نشانہ بنایا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد فرار ہو گئے اور انہیں کسی نے چیلنج نہیں کیا۔ انتظامیہ نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ سٹاف کے پاس سکیورٹی کا کوئی بندوبست نہیں تھا اور پولیس کے سربراہ نے کہا ہے کہ اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ زیر تربیت عملہ وہاں مقیم تھا۔ دہشت گردوں کی انٹیلی جنس پولیس سے زیادہ معتبر اور بہتر ہے۔ یہ حملہ متعدد پریشان کن سوالات کو جنم دیتا ہے۔ یہ سوچنا ناممکن ہے کہ اس نوعیت کا حملہ مقامی مدد کے بغیر کیا گیا ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ یہ مقامی عسکریت پسندوں کی ہی کارستانی ہو۔ ابھی چند ماہ قبل عسکریت پسندوں نے لاہور کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا تھا۔ ہو سکتا ہے اب وہ صوبائی حکومت کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے ہوں۔

بلوچستان

30 اگست: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے جمعرات کے روز بلوچستان میں کیے گئے ایک تحقیقاتی مشن کی رپورٹ جاری کی ہے۔ایچ آر سی پی کے تحقیقاتی مشن نے 15 مئی سے 19 مئی تک بلوچستان کا دورہ کیا تاکہ ان اقدامات کا جائزہ لیا جا سکے جو حکومت نے اس صوبے میں اٹھائے ہیں اور وہاں جاری بحران کے حل کے لیے متعلقہ فریقین کی تجاویز کو سنا جا سکے۔

مشن کی تکمیل پر تحقیقاتی ٹیم نے حسب ذیل سفارشات پیش کیں۔

1- بلوچستان میں کئی بنیادی حوالوں سے صورت حال ایسی ہی دکھائی دیتی ہے جیسی کہ 2011 میں تھی جب ایچ آر سی پی کے تحقیقاتی مشن نے بلوچستان کا دورہ کیا تھا۔اس میں تبدیلی نہیں آئی۔ بلوچستان میں جبری لاپتہ ہونے کے واقعات اب بھی پیش آ رہے ہیں اور اب بھی لاشوں کو ٹھکانے لگایا جاتا ہے۔عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ ایف سی اور خفیہ ادارے لوگوں کو لاپتہ کرنے میں ملوث ہیں۔کئی واقعات میں ان کا ملوث ہونا کسی شک وشبہ سے بالاتر ہے اور ثابت شدہ ہے۔قصورواروں کو سزا دینے اور ملوث افراد کے خلاف کارروائی میں ناکامی صورت حال کو مزید بگاڑ رہی ہے۔امن وامان کی حالت بدترین ہو چکی ہے اور تمام اضلاع میں فرقہ وارانہ ہلاکتیں بڑھ چکی ہیں۔

2- بلوچستان میں کئی مثبت تبدیلیاں بھی سامنے آئی ہیں جو صوبے میں حالات بہتر ہونے کی امید دکھا رہی ہے تاہم بہتری کی یہ امید بہت سے عوامل پر منحصر ہے۔اگرچہ سپریم کورٹ کی جانب سے کوئٹہ میں سماعت کے اثرات ابھی مکمل طور پر سامنے نہیں آئے مگر اس سے یقینی طور پر مثبت اثر ظاہر ہوا ہے۔ نوجوان اور سیاسی کارکن گفتگو اور مذاکرات میں شمولیت کے ذریعے بحران کا سیاسی حل ڈھونڈنے کے لیے پرجوش ہیں۔اخلاص اور خیر سگالی کے ذریعے موقع کو نتیجہ خیز بنایا جا سکتا ہے۔تبدیلی کی ضرورت کے حوالے سے یہاں بہت زیادہ شعور ہے اور لوگ تبدیلی لانے کے لیے آئندہ انتخابات کی طرف دیکھ رہے ہیں۔اگر انتخابی عمل آزاد اور شفاف ہوا تو ترقی پسند عناصر کی شرکت متوقع ہے۔کچھ قوم پرست مقابلہ میں نہیں اتریں گے مگر باقی الیکشن میں حصہ لیں گے۔قوم پرست اگر حکومت کا حصہ بنے تو معاملات بہتری کی طرف چل نکلیں گے۔تاہم لاقانونیت نے قوم پرست جماعتوں کے لیے انتخابات کی تیاری مشکل بنادی ہے کیونکہ ان میں سے بہت سی جماعتوں کا حلقہ انتخاب شورش زدہ اضلاع میں ہے۔بلوچستان میں انتخابی دھاندلی کے خدشات کے باعث قومی و بین الاقوامی نگرانی کا مطالبہ کیا گیا

ہے۔ بدامنی نے کئی اراکین پارلیمنٹ کو اپنے انتخابی حلقوں میں جانے سے روک رکھا ہے۔ اب لوگوں کو ایک دھائی میں ایک بار انتخابی عمل میں شرکت کا موقع مل رہا ہے۔ ایک عام خیال ہے کہ اگر بلوچستان میں حقیقی جمہوریت آئی تو جنگجو محدود تر ہو جائیں گے۔

3- بلوچستان میں تشدد اور کشیدگی کی کئی پرتیں ہیں۔ بدامنی ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے ہر شعبہ زندگی کو متاثر کیا ہے۔ جرائم کی لہر نے صوبے کے شہری علاقوں کو لپیٹ میں لے لیا ہے اور شاہراہیں تصادم کی علامت یا حکام کی نا اہلی کا ثبوت بن چکی ہیں۔ حکومت، قانون نافذ کرنے والے اور محافظ ادارے جنگجو، فرقہ ورانہ اور مجرمانہ عناصر سے نبٹنے میں مکمل طور پر ناکام ہو گئے۔

4- اغواء برائے تاوان ایک منافع بخش کاروبار بن چکا ہے۔ کسی مجرم کو گرفتار یا اس پر مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ کیسے اغواء کار بھاری سکیورٹی کے باوجود اپنا کام کرتے رہے۔ بلوچستان جانے والے زیادہ تر لوگوں کا ماننا تھا کہ مجرموں کو انتظامیہ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ صوبائی وزیر داخلہ نے ساتھی وزراء پر اس جرم میں ملوث ہونے کا الزام عائد کیا لیکن کوئی اقدام نہ کیا گیا۔ لوگوں نے سوال کیا کہ عوام کو، ہزارہ برادری کو، غیر مسلموں اور ان ٹرک ڈرائیوروں کو کون تحفظ فراہم کرے گا جو تاوان کی ادائیگی پر بھاری رقوم خرچ کر رہے ہیں۔

5- مسئلہ بلوچستان ایک طویل عرصے تک بلوچ مزاحمت اور بلوچوں کے حقوق کے تناظر میں دیکھا جاتا رہا ہے۔ بلوچستان کے مسائل پر ہمدردانہ غور کرنے کی ضرورت ہے، خاص طور پر پختون آبادی، ہزارہ برادری، غیر مسلموں اور آبادکاروں اور اس کے ساتھ ساتھ معاشی اور روزگار کے مسائل پر ہے۔

6- یہ شکائت عام تھی کہ ریاست یا تو مذہبی اقلیتوں اور کچھ مسلم فرقوں کے افراد کو تحفظ فراہم کرنے سے قاصر ہے یا پھر کرنا ہی نہیں چاہتی۔ آبادکاروں کا مزاحمت کاروں کے ہاتھوں قتل اور خوف و ہراس کی وجہ سے انہوں نے یا تو پختون اکثریت کے علاقوں میں پناہ لے لی یا صوبے سے ہی نقل مکانی کر لی۔ مذہبی اور لسانی شناخت کی بنیاد پر ٹارگٹ کلنگ اور جرائم بڑھ گئے ہیں۔ ہزارہ برادری کا مسلسل قتل عام اتنا بے رحمانہ تھا جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ وہ لوگ جو کمیشن سے ملے، نے کہا کہ اگر انتظامیہ قتل عام کو روکنا چاہتی یا اس کے ذمہ داروں کو سزا دینے میں سنجیدگی کا مظاہرہ کرتی تو یہ اس حد تک نہ پھیلتا۔ عقیدے کی بنیاد پر ہونے والے تشدد سے لوگوں کو بچانے میں حکومت کی آمادگی یا اس میں اہلیت نہ ہونیکا سوال اٹھایا گیا۔ بڑھتے ہوئے خطرات بشمول اغواء برائے تاوان کی وارداتوں نے، ہزارہ، غیر مسلموں، آبادکاروں اور متمول لوگوں کو ملک کے دوسرے حصوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے حتٰی کہ کچھ تو ملک ہی

چھوڑ گئے ہیں۔

7- کئی علاقوں میں طالبانائزیشن بڑھ رہی ہے۔ ماضی کے برعکس صرف کہیں اور سے صوبے میں مذہبی جنون درآمد نہیں ہورہا تھا، بلکہ اب یہ بلوچستان میں پرورش پا رہا تھا۔ مدرسوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے بین المسلکی منافرت کو بڑھا دیا ہے۔ یہ خوف پایا جاتا ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے جنگجوؤں کی حوصلہ افزائی کررہے ہیں اور کوئٹہ ان کے لیے جنت بنایا جارہا ہے۔ صوبے میں جنگجوؤں کے تربیتی مراکز کا ذکر بھی کیا گیا۔

8- بلوچستان سے بے قاعدہ ہجرت پر آمادہ لوگوں نے روشن مستقبل کی خاطر بے پناہ خطرات مول لیے اور انسانی سمگلر ان کے استحصال پر خوش تھے۔ ان اسباب کے ازالے بہت کم کام کیا گیا، جنھوں نے لوگوں کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔

9- ماضی کے برعکس تخریب کاروں نے مرحلہ وار انفراسٹرکچر اور تعمیراتی ڈھانچے کو نشانہ بنایا۔

10- باوجود اس کے کہ حکومت بلوچستان میں مسائل کے سیاسی حل کی نیم دلانہ خواہش رکھتی ہے، بھٹکے ہوئے عناصر کے ساتھ بات چیت میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔ حتیٰ کہ اس جانب ابتدائی اقدامات بھی نہیں اٹھائے گئے۔

11- ریاست کی اپنے بنیادی فرائض سے غفلت اور این جی اوز کی اپنے عملہ کے اغواء کے خطرہ کے پیش نظر پسپائی نے حالات کو گھمبیر بنا دیا ہے۔ حکومت اور ترقیاتی اداروں نے شورش زدہ علاقوں کو تنہا چھوڑ دیا ہے۔ صحت اور تعلیم کو نظر انداز کیا گیا۔ بہت سے قابل اساتذہ نے نقل مکانی کر لی ہے۔ صوبے کے کچھ حصوں میں شورش اس بات کا جواز پیش نہیں کرتی کہ ریاست ان لوگوں کی صحت، صفائی، بنیادی ضرورتوں اور انفراسٹرکچر کو نظر انداز کر دے جو کہ جاری کشمکش سے متاثر نہیں ہیں۔ صوبے میں ایسی جگہیں ہیں جہاں ایسے لوگ رہتے ہیں جو کہ رنگ و نسل سے بالاتر ہیں اور ایسے حالات میں رہتے ہیں جو کہ پتھر کے دور سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ کسی نے بھی ان کے مسائل کے حل کو ترجیح نہیں دی۔

12- ان مسائل کے حل میں صوبائی حکومت کہیں نظر نہیں آتی۔ وزیر اعلیٰ زیادہ وقت صوبے سے باہر رہتے ہیں اور صوبائی کابینہ صوبے سے باہر اجلاس منعقد کرتی رہی ہے۔ صوبائی حکومت نے بہت کم عرصے میں ہی بری شہرت کمائی ہے۔ یہ اپنی طرز کی انوکھی مثال ہے کہ اسمبلی کے سارے ممبران ماسوائے ایک ممبر کے، حکومت اور کابینہ میں شامل ہیں۔ اٹھارویں (18) ترمیم اور قومی مالیاتی کمیشن ایوارڈ کے بعد، بلوچستان کو یقیناً زیادہ فنڈز ملے ہیں۔ لیکن وہ نچلی سطح پر منتقل نہیں ہوئے ہیں۔ عام مشاہدہ ہے کہ کرپشن

بھی اتنی ہی بڑھی ہے۔

13- حکومت نے بلوچستان کی کمزور معیشت اور کاروبار کی بحالی کے لیے قدامات اٹھانے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں دکھائی۔صنعت تباہ ہو چکی ہے، قدرتی وسائل کا درست استعمال نہیں کیا جارہا اور زراعت تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے جو بلوچستان کی معیشت کا ایک اہم حصہ سمجھی جاتی ہے کیونکہ زراعت کی ترقی کیلئے نہ تو بجلی کی فراہمی یقینی بنائی گئی ہے اور نہ ہی پانی کی فراہمی کے دیگر ذرائع مثلاً ڈیم بنانے پر توجہ دی گئی ہے۔

14- دیگر صوبوں کے مقابلے پر بلوچستان کی بجلی کی ضروریات خاصی کم ہیں۔اس کے باوجود بلوچستان میں عوام کو شدید لوڈ شیڈنگ کا سامنا ہے۔عوام کا مطالبہ ہے کہ حکومت پاکستان کو ایرانی حکومت کی بلوچستان کو 1000 میگا واٹ بجلی کی فراہمی کی پیشکش قبول کر لینی چاہئے۔

15- بلوچستان کے عوام میں یہ احساس شدت سے موجود ہے کہ قومی میڈیا نے ان کے مسائل کو بری طرح سے نظر انداز کیا ہے۔حتیٰ کہ جب ہڑتال سے پورے کے پورے شہر بند ہوتے ہیں تو میڈیا اسے رپورٹ نہیں کرتا۔صحافت سے وابستہ افراد سکیورٹی فورسز اور شدت پسندوں کی جانب سے نقصان پہنچائے جانے کے ڈر سے اپنے فرائض درست طور پر ادا نہیں کر پاتے۔بلوچستان کے وہ اضلاع جہاں شدت پسند زیادہ مضبوط ہیں، وہاں کے عوام بالعموم اور صحافی بالخصوص خود کو قیدی محسوس کرتے ہیں۔ صحافی یا تو شدت پسندوں کی نظر میں باغی ہوتے ہیں یا سکیورٹی فورسز کی نظر میں اور دونوں صورتوں میں مارے جاتے ہیں۔قومی سطح کے اخبارات بھی بلوچستان سے متعلق مسائل کو اپنے اخبارات کے بلوچستان ایڈیشنوں میں ہی شائع کرتے ہیں۔اس وجہ سے ملک کے دیگر حصوں کے لوگوں کو بلوچستان کے اصل مسائل سے آگاہی نہیں ہو پاتی۔

16- ایچ آر سی پی کے اراکین کو بلوچستان میں جدید ہتھیاروں کی وافر تعداد میں موجودگی سے سخت صدمہ پہنچا اور اس بات سے بھی کہ ان ہتھیاروں تک لوگوں کی رسائی نہایت آسان ہے۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ جب ایک عام آدمی کو سکیورٹی چیک پوسٹ پر ایک چاقو رکھنے پر گرفتار کر لیا جاتا ہے تو اتنی وافر تعداد میں یہ ہتھیار کیسے ان چیک پوسٹوں سے گزر گئے۔اگر ہتھیاروں کے آزادانہ پھیلاؤ کو روکنے کے لیے پُرخلوص اقدامات اُٹھائے جاتے تو صورتحال اس سے مختلف ہوتی۔

17- عوام عام طور پر لیویز پر اعتماد کرتے ہیں کیونکہ اس میں مقامی افراد شامل ہیں۔پولیس کو عام طور پر عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔

18- بلوچستان میں ہونے والے پرتشدد واقعات کی تفتیش عام طور پر اس وقت ختم ہوجاتی ہے جب اس کی ذمہ داری کسی نہ کسی علیحدگی پسند گروپ کی جانب سے قبول کر لی جاتی ہے۔اس طرح بلوچستان میں جرائم پیشہ افراد کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی ہے کیونکہ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے جرم کی تفتیش نہ ہونے کے برابر ہے۔

03 ستمبر: طالبان کی جانب سے 12 سپاہیوں کے سر قلم ہونے کے واقعے کی مذمت کرتے ہوئے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے تمام اداروں، خصوصاً سیاسی جماعتوں کوخبردار کیا ہے کہ اگر وہ شدت پسندی کے انسداد میں ناکام رہے تو اس کے تباہ کن نتائج برآمد ہوں گے۔ کمیشن نے کہا: طالبان کی جانب سے 12 پاکستانی سپاہیوں کے سر قلم ہونے اور دیگر کو گولیوں سے ہلاک کرنے کے واقعے سے انتہاپسندوں کے مظالم کی لمبی فہرست میں ایک نئے سیاہ باب کا اضافہ ہوگیا ہے۔اطلاعات کے مطابق چند دن قبل باجوڑ میں طالبان نے ایک کارروائی کے دوران 15 سپاہیوں کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔اپنے یرغمالیوں کو ہلاک کرنے پر ہی اکتفا نہ کرنے والے شدت پسند گروہ نے مقتولین کے کٹے سروں، ان کی وردیوں اور عہدے کے نشانات کی نمائش کرنے کا بندوبست کیا اور ذرائع ابلاغ کو ویڈیوز بھیجیں۔ان کے اطلاع دینے کے عمل سے کوئی بھی مہذب آدمی خوف زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔انہوں نے کہا ''ان میں سے بیشتر کو گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا تھا، آپ نے دیکھ لیا ہے کہ ان میں سے 12 کو ذبح کیا گیا ہے، آپ نے دیکھا ہے کہ 12 کے سر یہاں ہیں اور زیادہ تر راستے میں ہیں''۔

ایچ آر سی پی مقتولین کے اہل خانہ کے ساتھ گہری تعزیت کا اظہار کرتا ہے جو اپنے فرائض کی ادائیگی کے دوران اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور امید کرتا ہے کہ کوئی فرد بھی دہشت گردی سے خوفزدہ ہوکر قاتلوں کی خوشی کا سبب بنے۔درحقیقت جنگجوؤں کی بربریت سے انتہاپسندی کے عفریت کی مکمل شکست تک اس سے لڑنے کے لوگوں کے عزم میں پختگی آنی چاہئے۔حالیہ واقعے سے حکومت اور سول سوسائٹی، خصوصاً سیاسی جماعتوں میں موجود ان عناصر کو باخبر ہوجانا چاہیے جو جنگجوؤں کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ان کا رویہ سنگدل قاتلوں کے ساتھ ملی بھگت کرنے کے مترادف ہے اور انتہاپسندی کے خلاف موقف اختیار کرنے میں ان کی ناکامی یقیناً ملک کو ناقابل تصور شدت کی تباہی کی طرف دھکیلے گی۔

24 ستمبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے غیر محفوظ گروہوں کے خلاف ملک بھر میں تشدد اور عدم برداشت کے حالیہ واقعات پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ عدم برداشت کو روکنے میں ناکامی کے باعث صورتحال سنگین ہورہی ہے۔سوموار کو جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا:

ایچ آر سی پی حالیہ دنوں غیر محفوظ گروہوں کے خلاف تشدد اور عدم برداشت کے واقعات میں نمایاں اضافہ ہونے پر تشویش میں مبتلا ہے۔ ایک اشتہاراتی شعبے کے ماہر شیعہ اور اس کے چھوٹے بیٹے کو کراچی میں قتل کیا گیا ہے، بوہرہ فرقے کے پرامن لوگوں کو بندرگاہ والے شہر میں نشانہ بنایا جارہا ہے، ایران میں زیارت سے واپس آنے والے شیعوں کو بلوچستان میں قتل کیا گیا ہے اور ایک نوجوان احمدی دکاندار کو کراچی میں قتل کیا گیا ہے۔ مردان میں ایک گرجا کو جلا دیا گیا اور کئی مسیحی گھروں پر حملہ کرنے کے بعد انہیں لوٹ لیا گیا۔ یہ لمحہ فکریہ ہے کہ تشدد کی بے قابو لہر کی روک تھام کے لیے موثر اقدامات دیکھنے کو نہیں ملے۔

07 اکتوبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے بڑھتی ہوئی عدم رواداری، عقیدے کے نام پر ناروا سلوک، بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں جبری گمشدگیوں اور غیر قانونی حراست کے جاری واقعات، ملک میں فرقہ وارانہ تشدد کے فروغ اور لاقانونیت پر تشویش کا اظہار کیا ہے اور اسے شہریوں کے زندگی کے حق اور مذہبی آزادی کی راہ میں بڑی رکاوٹیں قرار دیا ہے۔

اتوار کو ایچ آر سی پی کونسل کے اجلاس کے اختتام پر جاری ہونے والے ایک بیان میں کہا گیا: ''پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کو ملک بھر، خصوصاً بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں جبری گمشدگیوں اور غیر قانونی حراست کے واقعات کا سلسلہ ختم نہ ہونے پر شدید افسوس ہے۔ یہ موذی مرض طاعون کی شکل اختیار کر لینے والے فرقہ وارانہ تشدد کے ساتھ پاکستان میں تیزی سے پھیل رہا ہے جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے اور جو دیدہ دانستہ بھی ہے۔

ایچ آر سی پی مذہبی اور فرقہ وارانہ شناخت کی بنیاد پر عدم رواداری اور انتہا پسندی جس کا سبب بڑھتی ہوئی مذہب زدگی ہے، کے بارے میں شدید فکر مند ہے۔ تعلیم اور نظام انصاف سمیت، زندگی کے تمام شعبے اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اکثریتی آبادی کے عقیدے اور دیگر مذاہب کے عقائد بلکہ یہ عقائد رکھنے کے حق کا مذاق اُڑانے کے مترادف ہے۔ ریاستی اداروں میں مذہب زدگی کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ حال ہی میں پشاور ہائی کورٹ کی جانب سے ایک قحبہ خانے کی مالکہ کی ضمانت کو ہر روز ایک گھنٹہ کے لیے پورا ماہ، مدرسے میں جانے کے ساتھ مشروط کرنے کا امر ذلت آمیز ہے جس کی قانون میں کوئی بنیاد موجود نہیں۔ ہائی کورٹس کی جانب سے ایسے فیصلوں کے ماتحت عدالتوں کے ججوں پر اچھے اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ ایسی مثالوں کی نشاندہی کرنی چاہیے اور ان کی شدید مذمت کرنی چاہیے۔

غیر متزلزل اور مستحکم تعلیمی پالیسی اور آگہی مہمیں ہی اِس تباہ کن لہر کو روک سکتی ہیں۔ موجودہ بدنظمی اور لاقانونیت کے سنگین خطرے اور پرامن انتخابات کے آثار کی غیر یقینی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے ایچ آر

سی پی تمام سیاسی جماعتوں، میڈیا اور سول سوسائٹی کی تنظیموں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ بالعموم پورے ملک اور بالخصوص بلوچستان میں پر امن انتخابات کے انعقاد کو یقینی بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں اور الیکشن کمیشن آف پاکستان کی مدد کریں تا کہ وہ اپنی بھاری ذمہ داریوں کو سرانجام دے سکے۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان کے اس فیصلے کو ایچ آر سی پی خوش آئند قرار دیتا ہے جس کی رُو سے ایسے پولنگ اسٹیشنوں میں دوبارہ پولنگ کی جائے گی جہاں رجسٹرڈ خواتین ووٹرز اپنے رجسٹرڈ ووٹوں کے 10 فیصد سے کم ووٹ کاسٹ کریں گی۔ اس فیصلے پر عملدرآمد ہونا چاہیے کیونکہ اس کی بدولت انتخابی عمل میں خواتین کی شرکت بڑھے گی اور خواتین کو ووٹ ڈالنے سے محروم کرنے کے لیے امیدواروں اور سیاسی جماعتوں کی جانب سے کیے جانے والے غیر قانونی معاہدوں کا سدباب ہوگا۔ کمیشن اپنے دیرینہ مطالبے کا اعادہ کرتا ہے کہ احمدیوں کے خلاف امتیازی سلوک ختم کیا جائے اور مشترکہ ووٹرز فہرست میں ان کے ناموں کی شمولیت کو یقینی بنایا جائے۔ ایچ آر سی پی حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کرنے کے اپنے وعدے کی پاسداری بھی کرے۔ صنعتی اور زرعی مزدوروں کے کام کے خطرناک حالات کو ذرائع ابلاغ اور حکام کی جانب سے محض اُس وقت معمولی سی توجہ ملتی ہے جب کوئی تباہ کن واقعہ پیش آتا ہے جیسا کہ گزشتہ ماہ کراچی میں لرزا دینے والی آگ لگنے اور فروری میں لاہور میں قائم فیکٹری کی عمارت کے گرنے کا واقعہ پیش آیا تھا۔ صنعتی اور زرعی معاملات میں منافع کو مزدوروں کے تحفظ اور فلاح و بہبود پر ترجیح دی جاتی ہے جو کہ یہ گلہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اُن کے مفادات کی کوئی بھی دیکھ بھال نہیں کر رہا۔ یہ بوکھلا دینے والا امر ہے کہ حکام ملک بھر میں امن عامہ کی شدید بگڑتی ہوئی صورت حال کو سنجیدہ کیوں نہیں لے رہے جس کے باعث شہری اپنے تمام حقوق سے محروم ہو رہے ہیں، نہ صرف زندگی کے حق سے بلکہ کام کرنے اور تعلیم حاصل کرنے کے حق سے بھی۔ اس بات کے قابل جواز خدشات ہیں کہ صورت حال انتخابات کے قریب اور دوران خراب تر ہوتی جائے گی۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ملک بھر میں امن عامہ کی مفلوج صورت حال کو کنٹرول کرنے کے لیے، حکومت محض الفاظی کی بجائے دانشمندانہ اور ٹھوس اقدامات اٹھائے۔

بد قسمتی سے، حکومت کی عدم توجہی کے باعث سندھ اور بلوچستان میں سیلاب متاثرین تاحال مشکلات سے دوچار ہیں۔ ایچ آر سی پی سول سوسائٹی اور میڈیا سے توقع اور امید کرتا ہے کہ وہ حکام کو بلا امتیاز تمام شہریوں کے تمام حقوق کی پاسداری کا فریضہ مسلسل یاد دلانے کے حوالے سے عوام کے حقوق کے نگران کی حیثیت سے مزید ذمہ دارانہ کردار ادا کریں گے۔

15 اکتوبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے پاکستان میں خوراک کی بڑھتی ہوئی

قلت اور اس کے لوگوں، خصوصاً خط غربت سے نیچے زندگی گزارنے والوں پر اثرات پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ منگل کو 'عالمی دن برائے خوراک' کے موقع پر جاری ہونے والے ایک بیان میں کمیشن نے کہا: پاکستان میں خوراک کی قلت میں اضافہ ہونے کی نا قابل تردید شہادت موجود ہے اور اس کے نتیجے میں قیمتوں میں اضافے کے باعث نہ صرف غریب افراد بلکہ پاکستان کے متوسط آمدنی والے طبقے کے لیے بھی خوراک اور غذا تک رسائی مشکل ہوگئی ہے۔ اشیائے خورد ونوش کی قلت کا مسئلہ پیدا ہونے پر عموماً متعلقہ جنس درآمد کی جاتی ہے۔ زرعی اجناس کی کم سے کم سرکاری قیمت میں اضافے نے اجناس کی قیمتوں میں اضافے کو جنم دیا ہے اور انہیں غریب کی پہنچ سے مزید دور کر دیا ہے۔ خوراک کی قیمتوں میں شدید اضافے نے متوسط آمدنی والے گھرانوں کو بھی مجبور کر دیا ہے کہ جو وسائل پہلے وہ صحت اور تعلیم پر صرف کرتے تھے، اب خوراک پر صرف کریں۔ ایچ آر سی پی حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس مسئلے کو ترجیح دے۔ پاکستان وسیع پیمانے پر پالیسی سازی میں تبدیلی کے بغیر اس بحران سے نہیں نکل سکتا۔ 'عالمی دن برائے خوراک' سب کو یہ سوچنے کا موقع فراہم کرتا ہے کہ کس وجہ سے لوگوں کی غذائیت بخش خوراک تک رسائی مشکل ہے اور ارضیاتی و آبادیاتی دونوں لحاظ سے پیدا ہونے والی خوراک کی قلت کا سبب کیا ہے؟ یہ دن ہمیں بھوک اور غذائی کمی کا شکار افراد کی مدد کرنے کے عزم کا اظہار کرنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔

12 نومبر: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کے اراکین نے سینیٹر (ریٹائرڈ) اقبال حیدر کی وفات پر گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے۔ اقبال حیدر ایچ آر سی پی کے بانی اراکین میں شامل تھے اور انہوں نے کمیشن کی تشکیل کے برسوں میں اس کے استحکام کے لیے بہت زیادہ جدوجہد کی تھی۔ انہوں نے جبری مشقت اور جبری گمشدہ افراد کے مقدمات میں سپریم کورٹ میں ایچ آر سی پی کی نمائندگی بھی کی تھی۔ وہ ایچ آر سی پی کے شریک چیئرپرسن کی حیثیت سے بھی خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔

اقبال حیدر نے انسانی حقوق کے کارکن، رکن پارلیمان، وزیر قانون اور اٹارنی جنرل کی حیثیت سے پاکستان میں انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے پرعزم جدوجہد کا مظاہرہ کیا ہے۔ اکثر اوقات، پارلیمان میں عزت کے نام پر قتل کی مذمت اور پسماندہ طبقات کے حقوق کے لیے ان کی طرف سے واحد آواز بلند ہوتی تھی۔ وہ پرعزم سیاسی کارکن تھے اور انہوں نے متعدد بار فوجی حکومتوں کی جانب سے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ان کی وفات سے ملک، علاقے میں امن، انسانی حقوق کی اقدار اور غیر محفوظ طبقوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے کوشاں شخص سے محروم ہوگیا ہے۔

13 نومبر: اندرون نقل مکانی کے مسئلے پر غور وخوض کرنے کے لیے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

(ایچ آر سی پی) کی جانب سے منعقد کردہ مشاورت کے شرکاء اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ لوگوں کو تعلیم کی فراہمی، رواداری و امن کے فروغ، آفات سے نبٹنے کے طریق کار اور ہنگامی منصوبہ بندی کے استحکام کو یقینی بنانے سے پاکستان کو درپیش اندرون نقل مکانی کی مشکلات کو روکا جاسکتا ہے یا کم ازکم ان میں بڑی حد تک کمی لائی جاسکتی ہے۔ مینگورہ، سوات میں منعقد ہونے والے دو روزہ اجلاس کے شرکاء نے کہا کہ ملک میں نقل مکانی کی مشکلات کے ازالے کے لیے فریقین سے مشاورت نہایت اہمیت کی حامل تھی۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ قدرتی آفات میں پیشگی تنبیہ کا بہت کم مشاہدہ کیا گیا ہے، تاہم خودساختہ آفات میں اقدامات اٹھانے کے بہت زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ شرکاء کا کہنا تھا کہ شراکتی فیصلہ سازی کی حوصلہ افزائی اور بہتری کے لیے مقامی کمیونٹی کے ساتھ مشاورت نہایت ضروری ہے۔ انہوں نے امکانی نقصان اور نقل مکانی سے بچنے کے لیے شدت پسندی مخالف حکمت عملیاں اپنانے پر بھی زور دیا۔ شرکاء نے قدرتی آفات اور مسلح کشیدگی کے باعث پیدا ہونے والی نقل مکانی، خیموں کے اندر اور میزبان کمیونٹیوں کے ساتھ نقل مکنیوں کے قیام، اضافی مسائل کا شکار آئی ڈی پیز، میزبان کمیونٹیوں پر اثرات، واپسی اور بحالی نو، فیصلہ سازی کے عمل میں متاثرہ کمیونٹیوں کی شمولیت، میڈیا، سول سوسائٹی اور منتخب شدہ نمائندوں کے کردار، انسدادی حکمت عملیوں اور مستقبل کے لائحہ عمل سمیت نقل مکانی کے مسئلے کا تفصیلی جائزہ لیا۔

شرکاء کا خیال تھا کہ عوام دوست نظم و نسق، استحکام پذیر ذرائع معاش، موثر خواندگی، روادار، متوازن اور متبادل خیالات کے فروغ، مالاکنڈ ڈویژن اور فاٹا جیسے علاقوں کی آئینی حیثیت بارے دیرینہ تحفظات کے ازالے اور سول سوسائٹی کی موثر شراکت سے مشکلات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ بحالی نو کے عمل میں تاخیر نہ برتی جائے اور وہ شفاف اور جواب دہ ہو۔ منصوبہ بندی طویل المیعاد بنیادوں پر مبنی ہونی چاہئے تا کہ اس نتیجے میں پیدا ہونے والے فوائد مستحکم ہوں۔

سوات کے تناظر میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تشدد اور کشیدگی کی فضا کے انسداد کے لیے بحالی نو کے عمل کے ساتھ ساتھ مصالحتی عمل پر بھی توجہ دی جائے۔ مشاورت کے شرکاء میں اندرون نقل مکانی کے متاثرہ افراد، این جی اوز کے نمائندگان، مقامی سطح کی تنظیمیں، صحافیوں، وکلاء، انسانی حقوق کے مدافعین اور حکومتی اہلکار بھی شامل تھے۔

04 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کراچی میں تشدد کی حالیہ لہر اور امن وعامہ کی ابتر صورتحال پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے جس کے نتیجے میں پہلے ہی بیشتر انسانی زندگیاں ضائع ہوچکی ہیں۔ ایچ آر سی پی نے حکومت اور مرکزی سیاسی جماعتوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ مسئلے کے فوری حل کے

لیے مل کر کوئی حکمت عملی تشکیل دیں۔

پولیس/نیم فوجی دستوں کے مظالم

30 اپریل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے لیاری، کراچی میں عام شہریوں کو درپیش مشکلات پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے جہاں قانون نافذ کرنے والے اداروں نے گزشتہ کئی دنوں سے منظّم شدہ جرائم کے خلاف کارروائی شروع کر رکھی ہے۔

کمیشن نے کہا: ''ایچ آر سی پی لیاری میں جاری کارروائی کی نوعیت اور افادیت پر رائے دینے کی حالت میں نہیں ہے مگر اسے علاقے میں رہائش پذیر لوگوں کے نا قابل برداشت مصائب پر شدید تشویش ہے۔ لیاری میں بنیادی ضروریات کی قلت اور لوگوں کی بجلی، پانی اور بچوں کے لیے دودھ جیسی اشیا تک عدم رسائی کی اطلاعات منظر عام پر آئی ہیں۔ یہ صورتحال انتہائی افسوسناک ہے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکاروں اور ان کے اہداف کے مابین تصادم کے باعث متعدد لوگ وہاں سے نقل مکانی کر رہے ہیں اور یہ کہ انہیں پناہ فراہم کرنے کے لیے کسی قسم کے انتظامات نہیں کیے گئے۔ بچوں کی تعلیم کا سلسلہ مکمل طور پر تعطل پذیر ہوگیا ہے۔ یہ پریشان کن امر ہے کہ ان مشکلات کا قبل از وقت اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں تھا مگر ان پر مناسب توجہ مرکوز نہیں کی گئی۔ امدادی اداروں کو چاہئے کہ وہ لوگوں کو خوراک اور دیگر بنیادی ضروریات فراہم کریں، لوگوں کی ہسپتالوں اور ذرائع نقل وحمل تک رسائی کو یقینی بنایا جائے اور لوگوں کو پولیس اور اس کے اہداف کی زد میں آنے سے بچانے کے لیے مناسب اقدامات اٹھائے جائیں۔ حکام اس امر کو یقینی بنائیں کہ آپریشن کے باعث علاقے کے پرامن شہریوں کو مصائب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ آپریشن کے جانبدارانہ ہونے کے الزامات کے ماحول میں، حکام کو آپریشن، اس کی حکمت عملی، کامیابیوں اور وقت کے تعین کے حوالے سے شفافیت کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ ایچ آر سی پی حکومت اور تمام سیاسی جماعتوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ کراچی کے کشیدگی زدہ علاقے میں فوری امن کے قیام کے لیے جدوجہد کریں۔ کمیشن کو اس بات پر بھی تشویش ہے کہ فائرنگ کے نتیجے میں تین پولیس اہلکاروں سمیت 19 افراد ہلاک اور 2 صحافیوں سمیت متعدد افراد زخمی ہو چکے ہیں۔